بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مطالب الفرقان

(قرآن مجید کی تفسیر ـــــ خود ـــــ قرآن مجید سے)

جلد دوم

سورۃ بقرۃ - آیات ۳۰ تا ۱۱۲

پرویز

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب	———	مطالب الفرقان (جلد دوم)
مصنف	———	غلام احمد پرویزؒ
ناشر	———	طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
	———	25-B گلبرگ II لاہور 54660
	———	فون: 576 4484
طابع	———	دوست ایسوسی ایٹس
	———	الکریم مارکیٹ' اردو بازار' لاہور 54000
	———	فون: 712 2981
مطبع	———	عالمین پریس
چوتھا ایڈیشن	———	دسمبر 1996ء (بلا ترمیم)

طلوع اسلام ٹرسٹ سے حاصل شدہ جملہ آمدن
قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

باسمہٖ تعالیٰ

آئینۂ مطالب

عنوان	صفحہ
فہرست	ا۔ ظ
انڈکس آیات	ع
حرفِ آغاز	ف
پہلا باب — تمہید سرگذشتِ آدم	
الانسان	
۱۔ غیر جاندار مادہ سے زندگی کی نمود کیسے ہوگئی۔	۳
۲۔ نظریۂ ارتقاء اور قرآنِ مجید۔	۶
۳۔ محققینِ مغرب کی غلط نگہی۔ سیکولرازم کا تصور	۱۰
۴۔ انسان اور حیوان میں بنیادی فرق	۱۲
"نفخ رُوح" سے مراد	۱۵
۵۔ انسانی ذات یا نفس کے خصائص و وظائف	۱۶
حیات بعد الممات	
انسانی ذات، ذاتِ خداوندی کا جزو نہیں	۲۲
نفسِ انسانی	۲۳
۶۔ انسانی ذات ہر بچہ کو عطا ہوتی ہے لیکن غیر نشوونما یافتہ شکل میں۔	۲۴
۷۔ انسانی زندگی کا مقصد اس ذات کی نشوونما ہے۔	۲۴
۸۔ تزکیۂ نفس کا ذریعہ انفاق فی سبیل اللہ۔	۲۵
۹۔ اس کی پہچان کہ ذاتِ انسانی کی نشوونما ہو رہی ہے	۲۵
۱۰۔ ذات کی خصوصیت انفرادیت ہے۔	۲۶
نیز اختیار و ارادہ۔	″
۱۱۔ عملِ خیر سے مراد۔	۲۷
۱۲۔ موت کے بعد انسانی ذات اپنے اعمال کے نقوش لئے آگے بڑھتی ہے۔	۲۸
۱۳۔ سائیکالوجی کی تحقیق	۳۰
نفسِ انسانی کے دو شعبے۔ شعوری اور غیر شعوری — ان دونوں کا مجادلہ۔	″

عنوان	صفحہ
۱۴- اعمال نامہ سے مراد۔	۳۱
۱۵- نفسِ انسانی کا بقا۔	״
انسانی فطرت	״
۱۶- انسان کی کوئی فطرت نہیں	۳۴
۱۷- ہمارے ہاں کا غلط عقیدہ - اسلام دینِ فطرت ہے	۳۵
۱۸- قرآن میں بیان کردہ انسانی خصوصیات۔	۳۶
۱۹- خیر و شر کی تمیز انسان کے اندر رکھ دی گئی ہے۔	۳۸
یہ عقیدہ بھی غلط ہے۔	״
۲۰- **حملِ امانت**	۳۹
۲۱- دیگر انسانی خصوصیات	۴۰
۲۲- اشرف المخلوقات ہونے کا غلط نظریہ۔	۴۱
۲۳- انسان اور بشر۔	״
۲۴- جن و انس	۴۲
۲۵- النّاس	״
ابلیس	״
۲۶- انسانی کردار کے دو گوشے	۴۲
خونخواریت اور گدازیت	
۲۷- عیسائیت کا باطل نظریہ —	۴۳
گناہِ اول	״
۲۸- اس سے جبریت کا عقیدہ پیدا ہوا۔	۴۳
اس کی تردید۔	۴۴
۲۹- مغربی محققین کی ریسرچ	۴۴
اور اس کی تردید۔	۴۵

عنوان	صفحہ
۳۰- جبلت - نسل - وراثت - ماحول - عادات عمرانیت	
کے نظریات اور ان کی تردید۔	۴۶
۳۱- ابلیس یا شیطان — قرآن میں۔	۵۰
یہ خود انسان کے اپنے جذبات کا نام ہے۔	۵۱
۳۲- ان بیباک جذبات کے مختلف مظاہر —	
شیاطین الجن والانس۔	۵۲
۳۳- غلط اعمال کو مزین بنا کر دکھانا — شیطان کا	
سب سے زیادہ کامیاب حربہ	۵۳
مصنوعی نیکیاں — مصنوعی صلوٰۃ	۵۴
۳۴- احکام کے نتائج خود قرآن نے واضح کر دیئے۔	۵۶
اسے کتاب و حکمت کہتے ہیں۔	״
۳۵- نفسِ امّارہ۔ نفسِ لوّامہ۔ نفسِ مطمئنہ	۵۷
۳۶- نفسیاتی امراض اور اخلاقیات کا باہمی تعلق	۵۸
۳۷- انسانی جذبات کی گہرائیاں۔	۵۹
۳۸- شیطان اور ابلیس دونوں الفاظ کیوں؟	۶۰
آدم	
۳۹- آدم سے مراد آدمی ہے،	۶۱
۴۰- قصۂ آدم خود مدنی الطبع انسان کی سرگزشت ہے	۶۲
۴۱- آدم کا لفظ انبیاء کرام کے ساتھ۔	۶۳
خلیفہ	۴
۴۲- خلیفۃ اللہ کا غلط عقیدہ۔	۶۴
۴۳- خلیفہ کے معنی جانشین کے ہیں۔	۶۴

عنوان	صفحہ
۴۴- انسان سے پہلی مخلوق -	۶۵
۴۵- استخلاف فی الارض -	۶۶
ملائکہ	
۴۶- مدبرات امورِ الہیہ - یعنی نظم و نسق کائنات کے لئے مامور قوتیں	۶۷
۴۷- فطرت کی قوتیں -	۶۷
ضمناً - عرشِ خداوندی سے مراد	״
۴۸- تسبیح ملائکہ -	۶۸
۴۹- ملائکہ کا سجدہ -	״
۵۰- تسخیرِ فطرت -	״
۵۱- نفسیاتی اثرات پیدا کرنے والے ملائکہ -	۶۹
ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے -	״
دوسرا باب ـــ سرگزشت آدم	
آیات ۲/۳۰ تا ۲/۳۹	
۲/۳۰ - واذقال ربک ...... تعلمون	۷۲
۵۲- ملائکہ کی تسبیح و تقدیس -	״
۵۳- تسبیح اور ذکر کا قرآنی مفہوم	۷۳
۵۴- ورد و وظائف : تعویذ گنڈوں کی حقیقت	۷۵
۵۵- فساد انگیزیاں اور خونریزیاں ۔	۷۶
۵۶- نیشنلزم کی خونریزیاں و فساد انگیزیاں	۷۷

عنوان	صفحہ
۵۷- عیسائیت اور جنگ	۷۸
۵۸- تغلب یعنی قوت کے استعمال کی دو قسمیں (سائیکالوجی کا انکشاف)	۷۹
۵۹- قرآن اور قوت کا استعمال	۸۰
۲/۳۱ - وعلّم آدم الاسمآء ..... صٰدقین	۸۱
۶۰- علم الاسماء -	۸۱
۶۱- اشیائے کائنات یا قوانینِ فطرت کا علم	۸۲
۶۲- غلط نام رکھنے کی تباہ کاریاں - ایک ضمنی گوشہ	״
بڑے بڑے مزار اور خانقاہیں	״
۶۳- تسخیرِ فطرت -	۸۳
۶۴- علمِ انسانی کی امکانی وسعتیں	۸۴
۶۵- سائنسدانوں کا اعترافِ عجز -	״
۶۶- تسخیرِ فطرت مقامِ آدم ہے جس میں مومن و کافر سب شامل ہیں -	۸۶
۶۷- یہ مومنین کا فریضہ ہے -	״
۶۸- علماء کون ہیں -	۸۷
۶۹- کائنات کے متعلق سیکولرازم کا باطل نظریہ -	״
افلاطون کا نظریہ - اعیانِ نامشہود -	۸۸
ہندوں کی ویدانت اور ہمارے صوفیاء کا	״
وحدت الوجود کا عقیدہ -	۸۸
مغرب کے مادہ پرستوں کا نظریہ -	״
۷۰- قرآنی نظریہ کائنات -	۸۹

عنوان	صفحہ
اسے بالحق پیدا کیا گیا ہے۔	۸۹
اسے باطل سمجھنا کفر ہے۔	۹۰
۷۱۔ کائنات کو باطل سمجھنے والے دنیا میں ذلیل ہوتے ہیں۔	۹۱
۷۲۔ مادہ پرستی کی تباہ کاریاں — مغربی مفکرین کا واویلا۔	۹۱
۷۳۔ تین گروہ — مومن۔ مغرب کے مادہ پرست۔ مذہب پرست۔	۹۲
۷۴۔ تخلیقِ کائنات کا ایک مقصد — قانونِ مکافاتِ عمل کی کارفرمائی۔	۹۳
مغرب کے مفکرین کا اعتراف۔	
۲/۳۲ - قالوا سبحٰنک .... الحکیم	۹۴
۷۵۔ ملائکہ کا اعترافِ عجز۔	۹۵
۲/۳۳ - قال یاٰدم .... تکتمون۔	″
۷۶۔ خدا غیب و شہود کا علم رکھتا ہے۔ اس کا مفہوم۔	″
۷۷۔ میلادِ آدم کے مناظر (اقبال کی زبانی)	۹۶
۲/۳۴ - و اذ قلنا للملٰئکۃ ... من الکٰفرین	۹۸
۷۸۔ ملائکہ کا سجدہ۔	۹۸
سجدہ کا مفہوم۔	۹۹
۷۹۔ ابلیس کا انکار۔	″
ابلیس ملائکہ میں سے نہیں تھا۔	″

عنوان	صفحہ
۸۰۔ ابلیسی کردار کے دو رُخ۔	۱۰۰
اپنا فیصلہ — اور مجبوری کا عذر۔	
۸۱۔ عقیدۂ جبر، پستی کردار اور دوں ہمتی کا مظہر ہے۔	″
۸۲۔ معصیتِ ابلیس و آدم میں فرق۔	۱۰۱
آدم نے غلطی کا اعتراف کر لیا۔ اس میں اصلاح کا امکان ہو گیا۔	″
ابلیس نے اس کا اعتراف نہ کیا۔ اس میں اصلاح کا امکان نہ رہا۔	″
۸۳۔ ابلیسی کردار اور اقبال۔	″
۸۴۔ پیدائشی امتیاز کا باطل نظریہ	۱۰۲
۸۵۔ آدم مسجودِ ملائک ہے	۱۰۳
خدا کے سوا کسی کی محکومیت جائز نہیں	″
یہی مقامِ عبدیت ہے۔	″
۸۶۔ شرک کیوں جرمِ عظیم ہے	۱۰۴
۸۷۔ رسوم و مظاہر کی اہمیت اور انہیں مقصود بالذات سمجھ لینے کی تباہ کاریاں۔	۱۰۵
۸۸۔ سیکولر نظام میں سجدہ کی اجازت!	۱۰۶
تحریکِ پاکستان کے دوران یہی مسئلہ مابہ النزاع تھا	″
۸۹۔ ابلیس کے جرائم کی فہرست۔	۱۰۶
۹۰۔ جذبۂ حسد۔	۱۰۷
۹۱۔ مستبدوں کا دبدبہ اور بزدلی۔	″

عنوان	صفحہ
۹۲- فرعون کا ایمان — اس کی پستیٔ کردار کا نتیجہ	۱۰۷
۹۳- ابلیس کا جذبۂ انتقام۔	۱۰۸
۹۴- قیامت تک مہلت۔	؍؍
۹۵- ابلیس اور خدا کے مخلص بندوں کی آویزش میں خدا دخل نہیں دیتا۔	۱۰۹
۹۶- احتناک کا رسواکن تغلب۔	؍؍
۹۷- مستبد ڈکٹیٹر اپنے مخالفین کو ذلیل کرکے بڑی لذت حاصل کرتے ہیں۔	۱۱۰
۲/۳۵ - وقلنا یٰآدم ..... الظّٰلمین	۱۱۱
۹۸- جنتِ آدم۔ رزق کی فراوانی لیکن میری اور تیری کی تفریق نہیں۔	۱۱۱
۹۹- مردوں اور عورتوں دونوں کا حصہ۔	۱۱۲
۱۰۰- جو قوم دنیا میں ذلیل ہے وہ آخرت میں بھی ذلیل ہوگی۔	۱۱۳
۱۰۱- شجر سے کیا مراد تھی؟	؍؍
۱۰۲- باہمی اختلافات سے قبیلوں۔ گروہوں اور قوموں میں بٹ جانا۔	۱۱۴
۲/۳۶ - فازلّھما الشیطٰن ... الٰی حین	۱۱۵
۱۰۳- ابلیسی سازش یہ ہے کہ نوعِ انسان، اولاد کی نسبت سے مختلف ٹکڑوں میں بٹ جائے۔	۱۱۶
۱۰۴- اہل وعیال وجہِ زینت ہیں لیکن اگر یہ بلند انسانی مقاصد کے راستے میں حائل ہو جائیں تو فتنہ بن جاتے ہیں۔	۱۱۷
۱۰۵- قرآنِ کریم نے مرد اور عورت دونوں کو یکساں مجرم قرار دیا۔	۱۱۷
عیسائیت نے صرف عورت کو مجرم ٹھہرایا اور اس بنا پر اسے مردود مخلوق قرار دیا	؍؍
عیسائیت میں عورت کی حیثیت	۱۱۸
۱۰۶- عورت کی حیثیت خود ہمارے ہاں —	؍؍
وضعی روایات پر مبنی تفاسیر	۱۱۹
۱۰۷- قرآن کریم میں مرد اور عورت ہمدوش	۱۲۳
۱۰۸- ہبوطِ آدم سے مراد تشتت وافتراق کی پست سطحِ زندگی۔	۱۲۵
۱۰۹- عداوت کا مفہوم — الگ الگ ہو جانا۔	۱۲۶
۱۱۰- معاشی طبقات میں باہمی عداوت۔	؍؍
۱۱۱- قرآن کریم کی وارننگ۔	۱۲۷
۲/۳۷ - فتلقّٰی آدم ...... التوّاب الرّحیم	۱۲۹
۱۱۲- وحی کی راہنمائی کی ضرورت	۱۲۹
کلمات اللہ سے مراد وحیِ خداوندی ہے۔	۱۳۱
یا وہ نظریۂ حیات یا نظامِ زندگی جو وحی پر مبنی ہو	۱۳۲
۱۱۳- آدم کی توبہ — اصلاح کی گنجائش اور اس کا طریق	۱۳۳
۲/۳۸ - قلنا اھبطوا .... یحزنون۔	؍؍
۱۱۴- اتباعِ وحی کا نتیجہ — خوف وحزن سے مامونیت	؍؍
خوف وحزن کا تفصیلی مفہوم۔	۱۳۴
سب پر غالب — جماعتِ مومنین کی زندگی یہی اولیاء اللہ ہیں۔	۱۳۵

عنوان	صفحہ
۲/۳۹ - والذین کفروا وکذبوا ...... خلدون۔	۱۳۶
۱۱۵ - اس کے برعکس کفر اور تکذیب کا نتیجہ جہنم کی تباہی ہو گا۔	،،
تکذیب کا مفہوم۔	۱۳۶
۱۱۶ - سرگذشتِ آدم پر نگہِ بازگشت۔	۱۳۶
انسان نے خارجی کائنات کے حسن کو سنوارا ہے۔ لیکن اپنی دنیا کو تباہ برباد کرتا چلا آ رہا ہے۔	۱۳۷
۱۱۷ - جنتِ آدم اور جنتِ مومن میں فرق —	۱۳۸
بخشش کی جنت اور اعمال کے بدلے میں حاصل کردہ جنت۔	،،
۱۱۸ - تورات میں قصۂ آدم	۱۳۹
یہ نتیجہ ہے وحیِ خداوندی میں انسانی آمیزش کا	۱۴۱
۱۱۹ - وضعی روایات کی سازش۔	۱۴۲
ان روایات کی رُو سے قصۂ آدم کو اعجوبہ بنا	۱۴۳
دیا گیا ہے۔	۱۴۳
خلاصۂ آیات ۳۰ تا ۳۹	۱۴۴-۱۴۵
(مقتبس از مفہوم القرآن)	

تیسرا باب — داستانِ بنی اسرائیل — منزلِ اول

آیات ۲/۴۰ تا ۲/۴۶

عنوان	صفحہ
۱۲۰ - قرآن فہمی کے تین طریقے۔ علم و دانش کی رُو سے نتائج پرکھنے سے۔ یا تاریخی شہادت کے ذریعے۔	۱۴۷
۱۲۱ - تاریخ کی اہمیت۔	۱۴۹
سائنس یا فلاسفی اوف ہسٹری۔	۱۵۰
مارکس کا نظریۂ تاریخ۔	۱۵۱
۱۲۲ - قانونِ مکافاتِ عمل یا سنت اللہ	۱۵۲
۱۲۳ - اثری انکشافات (اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات)	۱۵۴
۱۲۴ - قوموں کے عروج و زوال کے اصول۔	۱۵۵
۱۲۵ - قوموں کی ہلاکت سے کیا مفہوم ہے۔	،،
۱۲۶ - داستانِ بنی اسرائیل	۱۵۶
ابتدائی تعارف۔	۱۵۷
فرعونِ مصر۔	،،
۱۲۷ - بنی اسرائیل کے دس گم شدہ اسباط۔	۱۵۹
۱۲۸ - بخت نصر کا حملہ۔	۱۶۰
اس کا نقشہ حزقی ایل نبی کے خواب کی صورت میں	۱۶۱
اس کا قرآن کریم میں ذکر۔	۱۶۱-۱۶۲
۱۲۹ - حضرتِ عیسیٰ کے زمانے میں یہودیوں کے احبار و رہبان کی حالت۔	۱۶۴
حضرت عیسیٰ کے انقلاب آفرین وعظ۔	،،
انجیل برنباس کا بیان۔	،،
سیکولرازم کے خلاف بغاوت۔	۱۶۵
۱۳۰ - آخری تباہی۔	۱۶۵

عنوان	صفحہ
۱۳۱- ان کے جرائم کی فہرست جن کی وجہ سے ان کی تباہی ہوئی۔	۱۶۶
۱۳۲- ایک غلط فہمی کا ازالہ —	۱۶۸
یہودیوں کی حکومت قائم ہو سکتی ہے۔	۱۶۸
۱۳۳- حضرتِ موسیٰ کی داستانِ حیات۔	۱۷۰
۲/۴۰ - یٰبنی اسرائیل..... فارھبون۔	۱۷۱
۱۳۴- بنی اسرائیل پر انعاماتِ خداوندی۔	۱۷۱
فرعون کی طرف سے عذاب کی شکلیں۔	″
محکومی — تفرقہ — ذبحِ ابناء کا مفہوم۔	۱۷۲-۷۳
۱۳۵- نجات کا قرآنی مفہوم۔	۱۷۴
۱۳۶- تمکن فی الارض خدا کا انعام ہے جس سے بنی اسرائیل بہرہ یاب ہوتے تھے۔	۱۷۶
۱۳۷- کتاب و حکومت و نبوت۔ سرفرازیاں اور سربلندیاں۔	۱۷۷
۱۳۸- میثاقِ بنی اسرائیل کی تفصیلات۔	۱۷۹
۱۳۹- نقضِ عہد کا نتیجہ — احساس کمتری۔ منافقت۔	″
۱۴۰- "صرف مجھ سے ڈرو" کا مفہوم۔	۱۸۰
۱۴۱- "خدا سے ڈرنے" کا مفہوم کیا ہے — ایک اہم ضمنی گوشہ۔	۱۸۰-۸۲
۲/۴۱ - وآمنوا بما انزلت..... فاتقون۔	۱۸۲
۱۴۲- اہلِ کتاب سے قرآن پر ایمان لانے کا مطالبہ کیوں کیا گیا؟	۱۸۲

عنوان	صفحہ
۱۴۳- ان کی کتابیں محرّف تھیں۔	۱۸۳
۱۴۴- ان میں اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔	۱۸۴
۱۴۵- تورات کی تاریخ۔	″
۱۴۶- وحی کی دو قسمیں — وحی جلی اور وحی خفی	۱۸۶
مثنا۔ جمارا۔ تالمود۔ باطنی علم۔	″
۱۴۷- قرآن کریم کے مصدق ہونے کا مفہوم۔	۱۸۷
۲/۴۱ - ولا تکونوا اول کافر بہ۔	۱۸۸
۱۴۸- دین کی سب سے زیادہ مخالفت مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہوتی ہے۔	۱۸۸
ایمان، قرآنِ خالص کی اطاعت کا نام ہے۔	۱۸۹
مذہب، شخصیتوں کو ساتھ ملاتا ہے۔ اور انہی کی وضع کردہ شریعت کو شریعتِ خداوندی کہہ کر پکارتا ہے۔	۱۹۰
یہ شرک ہے	″
۱۴۹- حضورؐ پر قریش تو ایمان لے آئے لیکن اہلِ کتاب مخالفت پر اڑے رہے۔	۱۹۰
۱۵۰- اگر تمام معاملات کے فیصلے منزل من اللہ کتاب (قرآن مجید) کے مطابق نہ کئے جائیں تو یہ کفر ہے۔	۱۹۱
۱۵۱- مذہب میں جنت آسانی سے مل جاتی ہے۔	۱۹۱
۱۵۲- یہود و نصاریٰ کا باہمی تفرقہ۔	۱۹۲
۱۵۳- یہ دین میں غلو کرتے تھے۔	۱۹۳

عنوان	صفحہ
رسولوں کو خدا اور علماءؔ و مشائخ کو رسول بنا دینا	۱۹۳
۱۵۴- ہر رسول کا اعلان کہ میں تمہارے ہی جیسا بشر ہوں۔	〃
۲/۴۱- وَلَا تَشْتَرُوا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا	۱۹۴
۱۵۵- مذہب کو کاروبار مت بناؤ	۱۹۴
ہر رسول کا اعلان کہ تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔	〃
۲/۴۲- ولا تلبسوا الحق بالباطل وتکتموا الحق وانتم تعلمون۔	۱۹۵
حق کے معانی و مفہوم	〃
خدا الحق ہے۔	۱۹۶
قرآن الحق ہے۔	〃
اسلام دین الحق ہے۔	〃
اعمال نامہ الحق ہے۔	۱۹۷
۱۵۶- کشمکش حق و باطل۔	۱۹۷
۱۵۷- قوانینِ فطرت بھی حق ہیں	۱۹۸
ان کی خلاف ورزی باطل نتائج پیدا کرتی ہے	۱۹۹
۱۵۸- اسلامی جنگیں بھی اسی مقصد کے لئے تھیں۔	〃
۲/۴۳- واقیموا الصلوٰۃ ..... الراکعین۔	۲۰۱
۱۵۹- زکوٰۃ کا مفہوم۔	〃
(ضمناً اسلام اور کمیونزم کا بنیادی فرق)۔	۲۰۲
۱۶۰- انبیاءِ سابقہ کو زکوٰۃ کا حکم۔	۲۰۲

عنوان	صفحہ
رسول اللہؐ اور جماعت مومنین کو زکوٰۃ کا حکم۔	۲۰۲
۱۶۱- زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم جو قرآن کے مطابق نہیں۔	۲۰۴
۱۶۲- ایتائے زکوٰۃ حکومت کا فریضہ ہے۔	۲۰۵
۱۶۳- زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم۔	۲۰۶
انسانی جسم اور ذات کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچانا	۲۰۷
۱۶۴- دولت جمع کرنے کی سخت ممانعت۔	۲۰۸
فاضلہ دولت کسی کے پاس نہ رہے۔	۲۰۹
زکوٰۃ کے متعلق ایک وضعی روایت۔	۲۰۹
۱۶۵- رسول اللہؐ نے مروجہ زکوٰۃ دی ہی نہیں۔	۲۱۰
حضورؐ کی مالی حالت۔	۲۱۰
۲/۴۳- وارکعوا مع الراکعین۔	
۱۶۶- رکوع کا مفہوم۔ اطاعتِ خداوندی۔	۲۱۱
رکوع اور سجدہ میں فرق — رکوع عبوری دور کے احکام کی اطاعت ہے۔	۲۱۲
۱۶۷- دین اجتماعی نظام کا نام ہے۔	۲۱۳
۱۶۸ تشکیل امت۔	〃
رنگ، نسل، زبان، وطن کے اشتراک سے نہیں ایمان کے اشتراک کی بنا پر تعمیر امت۔	۲۱۵
ضمناً۔ دین اور تصوف میں فرق۔	〃
۱۶۹- امت کا اجتماعی نظام — خلافت یا اسلامی مملکت	۲۱۶
مرکزِ ملت — قبلہ	〃
۱۷۰- ہماری موجودہ حالت — فرقہ بندی کے شرک میں مبتلا۔	۲۱۷

عنوان	صفحہ
(۲/۴۴)- اتامرون الناس.....تعقلون	۲۱۹
۱۷۱- برّ کے معنی۔	۲۱۹
۱۷۲- یہودیوں کے علماء و مشائخ کی حالت۔	۲۲۰
(۲/۴۵-۴۶) واستعینوا بالصبر...راجعون	۲۲۲
۱۷۳- یہودیوں میں استقلال اور استقامت سے خطرات کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رہی تھی — صبر کا مفہوم۔	″
۱۷۴- فیصلے قانون مکافاتِ عمل کے مطابق ہوں گے۔	۲۲۳
خلاصۂ باب	۲۲۴

چوتھا باب

داستانِ بنی اسرائیل - دوسری منزل سینا کی وادی

آیات ۲/۴۷ تا ۲/۵۹

عنوان	صفحہ
(۲/۴۷)- یبنی اسرائیل.....علی العلمین	۲۲۸
۱۷۵- نعمائے خداوندی کی یاد دہانی سے مقصد	۲۲۸
(۲/۴۸)- واتقوا یوما.....ینصرون	۲۲۸
۱۷۶- نجات کے متعلق یہودیوں کے عجیب و غریب عقائد۔	۲۲۹
۱۷۷- قانونِ مکافاتِ عمل کا تشریحی بیان۔	۲۳۰
۱۷۸- جزا اور سزا کا قرآنی مفہوم	۲۳۱
۱۷۹- شفاعت کا باطل عقیدہ	۲۳۲
۱۸۰- شفاعت کا قرآنی مفہوم۔	۲۳۴
(ضمناً) قرآنی اصطلاحات کا مفہوم کس طرح متعین کرنا چاہیئے۔	۲۳۵
۱۸۱- دنیاوی زندگی میں شفاعت کے معنی معاونت کے ہیں۔	۲۳۵
۱۸۲- اخروی زندگی میں شفاعت سے مراد شہادت (گواہی) دینے کے ہیں۔	۲۳۶
۱۸۳- خدا خود شفیع ہے۔	۲۳۷
۱۸۴- رسول اللہ کے لئے یہ لفظ نہیں آیا۔ حضورؐ کے لئے شاہد اور شہید کے الفاظ ہی آتے ہیں۔	۲۳۷
۱۸۵- مجرموں کو جرم کے بدلے میں کچھ لے کر بھی چھوڑا نہیں جائے گا۔ اسے عدل یا کفارہ کہتے ہیں۔	۲۳۹
۱۸۶- نصرت کے معنی کسی مجرم کی مدد کرکے اُسے چھڑا لینا	۲۳۹
(۲/۴۹)- واذ نجینکم......عظیم۔	۲۴۰
۱۸۷- بلا (ابتلا) کا قرآنی مفہوم۔	۲۴۱
اللہ اپنے بندوں کی آزمائش نہیں کرتا۔	″
۱۸۸- ابتلا سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنا محاسبہ کرتا رہے کہ اس کی صلاحیتیں کس حد تک نشوونما پا رہی ہیں اور وہ کس سیرت و کردار کا مالک ہے۔	۲۴۲
۱۸۹- بلاء عظیم کے معنی احسان عظیم۔	۲۴۳
(۲/۵۰)- واذ فرقنا.....تنظرون	۲۴۴

عنوان	صفحہ
۱۹۰- مصر سے نکل کر سینا کی طرف آنے کا مرحلہ۔	۲۴۴
۱۹۱- ضمناً — رسول اللہؐ کی ہجرت کے دوران غار کا واقعہ۔	۲۴۴
۱۹۲- عصا کے معنی۔	۲۴۵
۱۹۳- آل کے معنی	۲۴۵
۱۹۴- سمندر نے کیسے راستہ دیا تھا۔	۲۴۶-۴۸
۱۹۵- فرعون کا ڈوبتے وقت ایمان لانا۔	۲۴۹
(جبریل اس کے منہ میں مٹی ٹھونس رہا تھا!)	۲۴۹
۱۹۶- اس کے بالمقابل ساحرین دربارِ فرعون کا ایمان!	۲۵۰
۱۹۷- فرعون کی لاش کا محفوظ رکھے جانا۔	۲۵۲
(۲/۵۱)- واذ وٰعدنا ...... ظٰلمون۔	۲۵۳
۱۹۸- فرمائش کہ ہمارے لئے بھی ایک بت بنوا دیجئے	۲۵۳
۱۹۸- عزیر کون تھا!	۲۵۴
۱۹۹- سامری کون تھا۔	۲۵۶
داستان گو واعظ۔	۲۵۷
۲۰۰- گوسالہ پرستی کا واقعہ	۲۵۷
۲۰۱- قوم کو تفرقہ سے بچانے کے لئے عارضی شرک گوارا کر لیا۔	۲۵۹
۲۰۲- مسلمان اور فرقہ پرستی کا شرک!	۲۵۹
ابلیس کا افسوس - یہ فرقے نہیں مکاتبِ فکر ہیں۔	۲۵۹
۲۰۳- سامریت کی افسانہ نگاری۔	۲۶۰
۲۰۴- تورات کا بیان۔	۲۶۱

عنوان	صفحہ
۲۰۵- شرک سے انسان شرفِ انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے اس لئے یہ ظلم عظیم ہے۔	۲۶۱-۶۲
(۲/۵۲)- ثمّ عفونا ...... تشکرون۔	۲۶۲
۲۰۶- شکر کا مفہوم۔	۲۶۳
۲۰۷- بازآفرینی کا ایک اور موقعہ	۲۶۴
(۲/۵۳)- واذ اٰتینا ...... تھتدون	۲۶۴
۲۰۸- اس مقصد کے لئے ضابطۂ ہدایت دیا گیا	۲۶۴
۲۰۹- اسے فرقان کہا گیا۔ فرقان کا مفہوم۔	۲۶۴
۲۱۰- ہر نبی اور ہر رسول کو کتاب دی گئی تھی۔	۲۶۵
۲۱۱- حضرت موسٰیؑ اور حضرت ہارونؑ دونوں کو کتاب ملی تھی۔	۲۶۵
(۲/۵۴)- واذ قال ...... التواب الرّحیم	۲۶۶
۲۱۲- توبہ اور تواب کی مزید تشریح۔	۲۶۶
۲۱۳- خدا کی صفت البارئ کا مفہوم۔	۲۶۷
۲۱۴- فاقتلوا انفسکم کا مفہوم	۲۶۷
خلاصۂ باب	
پانچواں باب — آیات ۲/۵۵ تا ۲/۷۱	
داستانِ بنی اسرائیل — خوئے غلامی کے مظاہرے	
۲۱۵- خوئے غلامی پر پختگی کے نتائج۔	۲۷۲
۲۱۶- حضرت ابراہیمؑ کا سوال — رب ارنی کیف تحی الموتٰی۔	۲۷۴

عنوان	صفحہ
۲۱۷ - حضرت موسیٰؑ کو ستانے والی قوم۔	۲۷۵
طرح طرح کے مطالبات، شکوے، طعن تشنیع۔	؍؍
(۲/۵۵)- واذ قلتم..... تنظرون۔	۲۷۶
۲۱۸ - مطالبہ کہ ہم خدا کو بے نقاب دیکھیں گے۔	۲۷۶
اور بزدلی کا یہ عالم کہ بجلی کی کڑک سے ہوش و حواس اُڑ گئے۔	۲۷۷
شرک سے انسان ایسا ہی بزدل ہو جاتا ہے۔	؍؍
۲۱۹ - مسلمانوں کو تنبیہ کہ تم ایسا نہ ہو جانا!	۲۷۸
لیکن تصوف ہمیں ان سے بھی آگے لے گیا۔	۲۷۹
(۲/۵۶)- ثمّ بعثنٰکم..... تشکرون۔	۲۷۹
۲۲۰ - لفظ موت کا مجازی مفہوم۔	۲۸۰
۲۲۱ - لفظِ بعث کا مفہوم	۲۸۱
(۲/۵۷)- وظلّلنا علیکم..... یظلمون	۲۸۲
۲۲۲ - دیگر نعمائے خداوندی — بادلوں کا سایہ۔ یعنی آسائش و راحت کا سامان۔	۲۸۲
۲۲۳ - لفظِ نزول کے معانی	۲۸۳
۲۲۴ - من و سلویٰ۔	؍؍
۲۲۵ رزق کے ساتھ طیّب کی شرط۔ طیب کا مفہوم یہی شرط، کمیونزم اور قرآن کے معاشی نظام میں حدِ فاصل ہے۔	۲۸۳
(۲/۵۸)- واذ قلنا..... المحسنین	۲۸۵
۲۲۶ - خلافتِ ارضی۔ مملکت و تمکن۔	۲۸۶

عنوان	صفحہ
۲۲۷ - عام فاتحین اور مومن فاتحین میں فرق۔	۲۸۶
عجز و انکساری کے ساتھ مفتوحہ علاقہ میں داخل ہونا	؍؍
اندازِ ملوکیت کی بساط الٹ دی گئی۔	؍؍
۲۲۸ - مغفرت کا مفہوم	۲۸۷
بخشش کا تصور ہی خلافِ قرآن ہے۔	۲۸۸
۲۲۹ - محسنین کے لئے اجر سے بھی کچھ زیادہ۔	۲۸۹
محسنین کے معنے۔ حسن کا مفہوم۔	۲۸۹
الاسماء الحسنیٰ کے معنی۔	۲۹۰
۲۳۰ - عدل و احسان کا حکم۔ اس کے معنے۔	۲۹۱
۲۳۱ - ھل جزاء الاحسان الا الاحسان کا مفہوم۔	۲۹۱
(۲/۵۹)- فبدّل الذین..... یفسقون	۲۹۳
۲۳۲ - ہماری تفاسیر کی رُو سے اس کا مفہوم۔	؍؍
اس کا عملی نتیجہ — اہمیت صرف الفاظ کو۔	؍؍
معانی کو نہیں۔ فنِ قرأت۔ تبلیغی جماعت۔	؍؍
۲۳۳ - ان سے کہا کہ اٹھو اور ارضِ مقدس پر قبضہ کر لو۔ کہنے لگے۔ ہم تو نہیں جائیں گے۔ آپ دونوں بھائی جائیے۔	۲۹۴
	؍؍
وہ زمین چالیس سال تک اُن پر حرام قرار دیدی گئی۔	۲۹۵
۲۳۴ - زمین کے وارث وہی ہو سکتے ہیں جن میں اس کی صلاحیت ہو۔	۲۹۵
۲۳۵ - رجز کے معنی۔	۲۹۵

عنوان	صفحہ
(۲/۶۰)- واذا ستسقیٰ ... مفسدین	۲۹۷
۲۳۶- پانی کے چشمے۔	۲۹۷
۲۳۷- چٹپٹی غذاؤں کے تقاضے۔	۲۹۸
(۲/۶۱)- واذ قلتم ...... یعتدون	۲۹۹
۲۳۸- قتل انبیاء کا مفہوم۔	۳۰۰
(مرزا غلام احمد کی دلیل کا ابطال)۔	۳۰۱
۲۴۰- اللہ اور اس کے رسول ہی غالب آکر رہیں گے۔	۳۰۲
حزب اللہ اور حزب الشیطان،	۳۰۳
ہوسکتا تھا کہ دین کا غلبہ رسول کی وفات کے بعد ہو	۳۰۴
۲۴۱ - قتل بغیر الحق کے معنی۔	۳۰۴
۲۴۲ - تورات اور انجیل دونوں میں ہے کہ دین بنی اسرائیل	
کی قوم تک محدود رکھا جائے گا۔ عالمگیر نہیں ہوگا	
قرآن نے اس کی تردید کی۔	۳۰۵
(۲/۶۲)- اِنّ الذین امنوا .... یحزنون	۳۰۵
۲۴۳- دین عالمگیر انسانیت کے لئے ہے	″
(۲/۶۳)- واذ اخذنا .... تتقون۔	۳۰۶
۲۴۴- الطور سے مراد۔	″
(۲/۶۴)- ثم تولیتم .... الخسرین	۳۰۶
۲۴۵- مہلت کے وقفے میں اضافہ۔	۳۰۷
(۲/۶۵)- ولقد علمتم .... خاسئین	۳۰۷
۲۴۶ - سبت کا مفہوم۔	″
۲۴۷ - یہودیوں کے بندر بن جانے کا مفہوم	۳۰۸

عنوان	صفحہ
۲۴۸- مودودی صاحب کی تفسیر	۳۱۰
(۲/۶۶)- فجعلنٰها نکالاً .... للمتقین۔	″
۲۴۹ - یہ واقعہ ہمارے لئے موجب عبرت ہے۔	۳۱۰
(۲/۶۷)- واذ قال موسیٰ .... من الجٰھلین	۳۱۱
۲۵۰- ذبح بقر کا واقعہ	″
۲۵۱- اعوذ باللہ کا مفہوم۔	۳۱۲
(۲/۶۸)- قالوا ادع لنا .... تؤمرون۔	۳۱۴
۲۵۲ - بجائے اس کے کہ وہ اس حکم کی تعمیل کرتے لگے	
موشگافیاں کرنے — مثلاً اس بیل کی عمر	
کیا ہونی چاہئے۔	۳۱۴
(۲/۶۹)- قالوا ادع لنا ..... النظرین۔	″
۲۵۳ - اور اس کا رنگ کس قسم کا ہونا چاہئے۔	۳۱۴
(۲/۷۰)- قالوا ادع لنا .... لمھتدون۔	″
۲۵۴ - کہا کہ بات اب بھی مشتبہ سی ہے وضاحت کیجئے	۳۱۴
(۲/۷۱) - قال انہ ...... یفعلون۔	۳۱۵
۲۵۵ - اسقدر کٹ حجتیوں کے بعد جا کر اس سیدھے	
سادے حکم کی تعمیل کی!	″
۲۵۶- ناپختہ ذہنیتوں کے مسلمان اپنے سابقہ	
عقائد ساتھ لاتے ہیں	۳۱۵
۲۵۷ - قرآن کریم کے اصولی احکام کی جزئیات کا تعین	۳۱۶
۲۵۸- یہ قوم اس طرح حضرت موسیٰؑ کو تنگ کرتی تھی	۳۱۸
۲۵۹ - ہمارے ہاں کی ایک وضعی روایت- پتھر کپڑے لیکر بھاگ گیا	۳۱۹

عنوان	صفحہ
چھٹا باب آیات $\frac{2}{72}$ تا $\frac{2}{112}$	۳۲۱
داستانِ بنی اسرائیل — مسلسل	
($\frac{2}{72-73}$)- **واذ قتلتم ..... تعقلون** -	۳۲۲
۲۶۰ - قرآنی احکام وحقائق کے تین گوشے -	″
۲۶۱ - واقعہ قتل کی عام تفسیر اور اس پر اعتراضات	۳۲۳
۲۶۲ - ہمارا قیاس —— اس میں تفتیشِ جرم کا نفسیاتی طریقہ بتایا گیا تھا -	۳۲۵-۲۶
۲۶۳ - مودودی صاحب کا بیان کہ قرآن میں (معاذ اللہ) ابہام ہے -	۳۲۸
($\frac{2}{74}$)- **ثم قست قلوبکم ..... تعملون**	۳۲۹-۳۰
۲۶۴ - یہودیوں کی قساوتِ قلبی -	۳۳۰
۲۶۵ - دل کس طرح سخت ہو جاتے ہیں ؟	۳۳۱
۲۶۶ - یہودیوں کی زرپرستی اور خود غرضی کی انتہا -	۳۳۲
۲۶۷ - خشیت کا مفہوم -	۳۳۳
($\frac{2}{75}$)- **افتطمعون ...... یعلمون** -	۳۳۳
۲۶۸ - حضور دل سے چاہتے تھے کہ یہ لوگ تباہی سے بچ جائیں -	۳۳۴
($\frac{2}{76}$)- **واذ لقوا الذین .... تعقلون** -	۳۳۴-۳۵
۲۶۹ - ان کی منافقت -	۳۳۵
۲۷۰ - ان کے مذہبی پیشواؤں کی تاکید کہ مسلمانوں سے اپنی صحیح تعلیم کی کوئی بات نہ کہہ دینا -	۳۳۵
($\frac{2}{77}$)- **اولا یعلمون .... یعلنون**	۳۳۶
۲۷۱ - لیکن وہ خدا سے کیا چھپا سکتے تھے ؟ -	۳۳۶
۲۷۲ - لفظِ حدیث کے معنی -	″
($\frac{2}{78}$)- **ومنھم امیون ..... یظنون** -	۳۳۷
۲۷۳ - لفظِ اُمّی کے معنی (۱) ان پڑھ - (۲) غیر اہلِ کتاب اور (۳) مکہ کا باشندہ -	۳۳۷
۲۷۴ - رسول اللہ نبوت سے پہلے ان پڑھ تھے - بعد میں ایسے نہیں تھے -	۳۳۸
۲۷۵ - لفظِ امانیّ کے معنی آرزو اور (۲) لفظی تلاوت -	۳۳۸-۳۹
۲۷۶ - کتاب اللہ کا رسمی احترام - تلاوت مفہوم سمجھے بغیر -	۳۳۹
($\frac{2}{79}$)- **فویل للذین ..... یکسبون**	۳۴۰
۲۷۷ - شریعت سازی اور دین فروشی -	۳۴۰
جب مذہب ذریعہ معاش بن جائے تو ہر جگہ یہی کچھ ہوتا ہے -	۳۴۰
($\frac{2}{80-82}$)- **وقالوا ...... خلدون** -	۳۴۱
۲۷۸ - خدا کا قانونِ مکافات — جزا اور سزا اعمال کا نتیجہ -	۳۴۱
عمل اور فعل میں فرق -	۳۴۲
عمل کے معنی ہیں ایسا کام جو بالارادہ اور التزاماً کیا جائے -	۳۴۲
($\frac{2}{83}$)- **واذ اخذنا ..... معرضون**	۳۴۲-۴۳

عنوان	صفحہ
۲۷۹- تولید و تخلیق میں فرق	۳۴۳
خدا کا عمل تخلیقی ہے، تولیدی نہیں۔	〃
اس کے ہاں بیٹا نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اس کی بیوی نہیں۔	۳۴۴
ایک عظیم دلیل۔ خدا اپنے قوانین کے خلاف نہیں کرتا	〃
۲۸۰- والدین سے حسنِ سلوک۔	۳۴۵
۲۸۱- عائلی زندگی (یعنی خاندانی رفاقت) کی ضرورت	۳۴۶
۲۸۲- ماں باپ کی اطاعت کا حکم قرآن میں نہیں۔	۳۴۷
اسوۂ ابراہیمی کا اتباع نہ کہ رام کی تقلید۔	۳۴۸
۲۸۳- ذی القربیٰ سے حسنِ سلوک۔	۳۴۹
۲۸۴- یتامیٰ سے حسنِ سلوک۔	〃
یتیم کے معنی۔ جو معاشرہ میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے۔	۳۵۰
۲۸۵- قولوا للناس حسنا۔	〃
(۲/۸۴)- واذ اخذنا ۔۔۔۔ تشہدون۔	۳۵۲
۲۸۶- بنی اسرائیل کے دو عہد — باہمی خونریزی نہیں کرو گے۔	۳۵۲
(۲/۸۵)- ثم انتم ھؤلاء ۔۔۔۔ تعملون۔	〃
پہلے لوگوں کو بیکس اور محتاج بنا دینا، پھر ان کی مدد کر کے اپنے آپ کو فریب دے لینا کہ ہم ثواب کا کام کر رہے ہیں۔	۳۵۲-۵۳

عنوان	صفحہ
عصرِ حاضر کے باطل نظام سرمایہ داری، اور فلاحی مملکتوں کا نقشہ۔	۳۵۴-۵۶
۲۸۷- روایات اور پیش گوئیاں — ایک ضمنی گوشہ	۳۵۷
۲۸۸- غلام اور لونڈیاں — قرآنِ کریم کی روشنی میں	۳۵۸
—— مودودی صاحب کی تفسیر میں	۳۵۸-۵۹
۲۸۹- کتاب کے ایک حصہ پر ایمان دوسرے سے انکار!	۳۵۹-۶۰
یہ سیکولرازم ہے۔	۳۶۱
۲۹۰- تحریکِ پاکستان کے دوران، نیشنلسٹ علماء کا یہی مسلک تھا۔	۳۶۱
یہی اب ہماری حالت ہے۔ پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تمیز	۳۶۲
۲۹۱- دین کے نظام کی تکمیل تدریجاً ہو گی۔	۳۶۲-۶۳
(۲/۸۶)- اُولٰٓئِکَ ۔۔۔۔ ینصرون۔	۳۶۳
۲۹۲- اس کی وجہ — دنیاوی مفاد کو مستقل اقدار پر ترجیح دینا ہے۔	۳۶۳
(۲/۸۷)- ولقد اتینا ۔۔۔۔ تقتلون۔	۳۶۴
۲۹۳- ختمِ نبوت — ایک ضمنی گوشہ۔	۳۶۵
۲۹۴- روح القدس کا ایک مفہوم۔	〃
۲۹۵- قرآنِ خالص سے نفرت — اس میں تبدیلی کرنے کا مطالبہ۔	۳۶۶
(۲/۸۸)- وقالوا قلوبنا غلف ۔۔۔ یومنون	۳۶۷

عنوان	صفحہ
۲۹۶- حصولِ علم کی ضرورت کبھی ختم نہیں ہوتی۔	۳۶۸
انسانی علم ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا جارہا ہے۔	″
یہ ذہنیت غلط ہے کہ ہمیں مزید علم کی ضرورت نہیں۔	″
ہمارے علماء کی حالت۔	۳۶۹
امام غزالیؒ۔ مفتی محمد عبدہٗ۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ دارالمصنفین کے مجلہ معارف کی آراء۔ اور علامہ اقبال کی تنقیدات۔	۳۷۰-۷۳
۲۹۷- لعنت کے معنی۔	۳۷۴
(۲/۸۹)- ولما جاءهم ....علی الکفرین	۳۷۵
۲۹۸- تورات میں آنے والے رسول کی پیش گوئی۔	۳۷۶
انجیل میں بھی۔	۳۷۷
۲۹۹- حضرت عیسیٰ کی پیش گوئی حضورؐ کے متعلق قرآن کریم میں اس کا ذکر	۳۷۸
۳۰۰- تمام اہلِ مذہب آنے والے کے انتظار میں ہیں۔	″
وہ آنے والا آچکا ہے۔ یعنی حضور نبی اکرمؐ۔	۳۷۸
لیکن ہم بھی آنے والے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔	۳۷۹
مجدد دین۔ مہدی آخرالزمان۔ حضرت عیسیٰ کا نزول	″
۳۰۱- یہ عقائد ختمِ نبوت کے منافی ہیں۔ اب کوئی نہیں آئے گا۔	۳۸۰
(۲/۹۰-۹۳) بئسما ...... مؤمنین۔	۳۸۱-۸۳

عنوان	صفحہ
۳۰۲- قرآن مجید سننا لیکن عمل اس کے خلاف کرنا۔ یہ ہے ہمارا شیوہ۔	۳۸۳
(۲/۹۴-۹۶)- قل ان کانت ---- بما یعملون	۳۸۵-۸۶
۳۰۳- موت محاسبۂ خویش کا ذریعہ ہے۔	۳۸۵
مومن موت کا استقبال کرتا ہے۔	۳۸۶
کافر اس سے بھاگتا پھرتا ہے۔	″
(۲/۹۷-۹۸) قل من ..... للکفرین۔	۳۸۶-۸۷
۳۰۴- وحی کس طرح نازل ہوتی تھی، ہم جان نہیں سکتے۔	۳۸۷
ہم اس کے متن کو سمجھ سکتے ہیں۔	″
جبریل۔ میکائیل۔ روح القدس۔	۳۸۸
خدا کفار کا دشمن ہے۔ اس کا مفہوم۔	۳۸۸
خدا کے ولی (دوست) ہونے کا مفہوم۔	۳۸۸
(۲/۹۹) ولقد .... الفسقون۔	۳۸۹
۳۰۵- جو بھی غیر متبدل اخلاقی پابندیوں سے آزادی چاہتا ہے فاسق ہے۔	۳۸۹
عصرِ حاضر میں سیکولرازم، سوشلزم یا کمیونزم سب اسی جذبہ اباحت کے پیدا کردہ ازمز ہیں۔	۳۸۹
(۲/۱۰۰) اوکلما ...... یؤمنون۔	۳۹۰
۳۰۶- معاہدہ کے معنی یہ ہیں کہ اس کی پابندی پوری قوم کی طرف سے ہو۔	۳۹۰

عنوان	صفحہ
(۲/۱۰۱) - ولمّا .... یعلمون -	۳۹۱
۳۰۷- یہودیوں کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت۔	〃
۳۰۸- قرآن کریم کی طرف دعوت دینے والوں کی مخالفت۔	〃
(۲/۱۰۲) - واتبعوا .... یعلمون -	۳۹۲تا۴۲۷
۳۰۹- ایک حقائق پرور آیت اور اس کا غلط مفہوم	۳۹۲
حضرت سلیمان کے خلاف تورات کی یاوہ گوئی	۳۹۴
جادو اور حضرت سلیمانؑ --- اسم اعظم۔	۳۹۵
ضمناً، حضرت عیسیٰؑ کے حواری	۳۹۶
قرآن کریم نے حضرت سلیمانؑ کا دامن پاک کیا	۳۹۶
لیکن ہماری کتب تفاسیر میں کیا کہا گیا ہے؟	۳۹۷
۳۱۰- بابل --- سحر کاری کا اولین مرکز۔	۳۹۹
۳۱۱- ہاروت و ماروت کا افسانہ اور ہماری کتب تفاسیر۔	۴۰۰
مودودی کی تفسیر (تفہیم القرآن) میں۔	۴۰۱
آیت کا صحیح مفہوم۔	۴۰۲
۳۱۲- سحر یا جادو کی تاریخ اور حقیقت	۴۰۴
یہودی اور باطنیت --- یہی ہمارے ہاں کا تصوف ہے۔	۴۰۸
عیسائیت اور تصوف۔	۴۱۱
قرآن --- باطنیت کے خلاف چیلنج۔	۴۱۳
۳۱۳- مسلمان اور تصوف۔	۴۱۴
۳۱۴- رسول اللہؐ پر جادو (مودودی صاحب کی تفسیر)	۴۱۷
۳۱۵- تعویذ اور ورد وظیفے اور ہمارے علماء کرام	۴۱۹
۳۱۶- قرآن کی عظمت۔	۴۲۳
۳۱۷- علامہ اقبالؒ اور تصوف۔	۴۲۷
(۲/۱۰۴) یاایھا الذین اٰمنوا ..... عذاب الیم۔	۴۲۹
۳۱۸- یہودیوں کی پست ذہنیت۔ ذو معنی باتیں کرنا۔ زبان کو توڑ مروڑ کر گفتگو کرنا۔	۴۲۹
جماعت مومنین سے تاکید کہ بات ہمیشہ دوٹوک واضح کرو۔	۴۳۱
(۲/۱۰۵) - مایودّ الذین .... الفضل العظیم	〃
۳۱۹- قریش کی مخالفت کی وجوہات۔	۴۳۲
۳۲۰- قرآن کریم خیر ہے۔ اس کا مفہوم۔	۴۳۳
(۲/۱۰۶-۱۰۷) - ما ننسخ من اٰیۃ .... ولی ولا نصیر۔	۴۳۴
۳۲۱- ناسخ و منسوخ سے متعلق آیت۔	〃
(۲/۱۰۸) - ام تریدون .... سواء السبیل	〃
۳۲۲- دین تمام کا تمام قرآن کے اندر دیدیا گیا ہے۔	۴۳۵
(۲/۱۰۹) - ودّ کثیر .... قدیر۔	〃
۳۲۳- اہل کتاب کی کوشش کہ مسلمانوں کو دین سے برگشتہ کر دیں۔	〃

عنوان	صفحہ
ان سے اعراض برتو لیکن حسن کارانہ انداز سے۔	۴۳۵
نبی کا قلب گداز و پرسوز۔	۴۳۶
(۲/۱۱۰)۔ واقیموا الصّلوٰۃ۔۔۔۔ بصیر۔	؍؍
۳۲۴۔ اقامت صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ کے پروگرام	؍؍
کی اہمیت۔	؍؍
ان کا ہر عمل نتیجہ خیز ہوگا۔	؍؍
(۲/۱۱۱)۔ وقالوا۔۔۔۔۔۔۔ صٰدقین	۴۳۷
۳۲۵۔ ان کا زعم باطل کہ جنت یہود و نصاریٰ کے لئے مختص ہو چکی ہے۔	؍؍
اس کی تردید۔	؍؍
(۲/۱۱۲)۔ بلیٰ من اسلم۔۔۔ یحزنون۔	؍؍
۳۲۶۔ خدا کا قانونِ مکافات۔ ایمان و عمل کے نتائج ہر ایک کو ملیں گے	؍؍

خلاصہ باب پنجم و ششم صفحہ ۵۲–۴۳۷
(آیات ۲/۵۵ تا ۲/۱۱۲)

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

اِنڈکس آیات — جلد اول

یہ اِنڈکس اُن آیات کا ہے جن کی تفسیر مطالب الفرقان کی پہلی اور دوسری جلد میں مسلسل دی گئی ہے

جلدِ اوّل

آیت	سورۃ فاتحہ	صفحہ	آیت	سورۃ بقرۃ	صفحہ	آیت	سورۃ بقرۃ (مسلسل)	صفحہ
۱	....	۳	۵	....	۱۵۲	۱۸	....	۲۶۲
۲	....	۲۰	۶	....	۱۵۸	۱۹	....	۲۶۴
۳	....	۲۸	۷	....	۱۷۹	۲۰	....	۲۶۹
۴	....	۳۵	۸	....	۲۰۲	۲۱	....	۲۸۰
۵	....	۴۰	۹	....	۲۰۵	۲۲	....	۲۹۴
۶	....	۴۸	۱۰	....	۲۲۸	۲۳	....	۳۰۸
۷	....	۵۳	۱۱	....	۲۲۹	۲۴	....	۳۱۵
	سورۃ بقرۃ		۱۲	....	″	۲۵	....	۳۳۱
۱	....	۷۰	۱۳	....	۲۴۴	۲۶	....	۳۴۱
۲	....	۷۱	۱۴	....	۲۴۶	۲۷	....	۳۴۴
۳	....	۷۸	۱۵	....	۲۴۸	۲۸	....	۳۴۶
۴	....	۱۴۴	۱۶	....	۲۵۰	۲۹	....	۳۵۲
			۱۷	....	۲۵۷			

اِنڈکس آیات جلد دوم سورۃ بقرۃ

آیت	سورۃ بقرۃ	صفحہ	آیت	سورۃ بقرۃ	صفحہ	آیت	سورۃ بقرۃ	صفحہ
۳۰		۷۲	۳۴		۹۸	۳۸		۱۳۳
۳۱	....	۸۱	۳۵	....	۱۱۱	۳۹	....	۱۳۶
۳۲	....	۹۴	۳۶	....	۱۱۵	۴۰	....	۱۴۱
۳۳	....	۹۵	۳۷	....	۱۲۹	۴۱	....	۱۸۲

آیت	سورة	صفحہ	آیت	سورة	صفحہ	آیت	سورة	صفحہ
۴۲	سورة بقرة	۱۹۵	۶۵	سورة بقرة	۳۰۷	۹۰	سورة بقرة	۳۸۱
۴۳	- - - - - - -	۲۰۱	۶۶	- - - - - - -	۳۱۰	۹۱	- - - - - - -	۳۸۱
۴۴	- - - - - - -	۲۱۹	۶۷	- - - - - - -	۳۱۱	۹۲	- - - - - - -	۳۸۲
۴۵-۴۶	- - - - - - -	۲۲۲	۶۸	- - - - - - -	۳۱۳	۹۳	- - - - - - -	۳۸۲-۸۳
۴۷	- - - - - - -	۲۲۸	۶۹	- - - - - - -	۳۱۳	۹۴	- - - - - - -	۳۸۵
۴۸	- - - - - - -	۲۲۸	۷۰	- - - - - - -	۳۱۴	۹۵	- - - - - - -	۳۸۵
۴۹	- - - - - - -	۲۳۰	۷۱	- - - - - - -	۳۱۵	۹۶	- - - - - - -	۳۸۶
۵۰	- - - - - - -	۲۴۳	۷۲-۷۳	- - - - - - -	۳۲۲	۹۷-۹۸	- - - - - - -	۳۸۶-۸۷
۵۱	- - - - - - -	۲۵۳	۷۴	- - - - - - -	۳۲۹-۳۰	۹۹	- - - - - - -	۳۸۹
۵۲	- - - - - - -	۲۶۲	۷۵	- - - - - - -	۳۳۳	۱۰۰	- - - - - - -	۳۹۰
۵۳	- - - - - - -	۲۶۴	۷۶	- - - - - - -	۳۳۴-۳۵	۱۰۱	- - - - - - -	۳۹۱
۵۴	- - - - - - -	۲۶۶	۷۷	- - - - - - -	۳۳۶	۱۰۲	- - - - - - -	۳۹۲
۵۵	- - - - - - -	۲۶۷	۷۸	- - - - - - -	۳۳۷	۱۰۳	- - - - - - -	۴۰۴
۵۶	- - - - - - -	۲۶۹	۷۹	- - - - - - -	۳۴۰	۱۰۴	- - - - - - -	۴۲۹
۵۷	- - - - - - -	۲۸۲	۸۰-۸۲	- - - - - - -	۳۴۱	۱۰۵	- - - - - - -	۴۳۱
۵۸	- - - - - - -	۲۸۵	۸۳	- - - - - - -	۳۴۲-۳۴۳	۱۰۶-۷	- - - - - - -	۴۳۴
۵۹	- - - - - - -	۲۹۳	۸۴	- - - - - - -	۳۵۲	۱۰۸	- - - - - - -	۴۳۴
۶۰	- - - - - - -	۲۹۷	۸۵	- - - - - - -	۳۵۲	۱۰۹	- - - - - - -	۴۳۵
۶۱	- - - - - - -	۲۹۹	۸۶	- - - - - - -	۳۶۲	۱۱۰	- - - - - - -	۴۳۶
۶۲	- - - - - - -	۳۰۵	۸۷	- - - - - - -	۳۶۴	۱۱۱	- - - - - - -	۴۳۷
۶۳	- - - - - - -	۳۰۶	۸۸	- - - - - - -	۳۶۷	۱۱۲	- - - - - - -	۴۳۷
۶۴	- - - - - - -	۳۰۶	۸۹	- - - - - - -	۳۶۵		———	

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرفِ آغاز

(پہلا ایڈیشن)

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

مطالب الفرقان کی پہلی جلد، اکتوبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ آیات کے شمار کے اعتبار سے تو وہ سورۃ فاتحہ کے علاوہ سورۃ بقرۃ کی صرف (۲۹) آیات پر مشتمل تھی لیکن اس میں اتنے اصولی مباحث آگئے تھے کہ بعض ایسے احباب نے، جنہوں نے اس سے پہلے میری کسی تصنیف کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا تھا اور پہلے پہل اس جلد کو بدقتِ نظر دیکھا تھا۔ مجھ سے کہا کہ اس ایک جلد سے پورے کے پورے اسلام کا صحیح خاکہ ان کے سامنے آگیا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد چاروں طرف سے اس کی اگلی جلد کی اشاعت کے تقاضے شروع ہوگئے۔ اس تفسیر کا مسودہ میرے پاس پہلے سے تیار نہیں رکھا تھا میں اسے ساتھ کے ساتھ لکھا کرتا ہوں۔ اس میں جسقدر وقت لگتا ہے وہی کم نہیں، لیکن اس کے بعد، کتابت اور طباعت کی جن خاردار وادیوں میں سے گزرنا پڑتا ہے، ان کی آبلہ انگیزی اور دامنگیری کا اندازہ وہی حضرات لگا سکتے ہیں جو ان مراحل سے خود گزرے ہوں۔ بِللہِ الحمد کہ یہ صبر آزما منازل بھی بخیر و خوبی طے ہوگئیں اور میں اس قابل ہوگیا کہ اس کی دوسری جلد، حسبِ وعدہ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں پیشِ خدمتِ احباب کرسکوں۔ (اکتوبر کی تخصیص اس لئے ہے کہ طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن (بالعموم) اسی ماہ میں منعقد ہوتی ہے اور بادہ مستانِ ذوقِ قرآنی کا یہی وہ دلکش و پُرخلوص اجتماع ہے جو میرے اس نذرانۂ محبت و عقیدت کا صحیح محمل ہوسکتا ہے۔ خدا میرے ان رفقائے سفر کو تا دیر سلامت رکھے)۔

۲۔ زیرِ نظر جلد، سورۃ بقرۃ کی (۸۲) آیات ــــ از ۲/۳۰ تا ۲/۱۱۲ کو محیط ہے اور ان کا بنیادی موضوع قصۂ آدم اور داستانِ بنی اسرائیل ہے۔ جیسا کہ آپ دیکھیں گے، قرآن مجید میں بیان کردہ قصۂ آدم، کسی فرد کی داستانِ حیات نہیں۔ یہ خود انسان (آدمی) کی کیفیات و نفسیات کا تذکرہ ہے جسے تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں عمودی طور پر بتایا یہ گیا ہے کہ انسان میں تسخیرِ فطرت کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے۔ اگر یہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرکے انہیں

اقدارِ خداوندی کے مطابق استعمال کرے گا تو عالمِ انسانیت لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸) کا فردوس بداماں معاشرہ بن جائے گا۔ اور اگر، افراد یا اقوام انہیں اپنے سرکش جذبات کی تسکین کے لئے صرف میں لائیں گی، تو یہ کرۂ ارض، يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ (۲/۳۰)۔ فساد انگیزیوں اور خونریزیوں کا جہنم بن جائے گا۔

قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک محکم اصولِ حیات یا ابدی قانونِ زندگی پیش کرتا ہے اور نظری دلائل کے ساتھ ساتھ اقوامِ سابقہ کے تاریخی شواہد کو اس کی صداقت کی تائید میں سامنے لاتا ہے۔ اپنے اسی انداز کے مطابق اس نے سورۂ بقرہ کے آغاز میں قصۂ آدم کے فوری بعد، داستانِ بنی اسرائیل کی ابتداء کر دی ہے۔ یہ داستان صرف قومِ بنی اسرائیل کی تاریخ نہیں۔ اس میں قوموں کے عروج و زوال کے ابدی قوانین شرح وبسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے جس تکرار و اصرار سے اس داستان کو دھرایا ہے، کسی اور قوم کے تذکرہ کو اس تفصیل سے بیان نہیں کیا۔ زیرِ نظر جلد میں مقامِ آدم کی کیفیات اور داستانِ بنی اسرائیل کی تفصیلات (قریب قریب) بتمام و کمال آگئی ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ شمار کے اعتبار سے تو یہ جلد کل (۸۲) آیات پر مشتمل ہے لیکن مضامین کے لحاظ سے یہ گویا اپنے موضوع کا دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) ہے۔ اس وضاحت سے یہ حقیقت بھی سامنے آگئی ہو گی کہ (جیسا کہ میں نے جلد اول کے آغاز میں کہا تھا) اس تفسیر کی ابتدائی جلدوں میں آیات کی تعداد کم ہو گی لیکن جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، آیات کی تعداد زیادہ ہوتی جائے گی کیونکہ جو آیات پہلے آچکی ہوں گی انہیں دھرایا نہیں جائے گا۔ ان کے حوالہ پر اکتفا کیا جائے گا۔ اگرچہ بعض اوقات ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ جو بات کسی پہلی جلد میں کہی جا چکی ہے، وہ مزید وضاحت کے لئے کسی اگلی جلد میں بھی آجائے۔ میں حتمی وعدہ تو نہیں کر سکتا (کیونکہ اکثر ایسے حالات بھی رونما ہو جاتے ہیں جن کے متعلق پہلے سے کچھ نہیں کہا جا سکتا) لیکن میرا ارادہ یہی ہے کہ اس سلسلہ کو منقطع نہ ہونے دیا جائے۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ (۱۱/۸۸)۔ میرا عمر بھر کا ساتھی اگر عمر بھر میرے ساتھ رہے تو اس سے بڑھ کر میری سعادت اور کیا ہو گی؟

۳۔ ان مجلدات کے ترتیبی انداز کے متعلق جلد اول میں تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔ ان میں دو ایک نکات کا اضافہ ضروری ہے:-

(۱) آیات کے حوالوں میں اوپر سورۃ کا نمبر ہے اور نیچے آیت کا نمبر۔ (مثلاً ۲/۱۵ سے مراد ہے سورہ بقرۃ کی... پندرھویں آیت)۔ ان حوالوں کو بڑی احتیاط سے چیک کر لیا گیا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں چونکہ قرآن مجید کے مختلف نسخوں میں آیات کے نمبروں کا اختلاف ہوتا ہے، اس لئے اگر کسی حوالہ کے مطابق مطلوبہ آیت نہ ملے تو ایک آدھ

آیت پہلے یا بعد میں دیکھ لیا جائے۔ اگر اس سے بھی وہ آیت نہ ملے تو براہِ کرم مجھے مطلع فرمادیا جائے تاکہ، اگر حوالہ میں غلطی ہو تو آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کر لی جائے۔

(۲) جلد اول میں ان (۷ + ۲۹) آیات کا انڈکس نہیں دیا جا سکا تھا جن کی تفسیر اس جلد میں آئی تھی۔ زیرِ نظر جلد میں، فہرست کے بعد، جلد اول و جلد دوم دونوں کی آیات کا انڈکس دیدیا گیا ہے تاکہ مطلوبہ آیت یا آیات کے تلاش کرنے میں دقت نہ ہو۔

۴ - آخر میں اس اعتراف کو پھر دہرا دوں جسے میں اپنی ہر کتاب کا جزوِ لازم سمجھا کرتا ہوں کہ قرآن فہمی کے سلسلہ میں یہ، بہر حال ایک انسانی کوشش ہے جسے نہ سہو و خطا سے منزہ قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ حرفِ آخر۔ میں جو کچھ خدا کی اس کتابِ عظیم سے اپنی بصیرت کے مطابق سمجھ سکا ہوں اُسے میں نے بے کم و کاست پیش کر دیا ہے۔ اگر آپ اس سے متفق ہوں تو ہوالمراد۔ اگر اس سے اختلاف ہو تو آپ اپنے طور پر غور و تدبر کریں۔ میں اس ضمن میں کسی سے بحث میں نہیں اُلجھنا چاہتا کہ اس کے لئے مجھے فرصت ہی نہیں۔

وَاُفَوِّضُ اَمۡرِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ۔ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ (۴۰/۴۴)۔ والسلام۔

پرویز

۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

۱۵ ستمبر ۱۹۷۶ء

دوسرا ایڈیشن

مطالب الفرقان کو بفضلِ ایزدی اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کا پہلا ایڈیشن جلد ختم ہو گیا اور دوسرے ایڈیشن کے تقاضے بہ شدت موصول ہونے لگے۔ للہ الحمد کہ اب یہ ایڈیشن (بلا تغیر و تبدل) پیشِ خدمت ہے۔ اس دوران میں اس کی تیسری، چوتھی اور پانچویں جلد بھی شائع ہو چکی ہے۔

جنوری ۱۹۸۳ء

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

مطالب الفرقان

جلد دوم

سورۃ بقرۃ —— آیات ۳۰ تا ۱۱۲

پہلا باب

(تمہید سرگزشتِ آدم)

اِنسان کی پیدائش
نفسِ انسانی (انسانی ذات یا خودی)
انسانی فطرت
حملِ امانت سے مراد
ابلیس ــــــ شیطان
نفسِ امّارہ ۔ لوّامہ ۔ مطمئنّۃ
آدم
خلیفہ فی الارض
ملائکہ
تسخیرِ فطرت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پہلا باب

تمہید سرگزشتِ آدم

آغاز — سورۃ بقرۃ — آیت — (۲/۳۰)

مطالب الفرقان کی پہلی جلد، سورۃ بقرۃ کی آیت (۲/۲۹) پر اختتام پذیر ہوئی تھی۔ اس کا آغاز ہوا تھا، اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (۱/۱) یعنی خدا کی ربوبیتِ عالمینی سے۔ اور آیت (۲/۲۹) میں اِسی حقیقت کو ان الفاظ میں دہرایا گیا تھا کہ هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ لَکُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا (۲/۲۹)۔ "اے نوعِ انسان! ہم نے زمین میں جو کچھ پیدا کیا ہے وہ سب تمہارے اجتماعی مفاد کے لئے ہے"۔ یعنی اس سامانِ رزق میں تمام نوعِ انسان برابر کی شریک ہے۔ اسے ان سب کی نشو و نما کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ لہٰذا اسے انفرادی ملکیت میں نہ لے لینا۔ اگر ایسا کیا گیا تو اس کا عملی مفہوم یہ ہوگا کہ تم خدا کے شریک و سہیم پیدا کر لوگے (۲/۲۲)۔ یہ شرک ہوگا۔ اس حقیقت کو ان آیات میں نظری طور پر بیان کیا گیا تھا۔ اس کے بعد قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ نوعِ انسان کس طرح مختلف گروہوں میں بٹ گئی۔ انہوں نے کس طرح ان ذرائع رزق کو اِنفرادی ملکیت میں لے لیا اور اس طرح ان میں باہمی عداوت پیدا ہو گئی۔ اسے اس نے "قصۂ آدم" کے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے جس کا آغاز آیت (۲/۳۰) سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ داستان سمجھ میں نہیں آ سکتی جب تک پہلے یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ قرآن کریم خود انسان کے متعلق کیا بتاتا ہے۔ اس لئے ہم پہلے اسی موضوع کو لیتے ہیں۔

اَلۡاِنۡسَانُ

میں نے اپنی کتاب — ابلیس و آدم — کے پہلے باب میں کہا ہے کہ انسانی بچہ کی پیدائش آج ہمارے نزدیک ایک ایسا عادی اور معمولی واقعہ بن چکی ہے جیسے سورج کا طلوع و غروب۔ لیکن اسباب و علل کی کڑیوں میں جکڑا ہوا انسان جب کتابِ تخلیق کے اوراق کو پیچھے کی طرف الٹتا ہے تو اس کی نگۂ استعجاب کا اس مقام پر رُک جانا فطری امر ہے جسے وہ سلسلۂ تخلیقِ انسانی کی سب سے پہلی کڑی قرار دیتا ہے۔ اس وادیٔ حیرت میں پہنچ کر وہ ٹھٹک کر رہ جاتا ہے کہ "سب سے پہلا انسان" کس طرح وجود میں آ گیا۔ ذہنِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں اس سے زیادہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح ایک فرد کو تراش لیا جائے۔ پھر اس سے اس کا جوڑا پیدا کر دیا جائے۔

اِس طرح جب مرد اور عورت وجود میں آجائیں تو پھر افزائشِ نسلِ انسانی کے سمجھنے میں کوئی دشواری باقی نہیں رہ جائے گی. چنانچہ دنیا کے قریب قریب ہر مذہب میں "پہلے انسان" کے سلسلہ میں ایسا ہی کچھ بیان کیا گیا ہے ہم اس کی تفصیل قصۂ آدم میں (آگے چل کر) پیش کریں گے. یہاں بات انسان سے متعلق ہو رہی ہے۔

ہم مطالب الفرقان. جلد اول (ص ۲۸۵-۲۸۶) میں بتا چکے ہیں کہ "انسان" تو ایک طرف، دنیا بھر کے محققین آج تک اس حقیقت کو بھی نہیں سمجھ سکے کہ خود یہ کائنات کس طرح وجود میں آگئی۔ انہوں نے اس کے متعلق تو بہت کچھ کہا ہے کہ یہ اپنی ابتداء کے بعد مختلف گردشیں کرتی ہوئی، کس کس قسم کی تبدیلی کی وادیوں میں سے گزر کر اس مقام تک آپہنچی جہاں ہم اسے آج موجود پاتے ہیں، لیکن یہ کہ اس کی پہلی شکل کا آغاز کیسے ہو گیا —— وہ عناصر کہاں سے آگئے جن کی گردشوں سے یہ اس طرح آگے بڑھی —— اس سوال کے جواب میں آج کا بڑے سے بڑا سائنٹسٹ بھی اسی طرح انگشت بدنداں ہے جس طرح آج سے چھ ہزار سال پہلے کا انسان، یا آج کا جاہل دہقان۔

ڈاروِن کا نظریۂ ارتقاء

جب غیر جاندار کائنات کے آغاز کے متعلق ہمارے محققین کے عجزِ فہم کی یہ کیفیت ہے تو وہ اس کے متعلق کیا سمجھ سکتے ہیں کہ اس غیر جاندار مادہ (IN-ORGANIC MATTER) میں زندگی (LIFE) کی نمود کیسے ہو گئی. یعنی زندگی کا آغاز کیسے ہو گیا. (ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ) اس کا تصور ڈاروِن نے پیش کیا تھا. لیکن اس کے بعد اس نظریہ میں بڑی اہم تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ آج اس نظریہ کا سب سے بڑا ماہر (G. G. SIMPSON) کو سمجھا جاتا ہے۔ وہ اپنی کتاب (THE MEANING OF EVOLUTION) میں لکھتا ہے:-

> زندگی کی ابتدا کیسے ہو گئی؟ نہایت دیانتداری سے اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اس کا کچھ علم نہیں ...... اس معمہ کو حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور رفتہ رفتہ اس کے قریب پہنچا جا رہا ہے ...... لیکن اس معمہ کا آخری نقطہ (یعنی زندگی کا نقطۂ آغاز) وہ مقام ہے جو سائنس کے انکشافات کی دسترس سے باہر ہے. اور شاید انسان کے حیطۂ ادراک ہی سے باہر ...... کائنات کے آغاز اور سلسلۂ علّت و معلول کی اولین کڑی کا مسئلہ لاینحل ہے اور سائنس اس تک نہیں پہنچ سکتی .... یہ اولین کڑی راز ہے، اور میرا خیال ہے کہ ذہنِ انسانی اس راز کو کبھی نہیں پا سکے گا. ہم اگر چاہیں تو اپنے اپنے طریق پر اس علّتِ اولیٰ کے حضور اپنا سر جھکا سکتے ہیں،

لیکن اُسے اپنے حیطۂ ادراک کے دائرے میں کبھی نہیں لا سکتے۔ (PP. ۱۳ ؛ ۱۳۵)

مشہور سائنسدان (J.S. HALDAN) ہمارے دور کا بہت بڑا ماہر علم الحیات (BIOLOGIST) ہے۔ وہ اپنی کتاب --- (THE PHILOSOPHICAL BASIS OF BIOLOGY) میں لکھتا ہے:-

اب اس حقیقت کے تسلیم کر لینے میں کوئی دقت نہیں کہ (جیسا کہ نیوٹن کے اصولوں کے ماتحت سمجھا جاتا تھا) زندگی محض طبیعیاتی اور کیمیاوی کیفیات کی پیدا کردہ نہیں، بلکہ ان مادی کیفیات سے پہلے موجود تھی اور ہمیشہ سے موجود تھی۔ اور اس امر کے باور کرنے میں بھی کوئی دشواری نہیں کہ اس مادی کائنات کے پیچھے ایک اور دنیا ہے جس کی تعبیرات کی روشنی میں ہمیں اپنے حیاتیاتی اصولوں کو عملاً منطبق کرنا چاہیئے (P. ۳۸)۔ لہٰذا زندگی کے مسئلہ کو طبیعیاتی اور کیمیاوی مسئلہ سمجھنا ہی نہیں چاہیئے (P. ۱۱۱)۔ زندگی اور انسانی ذات (PERSONALITY) کا وجود اس حقیقت کی دلیل ہیں کہ ہماری کائنات کی محض مادی تعبیر ناممکن ہے۔ اور یہ تعبیر ناممکن ہی رہتی ہے خواہ ہم زمانہ (TIME) کے اعتبار سے کتنے ہی پیچھے اور مکان (SPACE) کے اعتبار سے کتنے ہی اونچے کیوں نہ چلے جائیں۔ زندگی کو پیچھے لے جانے سے اس کی مادی تعبیر کبھی نہ مل سکے گی، نہ ہی انسانی ذات کو پیچھے لے جانے سے ہم کسی ایسے مقام تک پہنچ سکیں گے جہاں ہم کہہ سکیں کہ انسانی ذات اس طرح مادہ سے پیدا ہوگئی (P. ۱۲۲)۔

زندگی آ کہاں سے گئی؟ اس سوال کا جواب تو کوئی نہیں دے سکا، البتہ ڈاروِن نے یہ بتایا کہ اس کی اولیں نمود کہاں سے ہوئی۔ یعنی ہم زندگی کی نمود کو اس کی اولین شکل میں کہاں دیکھتے ہیں۔ اس کی تحقیق ہمیں یہ بتاتی ہے کہ حیات کے جرثومۂ اولین (PROTOPLASM) کی ابتدا سمندر میں ہوئی تھی کیونکہ اس میں اسی نوعیت اور اُسی تناسب کے نمکیات (SALTS) پائے جاتے ہیں جیسے سمندر کے پانی میں۔ سمندر کا پانی جب اپنے کنارے کی مٹی سے ملا تو اس سے وہ پہلا (CELL) ---- خلیہ وجود میں آگیا جس میں زندگی اپنی ابتدائی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس خلیہ میں ہنوز نر و مادہ کی تمیز نہیں تھی، اس لیئے اسے سائنس کی اصطلاح میں (UNI-CELLULAR ORGANISM) کہتے ہیں۔ قرآن کریم اسے "نفسِ واحدہ" کہکر پکارتا ہے اسکے بعد سلسلۂ ارتقاء شروع ہوا۔ نفسِ واحدہ، جوشِ نمو سے دو حصوں میں بٹ گیا جن میں سے ایک حصہ نے نر کی شکل اختیار

کرلی اور دوسرے نے مادہ کی۔ اور یوں زندگی کے پیکروں کا سلسلہ آگے بڑھنے لگا۔ یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے مختلف شاخوں میں پھیل گیا۔ ان میں سے ایک شاخ نوعِ حیوانات کی ہے۔ اسی سلسلۂ ارتقاء نے ایک قدم آگے بڑھایا تو زندگی نے انسانی پیکر اختیار کرلیا۔ (ان اشارات کو ہم مطالب الفرقان۔ جلد اول (صفحہ ۹۲-۲۸۹) میں بھی بیان کرچکے ہیں، لیکن موضوع زیرِ نظر کی اہمیت کے پیشِ نظر ان کا یہاں دُہرا دینا ضروری ہے۔

سلسلۂ کائنات کی ابتداء اور اس کے تدریجی مراحل کے متعلق قرآن کریم نے ایک اصولی نظام بیان کیا ہے

نظریۂ ارتقاء اور قرآن جو اس بحث کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ ارشاد ہے:-

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ۔ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ (۳۲/۵-۶)-

تدابیرِ الٰہیہ (خدا کی اسکیموں) کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنی مضمر شکل میں علمِ الٰہی کی بلندیوں پر ہوتی ہیں۔ جب ان میں سے کسی اسکیم کو بروئے کار لانا مقصود ہوتا ہے تو قانونِ مشیت کے مطابق، زمین کی پستیوں سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر وہ اسکیم اپنے ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے اپنے مقامِ تکمیل کی طرف اٹھتی چلی جاتی ہے۔ یہ مراحل بڑے بڑے طویل المیعاد وقفوں میں طے ہوتے ہیں جن میں کا ایک ایک وقفہ (PERIOD) تمہارے حساب و شمار کی رو سے ہزار ہزار برس کا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ اس خدا کے قانون کے مطابق ہوتا رہتا ہے جو ہر شے کی موجودہ صورت سے بھی واقف ہے۔ اور اس کے مضمر ممکنات سے بھی۔ اس کا قانونِ مشیت اتنی قوت رکھتا ہے کہ وہ ہر شے کو مناسب نشو و نما دیکر اس کے نقطۂ تکمیل تک پہنچا دے۔

یہاں اِن مراحل کے متعلق کہا ہے کہ وہ "ہزار ہزار برس" کے ہوتے ہیں۔ دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ یہ بعض صورتوں میں "پچاس پچاس ہزار سال" کے بھی ہوتے ہیں (۷۰/۴)۔

خدا کے اسی نظامِ ارتقاء کی رو سے (اس نے کہا ہے کہ) زندگی کا آغاز پانی سے ہوا۔ سورۃ الانبیاء میں ہے:-

"جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۔ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ (۲۱/۳۰)" اور ہم نے ہر جاندار شے کو پانی سے بنایا، کیا یہ لوگ اس حقیقت پر یقین نہیں رکھتے"۔ اور اس کے بعد کہا کہ كَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ (۱۱/۷)"۔ زندگی کے اس

سرچشمہ پر پورا پورا کنٹرول خدا کو حاصل ہے"۔ اس کے بعد اس نے ان تخلیقی مراحل کا ذکر کیا ہے جن میں سے گزر کر زندگی، پیکرِ انسانی تک پہنچی۔ اس سلسلہ میں فرمایا:۔

وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ (۳۲/۷)۔(نیز ۶/۲؛ ۳۸/۷۱)۔

اس نے انسانی تخلیق کی ابتداء مٹی سے کی۔

دوسری جگہ "طین" کی بجائے "تراب" کا لفظ آیا ہے۔ (۳۰/۲۰؛ ۲۲/۵) "طین" یا "تراب" غیر جاندار مادہ تھا۔ جب اس کے ساتھ پانی کی آمیزش ہوئی تو وہ "طینِ لازب" یعنی چیچپی مٹی بن گیا۔ سورۃ الصّٰفّٰت میں ہے کہ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ (۳۷/۱۱)۔ قرآن نے اس کی بھی تصریح کر دی ہے کہ مٹی اور پانی کے امتزاج، یعنی اس گارے کی صورت یہ نہیں تھی کہ اس میں "مٹی" زندگی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس نے کہا یہ کہ اس "مٹی کا خلاصہ" پانی سے ملا تو اس سے زندگی کے اولین جرثومہ کی نمود ہوئی۔ چنانچہ سورۃ مومنون میں ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (۲۳/۱۲)۔ اس آیت میں "مٹی کے خلاصہ" کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں۔ ہم جب کوئی بیج زمین میں بوتے ہیں تو وہ ان اجزاء کو، جن پر اس کی نشوونما کا ۔۔۔ مدار ہوتا ہے، زمین سے کھینچ کر اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ انہی اجزاء (نمکیات، معدنیات وغیرہ) کو سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (۲۳/۱۲) یعنی مٹی کا خلاصہ کہا جائے گا۔ اس قسم کے مٹی کے خلاصہ سے حیات کا پہلا خلیہ (CELL) وجود میں آیا۔

قرآن کریم نے دیگر مقامات میں ایک اور حقیقت کی بھی وضاحت کی ہے۔ اس نے اشارۃً یہ بتایا ہے کہ پانی اور مٹی کے اس امتزاج کے ساتھ حرارت کی بھی ضرورت تھی، لیکن ان عناصرِ ترکیبی میں ایک خاص توازن، یا تناسب نہایت ضروری تھا۔ اگر وہ تناسب قائم نہ رہے تو وہ مٹی سوکھ کر ٹھیکری بن جائے۔ چنانچہ سورۃ الرحمٰن میں ہے: خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (۵۵/۱۴؛ ۱۵/۲۶) "ہم نے انسان کو خمیر اٹھے ہوئے گارے سے بنایا جس کی کیفیت یہ تھی کہ (اس میں اگر حرارت کی زیادتی ہو جاتی تو) وہ سوکھ کر ٹھیکری کی طرح بجنے لگ جاتے۔ لیکن ہم نے ان اجزاء میں ایسا تناسب قائم کیا کہ اس سے زندگی کا اولین جرثومہ وجود میں آگیا"۔ اسے قرآن کریم نے "نفسِ واحدہ" کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی ایسا خلیہ جس میں نر و مادہ کا امتیاز نہیں تھا۔ وہ واحد، یعنی ایک (UNIT) تھا۔ سورۃ الانعام میں ہے:۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ؕ

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ (۶/۹۹؛ ۴/۱)۔

خدا کی ذات وہ ہے جس نے تمہیں نفسِ واحدہ سے نشوونما دی۔ پھر تمہارے لئے مختلف

منازل مقرر کیں کہ تم ایک وقتِ معین کے لئے ایک منزل میں ٹھہرو اور وہ منزل تمہیں اگلی
منزل کے سپرد کر دے۔ اس طرح، تم ارتقاء کی مختلف منازل طے کرتے ہوئے پیکرِ انسانی
میں پہنچے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنے قوانینِ حیات کو نکھار اور ابھار کر بیان کر دیا ہے۔
لیکن انہیں وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو عقل و فکر سے کام لیں۔

اِنہی مراحل اور منازل کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے کہ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۸۴/۱۹) "تم یقیناً ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتے ہوتے یہاں تک پہنچے۔ اور اس کے بعد شاہراہِ حیات پر اسی طرح آگے بڑھتے اور بلند ہوتے جاؤ گے"۔ ارتقائی منازل میں اسی تبدل و تحوّل کے متعلق دوسری جگہ کہا: وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا (۷۱/۱۴) "اُس نے تمہیں اس طرح پیدا کیا کہ تم طور طریقے بدلتے ہوتے یہاں تک پہنچ گئے"۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ سلسلۂ ارتقاء کے متعلق سائنٹیفک تحقیق نے یہ بتایا ہے کہ سب سے پہلے زندگی کے جس خلیہ کی نمود ہوئی اس میں نر و مادہ کی تمیز نہیں تھی۔ اس کے بعد یہ خلیہ جوشِ نمو سے پھٹ کر دو حصوں میں بٹ گیا۔ ان میں سے ایک حصے نے نر کی شکل اختیار کی اور دوسرے نے مادہ کی۔ گویا یہ جوڑا اسی نفسِ واحدہ سے وجود میں آیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ:-

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا (۷/۱۸۹)۔

تمہارا نشو و نما دینے والا وہی ہے جس نے تمہیں ایک "نفسِ واحدۃ" سے پیدا کیا۔
اور اسی میں سے اس کا جوڑا بنا دیا۔ [1]

ضمناً قرآن کریم نے صرف انسان کے متعلق ہی یہ نہیں کہا کہ نفسِ واحدہ سے اس کا جوڑا بنایا۔ اس نے کہا ہے کہ: وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۵۱/۴۹؛ ۴۳/۱۲)۔ "اور ہم نے ہر شے کے جوڑے بنائے ہیں۔ ہم نے ان امور کا تذکرہ اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ تم قانونِ خداوندی کی ہمہ گیری کو پیشِ نظر رکھ سکو"۔ آج سائنس کے انکشافات اس حقیقت کو بے نقاب کر رہے ہیں کہ زندگی جہاں بھی ہے (مثلاً نباتات اور حیوانات میں) وہاں "جوڑے" موجود ہوتے ہیں۔ اگرچہ زندگی کے ابتدائی مراحل میں ایک ہی خلیہ کے اندر افزائشِ نسل کی صلاحیت ملتی ہے لیکن زندگی جب ذرا آگے بڑھتی ہے تو ہر مقام پر نر و مادہ کا سلسلہ دکھائی

---

[1] اس سلسلہ میں مزید حوالوں کے لئے دیکھئے: (۴/۱)؛ (۳۰/۲۱)؛ (۳۹/۴)؛ (۴۲/۱۱)؛ (۴۹/۱۳)۔

دیتا ہے۔ چونکہ اس مسئلہ کا تعلق ہمارے زیرِ نظر موضوع سے نہیں، اس لئے ہم اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔

قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ زندگی کی نمود تو "تراب" (یعنی زمین) سے ہوئی لیکن آگے بڑھ کر وہ مختلف انواع (SPECIES) میں اس طرح پھیل گئی جس طرح درخت کی شاخیں مختلف سمتوں میں پھیل جاتی ہیں (۱/۴۲)۔ سلسلۂ ارتقاء کے ماہرین جب مختلف انواعِ حیات کو سمجھاتے ہیں تو وہ اسے درخت کی شکل میں ہی پیش کرتے ہیں۔ ان انواع کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ انہی میں وہ جاندار بھی ہیں جو پیٹ کے بل رینگتے ہیں؛ وہ بھی جو دو پاؤں پر چلتے ہیں اور چوپائے بھی (۲۴/۴۵)۔ نیز اڑنے والے پرندے بھی۔ ان سب کے متعلق کہا کہ یہ تمہاری ہی قسم کی مختلف "امم" ہیں (۶/۳۸)۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے اصلِ حیات کی وحدت کو کس کس انداز سے سمجھایا ہے؟

ان تخلیقی مراحل کو طے کرتی ہوئی زندگی اس مرحلہ میں آ پہنچی جہاں افزائشِ نسل بذریعۂ تناسل یعنی نطفہ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ عام اصطلاح میں اسے درجۂ حیوانات کہا جاتا ہے۔ سورۃ السجدہ میں ہے:

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ (۳۲/۸)

پھر اس کی (انسان کی) نسل کو کمزور سے پانی کے خلاصہ سے بنایا۔

اسی کو دوسری جگہ نطفہ کہا گیا ہے (۱۶/۴)۔[1] نطفہ سے جو جرثومہ وجود میں آتا ہے وہ رحمِ مادر میں کن کن مراحل سے گزرتا اور کیا کیا شکلیں اختیار کرتا ہے، قرآن کریم نے مختلف مقامات پر اس کا تذکرہ بھی کیا ہے مثلاً سورۃ مومنون میں کہا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا (۲۳/۱۲-۱۴)۔[2]

ہم نے انسان کی تخلیق کی ابتدا مٹی کے خلاصہ (بے جان مادہ) سے کی۔ (پھر ہمارا یہ تخلیقی پروگرام اس کڑی تک جا پہنچا جہاں افزائشِ نسل بذریعہ تولید ہوتی ہے اس طرح

---

[1] مزید حوالوں کیلئے دیکھئے (۱۸/۳۷)؛ (۲۵/۵۴)؛ (۳۶/۷۷)؛ (۴۰/۶۷)؛ (۲۲/۵)؛ (۸۶/۵-۶)۔

[2] اس جگہ آیت (۲۳/۱۴) کے آخری الفاظ دانستہ چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ یہ ذرا آگے چل کر سامنے لائے جائیں گے

ہم نے اسے نطفہ بنایا جو (رحم کے اندر) ٹھہر گیا اور مادہ کے بیضہ میں قرار گیر ہو گیا۔ پھر اس نطفہ کو علقہ (جونک کی سی شکل) میں تبدیل کیا۔ پھر اس علقہ کو گوشت کا لوتھڑا سا بنا دیا۔ پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچہ ابھار دیا۔ پھر اس ڈھانچہ پر گوشت کی تہہ چڑھا دی۔

اسی طرح سورۃ الحج میں ہے...... فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۚ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ...... (۲۲/۵)[1] ۔ "ہم نے تمہاری پیدائش کی ابتدا بے جان مادہ سے کی (پھر یہ مادہ مختلف منازل طے کرتا اس منزل میں آپہنچا جہاں افزائش نسل بذریعہ تولید ہوتی ہے) اور نطفہ رحم مادر میں ٹھہر جاتا ہے۔ پھر وہ ایک جونک کی سی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر متشکل اور غیر متشکل گوشت کے ٹکڑے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ ان مراحل میں سے اس لیے گزرتا ہے کہ نطفہ میں جس قدر امکانات مضمر طور پر موجود تھے وہ بتدریج نشو و نما پاتے ہوئے ظہور میں آجائیں۔ وہ جنین ہمارے قانون مشیت کے مطابق کچھ وقت کے لیے رحم مادر میں رہتا ہے۔ پھر تم جیتے جاگتے بچے کی شکل میں دنیا میں آجاتے ہو۔"

مغربی محققین کی غلط نگہی

یہ مراحل وہ ہیں جن سے انسانی بچہ ہی نہیں بلکہ ہر حیوانی بچہ رحم مادر میں گزرتا ہے۔ لہٰذا اس حد تک انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مغربی محققین اپنی ریسرچ میں اس مقام تک آکر رک گئے اور انہوں نے فیصلہ کر دیا کہ انسان بھی دیگر حیوانات کی طرح فطرت کے طبیعی قوانین کے مطابق وجود پذیر ہوتا ہے۔ انہی قوانین کے ماتحت یہ زندگی بسر کرتا ہے۔ پھر انہی کے مطابق اس پر موت وارد ہو جاتی ہے، اور جس طرح دیگر حیوانات کا موت سے خاتمہ ہو جاتا ہے اسی طرح انسان کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے انسانی جسم کا تجزیہ کر کے یہ بھی بتا دیا کہ یہ کن کن عناصر سے مرکب ہے۔ انہوں نے بتایا کہ انسانی جسم میں :-

(۱) دس گیلن پانی ہے۔

---

[1] مزید حوالوں کے لیے دیکھئے (۳۶/۷۷) ؛ (۹۶/۲) ؛ (۴۰/۶۷)۔

(۲) اتنی چربی، جس سے صابن کے سات ڈنڈے بن سکیں۔
(۳) اتنا کاربن، جس سے نو ہزار سرمہ کی پنسلیں بن سکیں۔
(۴) اتنی فاسفورس، جس سے دو ہزار دو سو دیا سلائی کی تیلیاں تیار ہو سکیں۔
(۵) اتنا لوہا، جس سے ایک چھوٹی سی کیل بن جائے۔
(۶) اتنا چونا، جس سے ایک مرغی کے دڑبے میں سفیدی ہو جائے ——— اور
(۷) ذرا سی گندھک اور میگنیشیا ——— اللہ اللہ خیر سلاّ۔

(THE PROPER STUDY OF MAN; BY B.A. HAWARD)

ضمناً، اگر ان لوگوں کی تحقیق طبیعیات تک ہی محدود رہتی تو بھی خیر تھی، لیکن یہاں ایک اور دشواری نے سر ابھارا جسے مشہور مذہبی مفکر (F.J. SHEEN) نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> یہ ایک حقیقت ہے جس کی تصدیق تاریخ سے کی جا سکتی ہے کہ جب کبھی سائنٹیفک زاویۂ نگاہ میں کوئی بڑی تبدیلی واقعہ ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی ایسے مفکر پیدا ہو جاتے ہیں جو چاہتے ہیں کہ بنیادی اور ابدی صداقتوں میں بھی اسی زاویۂ نگاہ کے مطابق تبدیلی پیدا کر دی جائے۔ جب اٹھارویں صدی میں نیوٹن کے نظریہ کے ماتحت عالمِ آفاق کے متعلق نیا تصور قائم ہوا تو اس کے ساتھ ہی اس کا بھی تقاضا شروع ہو گیا کہ اب نیا کو مذہب بھی نیا ملنا چاہیئے۔ چنانچہ اس کے مطابق ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا جس کی رُو سے مطالبہ یہ کیا گیا کہ اخلاقیات، ادب اور مابعد الطبیعیات کو اپنے بنیادی اصول اور جوہر بدل لینے چاہئیں تاکہ وہ اس سائنٹفک زاویۂ نگاہ کے مطابق ہو جائیں۔

(PHILOSOPHY OF RELIGION)

خارجی کائنات کے متعلق نیوٹن کی تحقیق کا نتیجہ یہ ہوا۔ اور ڈاروِن کی تحقیق کی رو سے یہ نتیجہ کہ قوانینِ فطرت کے سوا نہ کوئی اور قوانین ہیں نہ سرچشمۂ علم۔ انسان کی طبیعی زندگی قوانینِ فطرت کے تابع بسر ہوگی اور اس کی تمدنی زندگی ان قوانین کی رو سے، جنہیں انسان خود وضع کرے۔ انیسویں صدی کے آخر میں اس تصور نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی جسے (RATIONALIST MOVEMENT) "تحریکِ عقلیت" کہا جاتا ہے۔ اس تحریک کی ایسوسی ایشن نے ۱۸۹۵ء میں اس کی تعریف ان الفاظ میں پیش کی تھی:۔

عقلیت سے مراد وہ ذہنی رجحان ہے جس کی رو سے عقلِ انسانی کو بلا حدود و قیود بلند ترین مقام پر فائز سمجھا جاتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ایسے فلسفہ اور اخلاقیات کی بنیاد رکھی جائے جس کی صداقت کا معیار خالص عقلِ انسانی ہو اور وہ کسی سند (انطارٹی) کو تسلیم نہ کرے۔ [1]

اس "نئے مذہب" کو سیکولرازم کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کی انتہائی شکل مارکسزم کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ چنانچہ اس باب میں لینن لکھتا ہے:۔

مادہ پرستی (سیکولرازم) کے معنے یہ ہیں کہ ہم یہ تسلیم کرلیں کہ خارجی صداقت وہی ہے جسے ہم اپنے حواس کے ذریعہ معلوم کرسکیں۔ عقلِ انسانی اس قابل ہے کہ یہ ہمیں صداقتِ مطلقہ کا علم دیدے۔ چنانچہ اس نے یہ علم دیدیا ہے۔ [2]

آپ نے غور فرمایا کہ خالص طبیعی تحقیق کے ڈانڈے کہاں جاکر ملائے گئے ہیں؟ یعنی اس تحقیق کی رو سے دعویٰ یہ کردیا گیا کہ وحی، رسالت، مستقل اقدار، حیاتِ آخرت سب اساطیر الاولین ہیں، ان کا کوئی وجود نہیں۔ انسان ایک حیوان ہے، صرف اس فرق کے ساتھ کہ یہ زندگی کے مسائل کے فیصلے اپنی عقل کی رو سے کرسکتا ہے۔

وہیں سے تردید انسان کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ اپنی ہر تحقیق کو حرفِ آخر سمجھ لیتا ہے، حالانکہ اگر وہ تھوڑا سا انتظار کرے اور اپنی تحقیق کو آگے بڑھنے دے تو اس کی سابقہ تحقیق کی کمزوری اس پر خود واضح ہو جائے۔ چنانچہ ابھی طبیعیاتی نظریہ کی صدائے بازگشت بھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ اسی مغرب سے ہمارے کانوں میں اس قسم کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں جن میں کہا گیا کہ:۔

میں آج آپ کے سامنے یہ نہیں کہنا چاہتا کہ مسئلۂ حیات۔ موجودہ زمانہ کی طبیعیات اور کیمسٹری سے سمجھایا جاسکتا ہے، خواہ سمجھانے والا کیسا ہی ذی فہم کیوں نہ ہو۔ ایسا ممکن ہی نہیں۔ آیا مستقبل کے علم طبیعیات اور کیمیا کے ذریعہ ایسا ہوگا، اس کے متعلق میں قیاس آرائی نہیں کرنا چاہتا۔ جب علم طبیعیات کے حوادث غیر متعین ہو جائیں، جب کیمیا خود طبیعیات بن جائے اس وقت صورتِ حالات اور ہو جائے گی۔ لیکن اس وقت تک میں (HALDANE) کی ہمنوائی میں یہی کہتا رہوں گا کہ جب ہم علم حیات کو تمام دیکھتے ہیں

[1] "انسان نے کیا سوچا" (ص ۲۷)۔ [2] "انسان نے کیا سوچا" (ص ۳۰)

تو ہمارے سامنے ایک بالکل نئی صورت آجاتی ہے۔ ایسی صورت، جسکی وحدت اور بنیادی فطرت ایسی ہی اہم ہے، جیسی طبیعیات کے کسی اور تصور کی۔ [1]

اور مشہور روسی مفکر اوسپینسکی کے الفاظ ہیں:۔

ہماری سائنس، زندگی اور اس کی ابتدا کے متعلق کچھ نہیں بتلا سکتی۔ یہ معمہ، معمہ ہی رہ جاتا ہے۔ ایک زندہ جسم، زندہ خلیہ (CELL) زندہ مادۂ حیات (PROTOPLASM) میں کچھ ایسی چیز ہے جسے سمجھا نہیں جا سکتا۔ یہی وہ ناقابلِ فہم شے ہے جو ذی حیات مادہ کو غیر ذی حیات سے متمیز کرتی ہے۔ ہمیں اس شے کا تعارف صرف اس کے عمل (FUNCTION) سے ہوتا ہے۔ اس کے اعمال میں سب سے اہم عمل، تولیدِ خویش (SELF-REPRODUCTION) ہے۔ یہ چیز غیر ذی حیات جسم، مردہ خلیہ اور مردہ مادہ میں نہیں پائی جاتی۔ ایک ذی حیات جسم اپنے آپ کو لامحدود طور پر (MULTIPLY) کرتے چلا جاتا ہے اور اس کے لئے غیر ذی حیات مادہ کو اپنے اندر جذب کرتا رہتا ہے۔ یہی "زندگی" کا وہ عمل ہے جس کی ماہیت سمجھائی نہیں جا سکتی۔ لیکن اتنا تو یقینی ہے کہ مادیئین کا یہ تصور بالکل غلط ہے کہ زندگی، میکانکی قوتوں کے نتیجہ کا نام ہے۔ (TERTIUM ORGANAM: P. 103)

گلاسگو یونیورسٹی کا وائس چانسلر، (JOHN CAIRD) اپنے ایک لیکچر میں کہتا ہے:۔

آج تک اس امر کی کوئی مثال بھی نہیں پیش۔۔۔ کی جا سکی کہ زندگی محض کیمیائی عناصر (CHEMICAL CONSTITUENTS.) سے پیدا ہو گئی ہو۔ لہٰذا یہ قیاس، کہ زندگی کا ارتقاً کسی اور زندگی کے اثر کے بغیر بھی ممکن ہے، بلا دلیل ہے۔ (PROTOPLASM) کو، جسے مادۂ حیات قرار دیا جاتا ہے، محض کیمیائی مرکبات کی سطح پر نہیں رکھا جا سکتا۔ وہ مادۂ حیات، جس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے اور جس کے کیمیائی اجزا معلوم ہو سکتے ہیں، زندہ نہیں، بلکہ مردہ مادہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس وہ مادۂ حیات، جسے زندہ کہا جا سکتا ہے، اگرچہ انہی اجزا کا مجموعہ ہوتا ہے جو مُردہ مادۂ حیات میں پائے جاتے ہیں، لیکن اس سے ایسے خواص و اعمال

---

[1] (THE PHYSICAL REASONABLENESS OF LIFE; BY A.V. HILL)

کا مظاہرہ ہوتا ہے جو بالکل جدید ہوتے ہیں اور جنہیں اس کے کیمیائی اور طبیعیاتی اجزاء کی طرف کبھی منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی شے کسی ایک وقت میں ایسے خواص کا مظاہرہ کرتی ہے جو یکسر کیمیائی یا میکانکی ہوں اور دوسرے وقت میں ایسے خواص کا، جن سے وہ اپنے آپ کو ایک جیتے جاگتے، بڑھنے پھولنے والے جسم میں تبدیل کرے، یا ایسے افعال کا جن سے وہ دوسری چیزوں کو اپنا جزوِ بدن بنا سکے اور پھر اپنے جسم سے کچھ اور پیدا کر سکے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ دوسری صورت میں جو نئی چیزیں اس میں پیدا ہوتی ہیں ان کا سبب کوئی ایسا جدید عنصر ہے جو پہلی صورت میں اسمیں موجود نہ تھا۔ اس سے محض کیمیائی یا میکانکی عمل ظہور میں آتا تھا۔

(INTRODUCTION TO THE PHILOSOPHY OF RELIGION-P. 96)

اس موضوع پر عصرِ حاضر کے محققین کے اسی قسم کے متعدد اقوال پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ انہیں اقوال سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ خود مغرب ہی کی تحقیقِ جدید کا رُخ اس سمت کی طرف مڑ چکا ہے کہ "زندگی" بے جان مادہ کی میکانکی تبدیلیوں سے وجود میں نہیں آجاتی۔ یہ کسی اور "عنصر" کی کارفرمائی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جس طرح "زندگی" مادہ کی سابقہ میکانکی کڑیوں سے بالکل متمیز اور ممتاز کڑی ہوتی ہے۔ اسی طرح جب "زندگی" حیوانات سے انسانی پیکر اختیار کرتی ہے تو وہاں بھی یہ کڑی اپنی سابقہ کڑیوں سے بالکل منفرد ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کے سمجھنے کے لئے قرآنِ کریم کی طرف پھر آیئے۔ سابقہ صفحہ (۹) پر آیت (۲۳/۱۲-۱۴) درج کرنے کے بعد ہم نے (حاشیہ میں) یہ لکھا تھا کہ اس آیت کے آخری الفاظ دانستہ چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ اُس آیت کے الفاظ اور اُس کے ترجمہ کو ایک دفعہ پھر سامنے لایئے اور اس مقام پر پہنچئے جہاں قرآن کریم نے کہا تھا کہ "رحمِ مادر میں جنین کی ہڈیوں کے ڈھانچے کو گوشت سے ڈھانپ دیا گیا"۔ یہاں تک کے مراحل حیوانی اور انسانی جنین میں مشترک تھے۔ اس کے بعد انسانی جنین کے سلسلہ میں کہا کہ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (۲۳/۱۴)۔ "پھر ہم نے انسان کو ایک بالکل نئی اور دوسری قسم کی مخلوق کی شکل میں نمودار کر دیا۔ سو دیکھو، خدا کا قانونِ تخلیق کتنی بڑی ممکنات کا حامل ہے اور اسی جہت سے وہ احسن الخالقین ہے"۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو "احسن الخالقین" کہا۔ اور انسان کی اس منفرد ہیئت کے متعلق دوسری جگہ کہا کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (۹۵/۴)۔ "ہم نے انسان کو احسن ہیئت کی ممکنات لئے ہوئے پیدا کیا"۔

یہ خَلْقًا اٰخَرَ۔۔۔ ایک بالکل جداگانہ قسم کی تخلیق۔۔۔ کیا ہے؟ جس میں انسان منفرد ہے؟ یعنی جو کسی اور مخلوق کو عطا نہیں ہوئی۔ قرآنِ کریم نے اس کیلئے ایک منفرد اصطلاح استعمال کی ہے۔ سورۃ السجدۃ میں پہلے، انسان کے مختلف تخلیقی مراحل کو گنایا گیا ہے اور اس کے بعد کہا ہے وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (۳۲/۹)۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے: "اور اس میں ہم نے اپنی روح پھونک دی"۔[1]، یہ خصوصیت صرف

[1] مزید حوالوں کیلئے دیکھئے (۱۵/۲۸-۲۹) ف (۳۸/۷۱-۷۲)۔

انسان کی ہے۔ کسی دوسری مخلوق کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ خدا نے اس میں اپنی روح پھونک دی۔ "روح" کے معنی توانائی ہیں۔ لہٰذا "نفخ" سے مراد یہ ہے کہ انسان کو ایک ایسی توانائی یا قوت عطا کی گئی جو دیگر مخلوقات میں سے کسی کے حصہ میں نہیں آئی۔ بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سمجھ میں آ جائے گی کہ یہ قوت، اختیار و ارادہ کی ہے۔ جملہ کائنات میں یہ قوت یا تو خدا کو حاصل ہے اور یا (اس کی عطا کردہ) انسان کو۔ اسی لئے خدا نے اِسے "روحِہٖ" یا "روحنا" (الوہیاتی توانائی۔ قوتِ خداوندی) کہکر پکارا ہے۔ بالفاظِ دیگر، انسان کو دیگر مخلوقات کی طرح مجبور پیدا نہیں کیا گیا۔ اسے صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب اس کے سامنے دو راستے (POSSIBILITIES) آئیں تو اسے اختیار دیا گیا ہے کہ یہ ان میں سے جس راستے کو چاہے اپنے لئے منتخب اور اختیار کرلے۔ اس کے سوا کسی مخلوق کو ایسا اختیار نہیں دیا گیا۔ کائنات کی ہر شے (بے جان اور جاندار) اُس راستہ پر چلنے کے لئے مجبور ہے جس کے لئے اُسے

انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہے

پیدا کیا گیا ہے۔ صرف انسان اس سے مستثنیٰ ہے۔ انسان میں وہ "شے" جسے یہ قوت عطا کی گئی ہے، قرآن نے اُسے "نفس" کہکر پکارا ہے۔ اسی کو انسانی ذات، خودی (SELF) یا (PERSONALITY) کہا جاتا ہے۔ عصرِ حاضر کے ماہرینِ علم النفس نے اس کے لئے ایک جدید اصطلاح (PSYCHE) وضع کی ہے۔ قرآنِ کریم نے انسانی نفس کی خصوصیات کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کفر اور ایمان یا حق و باطل کا اولین نقطۂ امتیاز یہی ہے۔ یعنی ایک تصورِ حیات یہ ہے کہ انسان حیوانات ہی کی ایک بڑھی ہوئی شکل کا نام ہے جو طبیعی قوانینِ فطرت کے تابع زندہ رہتا ہے اور انہی کے مطابق ایک دن ختم ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم اس تصور کو کفر کہہ کر پکارتا ہے۔ سورۃ محمدؐ میں ہے: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲)۔ "جو لوگ حیوانات کی طرح کھاتے پیتے اور دیگر طبیعی مفادات سے متمتع ہوتے ہیں اور اسی کو منتہائے زندگی سمجھتے ہیں، وہ کفر کی زندگی بسر کرتے ہیں"۔ دوسری جگہ ہے کہ:-

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (۴۵/۲۴)۔

ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ زندگی بس اس دنیا کی زندگی ہے۔ اسی میں مرنے والے مرجاتے ہیں اور نئے بچے، نئی زندگی لے کر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ زمانہ کا چکر ہے جو یونہی چلتا رہتا ہے۔ گردشِ زمانہ سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کو انسان

کی اصل و حقیقت کا کچھ علم نہیں، یونہی، سطحی سی معلومات ہیں جن کی بنا پر یہ اس قسم کی قیاس آرائیاں کرتے رہتے ہیں۔

انسانی نفس بالذات قرآن کریم نے یہ بات اپنے زمانۂ نزول کے مخاطبین کے متعلق کہی تھی لیکن آج خود مغرب کے محققین یہ کہہ رہے ہیں کہ ان سے پہلے جن محققین نے یہ تصورِ حیات پیش کیا تھا، وہ اُن کی قیاس آرائیاں تھیں جنہیں بعد کی تحقیق نے خود ہی غلط ثابت کر دیا۔ یہ محققین اس نتیجہ پر، کہ انسان میں اس کے طبیعی جسم کے علاوہ کچھ اور بھی ہے، اپنے طور پر عجیب انداز سے پہنچے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ انسانی جسم مرکب ہے مختلف خلیات (CELLS) کا۔ ان خلیات کی کیفیت یہ ہے کہ ان کی کثیر تعداد ہر وقت ضائع ہوتی رہتی ہے اور ان کی جگہ نئے خلیات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلۂ فنا و تجدید مسلسل جاری رہتا ہے تا آنکہ کچھ وقت کے بعد سابقہ جسم سارے کا سارا ایک نئے جسم میں تبدیل ہو جاتا ہے[1]۔ اگر انسان محض اس کے طبیعیاتی جسم سے عبارت ہوتا تو کچھ عرصہ کے بعد اس سابقہ انسان کا کچھ بھی باقی نہ رہتا۔ لیکن تجربہ اس کے خلاف جاتا ہے۔ آپ نے آج سے بیس تیس برس پہلے جو بات کہی تھی یا جو کام کیا تھا اس کے متعلق آپ آج بھی یہ کہتے ہیں کہ "میں نے یوں کیا تھا" یا "میں نے یہ بات کہی تھی"۔ جسے آپ "میں" کہتے ہیں طبیعی جسم کے بدل جانے کے ساتھ نہ وہ ختم ہوتی ہے نہ تبدیل۔ وہ بعینہٖ وہی رہتی ہے اور یہی وہ "میں" ہے جس سے انسان فی الحقیقت، انسان کہلانے کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اس مقام پر قرآنِ کریم میں بیان کردہ ایک ایسی عظیم حقیقت سامنے آتی ہے جسے پیش کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ سورۃ السجدۃ کی آیت (۹-۳۲) کا ایک حصہ پہلے درج کیا جاتا ہے۔ اس میں پہلے انسانی تخلیق کے ان مراحل کا ذکر ہے جن میں انسان اور حیوانات دونوں شریک ہیں۔ ان میں انسان کے لئے غیب کی ضمیر (THIRD PERSON) لائی گئی ہے — نَسْلَهٗ — سَوّٰىهُ — فِيْهِ — اس کے بعد ہے: وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ۔ "خدا نے اس میں اپنی روح پھونک دی"۔ اس طرح وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ (۹-۳۲)۔ "خدا نے تمہیں سماعت و بصارت اور قلب عطا کر دیئے"۔ یہاں ضمیر غائب کی جگہ مخاطب (لکُم) (SECOND PERSON) لائی گئی ہے۔ بالفاظِ دیگر، اس نفخ روحِ خداوندی" کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان تخاطب کے قابل ہو گیا یعنی اب

---

[1] سائنس کی اصطلاح میں اس طریق کو (ANABOLISM : KATBOLISM) اور (METABOLISM) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
اس کی تفصیل کے لئے میری کتاب — سلیم کے نام خطوط — جلد اول میں ساتواں خط دیکھئے۔

یہ مخلوق انسان کہلانے کی مستحق قرار پا گئی — اور یہ "تم" وہ ہے جو ہر آن بدلنے والے انسانی جسم کے ساتھ بدلتا نہیں رہتا۔ جب آپ کسی سے کہتے ہیں کہ تم نے دس سال پہلے یہ کہا تھا، تو اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ تم آج بھی وہی شخص ہو جو دس سال پہلے تھے۔

بہرحال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ اب مغربی محققین بھی اسے تسلیم کر رہے ہیں کہ انسان کے ہر آن بدلنے والے جسم میں کوئی شے ایسی بھی ہے جو تغیر نا آشنا ہے، جو بدلتی نہیں، جو اپنی ذات میں قائم رہتی ہے۔ اسے انسانی نفس یا ذات کہا جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں کہ انسانی جسم کے ہر آن بدلنے کا اس "میں" پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ جب انسانی جسم پر موت وارد ہو جاتی ہے تو اس کی "میں" اس سے بھی متاثر نہیں ہوتی۔ وہ اسی طرح باقی اور غیر متبدل رہتی اور جسم کا لبادہ اتار کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ انسانی نفس کی یہی بنیادی خصوصیت ہے جس کے متعلق مشہور فرانسیسی مفکر برگسان کہتا ہے کہ :-

WE CHANGE WITHOUT CEASING

یعنی "ہم میں تغیر تو واقع ہوتا ہے لیکن ہم کبھی معدوم نہیں ہوتے"۔ اور برگسان کی ہمنوائی میں پولینڈ کا مفکر (NICHOLAS BARDYEAU) کہتا ہے کہ :-

PERSONALITY IS CHANGELSSNESS IN CHANGE

یعنی "انسانی ذات، تغیرات کے ہجوم میں عدمِ تغیر کا نام ہے"۔ [1]

پروفیسر (ERWIN SCHRODINGER) نے ایک چھوٹی سی، لیکن بڑی اہم کتاب لکھی ہے۔ جس کا نام ہے (WHAT IS LIFE)۔ وہ اس کتاب کے خاتمہ پر لکھتا ہے :-

"میں" کسے کہتے ہیں ؟

اگر آپ "میں" کا تجزیہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ انسانی تجارب اور حافظہ سے کچھ زیادہ کا نام ہے۔ یہ وہ پردہ ہے جس پر انسانی حافظہ اور تجربہ کے نقوش جمع ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنی داخلی دنیا کا غور سے مطالعہ کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ جسے آپ "میں" کہتے ہیں، وہ اس بنیاد کا نام ہے جس پر تجربے

---

[1] مزید تفصیل کے لئے دیکھئے — انسان نے کیا سوچا۔ صفحات ۹۶-۹۴۔

> اور حافظے کی عمارت اٹھتی ہے .... اگر کوئی ماہرِ عملِ تنویم ایسا بھی کردے کہ تمہاری تمام سابقہ یادداشت یکسر ذہن سے محو ہو جائے پھر بھی تم دیکھوگے کہ اِس تمہاری "میں" کی موت واقع نہیں ہو جائے گی۔ لہٰذا انسانی ذات کی ہستی کبھی ضائع نہیں ہوتی۔

انسانی ذات اور حافظہ

اِس مفکر نے اس مقام پر ایک ایسا نکتہ بیان کیا ہے جس کی وضاحت کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ انسانی ذات کے منکرین (مادہ پرستوں) کی طرف سے کہا یہ جاتا ہے کہ جسے تم "میں" کہتے ہو اور اس کے ثبوت میں دلیل یہ پیش کرتے ہو کہ "میں نے دس سال پہلے جو بات کہی تھی، میں آج بھی اس کا احساس اور اعتراف کرتا ہوں کہ وہ میں نے ہی کہی تھی۔ اگر جسم کے بدلنے سے کچھ بھی باقی نہ رہتا تو مجھے اس کا احساس کیسے ہو سکتا تھا۔ اس سے واضح ہے کہ انسان میں کوئی شے ایسی ہے جو جسم کے تغیرات سے متاثر نہیں ہوتی۔ اِسی کو انسانی ذات کہتے ہیں"۔ یہ دلیل بڑی کمزور ہے۔ اِن (مادہ پرستوں) کا کہنا یہ ہے کہ یہ انسانی حافظہ ہے جس سے اس قسم کا احساس قائم رہتا ہے۔ جس شخص کا حافظہ خراب یا گم ہو جائے، اُسے اپنے متعلق کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ نہ اپنے ماضی کے کوائف کا کوئی احساس ہوتا ہے۔ اور حافظہ، دماغ کے خلیات کی کارفرمائی ہے۔ یعنی یہ طبیعی نظامِ جسم کا فعل ہے اور چونکہ دماغ کے خلیات، موت کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے مرنے کے بعد انسان کا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ پروفیسر (SCHRODINGER) نے یہاں ان کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ انسانی اعمال اور ارادوں کے نقوش انسانی ذات پر مرتسم ہوتے ہیں جو تغیر نا آشنا ہے۔ حافظہ وہ ذریعہ ہے جس سے یہ نقوش مشہود شکل میں سامنے آتے ہیں۔ اس لطیف نکتے کو دو ایک مثالوں سے سمجھئے۔ براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے کوئی پروگرام نشر ہو رہا ہے جسے آپ اپنے ریڈیو سیٹ سے سنتے ہیں کہ اس میں سے یکایک وہ آواز آنی بند ہو جاتی ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ ریڈیو اسٹیشن کا پروگرام ختم ہو گیا ہے۔ لیکن تحقیق کے بعد پتہ چلتا ہے کہ دراصل آپ کے سیٹ کا ایک تار خراب ہو گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ریڈیو سیٹ سے آواز کے بند ہو جانے کا مطلب یہ نہیں کہ ریڈیو اسٹیشن ختم ہو گیا ہے۔ وہ تو بدستور موجود ہے لیکن اس کے پروگرام پکڑنے کا جو ذریعہ (آپ کا سیٹ) تھا، اس میں نقص واقع ہو گیا ہے۔ حافظہ وہ ریڈیو سیٹ ہے جس کے ذریعے آپ کی ذات کے ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہونے والے پروگرام سامنے آتے ہیں۔ حافظہ (ریڈیو سیٹ) کی خرابی سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں ہوگا کہ اس کے پیچھے ریڈیو اسٹیشن ہی نہیں یا وہ منہدم ہو گیا ہے۔ لہٰذا اگر کسی کے حافظہ کے خراب یا گم ہو جانے سے اُسے ماضی کے احساسات یاد نہیں رہتے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ احساسات حافظہ پر منقوش تھے۔ اس کے

خراب یا گم ہو جانے سے، وہ نقوش ہی ضائع ہو گئے۔ وہ نقوش انسانی ذات پر مرتسم تھے، جو حافظہ کی خرابی کے باوجود اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ یا مثلاً سینما فلم کا عکس، سکرین (پردہ) پر پڑتا ہے جسے ہم سب دیکھتے ہیں۔ اگر سینما اسٹیج پر سکرین نہ رہے یا خراب ہو جائے تو وہ تصویر ہمیں نظر نہیں آئے گی۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہوں گے کہ وہ فلم ہی باقی نہیں رہی۔ فلم تو بدستور موجود ہے صرف وہ ذریعہ باقی نہیں رہا جس سے اس فلم کے نقوش مشہود طور پر ہمارے سامنے آ رہے تھے جب وہ سکرین درست ہو جائے گی (یا سائنس کی تحقیق اس کی جگہ کوئی دوسرا ذریعۂ اظہار ایجاد کرے گی) تو فلم پر منقوش تصویر پھر ہمارے سامنے آ جائے گی۔

برگساں اس باب میں اور بھی آگے جاتا ہے۔ وہ اپنی معرکہ آرا تصنیف (MATTER AND MEMORY) میں اس موضوع پر بلند فلسفیانہ سطح پر بحث کرنے کے بعد یہ نتیجہ پیش کرتا ہے کہ حافظہ درحقیقت دماغ کا فعل نہیں۔ وہ محض ذریعہ اظہار ہے ایک غیر مادی فعال عنصر کا۔ اس کے الفاظ ہیں:

> آپ نے اب سمجھ لیا ہو گا کہ حافظہ کیوں دماغ کا فعل نہیں ہو سکتا۔ دماغ، حافظہ کے تسلسل کو قائم رکھتا ہے اور اُسے مادی قالب میں سمو کر اس قابل بنا دیتا ہے کہ یہ حال (PRESENT) پر اپنا تصرف کر سکے۔ لیکن "خالص حافظہ" مادی شے نہیں۔ یہ روحانیت (غیر مادی عنصر) کا مظہر ہے۔ حافظہ کی دنیا درحقیقت رُوح کی دنیا ہے۔

اِن مفکرین کی تحقیق سے واضح ہے کہ انسانی شعور (یا حافظہ جو تسلسلِ شعور کا دوسرا نام ہے) انسان کے طبیعی نظامِ جسم کا نتیجہ نہیں۔ یہ اِنسانی ذات کا وظیفہ ہے جو تغیر نا آشنا ہے، اور جو مدت کے بعد بھی بدستور تغیر نا آشنا رہتا ہے۔

قرآن کریم نے اس عمیق حقیقت کو بڑے بلیغ انداز سے بیان کیا ہے۔ سورۂ زمر میں ہے:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا. فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۳۹/۴۲)۔

خدا انسانی ذات کو (جو سرچشمۂ شعور ہے) نیند کی حالت میں، اور موت کی حالت میں، اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے۔ (یعنی انسانی ذات کا وظیفہ شعور اور اختیار و ارادہ وقتی طور پر معطل ہو جاتا ہے) نیند کے بعد جب اِنسان بیدار ہو جاتا ہے تو یہ شعور ایک مدت تک کے لئے واپس آ جاتا ہے۔ لیکن موت کی صورت میں وہ (انسانی جسم کی طرف لوٹ کر نہیں آتا) روک لیا

جاتا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیں، ایک عظیم حقیقت تک پہنچنے
کی نشانیاں مضمر ہیں ۔

جسطرح نیند کی حالت میں انسانی ذات فنا نہیں ہو جاتی۔ اسی طرح، حافظہ کی خرابی یا گم ہو جانے کا مطلب یہ نہیں کہ انسانی ذات بھی فنا ہو گئی۔ یا وہ حافظہ سے الگ کوئی شے ہی نہیں۔ نیند کی حالت میں انسانی شعور کارفرما نہیں رہتا حالانکہ اس کا جسم بدستور کام کر رہا ہوتا ہے۔ موت کے بعد بھی انسانی جسم کے ہونے یا نہ ہونے کا اس کی ذات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ اپنے نقوش کو لئے بدستور باقی رہتی ہے۔ لیکن جسم کی طرف لوٹ کر نہیں آتی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ موت کے بعد انسانی ذات کے نقوش کے مشہود ہونے کے لئے کس قسم کے ذرائع عطا کئے جائیں گے لیکن ذرائع کوئی بھی ہوں، یہ حقیقت ہے کہ انسانی ذات کے نقوش فناپذیر نہیں۔ یہی ہے وہ حقیقت جسے ان مغربی مفکرین نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔

جن مفکرین کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اگرچہ ان کا تعلق بھی ہمارے ہی زمانے سے ہے لیکن وہ آج سے چند سال پہلے ہو گزرے ہیں۔ اسوقت دنیائے علم النفس (سائیکالوجی) میں (ERICH FROMM) کا نام سرفہرست ہے۔ وہ عقیدہ کی رو سے (HUMANIST) ہے یعنی وحی کا قائل نہیں، لیکن آپ دیکھئے کہ وہ سائیکالوجی کے عمیق اور طویل مطالعہ اور تجزیہ نفس کے ذاتی تجارب کے بعد نفسِ انسانی کے متعلق کیا کہتا ہے۔ وہ اپنی کتاب (MAN FOR HIMSELF) میں لکھتا ہے:۔

> انہی معنوں میں، ہم اپنے آپ پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ ہم اپنے جسم میں، اپنی ذات کے وجود سے باخبر ہیں۔ اس کا ہمیں احساس ہے۔ یہ ذات ناقابلِ تغیر ہے۔ اور تغیر پذیر احوال و کوائف، حتیٰ کہ اپنے خیالات اور جذبات تک میں بعض تغیرات کے باوجود، یہ ہماری زندگی میں شروع سے آخر تک اسی طرح قائم و دائم رہتی ہے۔ یہی وہ "شے" وہ معروضیات ہے جو لفظ "میں" کے پیچھے ایک حقیقت ہے اور جس کی بنیاد پر، ہمارے تشخص کے عقیدہ اور یقین کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اگر ہمیں اپنی ذات پر اعتماد اور یقین نہ ہو تو ہمارے تشخصِ خویش کا احساس متزلزل ہو جاتا ہے ـــــ ہم دوسرے لوگوں کے سہارے جینے لگتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ (ہماری اپنی کوئی رائے یا فیصلہ نہیں ہوتا) انہی لوگوں کی رائے ہمارے لئے تشخصِ خویش کا موجب بن جاتی ہے۔

یاد رکھئے! صرف وہ شخص، جسے اعتمادِ خویش حاصل ہو، دوسرے لوگوں سے عہدِ وفا نباہ سکتا ہے کیونکہ اسی صورت میں اسے اس امر کا یقین ہو سکتا ہے کہ وہ آنے والے زمانہ میں بھی وہی ہوگا جو وہ آج ہے۔ اور اسی طرح محسوس اور عمل کرے گا جس طرح وہ آج کرتا ہے۔ یہ اعتمادِ خویش ہی ہے جس سے ہم دوسروں سے کچھ وعدہ کرنے کے قابل ہوتے ہیں نطشے نے کہا تھا کہ انسان کی تعریف (DEFINITION) یہ ہے کہ "وہ وعدہ کر سکتا ہے"۔ اور یہی وہ خصوصیت ہے جس سے ایک انسان، انسان کہلا سکتا اور انسان رہ سکتا ہے۔ انسانی وجود کی شرطِ اوّلین، اس کا اپنے آپ پر یقین ہے۔ (صفحہ ۲۰۶)

غالباً ایسے ہی ہیں وہ لوگ، جن کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ:-

شاخِ نہالِ سدرۂ خارِ خسِ چمن مشو ÷ منکرِ اُو اگر شوی، منکرِ خویشتن مشو

اِس لئے کہ جو شخص خدا (وحی اور آخرت) کا منکر ہے لیکن انسانی ذات میں عقیدہ رکھتا ہے، اس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی دن ان صداقتوں کو بھی تسلیم کرے گا۔ لیکن جو شخص انسانی ذات کا منکر ہے (یعنی اپنے آپ کو ایک حیوان سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا) وہ حیوانیت سے بلند و بالا کسی حقیقت کو بھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس کا ذہن اس پست سطح سے بلند ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ:

بآدمے نرسیدی خدا چہ می جوئی

(ERICH FROMM) نے کہا ہے کہ انسانی ذات کے تغیر نا آشنا ہونے کا نتیجہ ہے کہ انسان کو اس کے سابقہ فیصلوں کا ذمہ دار اور پابند قرار دیا جاتا ہے۔ اس باب میں راشڈل اپنی کتاب (THEORY OF GOOD AND EVIL) میں لکھتا ہے کہ:-

> اخلاقی نظام کا دار و مدار ہی اس مسلمہ پر ہے کہ "میں" اپنے تمام گذشتہ فیصلوں اور معاہدوں کا ذمہ دار ہوں۔ اس لئے اگر کچھ عرصہ کے بعد "میں" وہ نہیں رہتا جو پہلے تھا تو اس صورت میں، "میں" اپنے سابقہ فیصلوں اور معاہدوں کا ذمہ دار ہی نہیں قرار پاتا۔ اگر صورتِ حال یہ ہو تو پھر کسی شخص پر معاہدہ کی خلاف ورزی کا الزام ہی عائد نہیں کیا جا سکتا۔

اور یہی ہے وہ بنیاد جس پر قرآن کے قانونِ مکافاتِ عمل کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے جس کا سلسلہ دراز موت کے بعد تک چلا جاتا ہے۔

نفسِ انسانی کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم نے اسے ان الفاظ میں سمجھایا ہے: وَ نَفَخَ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِهٖ "خدا نے انسان میں اپنی روح پھونک دی"۔ اس کے غلط مفہوم سے ایک ایسا عقیدہ وضع ہوا جس پر تصوف کی ساری عمارت ایستادہ ہے۔ ہندوؤں کے تصوف (ویدانت) نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ انسانی آتما (روح) پرماتما (سب سے مکمل روح یعنی خدا) کا ایک جزو ہے جو مادی جسم میں محبوس ہے اور انسانی زندگی کا منتہیٰ و مقصود یہ ہے کہ مادی آلائشوں کو اس طرح ترک کیا جائے کہ یہ روح، مادہ کی دلدل سے نکل کر پھر اپنی اصل، یعنی روحِ خداوندی سے جا کر مل جائے۔

انسانی ذات اور ذاتِ خداوندی

یہ عقیدہ پھرتا پھراتا مسلمانوں کے تصوف میں بھی در انداز ہو گیا اور تعلیم دی جانے لگی کہ انسانی ذات، ذاتِ خدا کا جزو ہے۔ اور انسانی زندگی کا منتہیٰ یہ ہے کہ یہ جزو، اپنی اصل میں جا کر مل جائے۔ غالبؔ کے الفاظ میں:

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

اسی عقیدے کا نتیجہ ہے کہ اولیاء اللہ کی موت کو موت نہیں کہا جاتا، اُسے "واصل بالحق" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی ان کی رُوح پھر سے الحق کے ساتھ جا کر مل گئی۔ اسے وصال بھی کہا جاتا ہے۔ یہ عقیدہ باطل ہے۔ ذات جہاں بھی ہو، اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ناقابلِ تقسیم وحدت ہوتی ہے۔ وہ اجزاء میں تقسیم ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر کسی ذات سے اس کا کوئی جزو الگ ہو جائے تو وہ ذات نامکمل یا ناقص ہو جاتی ہے اور نامکمل ذات کو ذات کہا ہی نہیں جا سکتا۔ انگریزی زبان میں انسانی ذات کی انفرادیت کے لئے لفظ (INDIVIDUALITY) آتا ہے (IN-DIVIDUAL) کے معنی ہی (IN-DIVISIBLE) یعنی ناقابلِ تقسیم ہیں۔ لہٰذا انسانی ذات، ذاتِ خداوندی کا جزو نہیں، یہ خدا کی عطا کردہ فضلاً ایک صلاحیت یا قوت ہے، جس سے انسان کو نوازا گیا ہے۔ پروفیسر (C. LLOYD MORGAN) نظریۂ فجائی ارتقاء (EMERGENT EVOLUTION) کا موجد ہے جس نے ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی بنیادوں تک کو متزلزل کر دیا ہے۔ وہ ارتقائے نفسِ انسانی کے سلسلہ میں لکھتا ہے:-

> میں اپنے اس عقیدہ کا اعتراف کرتا ہوں کہ (نفس کے) اس ارتقاء کو ایک "نفسِ اعلیٰ" (SUPREME MIND) کا مظہر یا عکس سمجھنا چاہیئے۔ وہ "نفسِ اعلیٰ" جو ان تمام اشیاء کا خالق ہے جسے ہم "جدیدیت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ میں اس ارتقائے نفس کے اندر یہی دیکھتا ہوں کہ اُوپر سے نیچے اور اول سے آخر تک ایک عظیم الشان اسکیم (تدبیر) عمل پیرا ہے۔ میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ فطرت کی ہر شے میں یہ ارتقائی بالیدگی، خدائی عاملیت (DIVINE AGENCY) کا ہی مظاہر

ہے۔ اور چونکہ اس سلسلۂ ارتقاء میں، نفسِ انسانی، بلند ترین مقام پر ہے، اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ارتقائے نفسِ انسانی اِس "نفسِ اعلیٰ" کی عالیت کا آئینہ ہے۔ لیکن (جیسا کہ میرا عقیدہ ہے)، یہ "نفسِ اعلیٰ" لامحدود اور زمان کی قیود سے بے نیاز ہے۔ اس کی ذات کے لئے "اوّل" اور "آخر" اور "جدت" و "اعادہ" کے الفاظ ان معانی میں استعمال نہیں کئے جا سکتے جن معانی میں یہ نفسِ انسانی سے بحث کرتے وقت استعمال ہوتے ہیں ...... وہ "رُوحِ خلاق" جو قدیم اور واجب الوجود ہے ارتقاء کی پیداوار نہیں، بلکہ وہ ایسی ذات ہے کہ خود ارتقاء کی بڑھتی ہوئی صورت اس کا پرتو ہے۔

(THE GREAT DESIGN)

اِس سے بھی اِنسانی ذات اور ذاتِ خداوندی کا بنیادی فرق ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے نفسِ انسانی کی جو خصوصیات بیان کی ہیں، اس فرق کا صحیح صحیح تصور انہی سے سامنے آسکتا ہے۔ اس مقام پر ہم، ان میں سے چند ایک کا تذکرہ ضروری سمجھتے ہیں۔

نفسِ اِنسانی

کتبِ لغت کی رُو سے، اس مادہ (ن۔ ف۔ س) کے متعدد معانی ہیں۔ عظمت اور بڑائی، ہمت، عزت، ارادہ اور عقوبت (سزا)، نیز عقل، علم، قلب، شعور اور احساس کے معنوں میں بھی۔ لیکن جامع طور پر یہ لفظ، انسانی ذات یا شخصیت کے جملہ پہلوؤں کو محیط ہوتا ہے۔ اِن معانی کی رُو سے، اس کے لئے ہمارے ہاں، ذات یا خودی کا لفظ بولا جاتا ہے۔ نیز نَفْسٌ کے معنی بھائی بندوں کے بھی ہوتے ہیں اور یہ لفظ ان معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے جن کے لئے ہم اپنے ہاں "اپنے آپ" کے الفاظ بولتے ہیں۔

ضِمناً نَفَسٌ (ف کے زبر کے ساتھ) کے معنی سانس کے ہوتے ہیں۔ اس کی جمع اَنْفَاسٌ آتی ہے۔ ——— زیرِ نظر موضوع کی نسبت سے ہم اپنے آپ کو صرف اس دائرہ تک محدود رکھیں گے جس کے اندر یہ لفظ انسانی ذات کے لئے آیا ہے۔ [1]

---

[1] مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: لغات القرآن جلد (...)

پہلے بتایا جاچکا ہے کہ حیوانات اور انسان میں مابہ الامتیاز خصوصیت، انسانی ذات ہے۔ اس سے واضح ہے کہ انسانی ذات، ہر انسانی بچہ کو بلا تخصیص عطا ہوتی ہے۔ اور یہی وہ امتیاز ہے جس کی بنا پر کہا گیا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰)۔ "ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم بنایا ہے"۔ انسانی ذات کیا ہے؟ یعنی اس کی کنہ و ماہیت کیا ہے، یہ نہ بتایا جاسکتا ہے نہ سمجھایا جاسکتا۔ اس لئے کہ یہ کوئی مادی شے نہیں۔ انسانی ذات تو ایک طرف، ہم تو یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ زندگی (LIFE) جسے عام طور پر "جان" کہتے ہیں، کیا ہے! ہم زندگی کی علامات سے، زندہ اور مردہ میں تمیز کر سکتے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ زندگی ہے کیا؟ یہی کیفیت انسانی ذات کی بھی ہے، بلکہ اس سے بھی لطیف تر۔ اس کی ماہیت کے متعلق بھی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اسے اُن خصوصیات کی بنا پر پہچانا جا سکتا ہے جو اس سے عملاً ظہور میں آتی ہیں۔ انسانی ذات، ہر انسان کو امکانی (POTENTIAL) شکل میں ملتی ہے۔ یعنی غیر نشوونما یافتہ (UN. DEVELOPED)۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اس میں نشوونما پاکر مستحکم ہونے کی بھی صلاحیت رکھدی گئی ہے اور اگر اس کی نشوونما نہ کی جائے تو یہ، دبی کی دبی رہ جاتی ہے۔ سورۃ الشمس میں ہے: وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (۹۱/۷-۱۰)۔ "انسانی ذات، اور جس انداز سے اسے متوازن بنایا گیا ہے، (اس پر غور کرو)۔ اس میں، اس امر کی صلاحیت رکھدی گئی ہے کہ یہ چاہے تو غلط روش پر چل کر اپنے اندر انتشار پیدا کرلے اور چاہے اس انتشار سے محفوظ رہ کر، مستحکم سے مستحکم ہوتی چلی جائے۔ جس نے اپنی ذات کی نشوونما کرلی وہ کامیاب و کامران ہوگیا، اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی۔ لیکن جس نے اسے اپنے پست جذبات کے بوجھ تلے دبائے رکھا اور ابھرنے نہ دیا، اس کی کشتِ حیات ویران ہوگئی۔ اس کی انسانی صلاحیتیں خوابیدہ کی خوابیدہ رہ گئیں"۔ [1]۔ اس کے نشوونما پانے کی کیفیت کے لئے قرآن کریم نے "تزکیہ" کی اصطلاح استعمال کی ہے جس کے لغوی معنی نشوونما یا بالیدگی (GROWTH) کے ہیں۔ انسانی زندگی کا فریضہ یہ ہے کہ اس (ذات) کی نشوونما کی جائے۔ اس سے یہ اس قابل ہوجائے گی کہ زندگی کے مزید ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی آگے بڑھ جائے (اسے حیاتِ اُخروی میں جنت کی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے)۔ لیکن اگر یہ غیر نشوونما یافتہ رہ جائے تو یہ آگے نہیں بڑھ سکتی۔ رُک کر رہ جاتی ہے (اسے جہنم کی زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے)۔ جہنم کے لئے ایک لفظ "جحیم" بھی آیا ہے جس کے معنی رکاوٹ کے ہیں۔

اِنسانی ذات کی نشوونما

انسانی ذات کی نشوونما ان اقدار کی پابندی سے ہوتی ہے جو وحی کی رُو سے عطا ہوئی ہیں اور اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ ان اقدار پر عمل پیرا ہونا، اس

[1] ان آیات کا ایک اور پہلو بھی غور طلب ہے، لیکن اسے ہم ذرا آگے چل کر سامنے لائیں گے جہاں یہ بھی بتایا جائے گا کہ اس کے مروجہ مفہوم نے کس قدر غلط فہمی پیدا کر رکھی ہے۔

نظام کے اندر رہتے ہوئے ممکن ہے جسے "الدین" یا "الاسلام" کہکر پکارا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ایک فریضہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یُزَکِّیۡکُمۡ (۲/۱۵۱)۔ "وہ تمہاری ذات کی نشوونما کرتا ہے"۔[1] اس کے معنی ہیں کہ رسولؐ تعلیم کتاب و حکمت کے مطابق ایسا نظام متشکل کرتا ہے، جس میں اقدارِ خداوندی کے اتباع سے مؤمنین کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں خانقاہوں کی خلوتوں میں چلّوں اور ریاضتوں سے تزکیۂ نفس کیا جاتا ہے، وہ فریبِ نفس سے زیادہ کچھ نہیں۔ قرآن کریم کی رُو سے تزکیۂ نفس، قرآنی نظام کے اندر جہدِ مسلسل کی رو سے ہوتا ہے۔ ان اقدار پر عمل پیرا ہونے کے مختلف اور متعدد گوشے ہیں۔ انسانی زندگی کا ہر گوشہ ان کی آماجگاہ ہے لیکن ان میں نمایاں حیثیت مزد و معاوضہ کے خیال کے بغیر انفاق فی سبیل اللہ کو حاصل ہے۔ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی استعداد اور استطاعت کے مطابق پوری پوری محنت کرے اور اس محنت کے ماحصل میں سے اپنی ضروریات کے مطابق لیکر باقی نوعِ انسان کی بہبود کیلئے اس نظام کے حوالے کردے۔ مثلاً سورۃ الّیل میں ہے کہ جہنم سے وہ محفوظ رہ سکتا ہے: اَلَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی (۹۲/۱۸)۔ "جو اپنا مال و دولت اس مقصد کے لئے دیدیتا ہے کہ اس کی ذات کی نشوونما ہو جائے"۔ سورۃ بقرۃ میں کہا گیا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ سے تثبیتِ نفس حاصل ہو جاتی ہے (۲/۲۶۵)۔ تثبیت کے معنی استحکامِ ذات کے ہیں۔ اِنفاق کے برعکس، بخل یا شحّ نفس ہے —— یعنی سب کچھ اپنے لئے سمیٹ کر رکھ لینا۔ قرآن کریم میں اس سے بچنے کی سخت تاکید آئی ہے (دیکھئے ۵۹/۹ و ۶۴/۱۶)۔ نظامِ خداوندی میں انفاق کی یہ شکل ایک تنظیمی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس کے لئے دیکھئے (۹/۱۰۳)۔

اس کا معیار

اس مقام پر فطری طور پر یہ سوال اُبھرتا ہے کہ اس کی پہچان کیا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما ہو رہی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے اس کی پہچان، آسان ہے۔ ذاتِ خداوندی مکمل ترین ذات ہے اور اس کی جو صفات قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں، وہ اس ذات کے مختلف (FACETS) یا شئون ہیں۔ ان میں بعض صفات تو ایسی ہیں جن کا تعلق ذاتِ خداوندی کی لامتناہیت سے ہے —— مثلاً اس کا ازلی اور ابدی ہونا۔ اِن میں تو کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا۔ لیکن دیگر صفات ایسی ہیں جن کی نمود (علیٰ حدِّ بشریت) انسانی ذات میں بھی ممکن ہے۔ لہٰذا جس انسان سے اِن صفات کی نمود ہو، اُس کے متعلق کہا جائے گا کہ اس کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہے۔ اسی کو "قربِ خداوندی" کہا جا سکتا ہے۔ اسی بنا پر قرآن کریم میں ہے: فَلَا تُزَکُّوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ ؕ ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی (۵۳/۳۲)۔ "تم خود ہی اپنے معیار کے مطابق فیصلے کرنے نہ بیٹھ جاؤ کہ تمہاری ذات نشوونما پا رہی ہے۔ خدا کو اچھی طرح معلوم ہے،

---

[1] مزید حوالوں کے لئے دیکھئے۔ (۲/۱۲۹) و (۳/۱۶۳) و (۶۲/۲)۔

کس کی ذات، کس حد تک، تخریب سے محفوظ ہے۔" (نیز دیکھئے ۴۹/۴ ؛ ۲۱/۲۴)۔ سورۃ الحشر میں ایک بڑی اہم آیت ہے جس میں کہا گیا ہے: وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنسٰهُمْ أَنفُسَهُمْ ۚ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ (۵۹/۱۹)۔ "دیکھنا! تم کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کو فراموش کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی اپنی ذات ہی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی"۔ اس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ خدا فراموشی اور خود فراموشی (منکرِ خویشتن شدن) لازم ملزوم ہیں۔ ان حقائق سے واضح ہے کہ صفاتِ خداوندی وہ معیار (STANDARD) ہے جس سے یہ ناپا اور پرکھا جا سکتا ہے کہ انسان کی ذات کس حد تک نشوونما پا چکی، یا پا رہی ہے۔

انفرادیت

ذات کی بنیادی خصوصیت انفرادیت ہے۔ انفرادیت کے معنی یہ ہیں کہ ہر ذات خود مکتفی ہے۔ بذاتہٖ قائم ہے۔ کسی دوسرے سہارے کی محتاج نہیں۔ یہ اپنے ہر فیصلہ کی آپ ذمہ دار ہے اور اس کے نتائج بھی اسے خود ہی بھگتنے پڑتے ہیں۔ اس میں نہ کوئی دوسرا شریک ہوتا ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ سورۃ اخلاص میں خدا کے متعلق جو کہا گیا ہے۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ (۱۱۲/۱)، تو اس میں "احد" کے معنی "ایک" نہیں، بلکہ یہ ذاتِ خداوندی کی انفرادیت یا یگانگت (UNIQUE-NESS) کا مظہر ہے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت اس کا صاحبِ اختیار و ارادہ ہونا ہے۔ کائنات کی ہر شئے قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ کائنات میں مشیتِ خداوندی بتمام و کمال کارفرما ہے، لیکن انسان کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ اِعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ (۴۱/۴۰)۔ "تم اپنی مرضی کے مطابق، جو کرنا چاہتے ہو، کرو"۔ انسان کا یہی اختیار و ارادہ ہے جس کی تصریحات سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ کہیں کہا گیا ہے: وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹)۔ "ان سے کہہ دو کہ الحق تمہارے رب کی طرف سے آ چکا ہے۔ تم میں سے جس کا جی چاہے اسے قبول اور اختیار کرلے، جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے"۔ کہیں کہا گیا: مَنِ اهْتَدٰى فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهٖ ۖ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا (۱۷/۱۵)۔ "جو صحیح راستہ اختیار کرے گا اس کا فائدہ اس کی ذات کو پہنچے گا۔ جو غلط راہ پر چلے گا اس کا نقصان بھی اس کی ذات کو ہو گا"۔[ۂ]

انسان کے اسی اختیار و ارادہ کا فطری نتیجہ ہے کہ ہر فرد اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس میں کوئی دوسرا

ۂ مزید حوالوں کے لئے دیکھئے۔ (۱۰۸/۱۰)؛ (۳۴/۴۲)؛ (۹۲/۲۷)؛ (۱۹/۶)؛ (۱۲/۳۱)؛ (۴۱/۲۹)۔ مطالب الفرقان جلد اول میں زیرِ تشریح آیت (۱/۵) میں اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔ اسے ایک نظر پھر دیکھ لیجئے۔ نیز کتاب التقدیر۔

شریک نہیں ہوتا۔ چنانچہ سورۃ بنی اسرائیل کی جو آیت ابھی ابھی درج کی گئی ہے یعنی (۱۷/۱۵)، اس کا اگلا حصہ یہ ہے: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (۱۷/۱۵) "کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا" (نیز دیکھئے ۳۵/۱۸) (۴۵/۱۵)۔ اس کی تشریح ان الفاظ سے کی گئی کہ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"انسانی ذات جو صحیح کام کرے گی اس کا فائدہ بھی اسی کو ہوگا، اور جو غلط کام کرے گی اس کا نقصان بھی اسی کو اٹھانا پڑے گا۔

. . . . حقیقت یہ ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے انسان کے ہر کام کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ اس کا ہر عمل، اس کی ذات پر ایک نقش چھوڑ جاتا ہے۔ مثلاً سورۃ النساء میں ہے: وَمَنْ يَكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ (۴/۱۱۱) "جو شخص اقدارِ خداوندی کی خلاف ورزی کرتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی ذات میں اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے"۔ دوسری جگہ کہا گیا: وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا (۷۳/۲۰)۔ "تم جو کچھ اپنی ذات کی بہبود کے لئے عملِ خیر کرتے ہو، خدا کے ہاں سے اس کا "خیر" نتیجہ ملے گا، اور یہ بہت بڑا معاوضہ ہے"۔ اگرچہ لفظ "خیر" کے عام معنی نیک عمل ہیں، لیکن بنیادی طور پر اس کے معنی ایسے اعمال ہیں، جن سے انسانی ذات کے اختیارات میں وسعتیں پیدا ہوتی ہیں۔ خیر اور اختیار کا مادہ ایک ہی ہے۔ (یعنی خ۔ ی۔ ر)۔ اس لئے مومنین سے کہا گیا ہے

عملِ خیر سے مراد

کہ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ (۲/۱۴۸، ۵/۴۸) "تم ان اعمال میں مسابقت کرو جو تمہاری ذات کے اختیارات میں وسعتیں پیدا کرنے کے موجب ہوں"۔ خود مومنین کی اعلیٰ صفت سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ (۳۵/۳۲) بتائی گئی ہے۔ یعنی وہ، جو يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ (۳/۱۱۳)، (۲۱/۹۰)، (۲۳/۶۱) "اختیارات افزا اعمال میں تیزی سے آگے بڑھ جاتے ہیں"۔ دوسری جگہ ان کے اعمال کا نتیجہ یہ بتایا گیا ہے کہ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ (۹/۸۸)۔ "ان کے لئے اختیارات کی وسعتیں ہیں"۔ خود احکامِ خداوندی کو فِعْلَ الْخَيْرٰتِ (۲۱/۷۳)۔ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ قرآن کریم میں بیشتر مقامات میں آتا ہے کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲/۲۸۶)۔ تو اس کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ وحی کی رو سے انسان پر جو پابندیاں عائد کی جاتی ہیں تو ان سے فی الحقیقت مقصود اس کی ذات میں وسعت پیدا کرنا ہوتا ہے، جسطرح نہر میں مختلف مقامات پر ٹھوکریں (FALLS) بنادی جاتی ہیں کہ ان سے پانی کی رفتار میں تیزی پیدا ہو جائے۔ اس بنا پر جنتی زندگی میں مسابقت چاہنے والوں کو مُتَنَافِسُوْنَ کہہ کر پکارا گیا ہے (۸۳/۲۶)۔ "تنافس" سے مراد، نفس کی وسعتوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی سعی و کاوش ہے۔ قرآن کریم کی ان تصریحات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ نیک اعمال، اعمالِ صالحہ یا اعمالِ حسنہ وہ کام ہیں، جن سے انسانی ذات میں وسعت یا استحکام پیدا ہوتا ہے، اور سیئات یا برے کام وہ ہیں، جن سے اس میں ضعف یا اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے، یعنی ان سے انسانی ذات میں انتشار

واقع ہو جاتا ہے۔ (DIS-INTEGRATION) منتشر کہتے ہی انتشار کو ہیں - اسی کو "خسرانِ نفس" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے - (۷/۹ ؛ ۳۹/۵۴) یعنی وہ اعمال، جن سے انسانی ذات میں کمی واقع ہو جاتی ہے - [1]

ہم نے اوپر کہا ہے کہ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے عمل سے مراد وہی کام نہیں، جو کسی سے محسوس طور پر سرزد ہوں - اس میں وہ امور بھی شامل ہیں، جن کا انسان ارادہ یا نیت کرے، خواہ وہ عملی طور پر اس سے سرزد نہ ہی ہوں۔ مثلاً آپ کسی کے ہاں بیٹھے ہیں اور میز پر اس کی قیمتی گھڑی پڑی ہے۔ آپ کے دل میں خیال آتا ہے کہ اگر موقع مل جائے تو میں اس گھڑی کو چُرا لوں لیکن آپ کو اس کا موقع نہیں ملتا۔ دنیاوی قانون کی رو سے آپ نے کسی جُرم کا ارتکاب نہیں کیا۔ لیکن خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے حساب سے آپ کی اس نیت کا اثر بھی آپ کی ذات پر مرتب ہو گیا۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے: وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ (۵/۱۶)۔ "ہم انسان کے دل میں گزرنے والے خیالات تک سے بھی واقف ہیں"۔ دوسری جگہ ہے: يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ۔ (۴۰/۱۹) نیز (۲/۲۸۴)۔ "خدا تمہاری نگاہوں کی خیانت اور دل کے پوشیدہ رازوں تک سے بھی واقف ہے"۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ انسان کی نیت اور ارادہ بھی اس کی ذات پر اثر مرتب کر دیتا ہے۔ انسانی ذات، اعمالِ انسانی کے انہی اثرات و نقوش کو ساتھ لے کر موت کے بعد آگے بڑھ جاتی ہے[2] اسی کا نام انسان کا اعمالنامہ ہے۔ اگر انسانی ذات کو نشوونما دینے والے اعمال کا وزن زیادہ ہے تو وہ ارتقائی منزل میں آگے بڑھ جائے گی۔ اور اگر ان کا وزن کم ہے اور انسانی ذات کی کماحقہٗ نشوونما نہیں ہو سکی تو وہ آگے بڑھنے سے روک دی جائے گی۔ اس لئے جنت کے متعلق کہا کہ وَذٰلِكَ جَزَآءُ مَنْ تَزَكّٰى (۲۰/۷۶)۔ "جنت، انسان کے ان اعمال کا بدلہ ہے جن سے اس کی ذات کی نشوونما ہو چکی ہو"۔ واضح رہے کہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، ہر ذات اپنے اعمال کی آپ ذمہ دار ہوتی ہے۔ نہ کسی دوسرے کے کسی عمل کا اثر اس پر پڑ سکتا ہے، اور نہ ہی کوئی اس کو کسی قسم کا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ یہ اس کی انفرادیت کا فطری نتیجہ ہے۔ سورۃ الانعام میں ایک آیت ہے کہ

---

[1] مزید حوالوں کے لئے دیکھئے - (۱۱/۲۱ ؛ ۲۳/۱۰۳ ؛ ۳۹/۱۵)۔ انسانی ذات کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول میں، زیرِ تشریح آیات (۱/۱) ؛ (۲/۹) ؛ (۲/۹) میں بھی ذکر آ چکا ہے۔

[2] اس مقام پر آپ آیت (۳۹/۴۲) کو ایک بار پھر سامنے لائیے جسے پہلے درج کیا جا چکا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ نیند اور موت کی حالت میں نفسِ انسانی (ذات) کا عمل معطل ہو جاتا ہے۔ نیند کی صورت میں وہ (ذات) بیدار ہونے پر "واپس آ جاتی ہے"۔ لیکن موت کی صورت میں اسے روک لیا جاتا ہے۔ وہ اس دنیا میں واپس نہیں آتی۔ اس کی کارفرمائی کا میدان اگلی دنیا ہوتا ہے۔ اسی کو اُخروی حیات کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ جس طرح نیند کی حالت میں انسانی ذات مرتی نہیں، اسی طرح موت سے بھی وہ مرتی نہیں۔ مرتا صرف جسم ہے۔ تفصیل اس کی اپنے مقام پر آئے گی۔

جوں جوں نگہ بصیرت اس کی گہرائیوں میں اترتی ہے۔ انسان وجد میں آجاتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۭ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (۶/۹۵)۔

اس آیۂ جلیلہ کا مفہوم یہ ہے کہ "جن جن چیزوں کو تم یہاں "میری" یا "میرا" کہتے ہو، جن اپنوں کو تم اپنے یا میرے کہہ کر پکارتے ہو، ان سب کو یہیں چھوڑ کر، صرف اپنی ذات کو لیکر ہمارے ہاں آؤ گے۔ تمہارے مال و دولت، تمہارے اعزہ و اقربا، تمہارے رفقاء اور متعلقین، تمہارا جسم، یہ سب پیچھے رہ جائیں گے۔ اور تم صرف اپنی ذات کو لے کر ہماری عدالت میں حاضر ہو گے"۔ لفظ "فرادٰی" سے انسانی ذات کی انفرادیت کی طرف اشارہ ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے تاکید کی ہے کہ عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ (۵/۱۰۵)۔ "تم اپنی ذات کی حفاظت کرو۔ اگر تم میرے راستہ پر چلتے رہے تو کوئی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا"۔ یہ آیت بھی ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ دنیا میں دوسرے لوگ انسان کو نفع بھی پہنچا سکتے ہیں اور نقصان بھی، لیکن یہ نفع اور نقصان اس کی طبیعی زندگی تک محدود ہوتا ہے۔ جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے، کوئی دوسرا اُسے نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ اس کو نفع بھی انسان خود آپ پہنچاتا ہے اور اس کا نقصان بھی یہ خود ہی کرتا ہے۔ کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ اس مقام پر ہمیں جرمن فلاسفر نطشے کا وہ قول یاد آجاتا ہے جس میں اس نے کہا تھا کہ تم نے جو جرم میرے خلاف کیا ہے اُسے میں تو معاف کر دوں گا لیکن اس سے جو جرم تم نے اپنی ذات کے خلاف کیا ہے اُسے کون معاف کر سکتا ہے؟ قرآن کریم میں جو بار بار کہا گیا ہے: وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۲/۵۷)۔ "ہم کسی پر ظلم نہیں کرتے۔ انسان، اپنی ذات پر، خود آپ ظلم کرتا ہے"۔ تو اس کا بھی یہی مفہوم ہے۔ انسان اپنی ذات کو خود آپ نقصان پہنچاتا ہے، کوئی دوسرا ایسا نہیں کر سکتا۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں ذاتِ انسانی کے وہ خصائص و لزومات، جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے۔ اس کی بعض دیگر بنیادی خصوصیات ایسی ہیں جن کا ذکر ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا۔ قرآن کریم نے یہ کہا تھا کہ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳) "ہم انہیں عالمِ آفاق اور خود ان کی نفسیاتی دنیا میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے، تا آنکہ یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے کہ قرآن کا ہر دعویٰ حقیقت پر مبنی ہے"۔ عالمِ آفاق، یعنی خارجی کائنات کے نظم و ضبط کے متعلق، سائنس کی تحقیقات ایک عرصے سے جاری ہیں اور ان میں، ہمارے دور تک، کافی ترقی ہو چکی ہے۔ لیکن عالمِ انفس (یعنی انسانی ذات) کے متعلق تحقیق کا دروازہ حال ہی میں کھلا ہے۔ اسے علم النفس یا

سائیکالوجی (PSYCHOLOGY) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اگرچہ اس تحقیق نے ابھی تک، باقاعدہ سائنس کی حیثیت اختیار نہیں کی لیکن، بایں ہمہ، اس وقت تک بھی اس کے متعلق جو تحقیق ہوئی ہے اس سے قرآنی حقائق پر بڑی حد تک روشنی پڑتی ہے۔ اس تحقیق کی رُو سے

سائیکالوجی کی تحقیق

انسانی نفس کو دو شعبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک نفسِ شعوری (CONSCIOUS MIND) اور دوسرا نفسِ غیر شعوری یا نیم شعوری (SUB, OR UN-CONSCIOUS MIND) ان کا کہنا یہ ہے کہ نفسِ شعوری کا تعلق انسان کے محسوس اعمال سے ہے اور ان اعمال کی بھی صورت یہ ہے کہ عقلِ انسانی غلط اعمال کو بھی مزیّن اور مستحسن بنا کر دکھا دیتی، اور ان کے جواز کے لئے قسم قسم کے دلائل مہیا کر دیتی ہے، جس سے انسان اس فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس سے کوئی غلط کام (جرم) سرزد نہیں ہوا۔ لیکن ان جرائم کے اثرات، نیز ان ارادوں، آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشوں تک کے اثرات جو محسوس شکل اختیار نہیں کر پاتے، ان سب کو نفسِ غیر شعوری، اپنی تہوں میں چھپائے رکھتا ہے۔ اس دنیا میں ان اثرات کے نتائج نفسیاتی امراض کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔ اور علمِ تجزیۂ نفس کی رو سے ان کا علاج بھی کیا جاتا ہے، لیکن جہاں تک انسانی ذات کے مستقبل کا تعلق ہے، یہ حیاتِ آخرت میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ وہاں کی زندگی کے متعلق قرآن کریم نے ایک مقام پر کہا ہے: یَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ (۸۶/۹) "جب چھپے ہوتے راز بھی اُبھر کر سامنے آجائیں گے" دوسری جگہ ہے: لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا ۔ فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ ۔ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (۵۰/۲۲)۔ "تم اپنے اعمال کے نتائج سے بے خبر تھے۔ آج تمہاری نگاہوں سے پردے اُٹھا دیے گئے ہیں اور وہ اتنی تیز ہوگئی ہیں کہ کوئی شے بھی ان سے اوجھل نہیں رہ سکتی"۔ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ (۳۰/۵۷ نیز ۷۵/۱۵)۔ "دنیاوی زندگی میں انسان کی عقلِ بہانہ ساز مختلف قسم کے دلائل سے اس کی غلط کوشیوں کے لیے وجہِ جواز مہیا کر دیا کرتی ہے۔ اس دن اس کی وہ وجوہِ جواز (معذرتیں) اسے کچھ فائدہ نہ دے سکیں گی"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت وہ تمام نقوش و اثرات، جنہیں نفسِ غیر شعوری نے اپنی تہوں میں چھپا رکھا تھا اُبھر کر سامنے آجائیں گے (۸۸/۲)۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے چار الفاظ میں اس اعجاز و ایجاز کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس کی کماحقہٗ، داد کوئی علم النفس کا ماہر ہی دے سکتا ہے۔ کہا ہے: يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا ۔ وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۱۶/۱۱۱) "جس دن انسان کا ایک نفس اس کے دوسرے نفس سے جھگڑتا ہوا سامنے آئے گا۔ اس دن ہر انسانی ذات کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا۔ اور کسی پر کسی قسم کی کوئی زیادتی نہیں ہوگی"۔ غور کیجئے! آج سے چودہ سو سال پہلے انسان کے ان "دو" نفسوں کے باہمی مجادلہ کا ذکر کیا کسی مفکر کے بس کی بات تھی؟ ایسا انکشاف وحیِ خداوندی ہی کر سکتی تھی۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، اسی کو قرآن نے انسانی اعمالنامہ سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ سورۃ بنی اسرائیل میں کہا گیا ہے:

اعمال نامہ | وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَ نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا - اِقْرَاْ كِتٰبَكَ . كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (۱۷/۱۳-۱۴).

اس دنیا میں انسان کا اعمالنامہ اس کی گردن میں لٹکا رہتا ہے لیکن ایک لپٹی ہوئی شکل میں ظہورِ نتائج کے وقت، یہ لپٹا ہوا اعمالنامہ ایک کھلی کتاب کی شکل میں سامنے آجائے گا۔ اس وقت انسان سے کہا جائے گا کہ تو اپنا اعمال نامہ خود ہی پڑھ لے۔ تمہارا حساب کرنے کے لئے باہر کسی محاسب کے ...... بلانے کی ضرورت نہیں۔ آج تمہارا نفس خود اپنے خلاف محاسبہ کرنے کے لئے کافی ہے۔

اُس وقت نفسِ غیر شعوریہ اپنے تمام پوشیدہ نقوش کو ساتھ لئے، نفسِ شعوریہ کے سامنے کھڑا ہو جائے گا اور اس سے کہے گا کہ عقلِ فریب کار، جن غلط اعمال کو مزین بنا کر تمہیں دکھاتی رہی اور تم اس کے فریب میں آتے رہے، آج وہ اعمال بے نقاب ہو کر تمہارے سامنے ہیں۔ اگر تم میں جرأت ہے تو ان سے انکار کر دو۔ تم ایسا نہیں کر سکتے، کہ یہ وہ سلیٹ ہے جس پر لکھا ہوا ہر حرف، حقیقت اور صداقت پر مبنی ہے۔ اس پر کوئی خارجی عنصر اثر انداز نہیں ہوا۔ سورۃ القیٰمۃ میں ہے: بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۙ وَّ لَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ (۷۵/۱۴-۱۵) عقلِ فریب کار، انسان کے غلط اعمال کو ہزار مزین بنا کر اُسے دھوکے میں رکھے، اس کا نفس (غیر شعوریہ) اس پر پوری پوری نگاہ رکھتا ہے اور وہ اس دن اس کا اچھی طرح محاسبہ کرے گا۔

یہ ہیں نفسِ انسانی کے متعلق قرآنی شواہد۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، علم النفس (سائیکالوجی) ہنوز اپنے عہدِ طفولیت میں ہے۔ جب یہ ذرا اور آگے بڑھے گا تو زمانہ دیکھے گا کہ اس کی تحقیقات کس طرح ان حقائق کی بھی تائید کرتی چلی جاتی ہیں، جو ابھی اس کے دائرۂ جستجو اور تفتیش سے باہر ہیں۔ یہ حضرات، انسانی نفس (SELF) کی حیاتِ بعد الممات (SURVIVAL) کے امکان کے تو قائل ہو چکے ہیں۔ وقت آئے گا کہ یہ اس کی بقا (IMMORTALITY) کے بھی انہی معنوں میں معترف ہو جائیں گے، جن معنوں میں قرآن کریم نے اسے پیش کیا ہے۔ [1] (SURVIVAL) اور (IMMORTALITY) میں کیا فرق

---

[1] اس باب میں ڈاکٹر (C.G. JUNG) کے تجربات بڑے بصیرت افروز ہیں۔ دیکھئے اس کی کتاب (MEMORIES, DREAMS REFLECTIONS) نیز (DEATH AND RE-BIRTH OF PSYCHOLOGY BY IRA PROGOFF)

ہے۔ اس کی وضاحت اس مقام پر کی جائے گی جہاں حیات بعد الممات کا تفصیلی تذکرہ آئے گا۔ سردست اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ قرآن کریم نے، اہلِ جنت اور اہلِ جہنم دونوں کے بقائے نفس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اہلِ جہنم کا یہ کہکر کہ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی (۲۰/۷۴) نیز (۸۷/۱۳)۔ "اس میں انہیں نہ زندگی نصیب ہوگی، نہ موت ہی آئے گی۔" یہ محض ل (SURVIVAL) ہوگا۔ ان کے برعکس اہلِ جنت کے متعلق کہا کہ: لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰی (۴۴/۵۶)۔ "پہلی موت (جو دنیا میں آ گئی، اس کے بعد) وہاں ان پر موت وارد نہیں ہوگی۔" اسے (IMMORTALITY) کہا جائے گا۔ یعنی بقائے دوام۔

اس کے ساتھ ہی اتنا اور سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ انسانی ذات کا بقائے دوام، خدا کے "بقائے دوام" جیسا نہیں خدا کی بقا فنا آشنا نہیں۔ لیکن یہ خصوصیت صرف لامحدود ذات (INFINITE) کی ہوسکتی ہے، جو خدا کے سوا کوئی نہیں۔ اُسے ہم ابدیت (ETERNITY) سے تعبیر کریں گے۔ انسانی ذات بہر حال محدود (FINITE) ہے۔ اس لئے یہ لاانتہا نہیں ہوسکتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی جائے گی۔ (جنت بھی اس کا منتہیٰ نہیں۔ راستے کی منزل ہے) لیکن اس کا بہر حال انجام ہوگا۔ وہ انجام کیا ہوگا، ہم اپنے ادراک کی موجودہ سطح پر اسے نہیں سمجھ سکتے۔ شاید وہاں جا کر یہ راز بھی کھل جائے۔

یہ ہیں انسانی ذات (نفس) کے متعلق، قرآنی شواہد کے چند گوشے۔

انسانی فطرت

انسانی ذات کے تذکرہ کے بعد، ہم ان چند ایک نظریات کا سامنے لانا ضروری سمجھتے ہیں، جو ہمارے ہاں شدید قسم کی غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موجب بنے چلے آرہے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ گمراہ کُن نظریہ "انسانی فطرت" (HUMAN NATURE) کا ہے۔ فکرِ انسانی کی بعض غلط اندیشیاں ایسی ہیں جن کے نتائج اس طرح عالمگیر ہو جاتے ہیں کہ وہ زمان اور مکان کی حدود سے بھی غیر متاثر رہتے ہیں۔ انہی میں ایک غلط نگہی انسانی فطرت کا نظریہ ہے۔ تاریخی اعتبار سے، انسانی فکر کا آغاز یونان کے فلاسفرز سے ہوتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ یہ نظریہ ان کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ انہوں نے انسان کی جو تعریف (DEFINITION) متعین کی تو اس کی بنیاد یہی نظریہ تھا۔ ان میں سے بعض نے کہا کہ "انسان، صاحبِ شعور حیوان ہے"، کسی نے کہا "انسان، مدنی الطبع حیوان ہے"۔ کسی نے کہا کہ "انسان وہ حیوان ہے جو اوزار بناتا ہے"۔ وغیرہ وغیرہ۔ اِن (DEFINITIONS) میں تو وقتاً فوقتاً اختلاف ہوتا رہا۔ لیکن فطرتِ انسانی کا بنیادی نظریہ مسلسل آگے چلا آیا۔ ہر مفکر نے انسانی فطرت کا نظریہ پیش کیا لیکن یہ کوئی نہ بتا سکا کہ انسانی

فطرت بالآخر ہے کیا؟ حیرت ہے کہ یہ اتنے بڑے بڑے مفکر اس دو اڑھائی ہزار سال کے عرصہ میں ان چند مبادیات پر بھی غور نہ کر سکے، جن سے یہ مسئلہ صاف ہو سکتا تھا۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ فطرت کسے کہتے ہیں؟ پانی کو اگر علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا جائے تو وہ نشیب کی طرف بہتا ہے، ہر برتن کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایک خاص درجہ حرارت پر جاکر منجمد ہو جاتا ہے اور دوسری طرف، بھاپ بن کر اڑ جاتا ہے۔ یہ خصوصیات پانی کی فطرت کہلائیں گی۔ یا مثلاً بکری گھاس کھاتی ہے، گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ شیر گوشت کھاتا ہے، کسی دوسری غذا سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسے بکری اور شیر کی فطرت کہا جائے گا۔ ان مثالوں سے ہم نے دیکھا کہ:-

فطرت کا مفہوم

(۱) فطرت اس بنیادی خصوصیت کو کہتے ہیں جو غیر متبدل ہو۔ اور

(۲) یہ فطرت اس نوع کے ہر فرد میں یکساں طور پر پائی جائے گی۔ یعنی بکری دنیا میں کہیں بھی ہو، اور کسی زمانے میں بھی ہو، وہ گھاس کھانے والی ہوگی۔ اسی طرح شیر بھی کسی زمانے میں ہو، اور کسی ملک میں، وہ گوشت خور ہوگا۔ اور یہ خصوصیات ہر بکری اور ہر شیر میں یکساں ہوں گی۔

شق (۱) سے ظاہر ہے کہ فطرت مجبور اشیاء کی ہوتی ہے جو اسے بدلنے پر قادر نہیں ہوتیں۔ لہٰذا صاحبِ اختیار و ارادہ کی کوئی فطرت نہیں ہو سکتی۔ اور انسان کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صاحبِ اختیار و ارادہ ہے۔

شق (۲) سے یہ واضح ہے کہ ہر نوع کی فطرت، اس نوع کے ہر فرد میں یکساں طور پر پائی جائے گی۔ اور جہاں تک انسان کا تعلق ہے، مختلف زمانوں کے انسان تو ایک طرف، کسی ایک زمانے میں بھی، نوعِ انسان کا ایک فرد، دوسرے فرد سے نہیں ملتا۔ ان کی شکل و شباہت یا انگلیوں کے نشانات کی بات نہیں، اگرچہ وہ بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے، ان کی سیرت و کردار ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان مبادیات سے یہ واضح ہے کہ انسان (MAN) کی کوئی فطرت نہیں (جبلّی طور پر، انسانوں میں جو حیوانی خصوصیات پائی جاتی ہیں، یا وراثت اور ماحول کا جو اثر، انسانی بچوں پر مرتب ہوتا ہے، اس کا ذکر آگے چل کر ابلیس کے عنوان کے تابع ملے گا) ایسے بچے پائے گئے ہیں جنہیں ان کی پیدائش کے وقت ہی کوئی جنگلی جانور اٹھا کرلے گیا اور انہوں نے، انہی جانوروں میں، جنگل میں پرورش پائی۔ بعد میں دیکھا گیا کہ ان میں کوئی بھی ایسی بات نہیں تھی جو انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ ان کی خُوبُو انہی حیوانوں جیسی تھی جن میں انہوں نے پرورش پائی تھی۔ اس کے برعکس، جانوروں کو کسی ماحول میں بھی رکھا جائے، وہ اپنی فطرت پر قائم رہتے ہیں۔ بکری اور کتے کی پرورش (ایک ہی گھر میں کیوں نہ ہو۔ بکری، بکری.... رہتی ہے اور کتا، کتا۔ یہ اس لئے کہ ان کی فطرت الگ الگ ہوتی ہے، جو غیر متبدل ہے۔

اِنسان کی کوئی فطرت نہیں

کوئی دو اڑھائی ہزار سال کے عرصہ کے بعد اب کہیں جا کر علم النفس کے ماہرین اِس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسان کی کوئی فطرت نہیں ۔ (ERICH FROMM) نے اپنے عمر بھر کے تجارب کے بعد اس غلط نظریہ کی بڑے محققانہ انداز سے تردید کی ہے۔ [1] اس نے بڑے نشترانہ انداز میں کہا ہے کہ یہ باطل نظریہ اس لئے مسلسل اور متواتر چلا نہیں آیا کہ علمی انداز سے اس کی تردید نہیں ہو سکتی تھی ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ انسان کی بہت سی تخریب کاریوں کے لئے سپر کا کام دیتا تھا۔ مثلاً ارسطو نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ غلامی، انسانی فطرت کا تقاضہ ہے اور یہی دلیل اٹھارویں صدی تک غلامی کے جواز میں دی جاتی رہی۔ یا مثلاً نظامِ سرمایہ داری کے جواز میں یہ کہا جاتا رہا کہ ذاتی ملکیت اور مفادِ خویش یا خود غرضی انسانی فطرت کا تقاضہ ہے ۔ اس لئے کوئی ایسا نظام انسانی فطرت کے مطابق نہیں کہلا سکتا جس کی بنیاد ان جذبات پر نہ ہو ۔

اِنسانی فکر نے تو یہ ٹھوکریں کھائی ہی تھیں، کہ اس کے پاس ایسا سرچشمۂ علم نہیں تھا جو غلطیوں سے منزہ ہو۔ لیکن حیرت اندر حیرت کہ خود مسلمانوں نے بھی اس نظریہ کو اختیار کر لیا ۔ اور یہیں تک اکتفا نہیں کیا؛ اسے بڑھا چڑھا کر یہاں تک لے گئے کہ عقیدہ یہ وضع کر لیا کہ :-

(۱) اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے ۔ [2]

(۲) لہٰذا انسان کی فطرت، عین خدا کی فطرت ہے ۔

(۳) اسلام دینِ فطرت ہے، یعنی عین انسانی فطرت کے مطابق ۔

(۴) لہٰذا کوئی کام، جو انسانی فطرت کے خلاف ہو وہ اسلام کے خلاف ہے ۔

(۵) ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے ۔ اگر اُسے ماحول کے اثرات سے غیر متاثر رکھا جائے تو اس کی زندگی اِسلام کے مطابق ہو گی ۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے اس کی کتاب (THE ANATOMY OF HUMAN DESTRUCTIVENESS. P. ۲۴۶-۲۴۸) آگے چل کر اس کتاب کے حوالے اکثر دیئے جائیں گے ۔ ان مقامات پر ہم صرف (ERICH FROMM) لکھیں گے ۔ اس سے مراد اسکی یہی کتاب ہوگی۔

[2] (محرف) تورات نے کہا تھا کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا ۔ ہم نے اس سے یہ تصور لے کر، یہ عقیدہ وضع کر لیا کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے ۔

ہمارے ہاں ان نظریات کو مسلمات کی حیثیت سے مانا جاتا ہے اور اس شدت کے ساتھ مانا کہ یہ گویا خود اسلام کے بنیادی نظریات ہیں۔ اس کی سند میں قرآن کریم کی ایک آیت پیش کر دی جاتی ہے جس میں کہا گیا ہے:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۔ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰/۳۰)

اللہ کی وہ فطرت، جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا۔ اللہ کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہ دینِ قیّم (اسلام) ہے۔ لیکن اکثر لوگ اسے نہیں جانتے۔

اس آیت میں جو لفظ "فطرت" آیا ہے اس کا یہ مفہوم (NATURE) یکسر غیر قرآنی ہے۔ قرآن کریم نے اس لفظ کو ان معانی میں استعمال ہی نہیں کیا جن معانی میں یہ آج مستعمل ہے۔ قرآن کریم تو ایک طرف، زمانۂ نزولِ قرآن کی عربی مبین میں بھی یہ لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں ہوتا تھا۔ بعد میں جب (عباسیوں کے زمانہ میں) یونانی فکر کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا تو ان کے ہاں کے لفظ (NATURE) کے لئے "فِطرت" کی اصطلاح وضع کی گئی۔ وہاں سے یہ لفظ نیچر کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اور پھر اسی خود وضع کردہ اصطلاح کے مطابق، قرآن کریم کی مندرجہ بالا آیت کی پہلے تفسیر کی گئی اور پھر دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔ یوں یہ باطل تصور نہ صرف یہ کہ ہمارے ہاں عام ہوا بلکہ اسلام کا بنیادی نظریہ قرار پا گیا۔

اس لفظ کے مادہ (ف۔ ط۔ ر) کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول (زیرِ تشریح آیت ۱/۲۱) میں تفصیل سے بتایا جا چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۴/۱۰) کہا ہے۔ فَطَرَ کے معنی ہیں کسی شے کو عدم سے وجود میں لانا۔ اسے پہلی بار پیدا کرنا۔ لہٰذا "فطرت" کے معنی ہوئے خدا کا وہ طریق (یا قانونِ) تخلیق، جس کی رُو سے وہ کسی شے کو عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ "فَطَرَ" کے ان معانی کی روشنی میں آیت (۳۰/۳۰) کا صاف مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بھی اپنے اُسی قانون و طریقِ تخلیق کے مطابق عدم سے وجود میں لایا ہے جس طریق کے مطابق اس نے جملہ کائنات کو پیدا کیا۔ تخلیقِ انسانی کے لئے کوئی دوسرا طریق اختیار نہیں کیا گیا۔ خدا کا یہ تخلیقی نظام بڑا محکم ہے، جس میں کبھی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ لہٰذا جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انسانوں کو اس نے کسی دوسرے طریق سے پیدا کیا (یعنی مثلاً اس نے مٹی کا ایک پُتلا بنایا۔ اس کی پسلی چیر کر اس میں سے اس کی بیوی نکالی اور اس سے نسلِ انسانی کا سلسلہ آگے بڑھا) وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ حقیقت سے واقف نہیں۔ چنانچہ اس نے خود انسانوں کے متعلق کہا ہے: قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (۱۷/۵۱) "اللہ وہ ہے جو تمہیں پہلی بار عدم سے وجود میں لایا" اس کی تشریح میں دوسری جگہ کہا: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا (۷۶/۱) کیا انسان پر وہ زمانہ نہیں گزرا، جب یہ کوئی قابلِ ذکر

شے نہیں تھا" بلکہ اَوَلَا یَذْکُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ یَكُ شَیْئًا (۱۹/۶۷) "کیا انسان کو یاد نہیں کہ ہم نے اُسے پیدا کیا درانحالیکہ یہ کوئی شے نہیں تھا" یہ ہے فطرت اللہ کا مفہوم۔ یعنی خدا کا قانونِ تخلیق، جس کی رو سے وہ دیگر مخلوقات کی طرح انسانوں کو بھی عدم سے وجود میں لایا۔ خود آیت (۳۰/۳۰) لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ میں "خلق اللہ" کے الفاظ "فطرت اللہ" کی تشریح کر رہے ہیں۔ یعنی قانونِ تخلیق۔

انسانی خصوصیات

ہم ذرا آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ انسان کو خدا نے اپنی فطرت پر پیدا کیا، اور ہم قرآن کریم میں دیکھتے ہیں کہ انسان کے متعلق خدا نے یہ کچھ کہا ہے:۔ (۱) وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا (۴/۲۸)۔ "انسان کو بڑا کمزور پیدا کیا گیا ہے"۔ (۲) اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (۱۴/۳۴)۔ "انسان ظالم بھی واقع ہوا ہے اور کفر پسند، ناشکر گزار بھی"۔ (۳) وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا (۱۷/۶۷) (نیز ۲۲/۶۶؛ ۴۲/۴۸؛ ۴۳/۱۵؛ ۸۰/۱۷) یعنی "انسان بڑا ہی ناشکر گزار ہے"۔ (۴) ناشکر گزار بھی بے حد جھگڑالو بھی — هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ (۱۶/۴)۔ "واضح طور پر جھگڑالو"۔ (۵) وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا (۱۸/۵۴)۔ "انسان اکثر معاملات میں خواہ مخواہ جھگڑے نکالتا رہتا ہے"۔ (نیز دیکھئے ۳۶/۷۷؛ ۲۲/۳)۔ (۶) وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا (۱۷/۱۱)۔ "انسان بڑا جلد باز واقع ہوا ہے"۔ (نیز ۲۱/۳۷)۔ (۷) وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا (۱۷/۱۰۰)۔ "انسان بڑا خود غرض بخیل اور تنگ نظر واقع ہوا ہے"۔ (۸) کیفیت اس کی یہ ہے کہ یہ بے صبرا بھی ہے اور ایسا لالچی کہ اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا — اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (۷۰/۱۹)۔ (۹) اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (۱۰۰/۶)۔ "یہ نعمائے خداوندی کی ناقدر شناسی کرتا ہے اور اس کی ہوس کی کوئی حد اور کنارا ہی نہیں"۔ (۱۰) اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی (۹۶/۶) "یہ بڑا سرکش واقع ہوا ہے"۔ (۱۱) سرکش بھی اور اس کے ساتھ ظالم اور جاہل بھی — اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (۳۳/۷۲)۔

یہ ہیں انسان کی موٹی موٹی خصوصیات، جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے۔ یہ تو ہم آگے چل کر بیان کریں گے کہ ان سے حقیقی مراد کیا ہے۔ اس مقام پر آپ اس پر غور کیجئے کہ اگر عقیدہ یہ ہو کہ خدا نے انسان کو اپنی "فطرت" پر پیدا کیا ہے اور انسانی فطرت کی، قرآن نے یہ خصوصیات بتائی ہوں۔ تو سوچئے کہ اس سے خود خدا کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوگا؟ کیا خدا کی فطرت (معاذ اللہ) انہی خصوصیات کی حامل ہوگی؟ لہذا یہ نظریہ یا عقیدہ بالبداہت غیر قرآنی اور باطل ہے۔ کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا۔ یا انسان کی کوئی فطرت بھی ہے! علاوہ ازیں، ہم دیکھ چکے ہیں کہ فطرت ان بنیادی خصوصیات کو کہا جاتا ہے جو غیر متبدل ہوں۔ اگر انسانی فطرت کے نظریہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر خدا کی طرف سے سلسلۂ ہدایت اور حضراتِ انبیائے کرام کی بعثت عبث ہو کر رہ جاتی ہے، کیونکہ جب فطری خصوصیات

کو بدلا ہی نہیں جا سکتا تو پھر اس تمام سلسلۂ رشد و ہدایت سے حاصل کیا ہوگا؟ ۔ کہا یہ جاتا ہے کہ انسان اپنی فطرت کی خلاف ورزی کرتا ہے اس لئے حضراتِ انبیاءؑ کرام مبعوث ہوتے رہے کہ وہ انسان کو اس کی فطرت کے مطابق چلائیں۔ یہ تصور پھر باطل ہے۔ کوئی شے اپنی فطرت کی خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتی۔ ہر نوع اپنی فطرت پر چلنے کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہے اور چونکہ وہ اپنی فطرت کی خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتی، اس لئے ان کے لیے نہ خارجی طور پر ہدایتِ خداوندی کی ضرورت ہے نہ ہادیانِ طریقت (انبیائؑ و رسلؑ) کی بعثت کی حاجت۔ بکریوں کو کوئی رسول آکر نہیں بتاتا کہ تمہارے لئے گھاس حلال ہے اور گوشت حرام۔ یہ چیز ان کی فطرت میں داخل ہے جس کی وہ خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتیں۔ جس خصوصیت کی خلاف ورزی کی جا سکے اُسے فطرت کہا ہی نہیں جا سکتا۔

ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ جس نوع کی کوئی فطرت ہو، اس کے تمام افراد اُس فطرت کے مطابق چلتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اس نوع کے افراد میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر کہا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو تمام انسانوں کو ایسا پیدا کر دیتے کہ ان میں کوئی اختلاف نہ ہوتا، لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ یہ ہماری مشیت کے خلاف تھا۔ سورۃ ھود میں ہے: وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ (۱۱/۱۱۸) "اگر تیرے رب کی مشیت میں ہوتا تو وہ تمام نوعِ انسان کو ایک گروہ کی طرح پیدا کر دیتا اور وہ آپس میں اختلاف نہ کرتے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ لہٰذا یہ آپس میں اختلاف کرتے ہیں۔ یہ اختلافات ہدایتِ خداوندی کی رو سے مٹ سکتے ہیں"۔ دوسری جگہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا۔ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۱۰/۹۹)۔ "اگر مشیتِ خداوندی میں ایسا ہوتا تو کرۂ ارض پر بسنے والے تمام انسان ایک ہی راستہ پر چلتے لیکن خدا نے ایسا نہیں کیا۔ اے رسول! کیا تو... انسانوں کو مجبور کرنا چاہتا ہے کہ وہ ایمان کی راہ اختیار کرلیں"؟ ان آیات سے بھی واضح ہے کہ انسان کی کوئی فطرت نہیں جس پر چلنے کے لئے اُسے مجبور پیدا کیا گیا ہو۔ ہر انسانی بچہ، ایک صاف اور سادہ لوح لے کر پیدا ہوتا ہے جس پر وہ جس قسم کے نقوش مرتسم کرنا چاہے، کرسکتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ـــــ

تو اپنی سرنوشت خود اپنے قلم سے لکھ ✽ خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

ـــــ وحیٔ خداوندی کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان اُس سلیٹ (اپنی ذات) پر اپنے اختیار و ارادہ سے، وحی کی راہنمائی میں صحیح خطوط و نقوش مرتسم کرلے۔ (ERICH FROMM) اپنی اس کتاب میں، جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، لکھتا ہے:

اب علم الانسان کے ماہرین کی اکثریت نے یہ انکشاف کیا ہے کہ انسان ایک قرطاسِ ابیض

(سفید کاغذ) بلکہ پیدا ہوتا ہے جس پر ہر کلچر اپنا متن تحریر کر دیتا ہے۔ (ص ۲۴۷)

خیر و شر کی تمیز

یہیں سے ہم ایک اور غلط فہمی کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ عقیدہ بھی ہے کہ خیر و شر کی تمیز خود انسان کے اندر موجود ہے۔ یہ عقیدہ بھی بالبداہت باطل اور قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ اگر خیر و شر کی تمیز انسان کے اندر ہوتی تو اُسے وحی کی راہنمائی کی قطعاً ضرورت لاحق نہ ہوتی۔ خیر و شر کی تمیز بکریوں کے اندر ہے، شیروں کے اندر ہے۔ جو چیز ان کے لئے شر (موجبِ نقصان) ہے، وہ کبھی اس کی طرف رخ نہیں کرتے۔ اس سے دُور بھاگتے ہیں۔ اور اس کے لئے انہیں کسی خارجی ہدایت یا تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر اس قسم کی صلاحیت انسان کے اندر ہوتی تو اُسے بھی وحی کی ہدایت کی ضرورت لاحق نہ ہوتی۔ اس غلط عقیدہ کے لئے بھی قرآن کریم کی ایک آیت کا سہارا لیا جاتا ہے، جس کے ایک گوشے کو ہم پہلے بھی سامنے لا چکے ہیں۔ یعنی سورۃ الشمس کی یہ آیت کہ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (۹۱/۸)۔ "خدا نے فسق و فجور اور تقویٰ کو نفسِ انسانی میں الہام کر دیا"[1] اور مطلب اس سے یہ لیا جاتا ہے کہ گناہ اور ثواب کے کاموں کی تمیز خود نفسِ انسانی کو الہام کر دی گئی ہے۔ جو کچھ "فطرتِ انسانی" کے سلسلہ میں لکھا جا چکا ہے اس کی روشنی میں اس عقیدہ کے ابطال کے لئے کسی دلیل اور سند کی ضرورت نہیں۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ نفسِ انسانی میں دونوں امکانات اور صلاحیتیں رکھدی گئی ہیں (POSSIBILITIES)۔ یعنی اگر وہ چاہے تو غلط روش اختیار کر کے منتشر ہو جائے (DIS-INTEGRATE)۔ اور چاہے تو صحیح روش اختیار کر کے اس سے بچ جائے (فُجُور کے معنی پھٹ جانا، ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ہے) اور آیہ زیرِ نظر میں "فجورہا" اور "تقوٰہا" کی ضمیر (ھا) اس کی طرف واضح اشارہ ہے ــــ یعنی انسانی نفس کا فجور اور تقویٰ اس کے اندر رکھ دیا گیا ہے۔ یہ ان دونوں ممکنات کی حامل ہے۔

---

[1] ہمارے ہاں کشف و الہام کے الفاظ بھی عام ہیں جن سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ خدا اپنے برگزیدہ بندوں (اولیاء اللہ یا صوفیاء) کو بذریعہ الہام، براہِ راست علم عطا کر دیتا ہے۔ یہ عقیدہ بھی قرآن کے خلاف اور ختمِ نبوت کے منافی ہے۔ خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملنے کا ذریعہ فقط ایک تھا جسے وحی کہکر پکارا گیا ہے اور وحی کا سلسلہ حضورؐ رسالتمآب پر ختم ہو چکا ہے۔ اس موضوع پر مطالب الفرقان جلد اول زیرِ آیت (۲/۴) (۲/۴) گفتگو ہو چکی ہے۔

اس ضمن میں سورۃ الاعراف کی آیت (۷/۱۷۲) پیش کی جاتی ہے، یعنی یہ آیت :-

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ڔ شَهِدْنَا ڔ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ (۷/۱۷۲)۔

اور اس سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ "ہستی باری تعالیٰ کا اقرار ہر انسان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیا گیا ہے"۔ یہ عقیدہ بھی بالبداہت غلط ہے۔ اس آیت کے صحیح مفہوم کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول (زیر آیت ۷/۱۷۲ ص ۲۹۳) میں تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمالیجئے۔

حملِ امانت

ایک اور غلط فہمی سورۃ احزاب کی آیت (۳۳/۷۲) کے غلط مفہوم سے پیدا کی جاتی ہے۔ آیت حسبِ ذیل ہے :-

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا - (۳۳/۷۲)۔

اس کا ترجمہ حسب ذیل کیا جاتا ہے :-

ہم نے اپنی امانت زمین اور آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی، لیکن انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ وہ اس ذمہ داری سے ڈر گئے، لیکن انسان نے اُسے اُٹھا لیا۔ یہ بڑا ہی ظالم اور جاہل واقع ہوا ہے۔

"امانت سے کیا مراد ہے" اسے تو ہم ذرا آگے چل کر واضح کریں گے۔ یہاں اتنی بات دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی شئے کو اُٹھانے کے لئے زمین، آسمان اور پہاڑوں سے کہا اور انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ آپ غور کیجئے کہ یہ تصور کس قدر باطل ہے۔ اشیائے کائنات کے متعلق تو قرآن کریم نے متعدد مقامات پر واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ وہ سب احکامِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (۱۶/۴۹)۔ ان میں سے کسی میں مجالِ سرکشی نہیں، یارائے انکار نہیں۔ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۱۶/۴۹) لہٰذا یہ سمجھنا کہ انہوں نے خدا کے کسی حکم کی اطاعت سے انکار کر دیا، قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔

اب اس سے آگے بڑھیئے۔ خدا نے اپنی امانت کو زمین، آسمان، پہاڑوں کے سامنے پیش کیا اور انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے (معاذ اللہ صد بار معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ کی کس قدر سبکی ہوئی ہوگی؟ اسی احساس کے ماتحت انسان آگے بڑھا اور کہا کہ لائیے! اسے میں اٹھائے لیتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ انسان کی اس پیشکش پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے شاباش ملنی چاہیئے تھی۔ لیکن، اس کی بجائے اللہ تعالیٰ نے یہ کہا کہ یہ بڑا ہی ظالم اور جاہل تھا۔ آپ دیکھئے کہ اس سے خدا کے متعلق کیا تصور سامنے آتا ہے!!

یہ ساری ٹیڑھی دیوار "حمل امانت" کے غلط مفہوم کی بنیاد پر اٹھائی گئی ہے۔ ان الفاظ کے معنے لئے جاتے ہیں: "امانت کا اٹھانا" حالانکہ عربی لغت کی رُو سے "حمل امانت" کے معنی ہیں "امانت میں خیانت کرنا"۔[1] ان معانی کی رُو سے اس آیۂ جلیلہ کا مفہوم یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے اشیائے کائنات کے ذمے کچھ فرائض عائد کئے تو وہ نہایت دیانتداری سے بے چون و چرا انہیں ادا کرنے لگے۔ انہوں نے اس امانت میں کوئی خیانت نہ کی۔ وہ ایسا کرنے سے خائف رہتے ہیں (۱۶/۵۰)۔ لیکن انسان کی یہ حالت ہے کہ جو فرائض اس کے ذمے عائد کئے گئے ہیں، یہ ان کی بجا آوری میں خیانت کرتا ہے۔ حالانکہ ایسا کرنے میں کسی اور کا کچھ نہیں بگڑتا، خود اسی کا نقصان ہوتا ہے — یہ اس کی کتنی بڑی جہالت ہے جس کی وجہ سے یہ خود اپنے آپ پر اس قدر ظلم اور زیادتی کرتا ہے"۔ (اس سلسلہ میں آیات ۱۴/۳۴ ، ۱۱/۲۱ ، ۱۵/۱۳ بھی ملاحظہ کیجئے)۔

دیگر انسانی خصوصیات

یہ بتایا جا چکا ہے کہ اختیار و ارادہ کی قوت یا صلاحیت انسان اور دیگر حیوانات میں خطِ امتیاز کھینچتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور صلاحیتیں بھی ہیں جو اسے دیگر حیوانات سے متمیز اور ممتاز کرتی ہیں۔ مثلاً "قوتِ گویائی (عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۵۵/۴)۔ تحریر کی صلاحیت۔ (عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۹۶/۴)۔ حصولِ علم کی استعداد۔ (عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۹۶/۵)۔ انسان میں یہ صلاحیتیں مضمر طور پر رکھ دی گئی ہیں۔ جنہیں وہ اپنی محنت اور کاوش سے بروئے کار لائے گا۔ یعنی یہ نہیں کہ ہر انسانی بچہ پیدائش کے ساتھ ہی عالم و فاضل اور صاحبِ قلم و لسان ہوتا ہے، وہ تو بالکل کورا ہوتا ہے۔ البتہ اس میں ایسا بننے کی صلاحیت ہوتی ہے جس کے لئے محنت اور کاوش درکار ہوتی ہے۔ اسی لئے کہا ہے کہ

---

[1] تفصیل کیلئے دیکھئے میری "لغات القرآن"۔

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳/۳۹)۔ "انسان وہی کچھ حاصل کرسکتا ہے جس کے لئے وہ محنت کرے۔"

اشرف المخلوقات

ہمارے ہاں انسان کو، اشرف المخلوقات بھی کہا جاتا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ کرۂ ارض پر جو مخلوق محسوس طور پر نظر آتی ہے، اس کے مقابلہ میں یہ واقعی اشرف ہے لیکن خدا کی مخلوق کرۂ ارض تک ہی تو محدود نہیں، نہ معلوم خدا کی اس ناپیداکنار کائنات میں اور بھی کس کس قسم کی مخلوق موجود ہے جس کی ہمیں ہنوز کچھ واقفیت نہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے انسان کے متعلق کہا ہے: وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا (۱۷/۷۰)۔ "ہم نے انسان کو اپنی اکثر مخلوق سے افضل پیدا کیا ہے۔" خدا نے "اکثر مخلوق سے افضل" کہا ہے۔ "تمام مخلوق سے افضل" نہیں۔ اس لئے یہ ..... اشرف المخلوقات نہیں کہلا سکتا۔ قرآن کریم میں تو یہاں تک بھی آیا ہے: لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۴۰/۵۷)۔ "ارض و سما کی تخلیق انسانی تخلیق کے مقابلہ میں کہیں بڑی تھی۔ لیکن اکثر لوگ اس کا علم نہیں رکھتے۔" اس حقیقت کی تفسیر کوئی بلند پایہ سائنسدان، یا سائنسدانوں کی جماعت پیش کرسکتی ہے۔ سطحی طور پر تو ہمارا خیال اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ انسانی تخلیق کے سلسلہ میں قرآن نے کہا ہے کہ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ (۳۲/۷)۔ "انسان کی پیدائش کا آغاز بے جان مادہ سے ہوا۔" لیکن بے جان مادہ کے متعلق کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس طرح وجود میں آگیا۔

اِنسان اور بشر دو ایک ضمنی گوشے اور بھی۔ قرآن کریم نے انسان اور بشر کے الفاظ مرادف معنوں میں بھی استعمال کئے ہیں۔ مثلاً سورۃ الحجر میں پہلے کہا: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ (۱۵/۲۶)۔ اور پھر اسی کو اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا (۱۵/۲۸)؛ (۱۵/۳۳) بھی کہا۔

قرآنِ کریم میں "جن و انس"، کے الفاظ بھی اکٹھے آتے ہیں۔ (مثلاً ۶/۱۳۱؛ دیگر مقامات) انسانی آبادیاں، قدیم الایام سے دو حصوں میں منقسم چلی آرہی ہیں۔ ایک آبادی وہ جو شہری یا تمدنی زندگی بسر کرتی ہے اور دوسری وہ، جو

جن و انس جنگلوں، صحراؤں میں خانہ بدوشوں کی طرح رہتی ہے۔ اب تو اس ثانی الذکر آبادی کی تعداد گھٹتی چلی جارہی ہے اور مواصلات کے عام ہو جانے سے ان میں باہمی میل جول بھی بڑھ رہا ہے۔ لیکن، پہلے

یہ آبادی بڑی کثیر التعداد ہوتی تھی اور رسوم و رواج اور بود و ماند کے طور طریقوں میں شہری آبادی سے بالکل مختلف۔ عربوں کے ہاں یہ دونوں آبادیاں خصوصیت سے ایک دوسرے سے متمیز تھیں اور ان کے رہنے سہنے کے طریقے، رسوم و عادات، معاشرتی و معاشی انداز بالکل جداگانہ۔ ان کے ہاں اَلْاِنْسُ اس قبیلہ کو کہتے تھے، جو کسی ایک جگہ مقیم ہو یعنی شہری آبادی اور اَلْجِنُّ ان لوگوں کو جو ان شہریوں کی نگاہوں سے اوجھل (دور) صحرانشینی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ دونوں گروہ انسانوں ہی پر مشتمل تھے۔ انہی کو قرآن کریم نے "جن و انس" کہکر پکارا ہے۔

النّاس قرآنِ کریم میں 'النّاس' کا لفظ نوعِ انسانی کے لئے آیا ہے۔ جیسے كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳؛ ۱۰/۱۹)۔ ان آیات میں قرآن نے نوعِ انسان کو امتِ واحدہ (ایک عالمگیر برادری) کہکر پکارا ہے۔ اور اسی اعتبار سے دوسری جگہ کہا ہے کہ جس طرح تمہارا آغاز ایک وحدت کی شکل میں تھا اسی طرح تمہاری نشاۃ ثانیہ بھی وحدت کا انداز لئے ہوگی۔ سورۃ لقمٰن میں ہے: مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۳۱/۲۸)۔ "تمہاری تخلیق اور بعثت نفسِ واحدہ کی طرح ہے"۔

قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ کسی انسان کو اس زمین پر دوام اور بقا حاصل نہیں۔ طبیعی موت ہر ایک کے لئے ہے۔ (۲۱/۳۵؛ ۲۹/۵۷)۔

اِبلیس

اب ہم اپنے اس تحقیقاتی سفر کی مشکل ترین وادی میں داخل ہوتے ہیں۔ چنگیز اور ہلاکو بھی انسان تھے جن کی وحشت، درندگی، خونخواریت، ظلم اور تشدد کے تصور سے آج بھی روح کانپ اٹھتی ہے۔ دوسری طرف حاتم طائی بھی انسان تھا جس نے اپنی ساری عمر نوعِ انسان کی بے مزد و معاوضہ خدمت اور غمگساری میں گزار دی۔ سوال یہ ہے کہ ایک ہی نوع کے مختلف افراد میں یہ "بُعد المشرقین" کیسا؟ اس سے ظاہر ہے کہ نہ تو ظلم اور تشدد ہی انسان کی فطرت میں داخل ہے ـــــ ایسا ہوتا تو انسان حاتم طائی کیسے بن سکتا تھا! ـــــ اور نہ ہی ہمدردی اور خیرسگالی کا جذبہ اس کی فطرت ہے، کیونکہ اس صورت میں انسان ہلاکو اور چنگیز کیسے بن سکتا تھا ـــــ یہاں سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ پھر انسان میں اس قسم کی خون ریزی اور قصابیت کہاں سے آتی ہے، اور دل سوز گدازیت کہاں سے؟ اس سوال نے صدیوں سے انسان کو عجیب کشمکش میں مبتلا کر رکھا ہے اور "مذہب" ان الجھنوں میں مزید اضافہ کا موجب

بنتا چلا آرہا ہے۔

(محرف) عیسائیت نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ ہر انسانی بچہ، پیدائش کے ساتھ، اپنے اولیں ماں باپ کے گناہ کی آلائش لے کر آتا ہے۔ اور اس آلائش کو دور کر دینا اس کے بس کی بات نہیں۔

عیسائیت کا نظریہ

اس کے معنی یہ ہوئے کہ گناہ یا شر (EVIL) انسان کی فطرت میں داخل ہے اور وہ اس باب میں مجبورِ محض ہے۔ اس خود پیدا کردہ مشکل کا حل انہوں نے یہ سوچا کہ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت مسیحؑ) کو دنیا میں بھیجا تاکہ وہ صلیب پر اپنی جان دیکر انسانوں کے اس گناہ کا کفارہ ادا کرے۔ (ہم اس وقت عیسائیت کے صرف یہ عقائد بیان کر رہے ہیں۔ ان پر تبصرہ اور تنقید سرِدست مقصود نہیں اور ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ان عقائد کا بودا پن ایسا واضح ہے جس کے لئے کسی تبصرہ اور تنقید کی ضرورت ہی نہیں)۔ "گناہِ اول" کے عقیدہ کے بعد خود ان کے ہاں یہ اعتراض پیدا ہوا کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ تو اپنے اولیں ماں باپ (آدم اور حوّا) کے گناہ کا بوجھ لیکر پیدا ہوتا ہے، لیکن خود آدم اور حوّا نے یہ گناہ کیسے کیا؟ وہ جب "پیدا ہی نہیں ہوتے تھے" تو وہ اس گناہ کے مرتکب کس طرح ہوئے؟ اس کے لئے انہوں نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ وہ شیطان کے بہکاوے میں آگئے تھے، اور شیطان کا تصور انہوں نے ایسا دیا گویا وہ خارج میں کوئی مستقل بالذات شخصیت ہے۔

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ "گناہِ اول"، کے عقیدہ نے جبریت (DETERMINISM) کا نظریہ پیدا کیا۔ مذہب کی گرفت کس قدر محکم اور انسانی قلب کی گہرائیوں تک پہنچی ہوتی ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یورپ میں ایسے ایسے محققین اور سائنسدان پیدا ہوئے جنہوں نے "انسان"، کے متعلق بڑی وسیع اور گہری ریسرچ کی۔ ان میں سے بیشتر ایسے تھے جو عیسائیت تو ایک طرف، خدا تک کے بھی منکر تھے، لیکن عیسائیت کے پیدا کردہ عقیدۂ جبریت کی محکمیت کا یہ عالم تھا، اور وہ اس طرح ان کے تحت الشعور میں داخل ہو چکی تھی کہ وہ اپنی ہر ریسرچ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ انسان اپنے اعمال میں آزاد نہیں، مجبور ہے۔ لیکن صداقت اپنے آپ کو منوائے بغیر نہیں رہتی۔ ہمارے زمانے میں علمِ انسانی نے جو محیر العقول ترقی کی ہے، وہ عیسائیت کے اس باطل عقیدہ اور سابقہ محققین کے جبریت کے غلط تصور کی تردید کرتی چلی جا رہی ہے۔ ذیل میں مختصر الفاظ میں، ان دونوں گوشوں کی، سرسری سی جھلک دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جہاں تک ان غلط نظریات کی تردید کا تعلق ہے، میں نے مناسب سمجھا ہے کہ (ERICH FROMM) کی اس کتاب کے حوالہ سے بات کروں جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ کیونکہ وہ اس ریسرچ میں تازہ ترین (LATEST) بھی ہے اور مختلف محققین کی فکر کی مہیمن بھی۔ عیسائیت کے عقیدۂ "اولین گناہ" کے متعلق (ERICH FROMM) لکھتا ہے کہ اس

عقیدہ کو فروغ اس لئے ہوا کہ اس نے انسان کے ہر جرم کے لئے وجہ جواز مہیا کر دی اور مجرمین نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دلا لیا (یعنی وہ خود فریبی کا شکار ہو کر اطمینان سے بیٹھ گئے) کہ ہم تو مجبورِ محض ہیں۔ جرم، انسان کی فطرت کے اندر پیدائشی طور پر ودیعت کر کے رکھدیا گیا۔ اس سے اتنا ہی نہیں ہوا کہ ارتکابِ جرم کے خلاف احساسِ ندامت تک ختم ہو گیا بلکہ یہ مایوسانہ تصور بھی عام ہو گیا کہ انسان کی کسی کوشش سے بدکرداری کی اصلاح ممکن ہی نہیں، لیکن :-

اس کی تردید

> اس طرح کی مایوسی کا عام کرنا بھی ایسا ہی ہلاکت انگیز ہے جس طرح کسی اور باطل کا عام کرنا۔ یہ الجھنیں بھی پیدا کرتا ہے اور حوصلہ شکنی بھی۔ اس قسم کے خلافِ عقل عقائد کا پھیلانا اور پھر ان کے پیدا کردہ نقصانات کی تلافی کے لئے "جھوٹے مسیحوں" کی آمد کا عقیدہ وضع کرنا کچھ کم ہلاکت آفریں نہیں۔ یہ عقائد پہلے انسان کو جرم اور گناہ کی ترغیب دلاتے ہیں اور پھر اُسے مفلوج بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ (ص ۴۸۴)

اب آئیے مغربی محققین کی اس ریسرچ کی طرف، جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ڈارون نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان، حیوان ہی کی بڑھی ہوئی شکل کا نام ہے۔ طبیعی طور پر ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ لہٰذا جو خصوصیات، حیوانات میں جبلی طور پر پائی جاتی ہیں، وہ خود انسان کے اندر موجود ہیں۔ اسے نظریۂ جبلّت (INSTINCTIVENESS) کہا جاتا ہے۔ سابقہ ماہرینِ علم النفس نے پہلے ان جبلتوں کو تین بنیادی شقوں میں تقسیم کیا، یعنی جذبۂ تحفظِ خویش (SELF-PRESERVATION) — جذبۂ تغلب (SELF-AGGRESSION) اور — جذبۂ افزائشِ نسل (SELF — PROCREATION)۔ فرائڈ نے جذبۂ تحفظِ خویش اور جذبۂ تغلب کو یکجا کر کے ان تین شقوں کو دو میں بدل دیا۔ لیکن جذبۂ تغلب نے اپنی اہمیت برقرار رکھی کیونکہ دنیا میں فساد انگیزیوں اور خون ریزیوں کا باعث اکثر و بیشتر یہی جذبہ ہوتا چلا آیا ہے۔ اس لئے یہ شق مغربی محققین کی تحقیق اور بحث و نظر کا موضوع بنتی رہی۔[1]

مغربی محققین کی ریسرچ

لیکن حال کی تحقیق نے اس نظریہ کی تردید کر دی ہے۔ چنانچہ (ERICH FROMM) لکھتا ہے کہ جبلی جذبات بیشک انسان کے طبیعی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں، لیکن انسان کے تقاضے طبیعی ہی

---

[1] اس باب میں (K-LORENZ) کی کتاب (ON AGGRESSION—1966) بڑی تفصیل کی حامل ہے۔ اور اس نے اس نظریہ کے عام کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

تو نہیں، ان سے آگے کچھ اور بھی ہیں، جن کا تعلق اس کی انسانی زندگی سے ہے۔ یہ تقاضے اس وقت پورے ہوتے ہیں، جب اس کے ان جبلی جذبات کو اس کے کیریکٹر کے ساحلوں کا پابند کر دیا جائے (ص ۲۶)۔ وہ دوسرے مقام پر لکھتا ہے کہ:

> انسانیت کا جوہر اس کا کیریکٹر ہے، جسے وہ حیوانیت کے جبلی تقاضوں کے نعم البدل کے طور پر اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔ (ص ۲۸۵)

"حیوانی جبلت" سے ملتا جلتا، نسل کا عقیدہ ہے جس کی رُو سے مغرب کے ماہرین علم الحیات (ANTHROPOLOGISTS) نے کہا... کہ انسانی بچہ کے ذہنی نقوش، معتقدات و تصورات وغیرہ انفرادی نہیں، بلکہ نسلی (RACIAL) ہوتے ہیں۔ ہر فرد، کسی نہ کسی نسل سے متعلق ہوتا ہے۔ نسلی معتقدات و تصورات وراثتاً آگے منتقل ہوتے رہتے ہیں، اور انہی کے مجموعی اثرات کا نام ایک فرد کے ذاتی خصائص و رجحانات ہوتے ہیں۔ نسلی امتیازات کا نظریہ بڑی تباہیوں کا موجب بنا کیونکہ اس سے انسانیت ایسے ٹکڑوں میں بٹ گئی جن کا متحد کرنا ناممکنات میں سے سمجھا گیا۔ غنیمت ہے کہ اب خدا خدا کر کے اس باطل نظریہ کی بھی تردید ہو چکی ہے۔ (مثلاً) پروفیسر (L. HOGBEN) اس باب میں رقمطراز ہے کہ:-

> تیس سال کے گہرے تجربہ نے اس امر کا بین ثبوت بہم پہنچا دیا ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر مخلوط نسل کے انسانوں کے اندر اس قسم کے افراد پیدا ہو جاتے ہیں جن کے خصائص اپنے آباؤ اجداد سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔

(THE NATURE OF LIVING MATTER)

"نسلیت" سے ملتا جلتا عقیدہ "وراثت (HEREDITY)" کا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی بچہ کو اس کے ماں باپ کے معتقدات و تصورات بھی پیدائشی طور پر ملتے ہیں۔ اس عقیدہ کا مشہور مؤید، پروفیسر (N.S. JENNINGS) انسانی بچہ کی پیدائش کے مختلف مراحل پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے کہ رحم مادر میں جنین کی تشکیل قریب ایک ہزار موالید (GENES) سے ہوتی ہے:

> اور یہ معلوم ہے کہ ان ہزار موالید میں سے ہر ایک اپنی اپنی مستقل حیثیت رکھتا ہے اور الگ الگ فریضہ۔ چنانچہ اگر ان میں سے ایک بھی تلف یا تبدیل ہو جائے تو جنین کی شکل و صورت میں بھی تبدیلی ہو جاتی ہے اور خود اس انسان میں بھی، جس کی ابتدا اس جنین سے ہو رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تبدیلی اس کی آنکھوں کی رنگت، ناک کی شکل یا قد و قامت پر اثر انداز ہو، اور اس کے ساتھ ہی اس کے

مزاج اور افتادِ طبیعت پر بھی۔ مزاج، ذہنیت، افتادِ طبیعت، شخصیت وغیرہ کا انحصار
مختلف طریقوں سے ان موالید پر ہے جن سے انسانی بچہ متشکل ہوتا ہے۔ [1]

لیکن اب اِس نظریہ کی بھی تردید ہوتی جا رہی ہے اور کہا یہ جا رہا ہے کہ جو کچھ ہمیں وراثتاً ملتا ہے، اُسے ماحول سے بدلا جا سکتا ہے، اور ماحول کو ہم اپنے کنٹرول میں رکھ سکتے ہیں۔ [2]

یہاں سے انسانی فکر کا رخ، نظریۂ وراثت سے نظریۂ ماحول کی طرف مڑ گیا۔ اس نظریہ کی سب سے مشہور شاخ، نظریۂ عادات (BEHAVIOURISM) ہے، جسے ڈاکٹر واٹسن نے پیش کیا تھا۔ اس نے یہ کہا کہ انسانی بچہ پیدائشی طور پر اپنے اندر کوئی خصوصیات یا تصورات لے کر نہیں آتا۔ اس میں، جس قسم کی عادات پیدا کر دی جائیں، وہی اس کے مختلف اعمال کی محرک بن جاتی ہیں، اور یہ عادات انمٹ ہوتی ہیں۔ اسی کی دوسری شاخ نظریۂ عمرانیت (SOCIOLOGY) ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی بچہ جس قسم کی سوسائٹی میں آنکھ کھولتا اور پرورش پاتا ہے، وہ ویسا ہی بن جاتا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اٹھارہ ماہ کی عمر سے لے کر تین سال یا زیادہ سے زیادہ پانچ سال کی عمر تک، انسان نے جو کچھ بننا ہوتا ہے، وہ بن چکتا ہے۔ اور بچپن کے ان نقوش کا مٹانا کسی کے بس کی بات نہیں۔ اس نظریہ نے ہمارے دور میں بڑی اہمیت اختیار کر لی، لیکن مزید تحقیق نے اسے بھی باطل قرار دیدیا۔ اِس تحقیق کی رو سے یہ تو تسلیم کیا جاتا ہے کہ بچہ پر ماحول کا اثر بڑا گہرا ہوتا ہے لیکن اِسے تسلیم نہیں کیا جاتا کہ اس کے یہ نقوش ایسے انمٹ اور محکم ہوتے ہیں کہ انہیں بعد میں بدلا ہی نہیں جا سکتا۔ اس باب میں مشہور محقق (B.F. SKINNER) نے بڑی وسیع تحقیق کی ہے جس کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ بچپن کے بعد اگر مثبت محرکات محکم طور پر پیدا کر دیے جائیں تو ان سے ابتدائی ماحول کا تمام اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔ (ERICH FROMM) اگرچہ پروفیسر (SKINNER) کے بعض نتائج سے اختلاف کرتا ہے لیکن وہ اس باب میں اس سے متفق ہے کہ ماحول کے یہ اثرات مٹائے جا سکتے ہیں اور اس کا طریقہ انسان کے اندر کیریکٹر پیدا کرنا ہے۔ [3]

---

[1] ملاحظہ ہو پروفیسر مذکور کی کتاب (THE BIOLOGICAL BASIS OF HUMAN KNOWLEDGE) ان امور کی تفصیل کیلئے دیکھئے میری کتاب ——— انسان نے کیا سوچا ——— کا باب "میکانیکی تصورِ حیات"۔

[2] دیکھئے (V.H. MOTTRAM) کی مشہور کتاب (THE PHYSICAL BASIS OF PERSONALITY)

[3] آپ نے غور فرمایا کہ محققینِ مغرب کی تحقیق کے نتائج کس طرح، خود بخود، قرآنی دعاوی کی دلیل اور ثبوت بنتے چلے جا رہے ہیں، یعنی انفس و آفاق میں آیاتِ خداوندی کی نقاب کشائی کس طرح حقائق کو سامنے لاتی چلی جا رہی ہے (۴۱/۵۳)۔

آپ نے غور فرمایا کہ نظریۂ جبلت، نسلیت، وراثت، عادات، عمرانیت کے واضعین، کس طرح غیر شعوری طور پر عیسائیت کے وضع کردہ نظریۂ جبریت سے متأثر ہوگئے اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ انسان اپنے معتقدات اور اعمال کے لئے آزاد نہیں ہوتا بلکہ وہ مجبور ہے۔ لیکن خود مغرب ہی کے محققین اب اس نظریہ پر پہنچے ہیں کہ جبریت کا عقیدہ اور نظریہ باطل اور ناقابلِ تسلیم ہے۔ اور یہ وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے آج سے چودہ سو سال پہلے نہایت واضح الفاظ میں پیش کر دیا تھا۔ اس نے انسان کے متعلق جو کہا کہ اسے اختیار و ارادہ یا انتخاب کی صلاحیت دی گئی ہے تو اس ایک نکتہ نے ان تمام باطل تصورات کو جڑ سے اکھیڑ کر رکھ دیا۔ مجبور کے سامنے ایک ہی امکان (POSSIBILITY) ہوتی ہے، ایک سے زیادہ نہیں۔ بکری کے سامنے ایک ہی امکان ہے کہ وہ گھاس کھائے، گوشت نہ کھائے۔ اس کے لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ ان دونوں (گھاس یا گوشت) میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلے۔ صاحبِ ارادہ اُسے کہا جاتا ہے جس کے سامنے دو امکانات (POSSIBILITIES) موجود ہوں اور اسے اس کا اختیار حاصل ہو کہ وہ ان میں سے جس امکان کو چاہے، اختیار کرلے۔ اس بنیادی تصور سے لازمی طور پر یہ نتائج سامنے آتے ہیں کہ (۱) پیدائشی طور پر انسان کوئی ایسا نقش لے کر نہیں آتا جو انمٹ ہو۔ ہر انسانی بچہ ایک سفید لوح لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اور (۲) دنیا میں خیر و شر، غلط اور صحیح، تخریب و تعمیر کے امکانات ہر دوراہے پر موجود ہوتے ہیں اور یہ انسان کے اپنے فیصلے پر موقوف ہے کہ وہ ان میں سے جسے چاہے، اختیار کرلے۔ سوال یہ ہے کہ انسان کے سامنے ان دو امکانات، اور ان میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے سے مراد کیا ہے؟ جیسا کہ واضح ہے، انسان کا جسم، حیوانات کی طرح، طبیعی قوانین کے تابع زندہ رہتا ہے، لہٰذا اس کے جسمانی یا طبیعی تقاضے وہی ہیں جو دیگر حیوانات کے ہیں۔ انہیں جبلت یا (ANIMAL INSTINCTS) کہا جاتا ہے لیکن انسان صرف حیوان ہی نہیں وہ "انسان" بھی ہے۔ اور اس اعتبار سے اس کے انسانی تقاضے بھی ہیں۔ یہ بات ہم محض "عقیدہ" کی سطح پر نہیں کہتے، عصرِ حاضر کے غیر مسلم محققین بھی اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ مثلاً (ERICH FROMM) اس باب میں لکھتا ہے:-

> اِنسان کے طبیعی تقاضے اور محرکات ضروری ہیں، لیکن وہ مقابلۃً کم اہمیت رکھتے ہیں انسان کے وہ جذبات، جو اس کی توانائیوں کو اس کے نصب العین کی تلاش کے لئے مجتمع کر دیتے ہیں، زیادہ اہم ہیں۔ انہیں ہم عقیدت (DEVOTIONAL) یا مقدس (SACRED) کے نام سے پکار سکتے ہیں۔[۱]

[۱] یہ مفکر خدا اور وحی کا قائل نہیں۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ وہ، انسان کے انسانی (حیوانات سے بلند) تقاضوں کے لئے کس طرح اپنے آپ کو ان اصطلاحات کے اختیار کرنے پر مجبور پاتا ہے، جن کا تعلق وحی کی دنیا سے ہے۔ ان کے لئے اور الفاظ مل ہی نہیں سکتے۔

زندگی کے طبیعی تقاضے تو انسان کو صرف زندہ رکھتے ہیں۔ اس کے وہ جذبات جو عقیدت یا تقدس کے دائرے میں آتے ہیں، ان کا میدان اس کی طبیعی زندگی سے بہت آگے ہے۔ یہ وہ میدان ہے جس میں انسان اپنی زندگی، بلکہ اپنی "قسمت" تک کو قربان کر دیتا ہے، یہی وہ زمین ہے جس میں اس کے وہ محرکات پیوست ہوتے ہیں، جو اس کی زندگی کو درحقیقت زندہ رہنے کے قابل بنا دیتے ہیں (صفحہ ۲۹۸)۔

اس سے ذرا پہلے وہ لکھتا ہے کہ "یاد رکھیئے کہ انسان میں کوئی بات بھی ایسی نہیں جس کی تبدیلی ناممکن ہو، اور نہ ہی یہ حقیقت ہے کہ انسان خارجی اثرات سے محفوظ رہ ہی نہیں سکتا۔ ہمیں بد سے بدتر سوسائٹی میں بھی ایسے افراد ملتے ہیں جو اپنے آپ کو ان اثرات سے ملوث نہیں ہونے دیتے۔ اور وہ بھی جن سے مناسب تعلیم و تربیت سے، یہ اثرات زائل ہو جاتے ہیں" (ص ۲۹۷ فٹ نوٹ)۔ وہ اپنی دوسری کتاب (MAN FOR HIMSELF) میں لکھتا ہے کہ:-

مریض انسانوں میں صحت یاب ہونے کی آرزو اس امر کی دلیل ہے کہ انسان مرض پر مطمئن نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنی بد اندیشی، تساہل، تغافل یا جہالت کی بنا پر مرض میں مبتلا ضرور ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اسے کہیں شفا کی کرن نظر آتی ہو تو وہ اس کی طرف لپک کر جاتا ہے۔ ہم جو تجزیۂ نفس (PSYCHOANALYSIS) کی رو سے نفسیاتی امراض کا علاج کرتے ہیں تو اس میں کرتے صرف اتنا ہی ہیں کہ پہلے ان اثرات کا کھوج لگاتے ہیں جو اس کے تحت الشعور میں جاگزیں ہوتے ہیں اور جنہیں اس کا شعور فراموش کر چکا ہوتا ہے۔ [1] اس کے بعد ہم اس کے ان محرکات کو تقویت دیتے ہیں جنہوں نے اسے اپنے علاج یا شفایاب ہونے کی ضرورت یاد دلائی تھی اور اس کے لئے اسے آمادہ کیا تھا۔ اگر انسان کے اندر یہ جذبہ موجود نہ ہو —— یا مر چکا ہو —— تو ہم اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ اسے بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ تنہا عقل انسانی اس مقصد کے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔ عقل انسانی مرض اور

---

[1] علم تجزیۂ نفس کی رو سے، انسان کے وہ احساسات، جن کا وہ اظہار تو نہ کرے لیکن ان کی یاد اس کے حافظہ میں موجود رہے، (SUPPRESSED FEELINGS) کہلاتے ہیں۔ لیکن جب ان کی یاد بھی محو ہو جائے تو وہ اس کے تحت الشعور میں جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ انہیں (REPRESSED FEELINGS) کہا جاتا ہے۔

اور صحت کو پہچان تو سکتی ہے۔ انسان کے ان محرکاتِ خیر کو بیدار نہیں کر سکتی جو شر کے
پیدا کردہ اثرات کا ازالہ کر سکیں (صفحہ ۲۲۴-۲۲۳)۔

اس مفکر کے یہ آخری الفاظ خاص اہمیت کے حامل ہیں جن سے وحی کی ضرورت پر بڑی گہری روشنی پڑتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ نکتہ بسردست ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لئے ہم فی الحال اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔ اس کا مقام آگے چل کر آئے گا۔ یہ مفکر، اس علاج کے لئے ایک ایسے معاشرے کا وجود اور قیام لاینفک سمجھتا ہے جس میں وہ اقدار و نظریات زندہ اور بیدار ہوں جو انسان کے ان محرکات کو تقویت دے سکیں جو شر کے پیدا کردہ اثرات کو مٹا دیں (ANATOMY صفحہ ۱۳۰)
وہ دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ:۔

انسان کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی پوری نشو و نما اور برومندی حاصل کرے بشرطیکہ جس معاشرہ میں وہ رہتا ہے اس کے حالات اس کیلئے ممد و معاون ہوں۔ (ANATOMY ۲۹۱)

اِس وقت مختلف اقوام اور ممالک میں، جس قسم کے معاشرتی حالات کارفرما ہیں، ان کے پیشِ نظر وہ اس قسم کی تبدیلی کو بڑا دشوار قرار دیتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اسے ناممکن نہیں کہتا۔ وہ انسان کے مستقبل سے ناامید نہیں۔ وہ کہتا ہے:۔

ایسا تصور کرنا بالکل جائز ہوگا کہ انسان اپنی نشو و نما کے امکانی دائرہ کو مکمل کرے گا اور ایسا معاشرہ متشکل ہو جائے گا جس میں کوئی انسان کسی دوسرے سے خائف نہ ہوگا؛[1] نہ کوئی بچہ اپنے ماں باپ سے خائف ہو اور نہ کوئی ماں باپ اپنے بالادستوں سے نہ کوئی طبقہ دوسرے طبقہ سے خائف ہو، نہ کوئی قوم اپنے سے زیادہ زور آور قوم سے خائف۔ اِس مقصد کا حصول بڑا مشکل ہے۔ کیونکہ موجودہ معاشی، سیاسی، ثقافتی اور نفسیاتی عوامل اس کے راستہ میں بہت بڑی رکاوٹیں بن کر کھڑے ہیں۔ علاوہ ازیں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ دنیا کی قومیں مختلف قسم کے باطل خداؤں کی پرستش کر رہی ہیں اور چونکہ ہر قوم کا خدا الگ ہے اس لئے وہ ایک دوسرے کو سمجھنے سے بھی قاصر ہیں اگرچہ وہ ایک دوسرے کی زبان ضرور سمجھتے ہیں ..... لیکن اس سے ہمیں مایوس نہیں ہونا

---

[1] قرآن کریم نے اس مثالی معاشرہ کی خصوصیت یہی بتائی ہے تا کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸)"اس میں کسی کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا، نہ حزن"۔ تفصیل اس اجمال کی اپنے مقام پر آئے گی۔

چاہیئے۔ انسان کے اندر ایسی صلاحیتیں موجود ہیں، جو ان تمام موانعات پر قابو پا سکتی ہیں (۴۸۵-۴۸۲)۔

ابلیس یا شیطان

اور یہاں سے ہم اس گوشے کی طرف آتے ہیں جسے قرآن کریم نے "ابلیس یا شیطان" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے اور جو ہمارے اس موضوع کا سرنامہ ہے۔ لفظ ابلیس کا مادہ (ب ل س) ہے جس کے معنی مایوسی اور ناامیدی کے ہیں، اور لفظ شیطان کا مادہ (ش۔ط۔ن) جس کے معنی دور چلے جانے کے ہیں۔ یعنی حدود فراموشی۔ یہ لفظ سرکشی، مخالفت اور بیباکی کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ نیز اس کے معنی جل جانے اور بھڑک اٹھنے کے بھی ہیں۔ اسی شعلہ مزاجی کی وجہ سے کہا گیا ہے کہ شیطان کی تخلیق آگ سے ہوئی (۷/۱۲)۔ (شیطان اور ابلیس (جو کچھ بھی اس سے فی الحقیقت مفہوم ہے) کے لئے یہ دو الفاظ کیوں آئے ہیں، اس کی تشریح آگے چل کر سامنے آئے گی)۔

"مذہب" نے شیطان کو انسان سے الگ، ایک جداگانہ اور خارجی ہستی قرار دیا جو انسان کو برائی پر اکساتا ہے[1]۔ عیسائیت نے اس تصور کو بڑی شدومد سے پھیلایا۔ اس لئے کہ یہ اس کے پیش کردہ عقیدۂ جبریت کی تائید کرتا تھا۔ اور عام لوگوں نے اسے اس لئے قبول کر لیا کہ اس سے وہ اپنے آپ کو اس خود فریبی میں مبتلا رکھ سکتے تھے کہ گناہ یا جرم کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی۔ اس کا ذمہ دار شیطان ہے۔ قرآن کریم نے اس باطل عقیدہ کی تردید کی اور ابلیس یا شیطان کا ایسا تصور پیش کیا جس کی تائید علمی تحقیق سے ہوتی جا رہی ہے۔ قرآن نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ بتایا اور اس کی وضاحت کی کہ جب یہ اپنے ارادہ کو غلط طور پر استعمال کرتا ہے تو اسے اس کا شیطانی فعل قرار دیا جاتا ہے اور جب یہ اسے صحیح طور پر استعمال کرتا ہے تو یہ اس کے شرفِ انسانیت کی دلیل ہوتا ہے۔ یعنی اس نے شیطنت کو خود انسان کا اپنا فعل قرار دیا۔ اور اس کے لئے خود اسی کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ مثلاً سورۃ الاعراف میں ہے کہ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ (۷/۲۰)۔ یعنی "شیطان نے انہیں بہکایا" اور دوسری جگہ کہا کہ "ہم نے انسان کو پیدا کیا" وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ (۵۰/۱۶)۔ "اور ہم جانتے ہیں کہ اس کا نفس اسے کس طرح بہکاتا ہے"۔ آپ دیکھئے کہ یہاں بہکانے کے فعل کو ایک جگہ شیطان کی طرف منسوب کیا ہے اور دوسری جگہ اُسے خود انسان کا اپنا فعل

---

[1] مجوسیت ایک قدم آگے بڑھی اور اس نے خیر اور شر کے لئے دو الگ الگ خدا تراش لئے۔ خیر کا خدا یزداں، اور شر کا خدا اہرمن۔ ان دونوں میں ابدی طور پر کشمکش جاری ہے۔ اس عقیدہ کو ثنویت (DUALISM) کہکر پکارا جاتا ہے۔

قرار دیا ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، انسان کو کچھ جذبات دیئے گئے ہیں جن کے تقاضوں کے پورا کرنے سے اس کی زندگی برقرار رہتی ہے۔ لہٰذا ان جذبات کی تسکین خود انسانی زندگی کا تقاضا ہے۔ مادی تصورِ حیات کی رو سے ان تقاضوں کو (حیوانات کی طرح) جس طرح جی چاہے، پورا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قرآنی تصورِ حیات کی رو سے یہ ضروری ہے کہ ان تقاضوں کو ان پابندیوں کے دائرے کے اندر رہ کر پورا کیا جائے جنہیں مستقل اقدارِ خداوندی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً افزائشِ نسل کے لئے جنسی جذبات کی تسکین ضروری ہے۔ ایک شخص ان کی تسکین اپنی بیوی کے ساتھ اختلاط سے کرتا ہے، دوسرا ان کی تسکین کسی پاک دامن، شریف النفس لڑکی کی عصمت دری کے ذریعہ۔ جذبات کی تسکین دونوں صورتوں میں ہو جاتی ہے۔ لیکن ایک طریق اپنے اندر خیر کا پہلو لئے ہوتے ہے اور دوسرا طریق شر کا۔ قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ اپنے جذبات کو سرکش اور بیباک نہ رکھو۔ بلکہ ان کی تسکین اقدارِ خداوندی کی راہنمائی میں کرو[1] چنانچہ اس نے کہا ہے کہ: اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (۴۵/۲۳) "کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنا لیا۔ الٰہ کے معنی ہوتے ہیں وہ قوت جس کے زیرِ اقتدار زندگی بسر کی جائے۔ اور دوسری جگہ کہا کہ: وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَیْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (۲۸/۵۰)" اس سے زیادہ راہ گم کردہ کون ہو سکتا ہے جس نے اپنے جذبات کی تسکین، ہدایتِ خداوندی سے الگ ہٹ کر کی۔" یعنی قرآن کریم کی رُو سے جذبات کی تسکین کوئی برا فعل نہیں۔ ہدایتِ خداوندی سے سرکشی برت کر ان کا پورا کرنا شر، جرم یا گناہ ہے۔ اسے اس نے شیطانی فعل کہہ کر پکارا ہے اور تاکیداً کہا ہے کہ لَا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ ..... اُعْبُدُوْنِیْ (۳۶/۶۰-۶۱) "شیطان کی عبودیت (محکومیت) مت اختیار کرو، خدا کی معبودیت اختیار کرو۔"

ان مقامات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ قرآن کی رو سے شیطان یا ابلیس کوئی موجود فی الخارج ہستی یا شخصیت نہیں یہ خود انسان کے اپنے ہی فیصلوں کا نام ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے، جہاں کہا ہے کہ

جہاں تا از عدم بیروں کشیدند ۞ ضمیرش سرد و بے ہنگام دیدند
بغیر از جانِ ما سوزے کجا بود ۞ ترا از آتشِ ما آفریدند

یہی وجہ ہے کہ (جیسا کہ ہم آگے چل کر قصۂ آدم میں دیکھیں گے) انسان اور شیطان بیک وقت زندگی کی اسٹیج پر سامنے آتے ہیں اور شیطان کو انسان کے آخری لمحاتِ زندگی تک مہلت دیدی گئی ہے۔ گویا انسان اور شیطان کا چولی دامن کا ساتھ

---

[1] ان امور کی تفصیل ــــ مطالب الفرقان۔ جلد اول میں آیات (۱/۱؛ ۱/۲؛ ۲/۴) میں گزر چکی ہے۔ ایک نظر اس پر بھی ڈال لی جائے۔

ہے (ملاحظہ ہوں آیات ۷/۱۴؛ ۱۵/۳۶؛ ۱۷/۹۲؛ ۳۸/۷۹ — تفصیل آدم کے عنوان میں ملے گی۔)

شیطان، چونکہ انسانی ارادوں یا جذبات ہی کا دوسرا نام ہے جو محسوس طور پر نظر نہیں آسکتے، اس لئے شیطان کے متعلق کہا کہ اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (۷/۲۷)۔ "وہ اور اس کے ہم قبیلہ تمہیں ایسے مقامات سے دیکھتے ہیں جہاں تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔" اور اسی جہت سے دوسری جگہ کہا: کَانَ مِنَ الْجِنِّ (۱۸/۵۰)۔ "وہ ان قوتوں میں سے ہے جو نگاہوں سے پوشیدہ رہتی ہیں۔"

چونکہ انسانی ارادے اور ان کے فیصلے کثیر التعداد ہوتے ہیں اور مختلف قسم کے پیکروں میں ان کی نمود ہوتی ہے، اس لئے یہاں، جنہیں شیطان کے ہم قبیلہ کہا ہے، دیگر مقامات پر انہیں "جنود ابلیس" ابلیس کا لاؤ لشکر یعنی ابلیس کے متبعین کہکر پکارا گیا ہے (دیکھئے ۷/۱۸؛ ۱۵/۴۲؛ ۲۶/۹۵؛ ۳۸/۸۵)۔ چونکہ ہر انسان کا اپنا اپنا "شیطان" ہوتا ہے اس لئے جب مختلف انسانوں کے شر انگیز اعمال اور تخریب کاریوں کا ذکر کیا گیا تو اُسے شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ (۶/۱۱۲) کہکر پکارا گیا۔ کہیں انہیں اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ (۱۷/۲۷) سے تعبیر کیا گیا۔ اور مجموعی طور پر انہیں حِزْبُ الشَّیْطٰنِ (۵۸/۱۹) یعنی شیطان کی پارٹی قرار دیا گیا، جس کے مقابلہ میں حِزْبُ اللّٰهِ آیا ہے (۵۸/۲۲) جس سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنے جذبات کی تسکین قوانینِ خداوندی کی حدود میں رہتے ہوئے کرتے ہیں۔ حزب الشیطان، یعنی شیطانی پارٹی کے سرغنوں کو بھی شیاطین کہا گیا ہے۔ (دیکھئے ۲/۱۴)۔ حتّٰی کہ ان سرکش قبائل کو بھی جنہیں حضرتِ سلیمانؑ نے اپنے احکام کی زنجیروں کا پابند کرکے انہیں بڑے بڑے کاموں پر لگایا تھا (۲۱/۸۲)۔ یعنی اگر انہیں ان پابندیوں سے آزاد کر دیا جاتا تو وہ ہر قسم کی سرکشی اور بغاوت پر اُتر آتے۔

حزب الشیطان میں وہ اقوامِ غالب بھی شامل ہیں جو خود بھی اقتدارِ خداوندی سے سرکشی برتتی ہیں اور اپنی مغلوب اقوام کو بھی انہی غلط راہوں پر چلاتی رہتی ہیں۔ اس کے لئے وہ کس قسم کے حربے استعمال کرتی ہیں، انہیں قرآن کریم نے (قصۂ ابلیس و آدم) میں بڑے لطیف اور دلکش انداز سے بیان کیا ہے۔ وہاں کہا گیا ہے کہ ابلیس نے خدا سے کہا کہ تو اس آدم (آدمی) کو دنیا میں بھیج۔ اور پھر دیکھ کہ میں اسے کس طرح تگنی کا ناچ نچاتا ہوں۔ اس کے لئے وہ جو طریق اور ذرائع استعمال کرے گا ان کے متعلق کہا گیا: وَاسْتَفْزِزْ ... بِصَوْتِكَ. وَاَجْلِبْ عَلَیْهِمْ بِخَیْلِكَ وَرَجِلِكَ. وَشَارِكْهُمْ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ (۱۷/۶۴)۔ "کبھی اس پراپیگنڈہ کے ذریعے، جسے آلاتِ ابلاغ کی مدد سے عام کیا جائیگا (مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ) کہیں ان کے خلاف "پولیس ایکشن" کیا جائے گا اور قوت کے بل بوتے پر انہیں اپنی مرضی کے مطابق چلایا جائے گا۔ کہیں اقتصادی امداد سے انہیں سیاسی محکومیت کے شکنجوں میں جکڑا جائے گا۔ اور کہیں ان کی اولاد کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کی جائے گی کہ وہ انہی سرکش جذبات کو لئے ہوئے پروان چڑھے۔ کہیں انہیں دلکش وعدوں سے بہلایا جائے گا۔" یہ ہیں اقوامِ غالب کے وہ حربے جنہیں ابلیسی ہتھکنڈوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔

انسان کی اپنی بیباک خواہشاتِ نفس ہوں یا اقوامِ غالب کے اس قسم کے حربے، ان کی بنیادی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ انسان کے غلط اعمال کو نہایت دلکش، جاذب اور مزین بنا کر دکھاتے ہیں (ملاحظہ ہوں آیات ۶/۴۳؛ ۸/۴۸؛ ۱۶/۶۳)۔ اگر برائی برائی بن کر سامنے آئے تو انسان اس سے دھوکا نہیں کھاتا۔ اگر جھوٹ بولنے والا اپنے جھوٹ سے فریقِ مقابل کو اپنا ہمنوا بنا لے اور اُسے اپنی مقصد براری کا آلۂ کار بننے کے لئے آمادہ بھی کرلے، لیکن آخر میں کہدے کہ میں نے تم سے جو کچھ کہا ہے، وہ سب جھوٹ ہے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ کبھی اس کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ وہ اس کے لئے اسی صورت میں تیار ہوگا کہ اُسے یقین پر یقین دلاتا چلا جائے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، بالکل سچ ہے۔ ابلیسی وساوس کی سب سے بڑی صنعت گری یہ ہوتی ہے کہ وہ جھوٹ کو سچ بنا کر دکھائے۔ انسان کے برے اعمال کے متعلق اُسے یقین دلادے کہ وہ نیک اعمال ہیں، ان میں کسی قسم کی برائی کی بات نہیں۔ ابلیس کا یہ حربہ بڑا کامیاب ہوتا ہے۔ یوں تو اس کی جولانگاہ انسانی زندگی کا ہر گوشہ ہے، لیکن جہاں یہ سب سے زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ وہ "مذہب" کی دنیا ہے۔ "مذہب" میں انسان، سینکڑوں ہزاروں ایسے کام کرتا ہے جو یا تو تخریب انگیز ہوتے ہیں یا بلانتیجہ رہ جانے والے۔ لیکن ابلیس ان لوگوں کو اس فریب میں مبتلا رکھتا ہے کہ یہ بڑے "ثواب" کے کام ہیں۔ ان سے احکامِ خداوندی کی تعمیل ہوتی ہے اور منشائے خداوندی کی تکمیل۔ ان سے تمہیں جنت مل جائے گی۔

غلط اعمال کو مزیّن کرکے دکھانا

اس اجمال کی تفصیل کے لیئے ایک الگ کتاب کی نہیں، تو کم از کم الگ باب کی ضرورت ہے (اور اسے ہم اس کے مقام پر پیش بھی کریں گے)، لیکن یہاں ہم اس کی ایک آدھ مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔ سورۂ کہف میں ہے کہ آؤ! ہم تمہیں بتائیں کہ وہ لوگ کون ہیں جن کے اعمال انہیں سب سے زیادہ نقصان میں رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غلط کام کرتے ہیں وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا (۱۸/۱۰۴)۔ لیکن سمجھتے ہیں کہ ہم بڑی نیکیاں کما رہے ہیں۔ لیکن یہ نیکیاں مصنوعی ہوتی ہیں، حقیقی نہیں ہوتیں"۔ نتیجہ اس کا یہ کہ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا (۱۸/۱۰۵)۔ "ان کے اعمال بالکل رائیگاں جاتے ہیں —— ایسے رائیگاں کہ ظہورِ نتائج کے وقت ان کے تولنے کے لئے میزان تک کھڑی کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی" —— غور کیجئے! یہاں ان لوگوں کا ذکر نہیں، جنہوں نے کوئی کام نہیں کیا، جو بے عمل تھے۔ ذکر ان لوگوں کا ہے جنہوں نے بہت سے کام کئے۔ بڑی جگر پاش مشقتیں اٹھائیں، جانکاہ صعوبات برداشت کیں، یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ بڑے ثواب کے کام ہیں۔ لیکن چونکہ وہ فریب میں مبتلا تھے اس لئے ان کی ساری مشقتیں اور محنتیں رائیگاں گئیں۔ یہ ایسی ملمع شدہ نیکیاں تھیں کہ جب انہیں حقیقت کا ایک تاؤ دیا گیا تو ان کا اصلی کھوٹ ابھر کر سامنے آگیا۔ اس قسم کی مصنوعی نیکیوں کی ایک محسوس مثال بھی قرآن کریم نے دی ہے۔ اس نے الصلوٰۃ کے متعلق کہا ہے کہ: إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ (۲۹/۴۵)۔ "الصلوٰۃ"

مصنوعی صلوٰۃ کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ انسان اور معاشرہ ہر قسم کی بے حیائیوں اور بدکرداریوں سے پاک اور صاف ہو جائے گا اور قانونِ خداوندی تمام انسان ساز قوانین پر غالب آ جائے گا" اگر الصلوٰۃ کا یہ نتیجہ سامنے آتا ہے تو وہ حقیقی صلوٰۃ اور سچی نیکی ہے لیکن اگر ایسا نہیں ہوتا تو انسان ہزار نمازیں پڑھتا رہے، اس کا یہ عمل مبنی بر حقیقت قرار نہیں دیا جائے گا۔ اس کے لئے قرآن نے کہا ہے: وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ (۲۹/۴۵)" جس قسم کی تم مصنوعی نماز پڑھتے ہو اور اللہ کا ذکر کرتے ہو اس سے ہم خوب واقف ہیں۔ یہ سب اعمال بے نتیجہ ہیں۔ تمہاری صنعت گری ہے۔ میزانِ خداوندی میں ان کا پر کاہ جتنا بھی وزن نہیں" اسی قسم کے نمازیوں کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ (۱۰۷/۱)" تو نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جو دین کی تکذیب کرتے ہیں؟" یعنی یہ لوگ دین کے منکر نہیں۔ کافر اور غیر مسلم نہیں۔ یہ دین کا زبان سے اقرار کرتے ہیں۔ اس کے ارکان کی بھی پابندی کرتے ہیں۔ لیکن محض رسمی۔ یہ نماز بھی پڑھتے ہیں لیکن فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (۱۰۷/۴-۷)" تباہی ہے ایسے نمازیوں کے لئے جو نماز کے محسوس رسمی ارکان کو (جو دوسروں کو نظر آ جاتے ہیں) تو بڑے حزم و احتیاط سے ادا کرتے ہیں لیکن صلوٰۃ کے مقصد اور غایت سے بے خبر رہتے ہیں۔ نماز کی اس شدت کے ساتھ پابندی بھی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ رزق کے ان سرچشموں پر، جنہیں بہتے پانی کی طرح ہر ضرورت مند کیلئے یکساں طور پر کھلا اور رواں دواں رہنا چاہیے، بند باندھ دیتے ہیں کہ وہ انہی کے تصرف اور ملکیت میں رہیں اور دوسرے ضرورت مند ان سے مستفید نہ ہو سکیں" یہ ہے وہ صلوٰۃ، جسے "مَا تَصْنَعُوْنَ" (مصنوعی) کہہ کر تباہی کا موجب قرار دیا گیا ہے۔

ضمناً۔ آج کل یہ بحث عام ہو رہی ہے کہ "قرآنی نماز" کون سی ہے اور اس کے لئے کہا یہ جا رہا ہے کہ قرآن کریم میں اتنے وقتوں کی نماز کا حکم ہے۔ ہر نماز میں اتنی رکعتیں اور ہر رکعت میں اتنے سجدے[1] اس نماز کو قرآنی صلوٰۃ کہا جاتا ہے اور جو نمازیں دوسرے مسلمان پڑھتے ہیں وہ غیر قرآنی صلوٰۃ۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ صلوٰۃ کا جو نتیجہ قرآن کریم نے بتایا ہے وہ نہ اس نماز سے حاصل ہوتا ہے نہ اس نماز سے۔ قرآنی صلوٰۃ وہ ہے جس سے معاشرہ سے بے حیائی اور بدکرداری ختم ہو جائے اور قانونِ خداوندی کی بالادستی قائم ہو۔ جس صلوٰۃ سے یہ نتیجہ مرتب نہ ہو وہ قرآنی صلوٰۃ نہیں کہلا سکتی۔ قرآن کی رُو سے "مَا تَصْنَعُوْنَ" کے ذیل میں آتی ہے۔ قرآن کریم نے اس عظیم حقیقت کو ان بصیرت افروز اور عبرت آموز الفاظ میں نمایاں

---

[1] فرقہ اہل قرآن، جس کا ذکر مطالب الفرقان جلد اوّل میں آ چکا ہے، اس نماز کو قرآنی صلوٰۃ کہہ کر پکارتا ہے۔

کیا ہے کہ: لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ ۔ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ ..... (۲/۱۷۷)۔
نیکی (اور کشادگی کی راہ) یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ بر و تقویٰ کی راہ یہ ہے کہ تم ایمان کے
بعد کس ایثار اور حسنِ کردار کا مظاہرہ کرتے ہو۔ جو ایسا کرتے ہیں وہ اپنے دعویٔ ایمان کو سچ کر دکھاتے ہیں۔ انہی کو متقی
کہا جائے گا۔ قرآن کریم نے اسی مقام پر رسمیات (FORMALISM) اور غرض و غایت کے فرق کو نمایاں کرکے بتا دیا ہے۔
مقصد، احکامِ خداوندی کی غرض و غایت کو پورا کرنا ہے جس کی پرکھ ان نتائج سے ہوتی ہے جن کی خود قرآن نے وضاحت
کر دی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ دین کے عملی نظام میں احکام کے ارکان اور محسوس مظاہر بھی اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔
لیکن یہ چیزیں دین کی غایت اور مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں، مقصود بالذات نہیں۔ لیکن "مذہب" میں یہی مظاہر،
مقصد بن جاتے ہیں۔ اور مقصد نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ احکام کی غایت اور ان کی محض رسمی ادائیگی کا یہی وہ
فرق ہے جسے اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل ⁂ یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست ⁂ یہ مذہبِ مُلّا و نباتات و جمادات

یہ ہیں وہ بے نتیجہ اعمال، جنہیں شیطان مزین بنا کر دکھاتا رہتا ہے ـــــ علامہ اقبالؒ نے ابلیس کے اس حربے کو اس نظم
میں بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے جس کا عنوان ہے ـــــ ابلیس کی مجلس شوریٰ ـــــ اور جو ان کے آخری مجموعۂ کلام
ـــــ ارمغانِ حجاز ـــــ کے حصۂ اردو میں شامل ہے۔ اس میں بات یوں چلی آ رہی ہے کہ ابلیس کے مشیر اس سے کہتے
ہیں کہ ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ زمانے کے تقاضوں سے یہ امتِ مسلمہ بیدار ہوتی جا رہی ہے اور ہمیں ڈر یہ ہے کہ کہیں پھر
سے نظامِ خداوندی کو قائم نہ کر دے جس سے ہمارا خاتمہ ہو جائے۔ ابلیس اُن سے کہتا ہے کہ تمہارا یہ احساس بالکل بجا ہے لیکن
میں تمہیں ایک ایسا گُر بتاتا ہوں جس سے یہ امت کبھی بیدار نہیں ہوگی۔ وہ گُر یہ ہے کہ ان کے غلط اور مصنوعی اعمال کو ان کی
نگاہوں میں ایسا حقیقی بنا کر دکھاؤ کہ یہ اس فریب میں گم رہیں اور ان نظریات و رسوم میں در متشدد ہوتے چلے جائیں۔ تم
انہیں ان مسائل میں اُلجھائے رکھو کہ:۔

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے ⁂ ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جُدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے ⁂ یا مجدد، جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات

ان نظری مسائل میں اُلجھا کر:

تم اِسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے ⁂ تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

اور اس کا عملی طریق یہ ہے کہ:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے ٭ پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

آپ اُمتِ مسلمہ کے احوال و کوائف پر غور فرمائیے اور پھر دیکھئے کہ ابلیس کا یہ حربہ کس قدر کامیاب ثابت ہو رہا ہے جس کی رو سے وہ ایک غلط اور بے نتیجہ اعمال کو مزین بنا کر دکھاتا چلا آ رہا ہے۔ جب تک ہم اس فریبِ نفس میں مبتلا رہیں گے ہماری حالت کبھی سنور نہیں سکے گی —— یعنی دین کی طرف آنے کے لئے "مذہب" سے نجات حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔

احکام کے نتائج

قرآن کریم نے ابلیس کے اس حربہ کو ناکام بنانے کے لئے کیا یہ کہ جہاں کوئی حکم دیا اس کے ساتھ ہی بتا دیا کہ اس پر عمل کرنے سے نتیجہ کیا برآمد ہوگا (اِسے کتاب و حکمت کہتے ہیں۔ یعنی احکام اور ان کی غرض و غایت)۔ اگر کسی حکمِ خداوندی پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ وہی نکلتا ہے جو خدا نے (اپنی کتاب میں) بتایا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس حکم پر منشائے خداوندی کے مطابق عمل ہو رہا ہے (اسے دین کہا جائے گا) لیکن اگر اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو یا وہ نتیجہ برآمد نہ ہو جو قرآن کریم نے بتایا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس حکم کی تعمیل منشائے خداوندی کے مطابق نہیں ہو رہی۔ اگر ہم اس مقام پر کھڑے ہو کر سوچتے نہیں کہ ہم سے کہاں غلطی ہو رہی ہے جو اس عمل کا قرآنی نتیجہ مرتب نہیں ہو رہا، بلکہ مطمئن ہو کر بیٹھے رہتے ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ عین منشائے خداوندی کے مطابق ہے اور اسی طرح پر عمل کرتے چلے جاتے ہیں تو (قرآنی الفاظ میں) اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان ہمارے غلط اعمال کو مزین بنا کر دکھا رہا ہے۔ اور ہم اس فریب میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہم نیک کام کر رہے ہیں (اسے مذہب کہا جاتا ہے) یہی وہ اعمال ہیں جن کا میزانِ خداوندی میں کوئی وزن نہیں ہوگا۔

اور یہاں سے ہم ایک اور اہم نکتہ کی طرف آ جاتے ہیں۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ عیسائیت کے پھیلاتے ہوئے عقیدہ کی رُو سے انسان کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ شیطان کی گرفت سے آزاد ہو جائے۔ اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ دورِ حاضر کی علمی تحقیق نے اس عقیدہ اور جبریت کے نظریہ کو باطل قرار دیدیا ہے۔ اور اب وہ اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ انسانی ذات میں اس امر کی صلاحیت موجود ہے کہ وہ حیوانی جذبات کی بیباکیوں پر غالب آ جائے۔ یہ وہ حقیقت کتنا اور انقلاب انگیز صداقت ہے جس کا اعلان، قرآن کریم نے آج سے چودہ سو برس پہلے کر دیا۔ اسے اس نے قصۂ ابلیس و آدم میں بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ ابلیس چیلنج پر چیلنج دیتے چلا جاتا ہے کہ میں ابنِ آدم کو اس طرح گمراہ کر دوں گا اور اس طرح تباہ کر دوں گا۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب یوں ملتا ہے کہ تیری ان تمام سازشوں کے باوجود اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ

ابلیس پر غالب آنے کی صلاحیت

سُلْطٰنٌ (۱۵/۴۲) "میرے بندوں پر تیرا کوئی غلبہ و تسلط نہیں ہو سکے گا۔ جو میرے قوانین و اقدار کی محکومیت اختیار کریں گے تو ان پر کبھی غالب نہیں آ سکے گا۔"

اِس کا اعادہ مختلف مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً (۱۵/۴۲؛ ۱۷/۶۵؛ ۳۸/۸۲)۔ ایک مقام پر اس کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ ابلیس کی سازشیں کتنی ہی گہری اور اس کے حربے بظاہر کتنے ہی محکم کیوں نہ ہوں، وہ خدا کے مخلص بندوں کے سامنے تارِ عنکبوت سے زیادہ مضبوط ثابت نہیں ہوں گے۔ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا (۴/۷۶)۔ "شیطان کے مکر و فریب بڑے کمزور ہوتے ہیں۔"

نفسِ انسانی کی انہی صلاحیتوں کو قرآن کریم نے اس کی تین کیفیات سے تعبیر کیا ہے۔ ایک جگہ کہا ہے کہ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ (۱۲/۵۳)۔ "یہ حقیقت ہے کہ انسان کا نفس اُسے بُرائی کے لئے اکسا تا رہتا ہے لیکن اس سے وہ لوگ محفوظ رہتے ہیں جو خدا کے سحابِ رحمت کے سائے تلے آجاتے ہیں۔" یہ اگرچہ (قصہ حضرت یوسفؑ میں) عزیزِ مصر کی بیوی کا قول ہے لیکن قرآن نے اس کی تردید نہیں کی اور جس انداز سے اس نے نفسِ انسانی کی وساوس انگیزیوں کا ذکر کیا ہے "اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خود انسان کے اپنے غلط فیصلے اُسے غلط راہیں اختیار کرنے کے لئے اکساتے رہتے ہیں۔ اسی کو نفسِ اَمّارہ کہا گیا ہے۔ اس کی دوسری حالت کو لَوَّامَة (۷۵/۲) کہکر پکارا گیا ہے۔ یہ انسانی ذات کی وہ کیفیت ہے جس میں اس کے اندر خیر و شر کی کشمکش بیدار ہوتی ہے۔ پہلے وہ ایک غلط فیصلہ کر بیٹھتا ہے۔ جب اُسے اس کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنے کیے پر نادم ہوتا ہے ــــــ یاد رکھئے! احساسِ ندامت بھی انسان کی خصوصیت ہے۔ حیوانات میں ندامت کا جذبہ نہیں ہوتا۔ حیوانات کیا، جو بھی کسی روش پر چلنے کے لئے مجبور پیدا کیا گیا ہو، اس میں احساسِ ندامت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو اپنے فیصلے کی غلطی کا احساس ہے جس سے ندامت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔

نفسِ انسانی کی تین کیفیتیں

یہ بہرحال نفسِ انسانی کی کشمکش کی کیفیت ہے۔ اور جب اس کی خیر کی قوت، شر کی قوت پر غالب آجاتی ہے تو اُسے اس کشمکش سے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ اسے قرآن کریم نے اَلنَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ (۸۹/۲۷) کہکر پکارا ہے۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں اسے متوازن ذات (BALANCED PERSONALITY) کہا جائے گا۔ لیکن یہ اطمینان وہ فریبِ نفس نہیں، جس میں شیطان غلط اعمال کو مزیّن بنا کر انسان کو دھوکے میں رکھتا ہے۔ یہ اطمینان وہ ہے جو کسی مریض کو شفایاب ہونے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ تندرستی کا اطمینان اور ہے اور اسپرین کھا کر درد سے (بظاہر) چھٹکارا حاصل کر لینے کا اطمینان اور۔

آپ نے دیکھا کہ قرآنِ کریم نے نہ انسانی جذبات کو مذموم اور قابلِ نفرت قرار دیا ہے۔ نہ ان کے فنا کرنے کا حکم دیا ہے ــــــ یہ جو ہمارے ہاں تصوف میں نفس کشی کو جہادِ اکبر قرار دیا جاتا ہے، یہ تصور خلافِ قرآن بھی ہے اور عملاً ناممکن بھی۔ انسانی جذبات کو فنا کیا ہی نہیں جا سکتا۔ انہیں (زیادہ سے زیادہ) دبایا جا سکتا ہے۔ اور ان کے دبانے سے انسان

ایسے نفسیاتی امراض کا شکار ہو جاتا ہے جن کے نتائج فرد اور معاشرہ دونوں کے لئے بڑے تباہ کن ہوتے ہیں۔ انہیں دبایا جائے تو یہ اپنی نمود اور کار فرمائی کے لئے غیر فطری راہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ اسے نفسیاتی اصطلاح میں بدنہادی یا (PERVERSION) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس قسم کے نفسیاتی عوارض اور اخلاق کا باہمی تعلق کیا ہے، اس کے متعلق علمائے نفسیات کی تحقیق ملاحظہ فرمائیے (ERICH FROMM) لکھتا ہے:-

> نفسیاتی صحت اور نفسیاتی عوارض کا مسئلہ اخلاقیات کے ساتھ اسطرح وابستہ ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر نفسیاتی عارضہ کسی نہ کسی اخلاقی مسئلہ کا مظہر (یا نمائندہ) ہوتا ہے۔ "ہیومن ازم" کے ضابطۂ اخلاق کی رو سے انسانی ذات کی تکمیل و محکمیت میں ناکامی، بجائے خویش اخلاقی ناکامی ہے۔ اس سے بھی زیادہ متعین الفاظ میں، نفسیاتی عوارض کسی نہ کسی اخلاقی مسئلہ کے مظاہر ہوتے ہیں اور نفسیاتی علامات، اخلاقی کشمکش کے حل نہ کرنے کا نتیجہ۔
>
> (MAN FOR HIMSELF P.224)

قرآن کریم نے منافقین کے متعلق جو کہا ہے کہ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ (۲/۱۰)۔ "ان کے دلوں میں مرض ہوتا ہے"۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۲/۱۰)۔ "اور اس کی وجہ سے بڑے الم انگیز عذاب میں مبتلا رہتے ہیں" تو اس سے مذکورہ صدر حقیقت واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے۔ منافقت اخلاقی کمزوری ہے اور اس سے کئی قسم کے نفسیاتی امراض پیدا ہو جاتے ہیں اس کے ساتھ ہی قرآن میں ہے: وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ (۲/۹)۔ "منافقین فریب نفس میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ شعوری طور پر انہیں اس کا علم نہیں ہوتا"۔ اس مرض کے حقیقی اسباب و علل ان کے تحت الشعور میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔

آپ دیکھئے کہ "انفس و آفاق کی نشانیاں" کس طرح قرآنی حقائق کی صداقتوں کی شہادت بنتی چلی جا رہی ہیں۔

بہرحال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ قرآن کریم نے کہا یہ ہے کہ انسانی جذبات کی تسکین ضرور کی جانی چاہیئے، لیکن ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، جنہیں اقدار خداوندی کہا جاتا ہے۔ اس باب میں حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک قول منسوب کیا جاتا ہے جو (میری قرآنی بصیرت کے مطابق) واقعی حضور کا قول ہو سکتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ حضورؐ نے ایک دفعہ فرمایا کہ ہر انسان کا ایک ابلیس ہوتا ہے صحابہ نے عرض کیا کہ کیا حضورؐ کا بھی ابلیس ہے؟ ارشاد ہوا، ہاں میرا بھی ابلیس ہے لیکن میں نے اسے مسلمان کر رکھا ہے۔

اِسی بصیرت افروز حقیقت کو اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است ❊ زانکہ اُو گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کُنی　　کشتۂ شمشیرِ قرآنش کُنی

اس مقام پر ہمارے سامنے برٹرینڈ رسل کا ایک واقعہ آتا ہے۔ رسل کا شمار عصر حاضر کے ممتاز ترین مفکرین میں ہوتا ہے، اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ بڑا متشدد دھریہ (ATHEIST) تھا۔ اور عیسائیت کے خلاف مجسم بغاوت اس کی کتاب (WHY I AM NOT A CHRISTIAN) نے کلیسا کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ بایں ہمہ، اس نے اپنی خودنوشت سوانح عمری کی تیسری جلد میں (جو اس کی زندگی کے آخری دور ۱۹۴۴ —— ۱۹۶۹ کے حالات پر مشتمل ہے) اپنا ایک واقعہ لکھا ہے جو ہمارے زیر نظر موضوع کے اعتبار سے بڑا غور طلب اور عبرت آموز ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

> میں اس سے پہلے کبھی یونان نہیں گیا تھا۔ وہاں میں نے جو کچھ دیکھا وہ انتہائی دلکش تھا۔ اس خطۂ زمین کی اُن محسوس کامرانیوں کے مظاہر کو دیکھنے کے بعد، جو ہر صاحب نظر سے خراج تحسین حاصل کر لیتی ہیں، میں ایک چھوٹے سے گرجا کی طرف چلا گیا جو اُس زمانہ میں تعمیر ہوا تھا جب یونان (عیسائیت کا مذہب اختیار کرنے کے بعد) بازنطینی حکومت کا حصہ بن چکا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس گرجا میں، میں غیر شعوری طور پر اپنے اندر ایک ایسی راحت اور سکون محسوس کر رہا تھا جو اس یونان کی عظیم عمارتوں میں نہیں محسوس ہوئی تھی جو اُن کے عہد اصنامیات کی یادگار تھے۔ اس سے مجھے محسوس ہوا کہ عیسائی زاویۂ نگاہ کی میرے قلب پر، میرے اندازہ و تصور سے کہیں زیادہ عمیق گرفت ہے۔ یہ گرفت میرے معتقدات پر نہیں تھی۔ میرے جذبات اور احساسات پر تھی۔ اس سے مجھے یہ دکھائی دیا کہ عہد پارینہ کا یونان، عصر حاضر سے جس باب میں مختلف (اور ممتاز) تھا وہ یہ تھا کہ انہیں (عیسائیت قبول کرنے سے پہلے) گناہ کا احساس نہیں تھا اور مجھے یہ محسوس کر کے بڑا ہی تعجب ہوا کہ احساسِ گناہ کے عقیدہ کا خود مجھ پر کس قدر گہرا اثر تھا۔ اگرچہ وہ اثر میرے نظریات اور معتقدات پر نہیں، میرے احساسات و جذبات پر تھا۔ (صـــ ۸۲-۸۳)۔

برٹرینڈ رسل جیسے انقلابی مفکر کی یہ کیفیت تھی کہ وہ عمر بھر عیسائیت کے خلاف برہنہ شمشیر رہا۔ لیکن عیسائیت کے بنیادی عقیدہ (اولین گناہ) کا اثر کس طرح اس کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکا تھا کہ وہ اپنی عمر کے آخری ایام تک اس سے نجات حاصل نہ

کرسکا۔ وہ اس کے تحت الشعور میں جاگزیں رہا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ابلیس کس طرح اعماقِ قلب میں گم رہتا ہے۔ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ "ایمان باللہ" تک آنے کے لئے، پہلے "کفر بالطاغوت" ضروری ہے، (۲/۲۵۶) تو اس سے مراد یہی ہے کہ جب تک باطل عقائد و تصورات کو دل کی گہرائیوں سے دور نہ کیا جائے، انسان صداقت اور حقیقت پر ایمان نہیں لا سکتا۔ رسلؔ کے اس واقعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مذہب کے باطل عقائد کی گرفت کس قدر محکم اور مضبوط ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب پرست قوم کا دین کی طرف آنا، ناممکن نہیں تو سخت دشوار ضرور ہوتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ اسلام جیسا مجسم صداقت دین اور حضور نبی اکرمؐ جیسے پیکرِ صداقت، اس دین کے پیش کرنے والے، لیکن بایں ہمہ، مدینہ کے یہودیوں اور عیسائیوں نے اسے قبول نہ کیا۔ یہ اس لئے کہ ان پر مذہب کی گرفت بڑی شدید تھی۔ ان کے برعکس، مکہ کے قریش اس کی آغوش میں آتے چلے گئے۔ اس لئے کہ وہ، اگرچہ بُت پرست تھے، لیکن کسی مصطلحہ مذہب کے پیرو نہیں تھے۔

اس سے ہمیں اس حقیقت کے سمجھنے میں بھی مدد ملے گی کہ آج کا مسلمان (بلکہ صدیوں پیشتر تک کا بھی) قرآن کی آواز کی طرف لبیک کیوں نہیں کہتا؟ ان کی "مذہب پرستی" ان کے راستے میں حائل ہے۔

یہ ضمنی گوشہ تھا۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ جذبات کو فنا نہیں کیا جا سکتا انہیں قرآنی احکام و اقدار کے تابع رکھا جا سکتا ہے۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے کہا کہ شیطانی وساوس گھومتے گھماتے مؤمنین کے سامنے بھی آتے ہیں لیکن .... اس "لیکن" کیلئے قرآن کے الفاظ دیکھئے۔ فرمایا:-

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَيْفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ (۷/۲۰۱)۔

قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنیوالوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کہیں شیطان کا کوئی خیال گھومتے گھماتے ان کے دل میں آ جائے تو وہ فوراً قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے لے آتے ہیں۔ اس سے یوں ہو جاتا ہے جیسے تاریکی میں یکایک روشنی آ گئی اور انہیں صاف صاف نظر آنے لگ گیا کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟[1] اس سے وہ ابلیس کی فریب کاریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ اسی کا نام ابلیس کو مسلمان کرنا یا اسے "قرآن کی شمشیر سے ذبح کرنا ہے"۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے چیلنج کے جواب میں یہ کہہ کر پیش کیا تھا کہ میرے مخلص بندوں پر تیرا کوئی حربہ کارگر نہیں ہو سکے گا۔

شیطان اور ابلیس دونوں الفاظ | ہم نے شروع میں کہا ہے کہ قرآن کریم نے شیطان کے لئے، شیطان اور ابلیس دونوں الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اس کی وجہ، اس سے پہلے سمجھ میں نہیں آ رہی

[1] یہی وہ "برہانِ رب" تھی جو ایک نہایت نازک مرحلہ پر حضرت یوسفؑ کے سامنے آ گئی تھی (۱۲/۲۴)۔

تھی لیکن اب علم النفس کے انکشافات نے اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھا دیا ہے۔ علمائے علم النفس نے اب ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے۔ جسے (FRUSTRATION—AGGRESSION THEORY) کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے جذبات کی شدت میں صحیح قوانین سے سرکشی برت کر غلط قدم اٹھا لیتا ہے۔ اس کے بعد جب اس کے نتائج و عواقب سامنے آتے ہیں تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس لئے سرکشی اور مایوسی انسانی اقدام کے دو گوشے یا رُخ ہوتے ہیں جو باہمدگر لازم و ملزوم ہیں۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ قرآن کریم نے اس کے لئے شیطان اور ابلیس کے الفاظ کیوں استعمال کئے ہیں۔ ابلیس اور شیطان ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ انسان کی کیفیت ہی یہ ہے: وَإِذَآ أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَىٰ بِجَانِبِهِۦ ۖ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوسًا (۱۷/۸۳)۔ "جب انسان کے حالات مساعد ہوتے ہیں تو قوانین خداوندی سے اعراض برتتا اور بے رخی اختیار کرتا ہے۔ اور جب اس کے اس طرزِ عمل کے نتیجہ میں، حالات نامساعد ہو جاتے ہیں تو وہ پھر مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے"۔ ——— یہی شیطنت اور ابلیسیت ہے۔ جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے "ابلیس" مایوسی کا مظہر ہے۔ اور شیطان سرکشی کا شعلۂ بیباک۔

اب ہم قصۂ ابلیس و آدم کی طرف آتے ہیں جس کی تمہید کے لئے اتنی تفصیلی گفتگو کی ضرورت لاحق ہوئی۔ لیکن اس کے لئے ابھی تھوڑے انتظار کی مزید زحمت برداشت کرنی ہوگی۔ تاکہ ہم پہلے ان اصطلاحات کا مفہوم سامنے لا سکیں جو اس داستان میں استعمال کی گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے لفظِ **آدم** کو لیجئے:-

آدم

لغت کی رُو سے اُدْمَۃٌ کے معنی ہیں قرابت، موافقت اور مل جل کر رہنے کی صلاحیت۔ یہیں سے لفظ آدم ہے۔ حکمائے یونان نے جو انسان کو مدنی الطبع حیوان (SOCIAL ANIMAL) قرار دیا تھا، تو آدم کا لفظ اس کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ اسی آدم کی طرف نسبت سے عربی لفظ آدَمِیٌّ ہے۔ عام بول چال میں اسی کو آدمی کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں جہاں آدم یا بنی آدم کے الفاظ آئے ہیں، ان کی جگہ اگر آدمی کا لفظ رکھ دیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے ہمارے ہاں بھی، (محرف) تورات کے زیر اثر، عام مشہور یہی ہے کہ قرآن کریم میں بیان کردہ قصۂ آدم، ایک جوڑے (آدم اور حوّا) کی داستان ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ یہ کسی فرد یا ایک جوڑے کی داستان نہیں، بلکہ یہ خود "آدمی" کی سرگزشت ہے جسے قرآن کریم نے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ اس داستان کا آغاز انسان کی اس حالت سے ہوتا ہے جب اس نے قدیم انفرادی زندگی کی جگہ پہلے پہل تمدنی زندگی شروع کی۔ یعنی قدیم قبائل کی شکل میں

قرآن کریم کی متعدد آیات ایسی ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ آدم سے مُراد، انسان یا بشر ہے۔ اور قصّۂ آدم کسی ایک جوڑے کی داستان نہیں بلکہ یہ خود انسان کی سرگزشت ہے جسے قرآن کریم نے بڑے لطیف اور دلکش محاکاتی (ڈرامائی) انداز سے بیان کیا ہے۔

یہ آدمی ہی کی سرگزشت ہے

سورۃ الحجر میں انسان کی تخلیق سے بات شروع کی گئی ہے (15/26) اور اس کے بعد کہا گیا ہے: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي خَالِقٌۢ بَشَرًا (15/28)۔ "جب تیرے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں ایک بشر پیدا کر رہا ہوں"۔ اور اس کے بعد قصۂ آدم سامنے لایا گیا ہے، کہ کس طرح اُسے ملائکہ نے سجدہ اور ابلیس نے انکار کیا (15/28-29)۔ اس سے اگلی آیات میں ہے کہ ابلیس نے کہا کہ مجھے اس "آدم" کی وجہ سے راندۂ درگاہ کیا جا رہا ہے لیکن آپ دیکھئے گا کہ میں کس طرح لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ (15/39)۔ "ان سب کو غلط راہوں پر ڈالتا ہوں"۔ یہاں هُمْ جمع کی ضمیر ہے جس کے معنی تمام انسان ہیں اور پھر لفظ "اجمعین" نے اس کی مزید وضاحت کر دی ہے کہ "ایک فرد (آدم) یا ایک جوڑے (آدم اور حوّا) کا قصہ نہیں، تمام نوعِ انسان کی داستان ہے۔ (نیز دیکھئے 38/71-82)۔

سورۃ بقرۃ میں اس داستان کی ابتدا "آدم اور اس کی بیوی" سے ہوتی ہے۔ جن کے لئے عربی قاعدے کی رو سے تثنیہ کا صیغہ استعمال کیا گیا (2/35)۔ لیکن اس کی اگلی ہی آیت میں ہے: وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلٰى حِينٍ (2/36)۔ "ہم نے ان سب سے کہا کہ تم زندگی کی بلند سطح سے نیچے گر چکے ہو جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم میں سے ایک، دوسرے کا دشمن ہوگا۔ تمہیں کچھ وقت کے لئے کرۂ ارض پر قیام کرنا ہوگا"۔ اس سے اگلی آیت میں ہے کہ آدم نے خدا سے کچھ ہدایات پائیں اور توبہ کی (2/37)۔ لیکن اس کے بعد پھر جمع کا صیغہ ہے اور اس میں "جَمِيعًا" کا لفظ بھی آیا ہے۔ اس کے بعد کہا ہے: فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (2/38)۔ "تمہاری طرف میری جانب سے ہدایت آتی رہے گی، جو ان ہدایات کا اتباع کریں گے انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن"۔ بعینہٖ یہی اسلوب، آیات (7/19 و 7/24) میں اختیار کیا گیا ہے اور اسی طرح کے صیغے وہاں بھی استعمال کئے گئے ہیں۔

مذکورہ بالا دو آیات میں تو انسان یا بشر یا آدم کی تخلیق کا ذکر ہے۔ سورۃ اعراف میں بات بالکل واضح کر دی گئی ہے کہ یہ تذکرہ پوری نوعِ انسان کا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِآدَمَ (7/11)۔ "یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی۔ پھر تمہیں ایک صورت عطا کی"۔ (ان میں "کُمْ"

جمع کا صیغہ ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے مراد پوری کی پوری نوعِ انسان ہے) ۔ اور اس کے بعد ہے کہ "ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو"۔ اس کے بعد پھر اس داستان کو دہرایا گیا ہے جس میں ابلیس کے انکار اور سرکشی کا ذکر ہے، اور ابلیس کے جواب میں جمع کے صیغے آتے ہیں۔ یعنی (لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ (۷/۱۶))۔ اور لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ (۷/۱۷) ۔ اِن آیات سے بھی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قصۂ آدم، بنی نوعِ انسان ہی کا قصہ ہے۔ بعض آیات میں اس کے لئے "بنی آدم" کے الفاظ آتے ہیں۔ مثلاً سورۂ اعراف میں ہے کہ "اے بنی آدم! ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا ہے" (۷/۲۶)۔ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ (۷/۳۱)۔ "اے بنی آدم! اپنی زیبائش و زینت کا خیال رکھو" اور اس سے ذرا آگے ہے: يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۷/۳۵)۔ "اے بنی آدم! (یعنی نوعِ انسان) ہم تمہاری طرف اپنے رسول بھیجیں گے جو تم میں سے ہی ہوں گے۔ وہ تمہارے سامنے ہمارے قوانین پیش کریں گے۔ جو لوگ ان قوانین کی نگہداشت کریں گے اور اپنی حالت کو سنوار لیں گے، انہیں کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا"۔ اس سے بھی بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ بنی نوعِ انسان کے لئے بعض مقامات پر "ذُرّیتِ آدم" کے الفاظ بھی آتے ہیں، مثلاً (۱۹/۵۸ ؛ ۱۷/۶۲)۔

نبوّتِ آدم کا عقیدہ

قرآن کریم میں ایک مقام پر البتہ لفظِ آدم، انبیائے کرام کے ساتھ آیا ہے۔ جہاں کہا ہے اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۳/۳۳)۔ "یقیناً اللہ نے آدم اور نوح اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو ان کی ہم عصر اقوام پر فضیلت دی"۔ یہاں آدم کا ذکر حضرت نوحؑ کیساتھ آیا ہے جس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس سے مفہوم کوئی خاص فرد ہے۔ اور اسی سے یہ کہا جاتا ہے کہ آدم ایک نبی تھے۔ لیکن صرف اتنی بات سے اس نتیجہ پر نہیں پہنچا جا سکتا کہ جس آدم کی داستان قرآن کریم میں آئی ہے، وہ ایک فرد تھا اور فرد بھی نبی۔ پہلی چیز تو یہ کہ آیت (۳/۳۳) میں "اِصْطَفٰی" کا لفظ آیا ہے اور یہ لفظ قرآن کریم میں غیر انبیاء کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً حضرتِ مریم کے متعلق (۳/۴۲) اور خود امتِ محمدیہؐ کے متعلق (۳۵/۳۲) میں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ نہ حضرتِ مریم نبیہ تھیں اور نہ ہی امتِ محمدیہؐ کے افراد نبی۔ نبوت کا تو سلسلہ ہی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکا ہے۔

دوسرے یہ کہ قرآن کریم نے ہر مقام پر سلسلۂ انبیاء کرام کا آغاز حضرت نوح علیہ السلام سے کیا ہے اور دیگر انبیاءؑ کے متعلق کہا ہے کہ وہ ان کے بعد آئے تھے (۴/۱۶۳)۔

اور سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ قصۂ آدم میں کہا گیا ہے کہ خدا نے آدم کو بالتصریح ایک حکم دیا اور آدم نے اس سے معصیت

برتی۔ اس قسم کی معصیت کسی نبی کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ قصۂ آدم میں ہر مقام پر کہا گیا ہے کہ ابلیس نے انہیں (آدم اور اس کی بیوی کو) بہکایا، اور وہ اس کے بہکاوے میں آگئے۔ حضراتِ انبیائے کرام تو ایک طرف (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) ابلیس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ (۱۵/۴۲) "یقیناً میرے بندوں پر تجھے غلبہ حاصل نہیں ہوگا" دیگر مقامات پر عباد کے ساتھ مخلصین کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب خدا کے عام مخلص بندوں پر بھی ابلیس غالب نہیں آسکتا تو ایک نبی پر وہ کس طرح غلبہ حاصل کر سکتا تھا۔

ان تشریحات سے واضح ہے کہ جس آدم کی داستان قرآن کریم میں آئی ہے وہ کوئی نبی نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ آدم کسی قبیلہ کے کسی ممتاز فرد کا نام ہو، کیونکہ عربی زبان میں اِدَامٌ کسی خاندان کے ایسے مثالی فرد کو بھی کہا جاتا ہے جس سے اس کے قبیلہ کو پہچانا جاتا ہے۔

اب رہا یہ کہ قصۂ آدم میں آدم اور اس کی بیوی کا ذکر آیا ہے تو ظاہر ہے کہ جب ہم آدمی کے متعلق گفتگو کریں گے تو اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہوں گے۔ قرآن کریم نے اس قصہ میں عورت کا ذکر خاص طور پر کیوں کیا ہے۔ اس کی وضاحت آگے چل کر سامنے آجائے گی۔

خلیفہ

اس سے اگلی اہم اصطلاح ہے ـــــ خلیفہ ـــــ ہمارے ہاں ایک غلط تصور یہ بھی رائج ہے کہ انسان دنیا میں "خدا کا خلیفہ ہے" (خلیفۃ اللہ فی الارض)۔ یہ تصور بھی قرآن کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی انسان کو "اپنا خلیفہ" نہیں کہا۔ آدم کے متعلق اتنا ہی کہا ہے کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (۲/۳۰) ـــــ اپنا خلیفہ نہیں کہا۔ اس کی تشریح ابھی سامنے آئے گی۔

لفظ خلیفہ کے مادہ (خ۔ل۔ف) کے معنی ہیں کسی کے پیچھے، کسی کے بعد۔ مثلاً ایک قرن کے بعد دوسرا قرن یا ایک نسل کے بعد دوسری نسل۔ ایک قوم جو کسی دوسری قوم کے بعد آئے۔ اس کے لئے ہمارے ہاں صحیح لفظ "جانشین" ہے۔ لہٰذا خلیفہ کے معنی ہیں کسی کا جانشین۔ اور یہ مادہ ان معانی میں قرآن کے متعدد مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً سورۃ الاعراف میں قوم عاد کے متعلق کہا گیا: وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ (۷/۶۹)۔ "تم اس حقیقت کو اپنے سامنے رکھو کہ خدا نے تمہیں قوم نوح کے بعد ان کا جانشین بنایا" حضرت نوحؑ نے اس قوم سے کہا کہ اگر تم نے پیغاماتِ خداوندی پر کان نہ دھرا تو یاد رکھو: وَیَسْتَخْلِفُ

رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ (۱۱/۵۷)۔" خدا تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئے گا۔ یعنی انہیں تمہارا جانشین بنا دے گا"۔ سورۃ الاعراف میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کچھ دنوں کے لئے اپنی قوم سے الگ ہونے لگے تو انہوں نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ (۷/۱۴۲)۔" میرے بعد تم میرے جانشین بننا"۔ اسی سورۃ میں بنی اسرائیل کے متعلق کہا ہے: فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِ هِمْ خَلْفٌ (۷/۱۶۹)۔" ان کے بعد ان کے جانشین ایسے لوگ ہوئے جنہوں نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ان مقامات سے واضح ہے کہ خلیفہ کے معنی ہیں کسی کے بعد اس کا جانشین ہونے والا۔ ظاہر ہے کہ یہ جانشین اُسی کا ہو سکتا ہے جو موجود نہ ہو۔ کسی کی موجودگی میں اس کے جانشین ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انسان کو اگر اللہ کا جانشین (خلیفہ) تسلیم کیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ خدا خود دنیا میں موجود نہیں۔ انسان اس کے بعد اس کا جانشین مقرر ہوا ہے۔ اور خدا کے متعلق ایسا تصور بالبداہت غلط اور باطل ہے۔ تاریخ میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کسی نے "یا خلیفۃ اللہ" کہہ کر پکارا۔ آپ نے اسے فوراً ٹوکا اور کہا کہ میں خلیفۃ الرسولؐ ہوں، خلیفۃ اللہ نہیں ہوں[1]"۔ انسان دنیا میں خدا کی جانشینی کرنے کے لئے نہیں آیا۔ خدا کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے اور اس کے قوانین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے آیا ہے۔ خود قرآن کریم نے، اس کا مقصدِ تخلیق یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (۵۱/۵۶)۔" ہم نے جن و انس کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ ہمارے قوانین کی اطاعت اختیار کریں"۔

انسان سے پہلی مخلوق

انسان درحقیقت ایک ایسی مخلوق کا جانشین ہے جو اس سے پہلے کرۂ ارض پر موجود تھی لیکن اب ناپید ہو چکی ہے۔ سورۃ الحجر میں ہے: وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (۱۵/۲۷)۔" اور انسان سے پہلے ہم نے ایک ایسی مخلوق کو پیدا کیا جسے آتشیں مخلوق کہا جائے گا، اور جو اب تمہاری نگاہوں سے اوجھل (ناپید) ہے"۔ ماہرینِ علم الحیات کی تحقیق یہ ہے کہ زندگی کے سلسلۂ ارتقاء میں اولیں جرثومۂ حیات سے لیکر بن مانس تک کی کڑیاں تو دائرہ تحقیق میں آ گئی ہیں، لیکن بن مانس اور انسان کے درمیان کی ایک کڑی گم ہے۔ اُسے وہ (MISSING LINK) سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایسا نظر آتا ہے کہ آیۂ زیرِ نظر میں اسی گمگشتہ کڑی کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ اس کرۂ ارض پر انسان کی نمود سے پہلے زمین بہت زیادہ گرم تھی اس لئے وہ مخلوق ایسی ہو گی جو نسبتاً تیز حرارت میں بھی زندہ رہ سکتی ہو۔ غالباً اسی نسبت سے قرآن کریم نے اُسے آتشیں مخلوق کہکر پکارا ہے۔

---

[1] کتاب "ابوبکر" مصنفہ محمد حسین ہیکل (اُردو ترجمہ ص۵۸۳)

اِس آیت سے بہرحال یہ واضح ہے کہ قرآن کریم نے جب کہا تھا کہ: اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً (۲/۳۰) تو اس سے مراد یہی تھی کہ ہم اب ایک ایسی مخلوق پیدا کر رہے ہیں جو سابقہ مخلوق کی جانشین ہوگی۔

دنیاوی مملکتوں میں، جانشینی اپنے ساتھ اقتدار لئے ہوئے ہوتی ہے۔ یعنی خلیفہ اس جانشین کو کہیں گے، جسے اقتدارِ مملکت حاصل ہو۔ اسی مفہوم کے پیشِ نظر قرآن کریم نے جماعتِ مومنین سے کہا ہے کہ تم سے پہلی قومیں جادۂ ہدایت سے منحرف ہوگئیں تو انہیں تباہ کر دیا گیا۔ ثُمَّ جَعَلۡنٰکُمۡ خَلٰٓئِفَ فِی الۡاَرۡضِ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ لِنَنۡظُرَ کَیۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ (۱۰/۱۴) "ان کے بعد ہم نے تمہیں دنیا میں ان کا جانشین بنایا ہے تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو"۔ ظاہر ہے کہ خلافت یا جانشینی اقتدارِ مملکت ساتھ لئے ہوتے ہے۔

بااقتدار جانشینی

لہٰذا خلیفہ کے معنی ہوں گے کسی کا بااقتدار جانشین۔ اسی نہج سے حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے کہ: اِنَّا جَعَلۡنٰکَ خَلِیۡفَۃً فِی الۡاَرۡضِ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ بِالۡحَقِّ (۳۸/۲۶) "اے داؤد! ہم نے تمہیں تمہارے پیشروؤں کا خلیفہ (جانشین) بنایا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم لوگوں میں الحق کے مطابق فیصلے کرو۔ (حکومت قائم کرو)"۔

اسی قسم کی جانشینی کو قرآن نے استخلاف فی الارض سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ سورۃ النور میں ہے: وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ (۲۴/۵۵) "تم میں سے جو بھی وحی کی صداقتوں پر ایمان لائے گا اور اس کے مطابق صلاحیت بخش کام کرے گا، اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں استخلاف فی الارض عطا کرے گا۔ جیسا کہ اس نے ان سے پہلی اقوام کو استخلاف عطا کیا تھا"۔

ضمناً، چونکہ جماعتِ مومنین کی صورت میں اس استخلاف کی غرض و غایت یہ بتائی تھی کہ: وَلَیُمَکِّنَنَّ لَہُمۡ دِیۡنَہُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَہُمۡ (۲۴/۵۵) "تاکہ وہ دین متمکن ہو سکے جسے خدا نے تمہارے لئے تجویز کیا ہے"۔ اس لئے یہ استخلاف فی الارض عام بادشاہوں کے استخلاف سے مختص اور متمیز ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں "خلافت" اور "ملوکیت" میں فرق کیا جاتا ہے۔[1]

ملآئکۃ

قصۂ آدم میں ایک اور اہم اصطلاح ملائکہ کی آتی ہے۔ بعض لغویین کا خیال ہے کہ اس لفظ کا مادہ (اَلۡاَکٌ) ہے۔ جس کے معنی پیغام رسانی کے ہیں۔ لیکن دوسرے محققین کا قول ہے کہ اس کا مادہ (مَلَکٌ) ہے جس کے معنی قوت کے

[1] استخلاف فی الارض کے متعلق مطالب الفرقان، جلد اول، آیات (۲/۲۰ ; ۲/۳۰) کی تشریحات ملاحظہ فرمایئے۔

ہیں۔ پیغام رسانی کے سلسلہ میں ملائکہ کا جو ذکر قرآنِ کریم کے مختلف مقامات پر آیا ہے، اُسے متعلقہ مقامات میں بیان کیا جائے گا۔ سرِ دست ہم ان ملائکہ کو لیتے ہیں جو قوت کے مظاہر ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات کو پیدا کیا تو اس کے نظم و نسق کے لئے قوانین وضع کئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو قوتیں، ان قوانین کی رو سے، اس نظم و نسق کائنات کا فریضہ سرانجام دیتی ہیں، انہیں ملائکہ کہکر پکارا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ حٰمٓ میں سمٰوٰت کے متعلق کہا گیا ہے: وَاَوْحٰى فِىْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (۴۱/۱۲)۔ "ہم نے ہر سمار کی طرف اپنا امر وحی کر دیا" اس سے مراد وہ قوانینِ خداوندی ہیں جن کی رو سے اجرام فلکی اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں مصروف ہیں۔ دوسری جگہ ارض و سمٰوٰت دونوں کے متعلق کہا: يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ (۶۵/۱۲)۔ "ان میں خدا نے اپنا امر نازل کر دیا"

مُدبّراتِ اُمورِ الٰہیہ

اور دوسری طرف سورۃ النّٰزعٰت میں فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (۷۹/۵) آیا ہے یعنی "تدبیرِ امور کرنے والے" خارجی کائنات میں ان امورِ الٰہیہ (قوانینِ فطرت) کے مدبّرین سے مراد ملائکہ ہیں۔ سورۃ الاعراف کی آیت (۷/۵۴) میں مختلف عناصرِ فطرت (سمٰوٰت، ارض، شمس و قمر اور نجوم وغیرہ) کے متعلق کہا: مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ (۷/۵۴)۔ "خدا نے انہیں اپنے امر کے تابعِ تسخیر کر رکھا ہے"؛ یعنی یہ سب اس کے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہیں۔ اور اس کے ساتھ کہا: ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (۷/۵۴)۔ "پھر وہ عرش پر مستوی ہو گیا"۔ لغوی طور پر عرش کے معنی تخت کے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ جب یہ لفظ خدا کے لئے استعمال ہو گا تو اس سے مراد اُس قسم کا مادی تخت نہیں ہو گا جس پر بادشاہ بیٹھتے ہیں۔ اس سے مراد اقتدار یا مرکزی کنٹرول ہو گا۔ (نیز دیکھئے ۲/۱)۔ اور دوسری جگہ ملائکہ کے متعلق کہا: وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ (۶۹/۱۷)۔ "وہ تیرے رب کے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں"۔ ایک اور مقام پر ان کے متعلق کہا:

عرش

حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ (۳۹/۷۵)۔ "وہ عرشِ خداوندی کے گرد گردش کرتے ہیں"۔ یعنی يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (۳۹/۷۵)۔ "اپنے نشوونما دینے والے کے نظامِ ربوبیت کو وجۂ حمد و ستائش بنانے کے لئے سرگرمِ عمل رہتے ہیں"۔ اسی "تسبیح" کے متعلق سورۃ الرعد میں ہے: وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ (۱۳/۱۳)۔ سلہ "رعد اور

سلہ علامہ ابنِ قیم نے کہا ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ قرآنِ کریم کی آیت يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ (۱۳/۱۳)۔ میں رعد سے مُراد "ملك من الملئكة موكل بالسحاب"۔ ملائکہ میں سے ایک مَلک ہے جسے بادلوں کے نظام پر مقرر کیا گیا ہے۔

(بحوالہ "فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر" از محمد تقی امینی صاحب صفحہ ۱۲۶)

(دیگر) ملائکہ نظامِ خداوندی کو وجۂ حمد و ستائش بنانے کے لئے سرگرداں رہتے ہیں " ـــــ تسبیح کے معنی ہیں کسی مقصد کے حصول کے لئے بھرپور کوشش کرنا۔ پوری پوری قوت صرف کر دینا۔ قرآن کریم میں اکثر مقامات پر جو آیا ہے کہ: سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (۵۷/۱) ۔ تو اس کے معنی یہی ہیں کہ" کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے وہ سب اس پروگرام کی تکمیل کے لئے جو قوانین خداوندی کی رُو سے ان کے لئے متعین کیا گیا ہے، پوری شدت اور بھرپور توانائی سے مصروفِ عمل ہیں"۔ اسی کو دوسری جگہ" ملائکہ کی تسبیح " کہکر پکارا گیا ہے[1] (۴۲/۵)۔

کائناتی قوتیں، قوانین خداوندی کی اطاعت کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہیں۔ سورۃ النحل میں ہے: وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ. يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۱۶/۴۹-۵۰) ۔" ارض و سموات میں جو کچھ ہے ـــــ خواہ وہ جاندار مخلوق ہو یا ملائکہ ـــــ قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِتسلیم خم کئے ہوئے ہے۔ اور ان سے کبھی سرکشی نہیں برتتے۔ وہ خدا کے غلبہ و تسلّط سے ہمیشہ خائف رہتے ہیں اور جو کچھ انہیں حکم دیا جاتا ہے، بلاچون وچرا اس کی اطاعت کرتے رہتے ہیں"۔

سجدۂ ملائکہ

فطرت کی ان ہی قوتوں (ملائکہ) کے متعلق قصۂ آدم میں کہا گیا ہے کہ وہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ سجدہ ریزی کے معنے ہیں، کسی کے سامنے سرِتسلیم خم کر دینا۔ اس کے تابع تسخیر ہو جانا۔ اسی جہت سے قرآن کریم نے بنی آدم یا نوعِ انسان سے کہا ہے کہ کائنات کی جملہ اشیاء قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دی گئی ہیں تاکہ وہ ان سے اپنے مقصد کے مطابق کام لے سکیں۔ سورۃ حج میں ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ (۲۲/۶۵) ۔" کیا تم اس پر غور نہیں کرتے کہ زمین میں جو کچھ ہے، خدا نے اُسے تمہارے فائدے کے لئے مسخر کر رکھا ہے"۔ دوسری جگہ (۳۱/۲۰) میں، ارض کے ساتھ سماوات بھی آیا ہے۔ اور سورۃ جاثیہ میں ہے: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ. اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۴۵/۱۳) "جو کچھ سماوات اور جو کچھ ارض میں ہے اِن سب کو خدا نے اپنی طرف سے، تمہارے فائدے کے لئے مسخر کر دیا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیں حقیقت تک پہنچنے کی بہت سی نشانیاں ہیں"۔ یہ آدم کے سامنے ملائکہ کا سجدہ ہے[2]۔ یعنی انسان، قوانینِ فطرت کا علم حاصل کر کے، اشیائے فطرت کو مسخر کر سکتا ہے۔ ان اشیاء میں بعض ایسی ہیں جو ایک ہی خاصیت کی حامل ہیں اور بعض وہ، جن میں ایک سے زیادہ خاصیتیں ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم نے

---

[1] مزید تفصیل اگلے باب میں ملے گی۔ [2] مزید تفصیل اگلے باب میں ملے گی۔

ملائکہ کے متعلق کہا: اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۔ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ (۳۵/۱)۔ عام الفاظ میں اس کا ترجمہ ہے " دو دو، تین تین، چار چار بازوؤں والے ملائکہ"۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ " خدا اپنی مشیت کے مطابق، اپنی خلق میں اضافہ بھی کرتا رہتا ہے"۔ سو، کون کہہ سکتا ہے کہ اشیائے کائنات میں کیا کیا اضافے ہوتے رہتے ہیں یا ان میں کتنی ایسی خاصیتیں ہیں جنہیں ابھی تک انسان دریافت نہیں کر سکا۔

قرآن کریم کی بعض آیات سے ایسا بھی مترشح ہوتا ہے کہ ملائکہ، انسانوں میں نفسیاتی اثرات پیدا کرنے کا موجب بھی بنتے ہیں۔ مثلاً بدر کے میدان میں، جماعتِ مجاہدین کو جو اطمینانِ قلب نصیب ہوا تھا، ان کا ذریعہ بھی ملائکہ بتائے گئے ہیں (۳/۱۲۵؛ ۸/۱۰)۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ کیسے ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہم ان مؤثرات کو دیکھ نہیں سکتے۔ ملائکہ کے یہ لشکر، جو جماعتِ مجاہدین کے لئے وجہ اطمینان و سکینت ہوتے تھے، ان کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ: لَّمْ تَرَوْهَا (۹/۲۶؛ ۹/۴۰)۔ " تم انہیں دیکھ نہیں سکتے"۔[1]

یہ کچھ اُن ملائکہ کے متعلق ہے جو کارگہِ کائنات ہیں، امورِ الہیہ کی تدابیر کے لئے مامور ہیں، اور جنہیں ہم نے فطرت کی قوتوں سے تعبیر کیا ہے۔ عالم امر میں یہ مدبراتِ امورِ الہیہ کس طرح کارفرما رہتے ہیں۔ ہم اس کے متعلق نہ کچھ جان سکتے ہیں، نہ کہہ سکتے۔

اتنا اور سمجھ لینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی سکیموں کے بروئے کار لانے کے لئے کسی کا محتاج نہیں۔ یہ قوتیں، جنہیں ملائکہ کہکر پکارا گیا ہے خود خدا کی تخلیق کردہ ہیں اور اسی کے حکم کے مطابق ان امور کو سرانجام دینے پر مامور۔ انسان نے اپنے دورِ جہالت میں، ان قوتوں کو دیوی اور دیوتا قرار دے کر ان کی پرستش شروع کر دی —— ہندوؤں کے ہاں سورج دیوتا۔ چاند دیوتا۔ اندر (بادل) دیوتا۔ اگنی (آگ) دیوی۔ وایو (ہوا) دیوی دھرتی (زمین) ماتا۔ گنگا ماتا وغیرہ۔ دیوی دیوتاؤں کی پرستش اسی توہم پرستی کا نتیجہ ہے۔ عربوں کے ہاں بھی ملائکہ (فرشتوں) کو دیویاں۔ (بلکہ خدا کی بیٹیاں) سمجھا جاتا تھا۔ قرآن کریم نے ان باطل معتقدات کی تردید کی اور ان سب (ملائکہ) کو آدم کے حضور سجدہ ریز بتا کر اس حقیقت کو واضح کیا کہ آدمی ان " دیوی دیوتاؤں" کا ساجد نہیں،

---

[1] یہ جو ہمارے ہاں مشہور ہو گیا کہ ۱۹۶۵ء کی " پاکستان - بھارت" جنگ میں، فرشتے مدد کے لئے آئے، اور لوگوں نے انہیں، کہیں سبز عماموں کے ساتھ، اور کہیں سفید گھوڑیوں پر سوار دیکھا، تو یہ سب انسانی ذہن کے تخیلات اور توہمات تھے۔ جب ملائکہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور جماعتِ صحابہؓ بھی نہیں دیکھ سکتے تھے تو وہ ہم آپ کو کیسے نظر آجائیں گے؟

مسجود ہے۔ اس سے آپ دیکھئے کہ قرآن نے بات کہاں سے کہاں پہنچادی۔ اور مقام آدمیت کس قدر بلند کردیا۔

قرآن کریم نے ملائکہ پر ایمان، اسلام لانے کی شرط قرار دیا ہے۔ اس سے مراد یہی ہے کہ ملائکہ کو دیوی دیوتا ماننے کی بجائے، فطرت کی وہ قوتیں تسلیم کیا جائے جنہیں اللہ تعالیٰ نے آدمی کے تابع تسخیر کردیا ہے۔

اس تمہید کے بعد، اب آیئے قرآن کریم میں بیان کردہ قصہ آدم کی طرف۔ اس میں آپ پر یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ جب تک ان امور اور اصطلاحات کی اس قدر مبسوط تشریح نہ کردی جاتی، قصہ آدم سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا۔

دوسرا باب
آیات ۳۰ تا ۳۹

سرگزشتِ آدم

۱ تخلیقِ آدم
۲ ملائکہ کا اعتراض
۳ علم الاسماء —— تسخیرِ کائنات
۴ کائنات کے متعلق قرآنی نظریہ
۵ سجدۂ ملائکہ —— استکبارِ ابلیس
۶ مسلکِ ابلیسی کی گمراہیاں
۷ جنتِ آدم کی خصوصیات
۸ آدم کی لغزش —— شجرِ ممنوعہ سے مراد
۹ مردوں اور عورتوں کی حیثیت
۱۰ آدم کی بازآفرینی
۱۱ وحی کی راہنمائی کی ضرورت
۱۲ اتباعِ وحی کا نتیجہ —— خوف و حزن سے مامونیت
۱۳ بائبل میں قصۂ آدم
۱۴ اور ہماری کتبِ تفاسیر میں۔

دوسرا باب

سرگزشتِ آدم

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا
مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ　۲/۳۰
قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔

پہلے باب میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کریم میں بیان کردہ قصۂ آدم، کسی ایک فرد (یا جوڑے) کی داستاں نہیں۔ یہ خود آدمی کی سرگزشت ہے جسے قرآن نے تمثیلی طور پر محاکاتی انداز میں بیان کیا ہے۔ تصور میں یوں لائیے کہ بارگاہِ ایزدی میں تین فریق کھڑے ہیں۔ درمیان میں آدم، یعنی آدمیت کا نمائندہ۔ ایک طرف ملائکہ، یعنی فطرت کی قوتیں، جو خدا کے متعین کردہ قوانین کے مطابق اس کے پروگرام کی تکمیل میں سرگرم عمل رہتی ہیں، اور تیسرا فریق، ابلیس یعنی آدمی کے وہ سرکش اور بیباک جذبات جو اقدارِ خداوندی کے ساحلوں میں پابند نہیں رہنا چاہتے۔ بارگاہِ خداوندی سے ملائکہ کو مخاطب کرکے ارشاد ہوتا ہے کہ ـــــ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (۲/۳۰)۔ "میں کرۂ ارض پر ایک نئی مخلوق پیدا کرنے والا ہوں جو اس سے پہلی مخلوق کی جانشین ہوگی"۔ اس پر ملائکہ کا ردِعمل مثبت اور منفی، دونوں حیثیتوں میں سامنے آتا ہے۔ مثبت حیثیت سے تو یہ کہ: نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ (۲/۳۰)۔ اس میں انہوں نے اپنی خدمت گزاری کی روئیداد پیش کی ہے اور کہا ہے کہ ہم اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کس طرح سرگرم عمل رہتے ہیں (نُسَبِّحُ) اور اس کے لئے جس حد تک بھی جانا پڑے جاتے ہیں (نُقَدِّسُ)۔ بالفاظِ دیگر، وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ حضور! کیا ہم سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی واقع ہوئی ہے جو کسی اور مخلوق کی تخلیق کی ضرورت لاحق ہوگئی ہے؟ اگر ایسا ہے تو فرما دیجئے۔ ہم اپنی اس کوتاہی کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور منفی حیثیت سے یہ کہا کہ اس نئی مخلوق کا جو ہیولیٰ ہمارے سامنے آیا ہے، اس میں ہمیں آگ کی چنگاریاں اور خون کے چھینٹے دکھائی دے رہے ہیں، تو کیا کرۂ ارض پر ایسی مخلوق پیدا کی جائے گی جو فساد انگیزیاں اور خون ریزیاں عام کرے! ہماری سمجھ میں تو یہ بات آئی نہیں۔ بارگاہِ خداوندی سے اس کے جواب میں اتنا ہی کہا گیا کہ ہم جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔

ملائکہ نے کہا تھا کہ نَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ (۲/۳۰)۔ اس میں نُسَبِّحُ اور نُقَدِّسُ کے الفاظ غور طلب ہیں۔ تسبیح کے متعلق سابقہ باب میں مختصر اشارات سامنے آچکے ہیں۔ لیکن یہ تصور مزید وضاحت کا متقاضی ہے۔ اس مادہ (س۔ب۔ح) کے بنیادی معنے تیرنے کے ہیں۔ اَلسَّبَّاحُ ایسے تیراک کو کہتے ہیں جو پورے ہاتھ

تسبیح و تقدیس

پھیلا کر تیرے۔ اور اسی نسبت سے اَلسَّوَابِحُ ان گھوڑوں کو کہتے ہیں جو پورے قدم پھیلا کر، انتہائی تیزی سے دوڑیں۔ اس بنیادی مفہوم کی رُو سے سَبْحٌ کے معنی ہوتے ہیں کسی کام کی تکمیل کے لئے پوری پوری تگ و تاز کرنا۔ امکان بھر جدّوجہد کرنا۔ ہر وقت سرگرداں اور سرگرم عمل رہنا۔ چنانچہ آسمانی کرّوں کی تیز خرامی کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ مثلاً سورۃ یٰسین میں ہے: وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسۡبَحُوۡنَ (۳۶/۴۰) و (۲۱/۳۳)۔ "تمام کُرّے اپنے اپنے مدار میں تیرتے پھر رہے ہیں۔"

قرآن کریم کی متعدد آیات میں آیا ہے: سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (۵۷/۱ ؛ ۵۹/۱ ؛ ۶۱/۱)۔ "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر شے خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے انتہائی شدت سے سرگرم عمل رہتی ہے۔" ضمناً، ان ہر سہ آیات کے آخر میں کہا گیا ہے: هُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ۔ یعنی اس خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے جو انتہائی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے۔ لیکن اس کا غلبہ اور تسلط مستبدانہ نہیں بلکہ حکمت پر مبنی ہے۔ یعنی یہ سب کچھ اس کے متعیّن فرمودہ قوانین کی رو سے ہوتا ہے۔ دھاندلی سے نہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے: تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبۡعُ وَالۡاَرۡضُ وَمَنۡ فِيۡهِنَّ۔ وَاِنۡ مِّنۡ شَيۡءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ۔ وَلٰكِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِيۡحَهُمۡ۔ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيۡمًا غَفُوۡرًا (۱۷/۴۴)۔ "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی ہر شے، خدا کے پروگرام کی تکمیل اور اُسے درخورِ حمد و ستائش بنانے کے لئے سرگرم عمل رہتی ہے۔ لیکن تم ان کی اس سرگرمیٔ عمل (تسبیح) کو سمجھتے نہیں۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ یہ کائنات محفوظ رہے۔ اور اس کی حفاظت کے لئے جو قوتیں سرگرم عمل ہوں وہ یونہی بھڑک اٹھنے والی نہ ہوں بلکہ انتہائی دھیمے پن سے اپنے فرائض کو انجام دینے والی ہوں۔"

اسی طرح سورۃ النور میں ہے کہ: اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنۡ فِي السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالطَّيۡرُ صٰٓفّٰتٍ۔ كُلٌّ قَدۡ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسۡبِيۡحَهٗ۔ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِمَا يَفۡعَلُوۡنَ (۲۴/۴۱)۔ "کیا تم نظامِ کائنات پر غور نہیں کرتے کہ اس میں کس طرح ہر شے ——— جمادات اور نباتات ہی نہیں بلکہ پرندوں تک ——— اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی کے لئے سرگرم عمل رہتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی تسبیح اور صلوٰۃ سے اچھی طرح واقف ہے۔ یعنی ہر شے یہ بھی جانتی ہے کہ اس کے فرائضِ منصبی کیا ہیں (صلوٰۃ کے یہی معنی ہیں) اور یہ بھی کہ اس کا دائرہ کار

کونسا ہوتا ہے۔ (تسبیح کا یہ مفہوم ہے)۔ اللہ تعالیٰ کو اس کا بخوبی علم ہوتا ہے کہ یہ اپنے اپنے فریضہ کو کس طرح سرانجام دیتے ہیں۔"

بعض آیات میں اس لفظ کو "استکبار" کے مقابلہ میں لاکر اس کے مفہوم کو اور بھی واضح کر دیا گیا۔ مثلاً سورۃ حٰمٓ میں ہے کہ فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْـَٔمُوْنَ (۴۱/۳۸)۔ "اگر یہ لوگ (یعنی حق کو تسلیم نہ کرنے والے) قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں تو انہیں ایسا کرنے دیجئے۔ اس سے یہ خدائی کائنات کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ اس لئے کہ کائنات کی ہر شے اس کے پروگرام کی تکمیل کے لئے دن رات سرگرمِ عمل رہتی ہے اور ان کا اس سے سرکشی برتنا تو ایک طرف، وہ اس عملِ پیہم اور حرکتِ مسلسل سے تھکتی بھی نہیں۔" سورۃ الاعراف میں اسے اور بھی واضح کر دیا گیا جہاں کہا کہ: اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ (۷/۲۰۶)۔ "خدا کے ہاں، کوئی شے اس کی اطاعت سے کبھی سرکشی نہیں برتتی۔ وہ سب اپنے اپنے فرائض کی تکمیل کے لئے ہر وقت سرگرمِ عمل رہتی ہیں اور خدا کے احکام کے سامنے سجدہ ریز۔"

دنیائے انسانیت میں یہی حکم، حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے، جماعتِ مومنین کو دیا گیا جہاں کہا گیا: فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (۵۶/۷۴) (۵۶/۹۶)؛ (۶۹/۵۲)۔ یعنی "تم خدا کی عظیم صفتِ ربوبیت کو عملاً مشہود کرنے کے لئے سرگرمِ عمل رہو۔" سورۃ الحجر میں ہے: فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ (۱۵/۹۸) "اپنے خدا کی صفتِ ربوبیت کو وجۂ حمد و ستائش بنانے کے لئے سرگرمِ عمل رہو اور اس طرح ان لوگوں کے زمرہ میں شریک ہو جاؤ جو خدا کی محکومیت اختیار کئے ہوتے ہیں۔" یہی جماعتِ مومنین کا شعار بتایا گیا ہے (۴۸/۲۹)۔ یہ پروگرام اتنا طویل، صبر آزما اور دشوار گزار تھا کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا گیا کہ آپ اس (پروگرام) کی تفاصیل اور جزئیات پر غور و فکر کرنے کے لئے راتوں کو زیادہ نہ جاگا کریں۔ اس لئے کہ. اِنَّ لَكَ فِى النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا (۷۳/۷)۔ "تمہارے سامنے دن بھر کا جو پروگرام ہوتا ہے وہ بڑا فرصت طلب ہوتا ہے۔" یہاں بھی سَبْحًا کے معنی واضح ہو جاتے ہیں لیکن اس کے صبر آزما ہونے کے لئے، یہ لفظ جہاں کشمکشِ صاحبِ ضربِ کلیمؑ اور فرعون کے سلسلہ میں آیا ہے وہ بڑا حقیقت کشا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ: اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۲۰/۲۴) "تم فرعون کی طرف جاؤ کہ وہ بڑا ہی سرکش اور مستبد ہوتا جا رہا ہے۔ اسے اس کی ان بیباکیوں سے روکو۔" حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے اس عظیم مہم کی دشوار گزاریوں کے پیشِ نظر چند ایک درخواستیں پیش کیں اور ان کے ساتھ یہ بھی کہا کہ میرے ساتھ

میرے بھائی ہارونؑ کو بھی بھیج دیجئے تاکہ وہ اس پروگرام میں میرا مددگار بنے۔ اور اس کے بعد ہے۔ کَیۡ نُسَبِّحَکَ كَثِيرًا وَّ نَذْكُرَكَ كَثِيرًا (۲۰/۳۳،۳۴)۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "تاکہ ہم وہاں

تسبیح اور ذکر

تیری بہت زیادہ تسبیح کریں اور بہت زیادہ ذکر کریں"۔ اور تسبیح اور ذکر کا جو عام مفہوم ہمارے ہاں لیا جاتا ہے وہ معلوم ہے۔ اس مفہوم کے پیشِ نظر سوچئے کہ کیا اس مہم کے سر کرنے کے لئے یہی کچھ کرنا تھا کہ فرعون کو الٹی میٹم دینے کے بعد، یہ دونوں بھائی اس کے دربار میں پہنچ کر تسبیح پھیرنے لگیں اور "ھُو حق" کی ضربیں لگائیں لیکن تسبیح کا جو قرآنی مفہوم اوپر بیان کیا گیا اس سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ تائید اور امداد اس لئے مانگی تھی کہ وہ اس پروگرام کی تکمیل کے لئے زیادہ قوت اور شدت کے ساتھ سرگرمِ عمل ہوں اور ایک ایک قدم پر اپنی راہنمائی کے لئے خدا کے قانون کو اپنے سامنے لائیں۔ (ذکر کا یہی مفہوم ہے۔ تفصیل اس کی اپنے مقام پر ملے گی)۔

واضح رہے کہ جن معانی میں تسبیح کا لفظ ہمارے ہاں مروج ہے، یہ شے (یعنی دانے پروئی ہوئی تسبیح) عربوں کے ہاں غیر معروف تھی۔ اس کا عیسائی راہبوں کے ہاں رواج تھا جنہوں نے اسے غالباً بدھ مت والوں سے لیا تھا۔ نیز گنتی (یعنی اتنی دفعہ یہ پڑھو، اتنی دفعہ یہ) کا تصور یہودیوں کے ہاں عام تھا۔ جو ہندسوں کے باطنی معانی پر عقیدہ رکھتے تھے۔ ورد وظائف، گنڈے تعویذ، اسمِ اعظم وغیرہ سب انہی کی اختراعات ہیں۔ یہ بہرحال ایک الگ موضوع ہے۔ اس مقام پر ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دین کے تصورات و نظریات "مذہب" میں آ کر کیا سے کیا ہو جاتے ہیں۔

سبحان اللہ

قرآن کریم میں "سبحان اللہ" کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ مثلاً سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُونَ (۳۷/۱۵۹)۔ دُوری کے اعتبار سے اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ذاتِ خداوندی کے متعلق انسانی ذہن جو تصورات بھی قائم کرے، وہ (خدا) اس سے بہت دور، بلند و بالا اور "وراء الورا" ہے۔ سعدی کے الفاظ میں:

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم — وز ہر چہ گفتہ ایم و نویسیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر — ما ہمچناں بہ اوّلِ وصفِ تو ماندہ ایم

ملائکہ نے دوسرا لفظ نُقَدِّسُ کہا تھا۔ اس مادہ (ق۔د۔س) کے معنی ہوتے ہیں دور تک چلے جانا۔ اور اسی سے قَدَّسَهُ کے معنی ہیں "اس نے اس کے تمام نقائص و اسقام کو دور کر دیا"۔ اس لحاظ سے خدا کی صفت قُدُّوسٌ (۵۹/۲۳، ۶۲/۱) کے معنی ہیں "ہر قسم کے نقائص و اسقام سے دور اور منزّہ"۔

تسبیح و تقدیس کے ان معانی کی رو سے ملائکہ نے کہا یہ کہ ہمارے ذمہ جو فرائض عائد کئے گئے ہیں، ہم ان کی ادائیگی کے

لئے ہمیشہ سرگرمِ عمل رہتے ہیں اور اس کے لئے نہیں جہاں تک بھی جانا پڑے، جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کائنات میں اس نئی مخلوق کی ضرورت کیا ہے ——— غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں؟———

فساد انگیزیاں اور خون ریزیاں

یہ تو تھا ملائکہ کے ردِعمل کا مثبت پہلو۔ منفی طور پر انہوں نے کہا کہ جو مخلوق زیرِ تکوین ہے اس کے متعلق تو ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں سمجھ سکے کہ: یُفۡسِدُ فِیۡہَا وَ یَسۡفِکُ الدِّمَآءَ (۲/۳۰)۔ "وہ (آدم) زمین میں فساد مچائے گا اور خون ریزیاں کرے گا"۔ بارگاہِ خداوندی سے اس کی تردید نہیں کی گئی۔ کہا صرف یہ گیا کہ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ (۲/۳۰) "میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"۔ آگے بڑھنے سے پہلے، ہم اس ارشادِ خداوندی کے حسن لطافت کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ اللہ تعالیٰ جیسے قادرِ مطلق اور صاحبِ ملکوت و جبروت کے کسی پروگرام پر ملائکہ جیسی مخلوق کی طرف سے اس قسم کا اعتراض یا ردعمل کس قسم کی سرزنش (بلکہ سزا) کا مستوجب ہونا چاہیئے تھا؟ کوئی دنیاوی حاکم ہوتا تو اپنے زیرِ دستوں کی اس قسم کی گستاخی کے جواب میں انہیں سُولی پر ٹانگ دیتا یا ان کی کھال کھنچوا دیتا۔ ساحرینِ دربارِ فرعون کا اتنا ہی جرم تھا کہ انہوں نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی پیش کردہ صداقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ فرعون کی طرف سے اس کے خلاف کس قسم کے ردِعمل کا اظہار ہوا تھا۔ اس نے گرج کر کہا تھا کہ ہیں! تم میری اجازت کے بغیر ہی ربِّ موسیٰؑ و ہارونؑ پر ایمان لے آئے ہو! تم دیکھو! کہ میں تمہارے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں کٹوا کر تمہیں سولی لٹکاؤں گا (۷/۱۲۱-۱۲۴)۔ ایک فرعونِ مصر پر ہی کیا موقوف ہے! ایسے مقام پر دنیا کے ہر فرعون کی طرف سے اسی قسم کے ردِعمل کا مظاہرہ ہوگا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے نہ کسی قسم کے غصہ کا اظہار کیا نہ ملائکہ کی زجر و توبیخ کی۔ کہا تو صرف اتنا کہ تم نے جو کچھ سمجھا ہے، تمہاری کوتاہیٔ علم کا نتیجہ ہے۔ تمہارا علم محدود ہے۔ تم اپنے علم کی بنا پر یہاں تک دیکھ اور سوچ سکتے ہو۔ تم اس باب میں معذور ہو۔ لیکن ہماری نگاہ اس سے بہت آگے جاتی ہے۔ ہم ابھی تمہارے علم میں اضافہ کر دیں گے اور اس کے بعد تم دیکھ لوگے کہ اس نئی مخلوق کی خصوصیات کیا ہیں اور اس کی تخلیق کی ضرورت کیوں پیش آرہی ہے ——— لیکن یہ بات ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی۔ سرِدست آپ ملائکہ کے پیش کردہ اعتراض کی طرف آئیے۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ نئی مخلوق دنیا میں فساد مچائے گی اور خونریزیاں کرے گی۔

لفظِ فساد کی تشریح کے سلسلہ میں، اس کتاب کی جلد اول میں زیرِ آیات (۲/۱۱-۱۲) تفصیل سے لکھا جا چکا ہے

(دیکھئے جلد اول صفحہ ۲۲۹-۲۴۴)۔ فساد کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو اس حالت پر نہ رہنے دینا جس حالت پر اُسے ہونا چاہیئے[1] اس میں بگاڑ پیدا کر دینا۔ اس کے عملی مظاہر کے لئے ہم نے ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری کی مثالیں پیش کی تھیں اور ان سے بھی زیادہ نمایاں مثال اس نیشنلزم کی پیش کی تھی جس نے دورِ حاضر میں عالمگیر تباہیاں مچا رکھی ہیں۔ فسادؔ کا یہ مفہوم آیۂ زیرِ نظر (۲/۳۰) سے تین ہی آیات پہلے (۲/۲۷) میں بڑی وضاحت سے سامنے لایا گیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ (۲/۲۷)۔ یعنی "خدا نے جنہیں آپس میں ملانے کا حکم دیا تھا، یہ انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور اس طرح دنیا میں فساد مچا دیتے ہیں"۔ ہم سمجھتے ہیں کہ فساد کی جس شکل کا یہاں ذکر کیا گیا ہے (آیت (۲/۳۰) میں) اوّلاً اسی کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی ملائکہ نے کہا کہ یہ نئی مخلوق (انسان) اپنی نوع کی وحدت ختم کر کے مختلف گروہوں، قبیلوں اور آخر الامر قوموں میں بٹ جائے گی جس کا نتیجہ باہمی جنگ و جدال کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اور یوں اس سرزمین پر خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے سورۃ یونس میں ان الفاظ میں سامنے لایا گیا ہے؛ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (۱۰/۱۹)۔ "نوعِ انسان شروع میں ایک عالمگیر برادری تھی۔ اس کے بعد انہوں نے آپس میں اختلاف پیدا کر لئے اور یوں گروہوں میں بٹ گئے"۔

نیشنلزم کی فساد انگیزیاں

قومیت (نیشنلزم)، اور جنگ و جدل کا ایک دوسرے کے ساتھ کیا تعلق ہے، اس کے لئے مغربی مفکرین اور مدبرین کی شہادات سامنے لائیے۔ (مثلاً) مشہور مفکر میسن (J. W. T. MASON) اپنی کتاب (CREATIVE FREEDOM) میں لکھتا ہے کہ:

> جنگ کی بنیاد نیشنلزم ہے، جس طرح افراد میں باہمی تنازعہ کی بنیاد جذبۂ انانیت ہوتا ہے۔ ارتقائے جنگ کی ساری تاریخ کا سراغ اسی بنیاد سے لگ سکتا ہے۔

ایک اور مفکر (ADAM DE HEGEDUS) نے دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ایک اہم کتاب شائع کی تھی۔ اس میں وہ لکھتا ہے:-

> مسئلہ کس قدر پیچیدہ کیوں نہ ہو، یہ واقعہ ہے کہ ہمارے دور کی دونوں عالمگیر لڑائیاں، نیشنلزم کی پیدا کردہ ہیں۔ اور یہی ہمارے زمانے میں سب سے بڑی سیاسی قوت ہے۔ ان دونوں لڑائیوں کی تہہ

---

[1] اقبال کے الفاظ میں:

گفت یزداں کہ چنیں است و چنیں خواہد ماند ؛ گفت آدم کہ چنیں است و چناں خواہد بود

ہیں وہی اصول کارفرما تھا جس کی رو سے دنیا کو آزاد قومی مملکتوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اور جس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ مختلف مملکتیں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی فکر کرتی ہیں[1] اور اس طرح ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ ان حالات میں کبھی صالح معاشرتی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔

اور رونا صرف یہی نہیں کہ یہ دو عالمگیر لڑائیاں کیوں ہو گئیں۔ رونا تو اس بات کا ہے کہ جب دنیا میں جنگ نہیں ہو رہی ہوتی، تو اس وقت بھی امن قائم نہیں ہو سکتا۔

(THE STATE OF THE WORLD - P. 11-12.)

یہی مفکر آگے چل کر لکھتا ہے کہ "نیشنلزم، انسانی تاریخ میں سب سے بڑا مفسدہ ہے۔ اس لئے کہ اس سے پہلے کوئی فسادِ انسانیت نہ عالمگیر ہوا کرتا تھا، نہ انسانی زندگی کو کلی طور پر محیط ہے[2]"

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ فساد اور خون ریزی میں باہمی کیا تعلق ہے۔ اور ملائکہ نے انسانی تاریخ کے کس بڑے مفسدہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

جہاں تک جنگ (یعنی قوت کے استعمال) کا تعلق ہے۔ عیسائیت نے ایسا نظریہ یا عقیدہ پیش کیا جس کی رو سے قوت کا استعمال کسی حالت میں بھی جائز قرار نہ دیا گیا۔ اس نے اس کی بجائے رحم کا تصور پیش کیا جس کی رو سے یہ کہا گیا کہ اگر کوئی دست دراز تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے، تو بجائے اس کے کہ تم اس کا ہاتھ روکو، اور اگر اس پر بھی وہ باز نہ آئے تو اس کی کلائی مروڑ کر رکھ دو، تم اپنا دوسرا گال اس کے سامنے کر دو۔ اگر کوئی تمہاری واسکٹ اتارے تو تم اپنا کرتہ خود اتار کر اس کے حوالے کر دو۔ یعنی عیسائیت میں عدل اور نظامِ عدل قائم

عیسائیت اور جنگ

کرنے کے لئے قوت کے استعمال کا تصور ہی نہیں۔ یہ خدا کی طرف سے دی گئی تعلیم نہیں۔ ان کی خود ساختہ تعلیم ہے۔ اس تعلیم کا نتیجہ کیا ہے، اس کے متعلق بھی ہم سے نہیں خود مغرب کے دانشوروں سے پوچھئے۔ مشہور مفکر رابرٹ بریفو نے اپنی شہرہ آفاق کتاب (THE MAKING OF HUMANITY) میں ہسپانیہ

---

[1] قرآنِ کریم نے قوموں کے باہمی فساد کا جذبہ محرکہ یہی بتایا ہے۔ جہاں کہا ہے: تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَنْ تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ (۱۶/۹۲) "تم آپس کے معاہدات کو بھی فریب دہی کا ذریعہ بنا لیتے ہو تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے آگے بڑھ جائے"

[2] ان امور کی مزید تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب — انسان نے کیا سوچا — بابِ سیاسیات

کے پروفیسر (DR. FALTA DE GRACIA) کا ایک اقتباس نقل کیا ہے، جس میں وہ کہتا ہے :-

عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نا مانوس ہے جس طرح ذہنی دیانت کا۔ یہ اس کے تصورِ اخلاق سے یکسر باہر کی شے ہے۔ عیسائیت نے ان لوگوں سے تو شفقت اور ہمدردی کا اظہار کیا ہے جن پر ظلم و ستم ہوں لیکن خود ظلم و ستم سے ہمیشہ چشم پوشی کی ہے۔ اس نے ان لوگوں کو، جو ظلم و استبداد کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہوں، جنہیں مصائب و شدائد کے ہجوم نے گھیر رکھا ہو، آئینِ محبت کی تعلیم دی ہے۔ انہیں رحم و عفو کا سبق سکھایا ہے، انہیں خدا کی ابوبیت یاد دلائی ہے۔ لیکن مذہب اور اخلاق کے اس ہجوم میں جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اخلاقی ضوابط کی معراجِ کبریٰ ہے، عام انصاف اور عام دیانت کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ "مسیحِ مقدس" جور و استبداد کے ستائے انسانوں کے درمیان آسمان سے اترتا ہوا فرشتہ دکھائی دیتا ہے لیکن اس جور و استبداد کی علت معلوم کرنا اس کے دائرۂ شعور سے باہر ہے۔ خیر و شر کا صحیح تصور اس کے حیطۂ نگاہ سے خارج ہے۔ یہ ظلم و ستم اس کے نزدیک خدا کی طرف سے گناہگاروں کے لئے ابتلا و آزمائش ہے۔ نظامِ عالم کا خاصہ ہے۔ اس حکومتِ خداوندی کا فیصلہ ہے جو دنیا میں خدائی حقوق کی بنا پر قائم ہے۔

(P.P. 332-333)

اسی بنا پر عصرِ حاضر کا عظیم مفکر (WHITE-HEAD) لکھتا ہے کہ :-

انجیل میں جس قسم کا اخلاقی ضابطہ دیا گیا ہے اُسے اگر موجودہ معاشرہ میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

(ADVENTURES OF IDEAS — P. 18)

عیسائیت کی اسی تعلیم اور اس کے بے پناہ پروپیگنڈہ کا اثر ہے کہ اسلام کے خلاف اس قسم کے اعتراضات عام ہوتے چلے آرہے ہیں کہ یہ خون ریزیوں کا مذہب اور جنگ و قتال کا دین ہے۔ ان اعتراضات اور اسلام کی صحیح تعلیم کے متعلق تو ہم آگے چل کر تفصیل سے لکھیں گے جہاں جہاد کے متعلق گفتگو کی جائے گی۔ یہاں اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ قوت کا استعمال ہر مقام پر ممنوع قرار نہیں پا سکتا۔ اور یہ وہ حقیقت ہے جس کا انکشاف، ہمارے دور کے علم النفس (سائیکالوجی) نے بڑی عمدگی سے کیا ہے۔ مثلاً (ERICH FROMM) اپنی کتاب میں جذبۂ تغلب (AGGRESSION) یعنی قوت کے استعمال پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ سمجھنا غلط ہے کہ تغلب ہر قسم کا ناجائز اور خلافِ شرفِ انسانیت ہے۔ تغلب کی دو قسمیں ہیں۔ یعنی (BENIGN AGGRESSION) جائز،

تغلب کی دو قسمیں

اور (MALIGNANT AGGRESSION) مذموم۔ شیر اگر فطرت کے تقاضے کے مطابق اپنی بھوک مٹانے کے لئے ہرن پر حملہ کرتا ہے تو یہ کوئی جرم یا ناجائز فعل نہیں۔ لیکن اگر کوئی شکاری (بھوک کے لئے نہیں بلکہ) محض تفریح کی خاطر ہرن پر گولی چلاتا ہے تو اخلاقی ضابطہ نگاہ سے یہ مذموم تغلب ہوگا۔ اگر کوئی ظالم کسی مظلوم کے سینے میں چھرا گھونپنے کیلئے ہاتھ اٹھاتا ہے تو اس کا یہ اقدام مجرمانہ ہے لیکن اگر کوئی شخص اس مظلوم کی جان بچانے کے لئے اس ظالم کی کلائی مروڑ دیتا ہے، یا اس کی مزاحمت پر اسے گولی مار دیتا ہے، تو یہ تغلب نہ صرف یہ کہ ناجائز نہیں بلکہ انسانیت کی حفاظت کیلئے ضروری بھی ہے۔

قرآن اور قوت کا استعمال:

اور یہی ہے وہ تغلب جس کی قرآن کریم نے نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ عند الضرورت اس کی تاکید بھی کی ہے۔ قرآن کریم کے نزدیک انسانی جان کی قیمت کتنی بڑی ہے، اس کے متعلق اس نے کہا ہے کہ: مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا (۵/۳۲)۔ "یاد رکھو! جس نے کسی ایک جان کو بھی ناحق ہلاک کر دیا (یعنی بجز اس کے کہ اسے جرمِ قتل کی سزا کے لئے ہلاک کیا جائے یا فساد کو روکنے کی خاطر) تو یوں سمجھئے گویا اس نے پوری نوعِ انسان کو ہلاک کر دیا۔ وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا (۵/۳۲)۔ اور جس نے کسی ایک کی جان کو بھی ہلاکت سے بچا لیا تو یوں سمجھئے گویا اس نے تمام نوعِ انسان کو زندگی عطا کر دی"۔ ایک طرف تو اس کے نزدیک انسانی زندگی کی یہ قدر و قیمت ہے، لیکن دوسری طرف وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ کوئی سرکش اور مستبد انسان، یا انسانوں کا گروہ مظلوم اور کمزور انسانوں پر گوشۂ عافیت تنگ کر دے اور ان کی ہلاکت و تباہی پر اتر آئے تو اُسے اس ظلم و استبداد سے روکنے کے لئے پہلے سمجھانا چاہیئے اور اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئے تو قوت کے زور سے اسے اس دراز دستی سے روک دینا چاہیئے۔ قرآن کی اصطلاح میں اس قسم کی جنگ کو "قتال فی سبیل اللہ" (یعنی نوعِ انسان کی حفاظت کے لئے اللہ کی راہ میں جنگ) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ سورۃ بقرۃ میں ہے کہ: وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ (۲/۲۵۱)۔ "اگر خدا ایسا انتظام نہ کرے (یعنی اس کی اجازت نہ دے) کہ ظلم و ستم کرنے والے افراد کی روک تھام، انصاف پرور گروہ، قوت کے زور سے کریں، تو کرۂ ارض پر فساد ہی فساد برپا ہو جائے۔ لیکن خدا نوعِ انسان کو اپنے سایۂ عاطفت میں رکھنا چاہتا ہے اس لئے اس نے عدل پرور انسانوں کو تاکید کر رکھی ہے کہ وہ ایسے مقام پر پوری پوری قوت سے کام لیں اور ظالموں کے ظلم کو روک دیں"۔ اس نے جماعتِ مومنین کو، جہاں پہلی بار جنگ کی اجازت دی ہے، تو وہ بھی ایسا ہی موقعہ تھا۔ اور اس میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ: وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ

وَصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۔ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۔ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ (۲۲/۴۰)۔ "اگر خدا ایسا انتظام نہ کرتا کہ انسانوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ کے جور و ستم کی روک تھام کر سکے تو دنیا سے مذہبی آزادی کا خاتمہ ہو جاتا اور یہود و نصاریٰ کی خانقاہیں اور یہودیوں کی پرستش گاہیں اور مسلمانوں کی مساجد سب منہدم ہو جاتیں۔ لیکن خدا نے ایسی جماعت (امتِ مسلمہ) اٹھا کھڑی کی ہے جو اس قسم کے سرکش گروہوں کی روک تھام کا انتظام کرے گی۔ اور چونکہ ان کا یہ عمل خدا کے متعین کردہ پروگرام کی خاطر ہو گا اس لئے خدا بھی ان کی مدد کرے گا۔ وہ بڑی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے"۔

اسی سلسلہ میں اس نے دوسری جگہ کہا ہے کہ جماعت مؤمنین کا فریضہ ہے کہ کوئی مظلوم اُسے کہیں سے بھی مدد کے لئے پکارے وہ اس کی مدد کو پہنچیں۔ ظالم کے تیروں کے سامنے سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو جائیں۔ اپنی جانیں دے دیں تاکہ ان مظلوموں، کمزوروں اور ناتوانوں کی جانیں بچ جائیں (۴/۷۵)۔ اس قسم کی جنگ میں دونوں فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہوں گی اور سطحی نگاہ سے دیکھنے والے اُسے ان کی باہمی جنگ قرار دیں گے۔ لیکن قرآن کریم نے ایک گروہ کے متعلق کہا ہے کہ ان کی یہ جنگ "قتال فی سبیل اللہ" ہے اور دوسرے گروہ کی جنگ "قتال فی سبیل الطاغوت" (۴/۷۶)۔ اِسی کو (ERICH FROMM) نے (BENIGN AGGRESSION) اور (MALIGNANT AGGRESSION) کی اِصطلاحات سے تعبیر کیا ہے۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ بارگاہِ خداوندی سے ملائکہ کو جواب ملا کہ ہمارے مقابلہ میں تمہارا علم محدود ہے اس لئے تم نہیں جانتے کہ اس نئی مخلوق کی کیا خصوصیات ہیں۔ اِسے ہم جانتے ہیں۔ اگر بات کو یہیں چھوڑ دیا جاتا تو ظاہر ہے کہ اس سے بھی ملائکہ کو کوئی شکایت پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن بارگاہِ خداوندی نے مناسب سمجھا کہ ملائکہ پر واضح کر دیا جائے کہ خود ان کے مقابلہ میں اس نئی مخلوق کی قوتوں کی کیا کیفیت ہے۔ اس کے لئے قرآن کریم میں ہے:-

۲/۳۱ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ۔ ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۔ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِىْ
بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔

آیت کے پہلے چار الفاظ کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "خدا نے آدم کو تمام اشیاء کے نام سکھا دیئے"۔ جہاں تک عَلَّمَ کا تعلق ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ خدا نے آدم کو یہ سب کچھ خود سکھا دیا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے انسان میں اس قسم کی صلاحیت رکھ دی جس کی بنا پر اس کے لئے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ ان کا علم حاصل کر سکے۔

علم الاسماء

علم کس چیز کا ؟ تمام کی تمام اشیائے کائنات کے اسمار کا۔ اس میں اسماء کا لفظ قابلِ غور ہے۔ اسماء، اسم کی جمع ہے جس کا مادہ (س۔م۔و) ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی شے کی وہ خصوصی علامت، جس سے وہ شے پہچانی جاسکے اور دوسری اشیاء سے متمیز ہوسکے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کسی شے کا محض نام جاننا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا تاوقتیکہ ہم اس شے کو پہچان نہ سکیں اور اس کی اس خصوصیت کا علم نہ ہو جو اسے دوسری چیزوں سے متمیز کرتی ہے۔ اسی لئے صاحبِ مفردات (امام راغب اصفہانی) نے اس لفظ (اسماء) پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب تک مسمّٰی کا علم نہ ہو اس کے اسماء کا علم کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ یعنی جب ہم پانی کہیں تو ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ کیا شے ہے اور اس کی خصوصیات کیا؟ اس اعتبار سے دیکھئے تو نام (اسماء) بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ آپ سوچیئے کہ اگر مختلف اشیاء کے اپنے اپنے نام نہ ہوں، یا ہمارے سامنے ایسی چیزیں رکھی ہوں جن کے ہم نام نہ جانتے ہوں تو اس سے کتنی دشواری پیدا ہو جاتی ہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ سائنسدان جب کوئی نیا انکشاف یا کوئی نئی شے ایجاد کرتے ہیں تو اس کا کوئی نہ کوئی نام ضرور رکھتے ہیں۔ اس باب میں ایک مغربی ڈاکٹر کہتا ہے کہ :-

> آدم پر تمام زندہ اشیاء کا نام رکھنے کی ذمہ داری عائد کی گئی۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری اور مشکل کام تھا۔ اس لئے کہ جن چیزوں کا نام نہیں رکھا جاتا ان کے خواص بھی غیر متعین رہ جاتے ہیں۔ اور جن چیزوں کے غلط نام رکھے جاتے ہیں اُن سے بڑے نقصان پہنچتے ہیں۔ [۱]

لہٰذا علم الاسماء کے معنی ہیں اشیائے کائنات کی ماہیت، کیفیت، خواص اور متمیزات کا علم۔ بالفاظ دیگر علومِ طبیعی کی تحصیل کی صلاحیت جس میں علومِ سائنس کے تمام گوشے آجاتے ہیں۔

ضمناً۔ ڈاکٹر (TYLER) نے کہا ہے کہ غلط نام رکھنے سے بڑا نقصان پہنچتا ہے طبیعی دنیا میں اس سے کس کس قسم کے نقصانات پہنچتے ہیں، اس سے قطع نظر، معتقدات کی دنیا میں یہ چیز کس قدر گمراہی اور تباہی کا باعث بنتی ہے وہ بھی بالکل

غلط ناموں کی تباہ کاریاں

واضح ہے۔ قرآنِ کریم نے کفار یا مشرکین سے کہا ہے کہ جنہیں تم اپنا معبود سمجھتے ہو وہ بجز این نیست کہ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ (۱۲/۴۰)۔ "یونہی کچھ نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لئے ہیں، یہ درحقیقت وہ نہیں — تم انہیں خدا کہتے ہو، یہ خدا نہیں۔ تم انہیں معبود سمجھتے ہو یہ معبود نہیں۔ تم نے ان کے یہ غلط نام رکھ چھوڑے ہیں۔ مَآ اَنْزَلَ

---

[۱] DR. M.L TYLER IN "HOMEO DRUG PICTURES" (PREFACE)

اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ (۱۲/۴)۔ "خدا نے اس کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی"۔ اس سے ظاہر ہے کہ معتقدات کی دنیا میں کسی کا نام رکھنے کے لئے بھی خدائی سند کی ضرورت ہو گی۔ یہ جو ہمارے ہاں بڑے بڑے آستانے، مزارات اور درگاہیں سجدہ گاہِ انام بن رہی ہیں، ان کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے بڑے بڑے نام رکھ دیئے گئے ہیں اور ان ناموں کو شہرت دے دی گئی ہے۔ اگر ان کے ایسے نام نہ رکھے جاتے اور ان کے لئے ایسا پراپیگنڈا نہ کیا جاتا تو وہ مٹی کے ڈھیر اور پتھر کے تودوں سے زیادہ کچھ حیثیت نہ رکھتے۔ آپ ایسے قبرستانوں سے آنکھیں بند کر کے گزر جاتے ہیں جن میں کسی قبر کا بڑا نام نہ رکھا گیا ہو یا اس پر رفیع الشان عمارت نہ تعمیر کی گئی ہو۔ لیکن جہاں کسی قسم کا مقدس نام ہو، یا بلند اور پرشوکت عمارت، تو وہ آپ کے لئے مرکزِ توجہ اور داعیٔ سجدہ بن جاتا ہے۔ انہیں محض قبریں کہیئے (یعنی انہیں ان کے اصلی نام سے پکاریئے)۔ وہ کبھی وجہ جبیں سائی انام نہیں بن سکیں گی۔ یہ بہر حال ضمنی گوشہ تھا۔ اب پھر اصل موضوع کی طرف آئیے۔

کہا یہ گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں اشیائے کائنات کی ماہیت معلوم کرنے کی صلاحیت رکھدی۔ اسے قوانینِ فطرت کا علم کہا جائے گا۔ انسان جن اشیائے فطرت کے خواص و ماہیت کا علم حاصل کر لیتا ہے اور وہ قوانین معلوم کر لیتا ہے جن کے تابع وہ سرگرمِ عمل رہتی ہیں، وہ اشیاء اس کے تابع تسخیر ہو جاتی ہیں[1] پھر وہ ان سے جو چاہے کام لے سکتا ہے۔ یہی وہ عظیم حقیقت ہے جس کی وضاحت کے لئے قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر یہ کہا ہے کہ خدا نے اشیائے کائنات کو انسان کے لئے مسخر کر دیا ہے۔ یعنی انہیں غیر متبدل قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے۔ جب انسان ان قوانین کا علم حاصل کر لیتا ہے تو وہ ان اشیاء کی مضمر قوتوں کو مسخر کر لیتا ہے اور اس سے مختلف فائدے اٹھاتا ہے۔

تسخیرِ فطرت

کہیں اس نے کہا ہے کہ اس نے تمہارے لئے چاند اور سورج کو مسخر کر دیا (۱۴/۳۳)۔ کہیں کہا ہے کہ رات اور دن کو مسخر کر دیا۔ (۱۴/۳۳؛ ۱۶/۱۲؛ ۳۱/۲۹؛ ۳۵/۱۳؛ ۳۹/۵)۔ کہیں یہ کہ تمہارے لئے دریاؤں، سمندروں اور ان میں چلنے والی کشتیوں کو مسخر کر دیا۔ (۱۴/۳۲؛ ۱۶/۱۴)۔ اس طرح متفرق اشیاء کا ذکر کرنے کے بعد جامع طور پر کہا کہ: سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ (۲۲/۶۵) "جو کچھ زمین میں ہے اس سب کو تمہارے لئے مسخر کر دیا"۔ کہیں کہا کہ: سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ (۳۱/۲۰)۔ "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں، ارض و سمٰوٰت میں جو کچھ ہے، اسے تمہارے لئے مسخر کر دیا"۔ اور سورۃ جاثیہ میں اسے جامع حیثیت سے ان الفاظ میں بیان کر دیا کہ: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۴۵/۱۳)۔ "ارض و سمٰوٰت میں جو کچھ ہے، اس سب کو من جانب اللہ تمہارے

---

[1] تسخیرِ فطرت کے متعلق پہلے باب میں بھی ضمنی اشارات آ چکے ہیں۔ اس جگہ اس اجمال کی تفصیل دی جاتی ہے۔

لئے مسخر کردیا گیا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو غور وفکر سے کام لیتے ہیں، حقیقت تک پہنچنے کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں"۔

اس آیت میں لفظِ جَمِیۡعًا، اُس لفظِ کُلَّھَا کی تفسیر ہے جو (۲/۱۳) میں اوپر آچکا ہے۔ ذرا اس کی وسعت کو تصور میں لائیے۔ کہا یہ گیا ہے کہ کائنات کی جملہ موجودات کی کیفیت و ماہیت اور ان کے خواص و جواہر کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت انسان میں رکھدی گئی ہے۔ پہلے تو مجملاً اس کائنات کو لیجئے جس کی وسعتوں اور پہنائیوں کے تصور سے بھی انسانی فکر عاجز آجاتی ہے۔ اور پھر اس میں جس قدر گوناگوں اشیاء ہیں (یعنی فطرت کی قوتیں اور ان کے مظاہر) انہیں تصور میں لائیے۔ اور اس کے بعد سوچئے کہ انسانی علم کے امکانات کس قدر لا محدود اور ناپیدا کنار ہیں۔ ہم اپنے دور کو سائنس کے انکشافات کی گویا معراج کبریٰ سمجھتے ہیں لیکن ہمارے سائنسدانوں کو خود اس کا اعتراف ہے کہ ہم (نیوٹن کے الفاظ میں) "علم کے سمندر کے کنارے بچوں کی طرح سیپ اور گھونگھے اکٹھے کرنے سے آگے نہیں بڑھ پائے"۔ (HAECKEL) اپنی کتاب (RIDDLES OF THE UNIVERSE) کے آخری باب میں لکھتا ہے کہ:۔

علمِ انسانی کی وسعت

ہمیں اس امر کا اعتراف کر لینا چاہیئے کہ نیچر کی کنہ و حقیقت سے ہم آج بھی اسی قدر بے خبر ہیں جسقدر آج سے دو ہزار چار سو سال پیشتر حکمائے یونان، یا دو سو سال پہلے نیوٹن اور اسپینوزا، یا سو سال پہلے کانٹ اور گوئٹے بے خبر تھے۔ ہمیں تو بلکہ اس امر کا بھی اعتراف کر لینا چاہیئے کہ ہم جس قدر اس جوہر کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے کائنات مرکب ہے۔ اور مادہ اور توانائی، جس کے خصائص ہیں، وہ اور معمہ بنتا جارہا ہے۔ ہم اس کی محسوس شکلوں کا اور ان کی ارتقائی منازل کا علم تو حاصل کر سکتے ہیں، لیکن ان محسوس شکلوں کے پیچھے جو اصل حقیقت ہے اس کے متعلق ہم کچھ بھی نہیں جان سکتے۔ (PAGE-310)

سر جیمز جینز ہمارے دور کا علم الافلاک کا سب سے بڑا ماہر تسلیم کیا جاتا ہے وہ اپنی مشہور کتاب (THE MYSTERIOUS UNIVERSE) کے خاتمے پر لکھتا ہے کہ:۔

جو کچھ کہا گیا ہے اور جو نتائج تجربتاً پیش کئے گئے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ وہ تمام محض قیاسی اور غیر یقینی ہیں۔ ہم نے اس مسئلہ پر بحث کرنے کی کوشش کی ہے کہ کیا عہدِ حاضر کی سائنس ان مشکل مسائل کے متعلق، جو ہمیشہ کے لئے ماورائے سرحد ادراک رکھے گئے ہیں، کچھ کہہ سکتی ہے؟ ہم زیادہ سے زیادہ روشنی کی ایک مدہم سی کرن دیکھ پاتے ہیں۔ اس سے زیادہ ہم کوئی دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ کرن بھی فریبِ نگاہ ہی ہو۔ اس لئے کہ اس باب میں ہمیں کچھ دیکھنے کے لیے اپنی آنکھوں پر بہت بوجھ ڈالنا پڑتا ہے۔ سو آج

یہ دعویٰ قطعاً نہیں ہو سکتا کہ دورِ حاضرہ کی سائنس کوئی یقینی اعلان کر سکتی ہے۔ بلکہ انسب یہ ہے کہ سائنس کو چاہیئے کہ اس قسم کے اعلان کرنا چھوڑ دے۔ علم کے دریا کا رخ اکثر اوقات پیچھے کی طرف لوٹتے بھی دیکھا گیا ہے۔

سائنسدانوں کے اس قسم کے اعترافات و اعلانات کے پیشِ نظر، شاید کوئی سطح بین مایوس ہو کر بیٹھ جائے کہ جب اشیائے کائنات کی کنہ اور حقیقت اور خواص و متمیزات کے متعلق علم حاصل کرنا ہمارے لئے ممکن ہی نہیں تو اس کے لئے اس قسم کی جانکاہ کوششوں سے فائدہ کیا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم کا طالب علم تو نہ ایسا کہہ سکتا ہے اور نہ اس طرح مایوس ہو کر بیٹھ سکتا۔ اس لئے کہ اس کے خدا کا ارشاد ہے کہ: عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا (۲/۳۱)۔ "آدمی میں تمام اشیائے کائنات کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت ودیعت کر کے رکھدی گئی ہے"۔ لہٰذا اس کا ایمان یہ ہو گا کہ انسان ان کوششوں میں آگے بڑھتا جائیگا اور اشیائے فطرت (كُلَّهُمۡ) کا علم حاصل کر کے رہے گا۔ اس ضمن میں (SIR FRANCIS YOUNG HUSBAND) کا ایک اعلان بڑا حقیقت کشا، بصیرت افروز اور امید افزا ہے۔ اس نے (THE MYSTRY OF NATURE) کے عنوان سے ایک حقائق پرور مقالہ لکھا ہے جو مشہور کتاب (THE GREAT DESIGN) میں شامل ہے۔ وہ اپنے مقالہ کے آخر میں لکھتا ہے:-

> سائنس سے ہم آخرالامر جو سبق سیکھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ علم کی کوئی انتہا نہیں۔ ہمیں سائنس سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ ہم فطرت کے متعلق سب کچھ معلوم نہیں کر سکیں گے۔ جو علم ہم حواس کے ذریعے حاصل کرتے ہیں، اس کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ محسوسات تو فطرت کی گہرائیوں کے بدن ابھرے ہوئے جزیرے یا کنارے ہیں۔ ہم صرف فطرت کا چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔ ہم اس چہرے کے بدلے ہوئے آثار کا بھی مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ لیکن جوں جوں ہم ان گہرائیوں میں جاتے ہیں یہ حقیقت پختہ ہوتی جاتی ہے کہ ان کے پیچھے کوئی ایسی قوت ہے جو ہماری نگاہوں سے پنہاں ہے۔ اس قوت کو جاننے کی آرزو ہمارے دل میں ہمیشہ مچلتی رہے گی۔ لیکن یہ شاید کبھی معلوم نہیں ہو سکے گی۔
>
> اس قسم کا احساس ہم پر مایوسی طاری کر دیتا لیکن ہمارا تجربہ یہ ہے کہ جوں جوں ہم اس سمندر کی گہرائیوں میں اترتے ہیں، ہمارے مسرت بڑھتی جاتی ہے۔ رموزِ فطرت ہمیں آوازیں دے دے کر آگے بلاتے ہیں اور ہم طوعاً و کرہاً ان کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں اور اس کے بعد ہمیں اس تگ و تاز کا صلہ بھی مل جاتا ہے۔ ہم جتنا گہرائیوں میں جاتے ہیں اتنا ہی اپنے آپ کو بلندیوں پر پاتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں اس میدان میں آگے ہی آگے بڑھتے

جانا چاہیئے۔ اور ہم آگے بڑھتے جائیں گے، کبھی رک کر کھڑے نہیں ہوں گے بلانے والے کی آواز میں کچھ ایسی دلکشی ہے کہ ہمارے قدم مجبوراً اس کی طرف اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ اور اٹھتے چلے جائیں گے۔ (صفحہ ۲۵۴-۲۵۵)

یہ مقام آدم ہے

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے تسخیرِ فطرت آدم (آدمی) کا فریضہ بتایا ہے ——— یعنی یہ فقط مقامِ آدم ہے جس میں کافر اور مومن سب شامل ہیں ——— مقامِ مومن اس سے بہت آگے ہے۔ جہاں تک مقامِ آدم کا تعلق ہے اس میں مومن بھی شریک ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہیں یہ کہا ہے کہ: اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ (۴۵/۳) "یہ حقیقت ہے کہ ارض و سماوات میں مؤمنین کے لئے آیات ہیں"۔ اس سے اگلی آیت میں ہے: اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ (۴۵/۴)۔ کہیں انہیں لَاٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یَّتَّقُوۡنَ (۱۰/۶) کہا ہے۔ یعنی کائنات میں متقیوں کے لئے آیات ہیں۔ ان، اور اسی قسم کی دیگر آیات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے مؤمن اور متقی ہونے کیلئے تسخیرِ فطرت ضروری ہے۔ اس سے واضح ہے کہ جنہیں ہم علومِ سائنس کہتے ہیں، ان کی تحصیل کے بغیر ایمان اور تقویٰ بھی مکمل نہیں ہوتا۔ قرآن کریم نے کائنات پر غور و فکر کی تاکید کے بعد کہا ہے کہ تِلۡکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتۡلُوۡھَا عَلَیۡکَ بِالۡحَقِّ (۴۵/۶) "یہ اللہ کی آیات ہیں جنہیں خدا، حق کے ساتھ تیرے سامنے پیش کرتا ہے"۔ جو لوگ اس کے بعد بھی

یہ مؤمنین کا فریضہ ہے

حق پر ایمان نہیں لاتے ان سے پوچھو کہ: فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَ اللّٰہِ وَاٰیٰتِہٖ یُؤۡمِنُوۡنَ (۴۵/۶) "یہ لوگ اللہ اور اُس کی اِس قسم کی آیات کے بعد اور کس چیز پر ایمان لائیں گے"۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے اس مقام پر کتنی عظیم حقیقت بیان کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا پر ایمان لانے کے دو گوشے ہیں۔ ایک اشیائے فطرت پر غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچنا کہ کائنات کے نظام کو ایک علیم و خبیر ہستی اپنے محکم، اٹل اور تعمیری قوانین کی رُو سے چلا رہی ہے۔ اور دوسرے، خدا کی کتاب، قرآن کریم میں تفکر و تدبر۔ اسی اعتبار سے صحیفۂ فطرت اور قرآنِ کریم دونوں کو "خدا کی کتابیں" کہا جا سکتا ہے۔ اول الذکر میں انسان کی طبیعی زندگی کے متعلق راہنمائی ہے اور ثانی الذکر میں اس کی انسانی زندگی سے متعلق ہدایات۔ آپ صحیفۂ فطرت کو کتاب اللہ (قرآن کریم) کا ضمیمہ کہہ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قوانینِ فطرت بھی اسی خدا کے متعین فرمودہ ہیں جس خدا نے دوسرا مجموعۂ قوانین، قرآن کے اندر عطا کیا ہے۔ بنابریں قوانینِ فطرت کی تحقیق و کاوش بھی خدا کی "عبادت" کا ایک گوشہ ہے ——— یعنی اس کے متعین فرمودہ قوانین کی تحقیق اور ان کا اتباع۔ ہمارے ہاں جن لوگوں کو "علماء" کہا جاتا ہے ان کے مبلغ علم کا ہر ایک کو علم ہے۔ انہیں نہ قوانینِ فطرت کا علم ہوتا ہے نہ قرآنی قوانین کا۔ قوانینِ فطرت کا تو بہر حال کچھ علم نہیں ہوگا۔ یہ ان کے دائرہ تعلیم میں داخل ہی نہیں ہوتا۔ لیکن آپ دیکھئے کہ قرآن کریم علماء کن لوگوں کو کہتا ہے۔ سورۃ فاطر میں ہے: اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنۡزَلَ

مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۔ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ۔ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا ۔ وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ (۳۵/۲۷) "کیا تونے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ کا قانون کس طرح بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے انواع و اقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ پھر تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ پہاڑوں میں کس کس انداز کے سرخ و سفید طبقات ہیں جن کے رنگ اور اقسام مختلف ہیں۔

عُلماء کون ہیں

ان میں بعض سرخ ہیں، بعض گہرے سیاہ رنگ کے اور اسی طرح دیگر مختلف رنگوں کی تہیں" وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ (۳۵/۲۸) ۔ "اور اسی طرح انسانوں اور دیگر جانداروں اور مویشیوں کے بھی مختلف اقسام ہیں"۔

آپ نے دیکھا کہ ان آیات میں کون کون سے امور کا ذکر ہو رہا ہے۔ کائنات کے مختلف گوشوں کا، بساطِ فطرت کے متنوع شعبوں کا، سائنس کے مختلف علوم کا جن میں طبیعیات، نباتیات، حیوانیات، فضائیات، ارضیات اور انسانیات کے تمام شعبے آجاتے ہیں۔ ان علوم و فنون کے تذکرہ کے بعد فرمایا: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۔ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ (۳۵/۲۸)۔ "حقیقت یہ ہے کہ اس کے بندوں میں سے علماء ہی وہ ہیں جن کے دل پر اس کی عظمت و ہیبت چھا جاتی ہے۔ کیونکہ وہ علی وجہ البصیرت اس حقیقت کا مشاہدہ کرلیتے ہیں کہ خدا کتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے اور کس طرح اس عظیم کارگاہِ کائنات کو ہر قسم کی تخریب سے محفوظ رکھ کر اس کی منزلِ مقصود کی طرف لئے جا رہا ہے"۔

اور یہاں سے ہماری فکر کا رُخ ایک اور سمت کی طرف مڑ گیا۔ پہلے کہا گیا کہ علم الاشیاء مقامِ آدم ہے جس میں کافر اور مومن سب شریک ہیں۔ جو انسان بھی صحیح خطوط پر محنت اور کوشش کرے گا، فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے گا۔ سوال یہ ہے کہ پھر کافر اور مومن میں فرق کیا ہے؟ اور یہ فرق کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ یہ نکتہ غور طلب اور وضاحت کا متقاضی ہے۔

کائنات کے متعلق سیکولر نظریہ

سیکولرازم کے متعلق اس کتاب کی پہلی جلد میں تفصیلی گفتگو کی جاچکی ہے۔ (ملاحظہ ہوں آیات ۱/۱؛ ۲/۴؛ ۲/۲۲ کی تشریحات، نیز اس جلد کے پہلے باب میں، "انسانی ذات کے متعلق گفتگو") سیکولرازم سے ہماری مراد ہے، وحی کی روشنی سے بے نیاز ہو کر تنہا فکرِ انسانی کی راہنمائی۔ اس فکر کی رو سے کائنات کے متعلق پہلا تصور یونان کے مشہور فلاسفر افلاطون (PLATO) نے پیش کیا۔ اس نے کہا کہ یہ محسوس کائنات فی الواقعہ موجود نہیں۔ حقیقی کائنات عالمِ امثال میں واقع ہے۔ اور یہ محسوس کائنات اس کا صرف سایہ ہے۔ وجود اصل شے کا ہے، اس کے سایہ کا نہیں۔ ہم نے پہلے بھی کہیں لکھا ہے کہ اگر کسی کا ذہن ہو بلند

اور نگاہ کا زاویہ ہو غلط تو اس سے انسانیت کو جس قدر نقصان پہنچتا ہے، اس کی تلافی ممکن نہیں۔ اس سلسلہ میں افلاطون کی نمایاں مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس نے کائنات کے متعلق یہ باطل نظریہ پیش کیا، اور اس اڑھائی ہزار سال میں، دنیا کی قریب قریب، ہر قوم اس سے متاثر ہوگئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بجائے اس کے کہ انسان کائناتی قوتوں کو مسخر کرنے کی کوشش کرتا، وہ اسے محض وہم و خیال تصور کر کے اس سے بیگانہ ہو کر بیٹھ گیا۔ ہندوستان کی ویدانت نے اس کا بڑا گہرا اثر لیا اور اسے مذہبی تقدس کا رنگ دیکر یہ نظریہ پیش کیا کہ یہ کائنات اپنا وجود نہیں رکھتی، وجود صرف برہما (خدا) کا ہے جس نے اشیائے کائنات کی شکل میں روپ دھار رکھا ہے۔ پراکرتی (مادی دنیا)

وحدت الوجود کا نظریہ

محض مایا (فریب) کا جال ہے۔ یہ ہندو دھرم کا تصوف تھا۔ اسی نے ہمارے ہاں وحدت الوجود کا لبادہ اوڑھا اور اس تصوف کی بنیاد بنا جس کا بانی شیخ الاکبر محی الدین ابن عربی کو قرار دیا جاتا ہے — ابن عربی کی بھی یہی کیفیت تھی کہ ذہن بڑا رسا تھا اور نگاہ کا زاویہ غلط، وحدت الوجود کے فریب تخیل نے مسلمانوں جیسی ہمہ تن عمل و حرکت قوم کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ علامہ اقبالؒ نے اسی بنا پر افلاطون کے متعلق لکھا ہے کہ :-

راہب دیرینہ افلاطوں حکیم　　از گروہِ گوسفندانِ قدیم
بر تخیل ہائے ما فرماں رواست　　جامِ اُو خواب آور و گیتی رباست
گوسفندے در لباسِ آدم است　　حکمِ اُو بر جانِ صوفی محکم است
قوم ہا از سکرِ اُو مسموم گشت
خفت و، از ذوقِ عمل محروم گشت

مغرب کے مادہ پرست

مغربی محققین و مفکرین نے افلاطون کی اس افیون سے پیچھا چھڑایا تو وہ افراط کی طرف نکل گئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ کائنات مادی ہے اور مادہ کے سوا کسی شے کا وجود ہی نہیں۔ یہ کائنات کسی نہ کسی طرح محض ہنگامی طور پر وجود میں آ گئی ہے۔ کچھ قوانین ہیں جن کی رو سے یہ ایک بے روح مشینری کی طرح مصروفِ حرکت ہے۔ اس کی نہ کوئی غرض و غایت ہے نہ منزلِ مقصود۔ نہ اس کے پیچھے کوئی بصیر و خبیر قوت ہے نہ اس کے آگے کوئی دلیلِ راہ۔ کائنات کے متعلق اس قسم کا تصور مغربی محققین کا پیدا کردہ نہیں، یہ تصور بھی قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ مغربی محققین نے صرف اسے جلا دی ہے اور (بزعم خویش) اس کی تائید میں دلائل و شواہد پیش کئے ہیں۔

قرآنِ کریم نے کائنات کے متعلق ان ہر دو تصورات کی شدت سے تردید کی۔ اس نے کہا کہ یہ بھی غلط ہے کہ :-

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ　　عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اور یہ کہنا بھی باطل ہے کہ نہ اِس کے پیچھے کوئی علیم و خبیر قوت ہے نہ اس کے سامنے کوئی غرض و غایت۔ اس کے برعکس اس نے اعلان کیا کہ:-

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۔ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۔ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ (۲۷/۳۸)۔

قرآنی نظریۂ کائنات

"ارض و سماوات اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اُسے ہم نے باطل کے طور پر پیدا نہیں کیا"۔ باطل کے مقابلہ میں لفظ حق آتا ہے۔ حق کے معنی ہیں کسی چیز کا اسطرح موجود، واقع اور ثابت ہوجانا کہ اس کے واقع ہونے یا ثابت ہونے سے انکار نہ کیا جاسکے۔ حق، ہر ناقابل انکار حقیقت کو کہا جاتا ہے۔ نیز حق، اس نظریہ یا مسلمہ کو کہتے ہیں جو تعمیری نتائج پیدا کرے جو اپنی جگہ پر ثابت، محکم اور اٹل ہو۔ باطل چونکہ حق کی ضد ہوتا ہے اس لئے اس کے معنی ہوں گے ایسی شئے جو فی الواقعہ موجود نہ ہو جو ثابت اور محکم نہ ہو۔ جس سے تعمیری نتائج پیدا نہ ہوں۔ جس کی کوئی غرض و غایت نہ ہو۔ باطل کے ان معانی کے پیشِ نظر آپ مندرجہ بالا آیت کے اُن الفاظ پر غور کیجئے جن میں کہا گیا ہے کہ ہم نے کائنات کو باطل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ فی الواقعہ موجود ہے۔ اس کی غرض و غایت ہے[1] یہ تعمیری نتائج پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس سے افلاطون کے نظریہ اور مغرب کے مادہ پرستوں کے تصور، دونوں کی تردید ہوگئی۔ قرآن کریم کے نزدیک کائنات کے متعلق صحیح تصور کو کس قدر اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اِس آیت کے اگلے الفاظ سے لگ سکتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "کائنات کو باطل تصور کرنا کفر ہے اور محض ظن و قیاس پر مبنی۔ یعنی نہ یہ علم پر مبنی ہے نہ صداقت پر۔ ایسا سمجھنے والے مومن نہیں، کافر ہیں"۔

کائنات کو باطل تصور کرنے کا جو نتیجہ مندرجہ بالا آیت میں بتایا گیا ہے، وہ بڑا ہی غور طلب ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ اس تصور کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانوں کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں گی۔ جیسا کہ اوپر کہا جاچکا ہے، کائنات کے متعلق یہ تصور کہ یہ محض فریب تخیل ہے، انسانیت کو مفلوج بنا دینے کا موجب بنا۔ اور اب مغربی محققین کا یہ نظریہ، کہ اس کی کوئی

---

[1] چونکہ "کائنات" میں خود انسان بھی شامل ہوجاتا ہے، اس لئے مغرب کے مادی نظریہ کی رد سے انسان کے متعلق بھی یہی کہا گیا کہ اس کی تخلیق کی بھی کوئی غرض و غایت نہیں۔ اسے یونہی بے مقصد پیدا کر دیا گیا ہے —— کاروانِ زندگی بے منزل است۔ قرآن کریم نے اس باطل تصور کی بھی یہ کہکر تردید کر دی کہ: اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا (۲۳/۱۱۵)۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں یونہی بے غرض و غایت، بے مقصد، پیدا کر دیا ہے"۔ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ (۲۳/۱۱۶)۔ "ایسا کرنا خدا کے شایانِ شان نہیں"۔ (تفصیل اس اجمال کی اپنے مقام پر آئے گی)۔

غرض و غایت نہیں، انسان کو حیوان بنا دینے کا باعث۔ اس قسم کی زندگی کو قرآن نے جہنم کا عذاب قرار دیا ہے جس میں اس وقت ساری دنیا ماخوذ ہے۔ اس سے اگلی آیت میں قرآن کریم نے ان دونوں نظریات کے حامل گروہوں میں خطِ امتیاز کھینچ کر رکھ دیا ——— یعنی وہ گروہ، جو تخلیقِ کائنات کو باطل سمجھتا ہے اور وہ گروہ جو اُسے حق تسلیم کرتا ہے۔ اس آیت میں کہا گیا ہے :-

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِى الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ (۳۸/۲۸)۔

"اِن سے پوچھو کہ کیا ہم ان لوگوں کو، جو کائنات کے بالحق ہونے پر ایمان رکھیں اور پھر ایسے پروگرام پر عمل پیرا ہوں جو اشیائے کائنات کی مضمر ممکنات کو بیدار کریں اور انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کا موجب بنیں، ان لوگوں کے برابر قرار دیں گے جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، کیا متقین اور فجار ایک جیسے ہو جائیں گے؟" اس میں مفسدین کا لفظ قابلِ غور ہے۔ اسی فساد کی طرف تو ملائکہ نے اشارہ کیا تھا! ان دونوں گروہوں میں فرق کر کے بارگاہِ ایزدی نے ملائکہ کو بتا دیا کہ ان کے سامنے ایک ہی گروہ ہے دوسرا نہیں۔ یہ دوسرا گروہ کس طرح وجود میں آئے گا۔ وہ کہاں سے راہنمائی حاصل کرے گا۔ اس کے متعلق اس سلسلہ کی اگلی آیت میں کہا :-

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۳۸/۲۹)۔

"یہ راہنمائی انہیں اس کتاب میں ملے گی جسے ہم نے اے رسولؐ! تیری طرف نازل کیا ہے۔ یہ راہنمائی یکسر خیر و برکت کا موجب ہے۔ لیکن یہ حاصل اُنہی کو ہوگی جو اس کے قوانین پر غور و فکر سے کام لیں اور عقل و بصیرت کی رو سے انہیں ہمیشہ اپنے سامنے رکھیں"

اِس سے سیکولرازم کے حامیوں اور وحی سے اکتسابِ ضیا کرنے والوں میں فرق کر کے بتا دیا۔

مندرجہ بالا آیت (۳۸/۲۷) میں کہا گیا ہے کہ "ہم نے کائنات کو باطل پیدا نہیں کیا" یہ منفی پہلو تھا۔ مثبت طور پر کہا کہ :-

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۲۹/۴۴)

"اللہ تعالیٰ نے ارض و سمٰوٰت کو بالحق پیدا کیا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی نشانیاں ہیں جو وحی کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں"۔ وحی کی صداقت پر یقین رکھنے والے تو وہ لوگ ہیں جن کے متعلق سورۃ آلِ عمران میں کہا گیا ہے کہ: اِنَّ

مقامِ مومن

فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِى الْاَلْبَابِ (۳/۱۸۹)۔ "یہ حقیقت ہے کہ ارض و سما کی تخلیق...... اور لیل و نہار کی گردش میں صاحبانِ عقل و بصیرت کیلئے عظیم نشانیاں ہیں"۔ یہ صاحبانِ عقل و بصیرت کون ہیں؟ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۳/۱۹۰)۔

"یہ وہ لوگ ہیں، جو کھڑے، بیٹھے، لیٹے، قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں اور کارگاہِ کائنات کی تخلیق پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ اور اس کے متعلق تحقیق و تدقیق کے بعد پورے حتم و یقین کے ساتھ پکار اٹھتے ہیں کہ اے نشوونما دینے والے! تو نے اس محیر العقول کارگاہِ کائنات کو باطل طور پر پیدا نہیں کیا۔ تیری ذات اس سے بہت بلند ہے کہ تو یونہی باطل تخلیق کرے۔ ہماری آرزو یہ ہے کہ ہم اس طرح کے وہم میں مبتلا نہ ہو جائیں جس سے ہماری سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر راکھ ہو جائیں"۔ اس سے اگلی آیت میں یہ بتا دیا کہ اس "عذابِ نار" کا محسوس و مشہود

دنیا میں ذلّت کی زندگی

نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ یہ کہ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ۔ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۳/۱۹۱) "عذابِ جہنم میں مبتلا وہ قوم ہوتی ہے جو دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہے۔ ایسی قوم کا دنیا میں کوئی مددگار نہیں ہوتا"۔

آپ اقوامِ عالم پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ قرآنِ کریم نے ان چند الفاظ میں کیسی عظیم الشان حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔ دنیا کی جس قوم نے افلاطونی فریب پر مبنی ویدانت یا تصوف کو مسلکِ زندگی بنایا وہ تسخیرِ کائنات کی طرف سے بے بہرہ ہو گئی۔ انہی اقوام کو "مذہب پرست" کہا جاتا ہے جو مادی دنیا اور اس کی خوشنمائیوں کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھ کر ان سے کنارہ کش رہنے میں قربِ خداوندی کی جھلک دیکھتی ہیں۔ یہ قومیں، ان اقوام کے مقابلہ میں، جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتی ہیں، نہایت ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ یہ اپنی ضروریاتِ زندگی تک کے لئے ان قوموں کی محتاج اور دست نگر ہوتی ہیں، اور وہ قومیں اس امداد کی جو قیمت وصول کرتی ہیں، وہ ہمارے سامنے ہے۔ یعنی ان کی سیاسی غلامی اور محکومی۔ قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ اس قسم کی قوموں کا کوئی حامی و ناصر نہیں ہوتا۔ یہ قومیں، جنہیں اپنا حامی و ناصر سمجھتی ہیں (یعنی جو بظاہر ان کی امداد کرتی ہیں) وہ درحقیقت ان کی ہمدرد اور دوست نہیں ہوتیں۔ وہ ان کی احتیاج کا فائدہ اٹھا کر ان کا پورا پورا استحصال کرتی ہیں۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآنِ کریم نے جو کہا تھا کہ کائنات کو باطل نہیں، بالحق پیدا کیا گیا ہے تو اس کا حقیقی مفہوم کیا ہے، اور مقصود و مطلوب کیا۔ اب رہیں وہ قومیں جو وحی کی راہنمائی سے کام نہ لیتے ہوئے تخلیقِ کائنات کو (جس میں انسان بھی شامل ہیں) بے غرض و غایت سمجھتی ہیں، وہ انسانوں کی تمدنی دنیا میں بھی وحی کی

مادہ پرستی کی تباہ کاریاں

راہنمائی سے کام نہیں لیتیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فطرت کی بے پناہ قوتوں کو مسخر کر کے انہیں ایک دوسرے کی ہلاکت اور تباہی کے لئے صرف کرتی ہیں۔ پروفیسر جوڈ اس باب میں لکھتا ہے:-

انیسویں صدی، سائنس کی ظفر مندی کا زمانہ تھا۔ سائنس نے ہمیں سستا کوئلہ اور کپاس دی اور ذرائع رسل و رسائل

میں انقلاب پیدا کر دیا۔ دیگر سینکڑوں طریق سے انسانی زندگی میں تبدیلیاں پیدا کر دیں اور آسائش کے سامان مہیا کر دیئے۔ لیکن سائنس ایک دو دھاری تلوار تھی جس نے انسانوں کو وہ قوتیں عطا کر دیں جن کا طریقِ استعمال وہ نہیں جانتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی قتل و غارت گری کی استعداد میں اضافہ ہو گیا اور اس طرح اس کی تہذیب، تباہی کے جہنم کے کنارے تک آ پہنچی۔ انیسویں صدی نے صرف سائنس کی ترقی دیکھی اور یہ ہمارے لئے چھوڑ دیا کہ ہم دیکھیں کہ سائنس کی اس ترقی کے ساتھ ساتھ انسانیت میں کس طرح تنزل واقع ہوتا چلا گیا۔

(GOOD AND EVIL — PAGE 119)

آئن سٹائن عصرِ حاضر کا عظیم ترین سائنسدان ہے۔ وہ اس ضمن میں لکھتا ہے:۔

ہمارے دور کے سائنسدانوں کی قلبی حالت الفریڈ نوبل کی سی ہو گئی ہے۔ الفریڈ نوبل نے ایک ایسا "بھک سے اُڑ جانے والا" مادہ ایجاد کیا تھا جو اس زمانے میں سب سے زیادہ ہلاکت انگیز تھا۔ اس سے اس کے ضمیر پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے اپنے جرم کا کفارہ ادا کرنے کے لئے نوبل پرائز کا اعلان کیا جو ہر سال اس شخص کو دیا جاتے جو دنیا میں قیامِ امن کا سب سے بڑا موجب ہو۔ ہمارے سائنس دان، جنہوں نے اس قدر ہلاکت انگیز ایجادات کی ہیں، اپنے آپ کو ضمیر کی اسی جہنمی سوزش میں مبتلا پاتے ہیں۔ یہ اگر جرم کا احساس نہیں تو کم از کم ذمہ داری کے احساس کا نتیجہ ضرور ہے۔

(OUT OF MY LATER DAYS)

ہمارے دور کے سائنسدانوں، مدبّروں، مفکروں، سیاستدانوں کی یہی قلبی کیفیت ہے جسے قرآن کریم نے "عذاب النار" سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے برعکس دوسرا گروہ مومنین کا ہے جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے استعمال میں لاتا ہے۔ اس سے ہمارے سامنے تین قسم کی قومیں آ گئیں۔

تین گروہ

(۱) وہ قوم، جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں وحیٔ خداوندی کی روشنی میں عالمگیر انسانیت کی ربوبیت کے لئے استعمال کرتی ہے۔ اسے جماعتِ مومنین کہا جائے گا۔

(۲) وہ قوم جو فطرت کی قوتوں کو تو مسخر کر لیتی ہے لیکن انہیں دوسروں کی ہلاکت اور تباہی اور اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے استعمال کرتی ہے، یہ مقامِ آدم ہے، جس کا نتیجہ یُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ (۲/۳۰) ہے —— اور

(۳) وہ قوم جو فطرت کی قوتوں کو مسخر ہی نہیں کرتی۔ یہ مذہب پرست اور تصوف زدہ قوم ہے جو انتہائی ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہے۔ اور چونکہ قرآن کریم کا فیصلہ یہ ہے کہ جو یہاں ذلت اور خواری کی زندگی بسر کرے اور اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ جائے۔ وہ آخرت میں بھی ذلیل و خوار ہو گا۔ اس لئے اس قوم کی دنیا بھی تباہ ہوتی ہے اور عاقبت بھی خراب۔

تخلیقِ کائنات کی غرض و غایت کیا ہے ، یہ ایک الگ موضوع ہے جسے کسی دوسرے مقام پر تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔ اس وقت ہم صرف قرآن کریم کی ایک آیت سامنے لانا چاہتے ہیں جس سے اصولی طور پر واضح ہو جائے گا کہ جہاں تک ہمارا

تخلیق کائنات کا مقصد

تعلق ہے ، تخلیقِ کائنات سے مقصد کیا ہے ۔ سورۃ جاثیہ میں ہے: وَخَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۔ وَلِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا کَسَبَتْ وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ (۴۵/۲۲)۔ "خدا نے ارض و سماوات کو بالحق پیدا کیا ہے ۔ اس لئے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل جائے اور کسی پر کسی قسم کا ظلم نہ ہو" اس سے ظاہر ہے کہ تخلیق کائنات کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل بروئے کار آ جائے ۔ یہ کس طرح ہوتا ہے ، ہمیں اس کا علم نہیں ۔ لیکن جو قوم تخلیقِ کائنات کی اس غرض و غایت پر ایمان رکھے وہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر پورے پورے حتم و یقین کے ساتھ ایمان رکھے گی ۔ اور یہی وہ قوم ہے جو فطرت کی قوتوں کو فساد اور خونریزیوں کا موجب بنانے کے بجائے ، انہیں عالمگیر انسانیت کی ربوبیت کا ذریعہ بنائے گی

ہم نے اوپر کہا ہے کہ یورپ کے انیسویں صدی کے محققین اور مفکرین نے یہ نظریہ وضع کیا کہ کائنات کی کوئی غرض و غایت نہیں ۔ یہ یونہی بے مقصد وجود میں آ گئی ہے اور اس کا منطقی نتیجہ یہ کہ اپنی طبیعی زندگی کی پرورش کے سوا ، خود انسانی زندگی کی بھی کوئی غرض و غایت نہیں ۔ لیکن اب وہاں کے مفکرین نے کروٹ بدلی ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ نہ کائنات کی تخلیق بے مقصد ہے اور نہ ہی انسانی زندگی بے غرض و غایت ۔ وہاں کا ایک مفکر (F.W. JONES) اپنی کتاب (DESIGN AND PURPOSE) کا اختتام ان الفاظ پر کرتا ہے :۔

> اگر انسان نے اپنی فکر میں تبدیلی پیدا کر لی کہ انسانی زندگی بلا مقصد نہیں تو اس سے نوعِ انسان کو بیحد فائدہ پہنچے گا ۔ انسانی زندگی کو با مقصد تسلیم کرنے سے یہ بھی تسلیم کیا جائے گا کہ تمام ذی حیات اشیاء اور غیر ذی حیات اشیاء ، غرضیکہ پوری پوری کائنات با مقصد ہے ۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک دن ، انسان ، شاہراہِ حیات پر اس طرح گامزن ہو کہ اسے نظر آ جائے کہ اس کے ساتھ تمام سلسلۂ کائنات اسی منزل کی طرف جا رہا ہے جو اس کا منتہائے نگاہ ہے اور یہ اس کائنات کا ایک ہمسفر ہے ۔ اس شاہراہِ کائنات پر تمام افرادِ کارواں کے حقوق یکساں ہیں ۔ اس شاہراہ کے منتہٰی کا ہمیں علم نہیں ، لیکن اس سے ہم اس حقیقت کا احساس تو کر سکتے ہیں کہ یہ بات کائنات کے بس میں نہیں کہ وہ اس راہ اور اس پر چلنے والے افرادِ کارواں کو فنا کر سکے ...... تاریخ کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس میں یہ احساس بھی ضروری ہو گیا ہے کہ کائنات کا یہ عظیم القدر سلسلہ ایک مقصد کا ثبوت پیش کر رہا ہے اور ہر انسانی زندگی ، خواہ وہ کسی قدر غیر اہم کیوں نہ ہو ۔ اس کائناتی مقصد کا جزو ہے ۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک اور ضمنی اشارہ بھی لائقِ توجہ ہے۔ کائنات کی تخلیق کے سلسلہ میں قرآنِ کریم نے ایک جگہ کہا ہے: وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ۔ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (۴۴/۳۸-۳۹)۔ "ہم نے ارض و سماوات، اور جو کچھ ان کے درمیان ہیں، اسے محض کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ اسے بالحق پیدا کیا ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس کا علم نہیں رکھتے"۔ ہندوؤں کے ہاں برہما (یعنی ان کے تصور کے خدا) کو نٹ راجن کہکر پکارا جاتا ہے۔ یعنی "کھلاڑیوں کا راجہ"، سب سے بڑا کھلاڑی۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ برہما نے اس دنیا کو کھیل اور تفریح کے لئے پیدا کر دیا ہے۔ اسی جہت سے اُسے نٹ راجن کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے ان کے اس باطل عقیدہ کی بھی تردید کر دی۔ اور اس کی وضاحت کر دی کہ یہ خدا کے شایانِ شان ہی نہیں کہ وہ محض کھیل تفریح کی خاطر اس قسم کے تماشے کرتا رہے۔ وہ خود الحق ہے اور اس کا ہر ارادہ اور ہر کام حق پر مبنی۔

آپ غور کیجئے کہ قرآنِ کریم کا ایک ایک لفظ کیسی کیسی عظیم حقیقتوں کو اپنے اندر مضمر رکھتا ہے۔

اب آجائیے پھر اصل موضوع کی طرف۔ آیت (۲/۳۱) میں کہا یہ گیا ہے کہ خدا نے آدم میں یہ صلاحیت رکھدی کہ وہ قوانینِ فطرت کا علم حاصل کر کے، فطرت کی قوتوں کو اپنے مصرف میں لائے۔ اور اس میں (كُلَّهَا) کا اضافہ کر کے یہ بتا دیا کہ فطرت کی کوئی قوت بھی ایسی نہیں جو اس کے دائرۂ تسخیر سے باہر رہ جائے۔ اس کے بعد (اسی تمثیلی یا محاکاتی انداز میں) کہا کہ خدا نے پھر ان اشیائے کائنات کو ملائکہ کے سامنے رکھا اور ان سے کہا کہ اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو کہ دنیا میں کسی نئی مخلوق کی ضرورت نہیں، ہم مملکتِ خداوندی کے نظم و نسق کو سرانجام دینے کے لئے کافی ہیں اور ہمارے ہی ہاتھوں خدا کا تخلیقی پروگرام اپنے مقصد تک پہنچ جائے گا، تو ذرا تم ان اشیاء کے خواص و جواہر اور ان کی مضمرات و ممکنات کے متعلق بتاؤ۔ اس کے بعد ہے:-

۲/۳۲ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ۔

ملائکہ نے اپنے عجز کا اعتراف کر لیا اور کہا کہ "ہمیں تو اتنا ہی علم ہے جتنا علم آپ نے ہمیں دیا ہے۔ اس سے زیادہ نہ ہمیں از خود کوئی معلومات حاصل ہیں اور نہ ہی ان کی تحصیل کی صلاحیت ہمارے اندر۔ کہاں آپ کا لامحدود علم اور حکمت اور کہاں ہمارا محدود علم! ان دونوں میں نسبت ہی کیا ہو سکتی ہے!"

یہاں بھی ایک عظیم حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کائنات کی ہر ذی حیات یا غیر ذی حیات شئے اپنے قوی اور خواص

کا علم تو رکھتی ہے لیکن کوئی شے کسی دوسری شے کے متعلق کچھ علم نہیں رکھتی۔ سونے کو کچھ علم نہیں کہ لوہا کیا ہوتا ہے۔ بکری کو کچھ علم نہیں کہ مچھلی میں کیا کیا خواص پوشیدہ ہیں۔ ان کے اس شعور کو عام اصطلاح میں شعورِ سادہ (SIMPLE CONSCIOUSNESS) کہا جاتا ہے۔ جب ہم نے کہا ہے کہ انہیں صرف اپنے متعلق "علم" ہوتا ہے تو اسے بھی درحقیقت علم نہیں کہا جائے گا۔ ان میں جبلی طور پر کچھ خاصیتیں ہوتی ہیں جن کا، ان سے، مختلف مواقع پر اظہار ہوتا رہتا ہے۔ انہوں نے نہ ان خاصیتوں کا علم کہیں سے حاصل کیا ہوتا ہے نہ ان میں اس سے زیادہ علم حاصل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے متعلق ملائکہ نے کہا ہے کہ: لَاعِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا (۲/۳۲)۔ اس کے بعد ہے:-

قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۲/۳۳﴾

اس پر "خدا نے آدم سے کہا کہ تم انہیں ان کی خاصیتوں، صلاحیتوں، یا کنہ و حقیقت کے متعلق بتادو کہ وہ کیا ہیں۔ جب آدم نے انہیں یہ بتادیا تو خدا نے انہیں (ملائکہ کو) کہا کہ کیا اب تمہاری سمجھ میں یہ بات آئی جو ہم نے کہا تھا کہ جو کچھ ہم جانتے ہیں، تم نہیں جانتے۔۔۔۔۔۔"

غیب و شہود "غیب" کا مفہوم مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں آیت (۲/۳) کی تشریح کے ضمن میں بتایا جاچکا ہے۔ اُسے ایک بار پھر سامنے لے آیئے۔ اس وقت ہم صرف اتنا دُھرا دینا کافی سمجھتے ہیں کہ جب کوئی شے صرف علمِ خداوندی میں ہو اور محسوس طور پر وجود میں نہ لائی گئی ہو اُس کی اِس حالت کو "غیب" کہیں گے۔ اور جب وہ محسوس طور پر سامنے آجائے تو اُسے مشہود کہا جائے گا۔ اسی طرح جس شے کی کوئی مُضمر صلاحیت ہنوز محسوس طور پر سامنے نہ آئی ہو اُسے بھی غیب کہا جاتے گا۔ اور جب وہ علمِ انسانی میں آجائے تو اُسے مشہود کہکر پکارا جائے گا۔ سو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے کہا کہ پہلی چیز تو یہ ہے کہ تمہارے سامنے صرف مشہود و محسوس کائنات ہے۔ اور ہم، ان اشیائے کائنات کا بھی، علم رکھتے ہیں جو ہنوز ہمارے علم و ارادے میں ہیں اور جو محسوس و مرئی طور پر سامنے نہیں آئیں۔ (وہ جو کہا گیا ہے: يَزِيْدُ فِى الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (۳۵/۱)۔ وہ اپنی مخلوق میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔ تو اس سے یہی مُراد ہے)۔ اور دوسرے یہ کہ تم مختلف اشیاء کی مضمر صلاحیتوں سے واقف نہیں۔ بنابریں تمہارا علم بے حد محدود ہے۔ اس کے برعکس، ہم ارض و سما اور ان میں پھیلی ہوئی جملہ اشیاء کے غیب اور شہود دونوں سے واقف ہیں۔ اور یہی ہمارا وہ علم ہے جس کا ایک گوشہ ہم نے اس نئی مخلوق ——— آدم ——— میں ودیعت کرکے رکھدیا ہے۔ اس کا مظاہرہ ابھی ابھی ہوچکا ہے۔

اس آیت کے اگلے الفاظ اس حقیقت کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔ لیکن ان کا غلط مفہوم یا ترجمہ بڑی گمراہی کا موجب

بن جاتا ہے۔ ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ خدا نے ملائکہ سے کہا کہ "ہم جانتے ہیں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم ہم سے چھپاتے ہو"۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ملائکہ کو یہ قوت بھی حاصل ہے کہ وہ اپنی بعض باتوں کو خدا سے چھپائے رکھیں۔ آپ غور کیجئے کہ اس سے ملائکہ اور خود خدا کے متعلق کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے۔ اِن الفاظ میں درحقیقت غیب اور شہادت کے تصور کی مزید وضاحت کی گئی ہے۔ آپ اشیائے کائنات پر غور کیجئے۔ یہ تخلیقِ کائنات کے وقت سے دنیا میں موجود ہیں، لیکن ان کی کیفیت یہ ہے کہ ایک وقت میں ان کی کوئی ایک مضمر صلاحیت یا خاصیت نمود میں آتی ہے۔ جوں جوں ارتقاء کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے، یا انسانی تحقیق آگے بڑھتی جاتی ہے، اِن اشیاء کے مضمر خواص آہستہ آہستہ بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اسی ایٹم (ATOM) کو لیجئے۔ دنیا میں موجود تو یہ پہلے دن سے تھا لیکن اس کی ساری خاصیتیں (POTENTIALITIES) مضمر تھیں، پوشیدہ تھیں، مخفی تھیں، زیرِ نقاب تھیں۔ محسوس طور پر ان کی نمود نہیں ہوئی تھی۔ اور آج اسی ایٹم کی یہ مخفی اور مضمر صلاحیتیں اس طرح نمود میں آرہی ہیں کہ ان سے کام لیتے ہوئے انسان چاند تک پہنچ گیا ہے۔ اور ابھی تو ان خاصیتوں کے نمود کی شاید پہلی ہی منزل ہے۔ یہ ہے اشیائے کائنات کی وہ حالت، جسے مَاكُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ (۲/۳۳) کہکر پکارا گیا ہے۔ اور اس کے بعد یہ ہے اُن کی نمود کے بعد کی کیفیت جسے مَا تُبْدُوْنَ (۲/۳۳) کہا گیا۔ ملائکہ سے کہا یہ گیا کہ ہم نے جو علم آدم میں ودیعت کرکے رکھدیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا دستِ تحقیق تمہاری ان خاصیتوں کو بھی بے نقاب کرکے رکھ دے گا جو آج، اور تو اور خود تمہاری اپنی نگاہوں سے بھی پوشیدہ ہیں۔ یہ ہے اس نئی مخلوق کا مقام اور وہ خصوصیت جس سے تم عاری تھے اور جس کا اسے حامل بنایا جارہا ہے۔ تمہاری مضمر خاصیتوں کی نمود اس کے ہاتھوں سے ہوگی۔ علامہ اقبالؒ نے (بالِ جبریل میں)

میلادِ آدم کا منظر

اسی منظر کی اپنے مخصوص اور شگفتہ انداز میں عکاسی کی ہے۔ ایک سین میں یہ دکھایا گیا ہے کہ فرشتے آدم کو جنت سے کس طرح رخصت کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ اس (آدم) سے کہتے ہیں:-

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بیتابی ؛ خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی

تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر ؛ کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

اس کے بعد اگلا سین وہ ہے جس میں روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے۔ اس میں ارض آدم سے کہتی ہے کہ:-

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ ؛ مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ ؛ ایامِ جدائی کے ستم دیکھ، جفا دیکھ

بے تاب نہ ہو، معرکۂ بیم و رجا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے ؛ دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے

ناپید ترے بحرِ تخیّل کے کنارے ۔۔۔ پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے

تعمیرِ خودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ!

یہ تھا وہ مقامِ آدم، جسکی ملائکہ کے سامنے، دستِ یزداں نے خود نقاب کشائی کی۔

اقبالؒ نے پیامِ مشرق میں، اس منظر کو فارسی زبان میں پیش کیا ہے، اور اس سے بھی کہیں زیادہ جوش و جلال کے ساتھ۔ جی نہیں چاہتا کہ میں قارئین کو اس سے محروم رکھ کر آگے بڑھ جاؤں۔ میں نے اس منظر کو اپنے مقالہ "آدم کی کہانی" میں (جو اب میری کتاب ۔۔۔ اقبال اور قرآن ۔۔۔ میں شائع ہو چکا ہے) محاکاتی انداز میں پیش کیا ہے۔ تخلیقِ آدم کے مرحلۂ اولیں سے آگے بڑھتے ہوئے میں نے لکھا ہے کہ "ہزارہا سال کی گردشوں کے بعد اس مشتِ خاک نے ایک متعین صورت اختیار کی۔ بکھری ہوئی شوخیاں سمٹ کر بجلیاں بن گئیں۔ زمین کانپی، آسمان تھرتھرایا، چاند کا ساغرِ زریں چھلک گیا۔ ستاروں کے ننھے سے دل دہل گئے، فضا میں ایک شور اٹھا اور:

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد ۔۔۔ حُسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور ۔۔۔ خودگرے، خودشکنے، خودنگرے پیدا شد

خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل ۔۔۔ حذر اے پردگیاں، پردہ درے پیدا شد

آرزو بے خبر از خویش بآغوشِ حیات ۔۔۔ چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد

زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر

تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

اقبالؒ کی فارسی نظموں کا اُردو میں ترجمہ بہت مشکل ہے۔ ترجمہ میں یوں بھی اصل کی روح مسلی جاتی ہے۔ لیکن اس نظم کا ترجمہ علامہ اسلم جیراجپوریؒ نے کیا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان اشعار کو اردو دان طبقہ کو سمجھانے کے لئے اس سے زیادہ موزوں الفاظ ملنے مشکل ہیں۔ وہ ترجمہ یہ ہے:۔

عشق چیخ اُٹھا کہ اک خونیں جگر پیدا ہوا ۔۔۔ حُسن کانپ اٹھا کہ اک صاحب نظر پیدا ہوا

فطرت آشفتہ کہ خاکِ عالمِ مجبور سے ۔۔۔ ایک خودگر، خودشکن اور خودنگر پیدا ہوا

پہنچی گردوں سے شبستانِ ازل میں یہ خبر ۔۔۔ پردہ دارو! ہوشیار! اک پردہ در پیدا ہوا

آرزو تھی زندگی کی گود میں سوتی ہوئی ۔۔۔ آنکھ کھولی، اک جہانِ خیر و شر پیدا ہوا

زندگی بولی کہ تھی میں آب و گِل میں مضطرب

ہائے آج اس گنبدِ بے در میں در پیدا ہوا

علامہ اسلمؒ نے ان اشعار کے ترجمہ کے بعد، کچھ اپنی طرف سے بھی اضافہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہے :-

مسکرا کر یہ ملائک سے کہا ابلیس نے　　لو! تمہارا اک حریفِ تازہ تر پیدا ہوا
چرخ سے آئی ندا اے ساکنانِ بحر و بر　　اک جہان آشوب، ظالم فتنہ گر پیدا ہوا
جس کی خاطر یہ زمین و آسمان چکر میں تھے　　مادرِ فطرت کا وہ نورِ نظر پیدا ہوا
تھا فضائے عالمِ ناسوت کا بربط خموش
آخر اس سازِ کہن کا زخمہ در پیدا ہوا

آدم کے اس مقام سے آگاہ ہو جانے کے بعد ملائکہ کا جو ردِ عمل ہو سکتا تھا، وہ ظاہر ہے۔ قرآن نے اسے ان الفاظ میں پیش کیا ہے :-

۲/۳۴ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ۔

ملائکہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ تسخیرِ فطرت کے متعلق جو کچھ پہلے لکھا جا چکا ہے اس کی روشنی میں ملائکہ کا سجدہ کسی مزید تشریح کا محتاج نہیں۔ ہمارے ہاں تو سجدہ کا مفہوم اتنا ہی رہ گیا ہے کہ نماز میں اپنی پیشانی کو زمین پر ٹکا دیا جائے لیکن سجدہ کے بنیادی معنی کسی کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا، کسی کی اطاعت اختیار کر لینا ہیں۔ قرآن کریم میں بیشمار مقامات پر یہ لفظ انہی معانی میں آیا ہے۔ سورۃ النحل کی ان دو آیات کو ایک دفعہ پھر سامنے لائیے جن میں کہا گیا ہے کہ :-

ملائکہ کا سجدہ

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ۔ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۱۶/۴۹-۵۰)

"کائنات میں جو کچھ ہے، خدا کے حضور سجدہ ریز ہے۔ وہ ہمارے سامنے کی جاندار مخلوق ہو یا ملائکہ، سب قوانین خداوندی کے اطاعت گزار ہیں۔ وہ اس سے کبھی سرکشی نہیں برتتے۔ وہ سرکشی برتنے کے انجام سے خائف رہتے ہیں۔ جو حکم انہیں دیا جاتا ہے، وہ بلا چون و چرا اس کے مطابق عمل کرتے ہیں" دوسری جگہ ہے اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ۔ (۷/۲۰۶) "تیرے رب کے ہاں جو مخلوق ہے وہ اس کی محکومیت سے سرکشی نہیں برتتی۔ جو فرائض انہیں تفویض کئے گئے ہیں وہ ان کی سرانجام دہی میں سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔ یعنی وہ خدا کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں" ان آیات میں سجدہ کا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

اس آیت (۲/۳۴) میں کہا گیا ہے کہ ملائکہ نے تو آدم کو سجدہ کر دیا، لیکن ابلیس نے ایسا نہ کیا۔ اس نے اس سے انکار کیا، اور انکار ہی نہیں، اس سے سرکشی برتی، اور اس طرح کفر کا ارتکاب کیا۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی آدم کی سرگزشت کا تذکرہ آیا ہے، وہاں اس حقیقت کو دہرایا گیا ہے کہ ملائکہ نے تو سجدہ کر دیا لیکن ابلیس نے اس سے سرکشی برتی۔ [ملاحظہ ہوں آیات ۷/۱۱؛ ۱۵/۳۱؛ ۱۷/۶۱؛ ۱۸/۵۰؛ ۲۰/۱۱۶؛ ۳۸/۷۳-۷۴]۔ ملائکہ کے سجدہ اور ابلیس کے انکار و سرکشی سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اگر قوانینِ فطرت کا علم حاصل کرے تو فطرت کی قوتیں، تمام کی تمام، اس کے سامنے جھک سکتی ہیں کہ وہ ان سے جس طرح جی چاہے کام لے۔ لیکن انسان کے اپنے جذبات، احکامِ خداوندی اور مستقل اقدار کی اطاعت سے سرکشی برتتے ہیں۔ اور یہی وہ گوشہ ہے جہاں ہدایت خداوندی کی ضرورت پڑتی ہے، اور جس کا ذکر آگے چل کر آتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں عام عقیدہ یہ ہے (اور اکثر تفاسیر میں بھی یہی لکھا ملتا ہے) کہ ابلیس ملائکہ ہی میں سے تھا — بلکہ بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ وہ معلم الملکوت (یعنی فرشتوں کا اُستاد) تھا۔ لیکن یہ خیال بالبداہت غلط ہے۔ ملائکہ کے متعلق تو قرآن کریم نے ہر مقام پر یہ کہا ہے کہ: هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ (۱۶/۴۹)۔ "ملائکہ کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتے۔" دوسری جگہ ہے: لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۶۶/۶)۔ "جو کچھ انہیں خدا کی طرف سے حکم ملتا ہے وہ اس کے مطابق کام کرتے ہیں اور کبھی معصیتِ خداوندی اختیار نہیں کرتے۔" لہٰذا جب ملائکہ کے متعلق قرآن کریم نے یہ کہا ہے تو ابلیس کس طرح ملائکہ میں سے ہو سکتا ہے، جس کا پہلی بار تعارف ہی یہ کہہ کر کرایا گیا کہ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ (۲/۳۴)۔ اور ہر جگہ اسے دہرایا گیا ہے۔ یہ غلط فہمی آیت (۲/۳۴) میں لفظ اِلَّا کے غلط مفہوم سے پیدا ہوتی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اور ملائکہ نے تو سجدہ کر دیا لیکن ابلیس نے نہ کیا۔ اس مفہوم کی رو سے ابلیس کو ملائکہ کے زمرے میں شمار کر لیا گیا۔ ہم عربی گرامر کی تشریحات میں الجھے بغیر "اِلَّا" کا مفہوم اردو زبان کی عام عبارات کی رو سے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ "اور مرد تو آ گئے لیکن زید نہیں آیا۔" اس سے واضح ہے کہ زید بھی ایک مرد ہے۔ یعنی وہ مردوں میں سے ایک ہے۔ لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ "مرد تو سب آ گئے لیکن زینب نہیں آئی،" تو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ زینب مردوں میں سے نہیں، وہ کوئی اور جنس (عورت) ہے۔ آیت (۲/۳۴) میں "اِلَّآ اِبْلِيْسَ" کے یہی معنے ہیں۔ یعنی ملائکہ نے تو سجدہ کر دیا لیکن ابلیس نے اس سے انکار کر دیا۔ اس سے واضح ہے کہ ابلیس ملائکہ میں سے نہیں تھا۔

ابلیس کا اِنکار

ہم نے یہ وضاحت اس غلط فہمی کے رفع کرنے کی غرض سے ضروری سمجھی ہے جو ہمارے ہاں متداول چلی آ رہی ہے، ورنہ ملائکہ اور ابلیس کا جو مفہوم پہلے بیان ہو چکا ہے اس کے پیشِ نظر اس قسم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ابلیس ملائکہ میں سے تھا — ملائکہ فطرت کی قوتیں ہیں، ابلیس خود انسان کے اپنے سرکش جذبات۔

ابلیس کی سرکشی کے سلسلہ میں قرآنِ کریم میں ایک ایسا عمیق نکتہ ہے جو ایک عظیم حقیقت کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ یعنی عقیدہ

جبر و قدر کی- بالفاظِ دیگر، مسئلہ تقدیر کی- سورۃ الاعراف میں ہے کہ خدا نے ابلیس سے پوچھا کہ جب میں نے تجھے سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا تو وہ کونسی بات تھی جس نے تجھے اس حکم کی تکمیل سے روکا۔ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۔ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۔خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (۷/۱۲) -"اس نے کہا کہ میرا مقام آدم سے بلند ہے۔ میں اس سے بہتر ہوں- تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اُسے مٹی سے" میں اس "مٹی کے مادھو" کے سامنے

ابلیس اور عقیدۂ جبر و قدر

کیوں جھکوں جبکہ میں اس سے افضل ہوں۔ (نیز دیکھئے ۱۵/۳۴؛ ۱۷/۶۱؛ ۳۸/۷۵)- آپ دیکھئے کہ ابلیس نے اپنے انکار کے جواز میں ایک دلیل پیش کی ہے۔اس کے معنے یہ ہیں کہ اس نے اس کا اعتراف و اقرار و اعلان کیا ہے کہ میں نے ایسا کچھ دیدہ دانستہ، اپنے اختیار و ارادہ سے، اپنے فیصلہ کے مطابق کیا ہے اور وہ اس دلیل پر مبنی ہے کہ میں آدم سے افضل اور بہتر ہوں۔ ابلیس کی یہ دلیل غلط ہو سکتی ہے (اور جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ یہ دلیل غلط تھی جس کی وجہ سے وہ اس قسم کی خود فریبی میں مبتلا ہو گیا)۔ لیکن اس سے اس نے اپنے آپ کو صاحبِ اختیار و ارادہ بتایا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنے اس فیصلے اور اقدام کی ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے۔ یہ فیصلہ اور اقدام "شیطان" کا تھا — یعنی انسان کے سرکش جذبات کا۔ لیکن جب اس کے بعد اس کے سامنے اپنے اس غلط فیصلے اور سرکش اقدام کے نتائج آئے تو اس پر مایوسی طاری ہو گئی۔ (یہ ابلیسیت کا مظاہرہ ہے) —— اس مایوسی میں اس نے معذرتیں تلاش کرنا شروع کر دیں۔ لیکن اُسے اس کے سوا کوئی معذرت نہ مل سکی کہ وہ اپنے آپ کو مجبور ثابت کرے۔ قرآن کریم نے جہاں اس کی پہلی دلیل کو پیش کیا ہے جس میں اس نے کہا تھا کہ میں آدم کو کیوں سجدہ کروں، میں اس سے اعلیٰ ہوں۔ اس کے بعد کہا ہے کہ خدا نے اس سے کہا کہ جاؤ! تم راندۂ درگاہ ہو گئے۔ فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ (۱۵/۳۴)۔ "تم زندگی کی تمام شادابیوں اور خوشگواریوں سے محروم کر دیئے گئے ہو" یہ تھے اس کے غلط فیصلے کے نتائج و عواقب۔ جب اس کے سامنے یہ نتائج آئے تھے تو اُسے چاہیئے تھا کہ جس دھڑلے سے اس نے اپنی سرکشی کا اعلان کیا تھا اسی جرأت سے ان عواقب کا بھی سامنا کرتا۔ یہ اس کے کیریکٹر کی پختگی ہوتی۔ لیکن اس نے اس مقام پر بڑی پستی کا ثبوت دیا۔ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ (۱۵/۳۹؛ ۷/۱۶) اس نے کہا کہ "بارِ الٰہا! میں کون ہوں جو تیرے حکم سے سرتابی برتتا۔ مجھ میں اس کی تاب و مجال کہاں ہے۔ میں تو بندۂ مجبور ہوں۔ تیرے حکم کے بغیر تو ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ اس لئے میں خود گمراہ نہیں ہوا، مجھے تو نے گمراہ کیا ہے" یہ تھی مایوس (ابلیس) کی پستی کردار یعنی اپنے آپ کو مجبور قرار دیکر اپنی غلطی کی ذمہ داری اپنے اوپر نہ لینا۔ یہی پستی کردار اس کے راندۂ درگاہ ہونے کا موجب بنی۔

ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ آدم سے بھی ایک لغزش ہوئی۔ اس نے خدا کے حکم سے معصیت برتی (۲/۱۲۱) اور ابلیس سے بھی معصیت ہوئی۔ جب آدم سے پوچھا گیا کہ تو نے ایسا کیوں کیا تو اس نے ندامت سے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا: رَبَّنَا ظَلَمْنَآ

اَنفُسَنَا۔ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (۷/۲۳) "اے ہمارے نشو ونما دینے والے! ہم نے خود اپنے خلاف زیادتی کی ہے۔ ہم سے بھول ہوئی، چوک ہوئی۔ اگر تو ہماری حفاظت کا سامان عطا نہیں فرمائے گا تو ہم تباہ ہو جائیں گے"۔

معصیتِ ابلیس و آدم میں فرق

اس کے جواب میں اس سے کہا گیا کہ آدم! تم نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ اس کی ذمہ داری قبول کر لی۔ اور آئندہ کیلئے محتاط رہنے کا وعدہ کر لیا۔ لہٰذا تمہاری اصلاح کا امکان ہے۔ اگر تم اس کے بعد ہماری راہنمائی کی پیروی کرو گے تو تم اس لغزش کے نقصان رساں نتائج سے بھی محفوظ رہو گے، اور آئندہ کے لئے بھی تمہیں زندگی کی خوشگواریاں نصیب ہوں گی"۔ یعنی قرآن کریم کی رو سے اصلاح کا امکان اس شخص کے لئے ہے جو اپنے فیصلہ اور عمل کی ذمہ داری کو قبول کرتا ہے۔ اس کے برعکس جب ابلیس سے پوچھا گیا کہ تو نے ایسا کیوں کیا تو اس نے اپنے فیصلہ اور عمل کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ میں ایسا کرنے والا کون ہوں، تو نے مجھے گمراہ کیا۔ قرآن نے بتایا ہے کہ اس قسم کا عقیدہ رکھنے والوں میں اصلاح کا امکان ہی نہیں ہوتا۔

اس سے آپ غور فرمائیے کہ یہ جو ہمارے ہاں ایک ایک سانس میں دُھرایا جاتا ہے کہ —— وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے —— سب کچھ خدا ہی کے حکم سے ہوتا ہے۔ انسان تقدیر کا پابند ہے۔ اپنی قسمت کے ہاتھوں مجبور ہے۔ قرآن کریم اس عقیدہ اور نظریہ کے متعلق کیا کہتا ہے، اس کے لئے مطالب الفرقان جلد اول میں آیات (۲/۱ تا ۲/۴) کی تشریحات میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اسے بھی ایک نظر دیکھ لیجئے۔ نیز میری مستقل تصنیف —— کتاب التقدیر —— کا مطالعہ بھی مفید رہے گا۔

اقبالؒ اور ابلیسی کردار

علامہ اقبالؒ نے اپنی کتاب "ضربِ کلیم" میں تقدیر کے عنوان سے ایک بڑی بلیغ اور دلکش نظم لکھی ہے جس میں ابلیس کے ان اقدامات اور ان کے نتائج کو بڑے حسین انداز میں اُجاگر کیا گیا ہے۔ بہتر ہو کہ آپ اُسے خود ملاحظہ فرمالیں۔ وہ نظم یہ ہے:-

تقدیر

(ابلیس و یزداں)

ابلیس

اے خدائے کن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر   آہ! وہ زندانیٔ نزدیک و دور و دیر و زود

حرفِ "استکبار" تیرے سامنے ممکن نہ تھا   ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود!

یزداں

کب کھلا تجھ پر یہ راز، انکار سے پہلے کہ بعد!

ابلیس

بعد! اے تیری تجلّی سے کمالاتِ وجود!

یزداں　　(فرشتوں کی طرف دیکھ کر)

پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے　　کہتا ہے تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود،

دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام　　ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود!

(ماخوذ از محی الدین ابن عربی) [1]

اِسی سرگزشت سے ایک اور بات بھی ہمارے سامنے آتی ہے۔ ابلیس کی خطا فکر کی غلط بینی، یا بناءِ استدلال کی کجی کا نتیجہ تھی۔ انسان میں اس قسم کی غلطیوں کا امکان ہے۔ ان کی تلافی کا طریق یہ ہے کہ جس وقت اس غلطی کا علم ہو جائے، اس سے رجوع کر لیا جائے۔ لیکن جس غلطی کا انسان اپنے آپ کو ذمہ دار ہی تسلیم نہ کرے، وہ اس کی جذباتی کجروی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس کی تلافی ممکن نہیں۔

پیدائشی امتیاز کا باطل نظریہ

ہم نے اوپر کہا ہے کہ ابلیس کی پیش کردہ دلیل بڑی گمراہ کن تھی۔ اس نے اپنی برتری اور آدم کی کہتری کے لئے دلیل یہ دی تھی کہ میری پیدائش آگ سے ہوئی اور آدم کی مٹی سے۔ یعنی اس نے پیدائشی امتیاز کے تصور کو اپنے لئے وجۂ فضیلت قرار دیا تھا۔ قرآن کریم کی رُو سے پیدائشی تفریق و امتیاز کا نظریہ باطل ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ یکساں واجب التکریم ہوتا ہے (۱۷/۷۰)۔ برہمن، کشتری، ویش اور شودر کے امتیازات انسانوں کے خودساختہ ہیں۔ قرآن کریم نے اس کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ مدارج کا معیار ہر شخص کے اعمال، یعنی اس کا کردار و عمل ہے (۴۶/۱۹)؛ (۴۹/۱۳)۔ لہٰذا یہ کہنا کہ میں پیدائش کی رُو سے کسی دوسرے انسان سے افضل و اعلیٰ ہوں، باطل نظریہ ہے۔

---

[1] حیرت ہے کہ ابن عربی نے ابلیس کے صاحبِ ارادہ اور اس کے بعد جبریت کو کس طرح موضوعِ سخن بنایا۔ وہ تو وحدۃ الوجود کا قائل ہی نہیں، السابق الاول ہے۔ اور وحدت الوجود کے عقیدہ کی رُو سے ابلیس کا الگ وجود تسلیم ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ابن عربی نے تو فرعون کے متعلق کہا ہے کہ "اُسے ایک طرح سے حق حاصل تھا کہ کہے اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى۔ کیونکہ فرعون ذاتِ حق سے جدا نہ تھا۔ اگرچہ اس کی صورت فرعون کی تھی۔ (فصوص الحکم۔ کلمۂ موسویہ)۔ بہرحال جو کچھ کہا گیا ہے وہ ہے بڑا دلچسپ اور معنی خیز۔

آگے بڑھنے سے پہلے سجدہ کے متعلق ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ اُوپر بتایا جاچکا ہے کہ سجدہ کا مفہوم، کسی کی اطاعت اور محکومیت اختیار کرنا ہے۔ قرآن کریم نے انسان کے متعلق واضح طور پر کہدیا کہ اُسے صرف احکام و قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنی چاہیئے،

سجدہ کا مفہوم

کسی اور کی نہیں۔ اسی کا نام عبادتِ خداوندی ہے۔ سورۃ حج میں ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ (۲۲/۷۷) "اے جماعتِ مؤمنین! تم صرف اپنے رب کا رکوع و سجود و عبودیت اختیار کرو"۔ اس میں رکوع و سجدہ اور عبادت کو مترادف معانی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اور ان تمام الفاظ سے مراد اطاعتِ خداوندی ہے۔ سورۃ النجم میں ہے: فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا (۵۳/۶۲) "اللہ کو سجدہ کرو۔ یعنی اس کی محکومیت اختیار کرو"۔ یہاں سے بھی سجدہ کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔ یعنی اس سے مراد عبودیتِ خداوندی ہے۔ قرآن کریم نے شرفِ انسانیت کا بلندترین مقام "عبدیت" بتایا ہے، اس نے دیگر انبیائے کرام کو بھی خدا کے عبد کہہ کر پکارا ہے۔ اور حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی لقب سے نوازا ہے۔ عبدیت کا مفہوم اس کتاب کی جلد اوّل میں آیات (۱/۴ و ۲/۲۳) میں واضح کیا جاچکا ہے۔ اس مقام پر اتنا دُہرا دینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے جو یہ کہا کہ ملائکہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہوگئے تو اس سے اس نے اس باطل نظریہ کی تردید کردی جس کی رو سے مظاہرِ فطرت کو دیوی دیوتا سمجھ کر، انسان ان کے سامنے سجدہ ریز ہوتا تھا۔ جہاں تک خود انسانوں کا تعلق ہے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۔ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۔ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۳/۷۹-۸۰) "کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ خدا اُسے ضابطۂ قوانین، حکومت اور نبوّت تک بھی کیوں نہ عطا کردے، کہ وہ لوگوں سے یہ کہنا شروع کردے کہ تم خدا کے احکام کی جگہ میرے احکام کی اطاعت کرو۔ اس کی

مقامِ عبدیّت کی سرفرازیاں

تعلیم یہی ہوگی کہ تم سب اس کتاب خداوندی کی اطاعت سے جس کی تم دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور جس پر غور و تدبر کرتے ہو، ربّانی یعنی خدا کے نظامِ ربوبیت کے علمبردار بن جاؤ۔ اُسے یہ بھی نہیں کہنا چاہیئے کہ تم ملائکہ کی پرستش شروع کردو یا نبیوں کو خدا بنالو۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ تم تو قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے کا عہد کرو اور وہ تمہیں کفر کی تعلیم دے، ایسا کسی کو نہیں کرنا چاہیئے"۔ یہ ہے مقامِ آدمیت یعنی کائنات میں، خدا کے قوانین کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کرنا۔

شرک اس لئے جرمِ عظیم نہیں کہ اس سے (معاذ اللہ) خدا کو غصہ آجاتا ہے کہ تم نے اوروں کو میرے جیسا (خدا) کیوں تسلیم کرلیا؟ یہ اس لئے ظلمِ عظیم ہے کہ اس سے انسان شرفِ انسانیت کے مقام سے گر جاتا ہے۔ شرفِ انسانیت کا مقام یہ ہے

کہ انسان ایک خدا کے قوانین کی اطاعت اختیار کرکے، ساری کائنات میں سرفرازانہ زندگی بسر کرے۔ یہی وہ توحید ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجیے۔۔ کہ انسان خدا کا عبد بننے کے بعد کس طرح ہر قسم کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس عبدیت کو سجدۂ خداوندی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ۔۔۔ ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یہ ہے وہ سجدۂ خداوندی، جس کا حکم قرآن کریم میں دیا گیا ہے، لیکن اب جس کا مفہوم، نماز میں اپنی پیشانی کو زمین پر رکھ دینے میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نماز کا یہ سجدہ بھی ضروری ہے اور اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ انسانی ارادہ اور اس کی جسمانی حرکات میں ایک خاص ربطِ باہمی ہے، اسے (PARALLELISM) کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔[1] جب آپ کسی کو سلام کہتے ہیں تو آپ کا ہاتھ غیر شعوری طور پر ماتھے کی طرف اُٹھ جاتا ہے۔ جب آپ کے دل میں کسی کے احترام کا جذبہ بیدار ہوتا ہے تو آپ کا سر خود بخود جھک جاتا ہے۔ خوشی کی خبر سن کر آپ کا چہرہ تمتما اٹھتا ہے۔ ندامت میں آپ کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ غصہ میں آپ غیر شعوری طور پر چلا کر بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ محبت کا اظہار بڑی لطافت و نزاکت لئے ہوتا ہے۔ انسانی جذبات اور ان کے محسوس مظاہر کا یہ ربط غیر شعوری بھی ہے اور بڑا اہم بھی۔ آپ کسی شعلہ نوا مقرر سے کہئے کہ وہ اپنی تقریر کے دوران کسی قسم کی حرکت نہ کرے ساکت وصامت کھڑا ہوتا چلا جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ چند منٹ تک بول کر رُکتا جائے گا۔ اور اس کی ان چند منٹ کی تقریر بھی بڑی غیر مؤثر ہوگی۔

خدا کی اطاعت کے جذبہ کے اظہار کے لئے اس قسم کے جسمانی مظاہر ناگزیر بھی ہیں اور ضروری بھی۔ ان کے بغیر انسان کی تسکین نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کی جسمانی حرکات کو (FORMALISM) کہا جاتا ہے۔ یعنی رسوم و مظاہر۔ نماز میں قیام و رکوع و سجود،

رسوم و مظاہر

یا حج میں طوافِ کعبہ، انہی جذباتی تقاضوں کی تسکین کا ذریعہ ہیں۔ دین کے پروگرام میں ان کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس میں یہ رسوم و مظاہر تو باقی رہ جاتے ہیں، اطاعت کی روح گم ہو جاتی ہے۔ اس میں سارا زور ان مظاہر کی باقاعدگی اور پابندی سے ادائیگی پر دیا جاتا ہے۔ اور اطاعتِ خداوندی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ جو شخص نماز میں اس طرح سجدہ ادا کرے کہ اس کے ساتوں اعضاء —— دونوں پاؤں کے پنجے، دونوں گھٹنے، دونوں ہاتھ اور ماتھا —— زمین کے ساتھ لگ جائیں، اس کے متعلق کہا جاتا ہے

---

[1] ان حقائق کو جلد اول میں بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ ملاحظہ ہوں صفحات (۱۲۳ - ۱۲۰)۔ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر اس مقام پر ان کا اعادہ ضروری سمجھا گیا ہے —— اور ایسا تو مطالب الفرقان میں اکثر ہوتا رہے گا۔

کہ اس نے صحیح سجدہ ادا کر لیا خواہ اس سجدہ کی ادائیگی کے وقت وہ دل میں طاغوتی فیصلوں کے بروئے کار لانے کے پروگرام کی تفصیلات ہی کیوں نہ طے کر رہا ہو۔ ابلیس ان مظاہر کو کس طرح مزیّن بنا کر دکھاتا رہتا ہے۔ اس کے متعلق ہم، باب اول میں تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔ اقبالؒ نے اس سجدہ میں، جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (۹۶/۱۹)۔ یعنی "سجدہ کر اور خدا کے قریب ہو جا۔" اور ہمارے رسمی سجدوں میں بڑے دلکش انداز میں فرق کر کے بتایا ہے۔ وہ اپنی مثنوی "پس چہ باید کرد" میں کہتے ہیں:۔

مردِ آزادے چو آید در سجود ۔۔۔ در طوافش گرم رو چرخِ کبود

وہ خدا سے آرزو کرتے ہیں کہ:۔

نہ خواہم ایں جہان و آں جہاں را ۔۔۔ مرا ایں بس کہ دانم رمزِ جاں را
سجودے دہ کہ از سوز و سرورش ۔۔۔ بوجد آرم زمین و آسماں را

خدا کے حضور صحیح سجدہ کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق کہتے ہیں:۔

مسلمانیم و آزاد از مکانیم ۔۔۔ بروں از حلقۂ نُہ آسمانیم
بما آموختند آں سجدہ کز وے ۔۔۔ بہائے ہر خداوندے بدانیم

یعنی وہ سجدہ، جس سے دنیا میں خدائی کے ہر دعویدار کی قدر و قیمت معلوم ہو جاتی ہے۔ یعنی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اُسے کتنے میں خریدا جا سکتا ہے۔ کتنا بڑا ہے یہ مقام جو انسان کو، خدا کے حضور سجدہ عطا کر دیتا ہے۔ اور اس کے بعد اقبالؒ (ہماری موجودہ حالت پر اشکبار ہوتے ہوئے) بصد حسرت و یاس پکار اٹھتا ہے کہ:۔

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی ؛ اُسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

وہ مسلمان سے کہتا ہے کہ یاد رکھ!

وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام ؛ کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

آستانِ خداوندی پر سر جھکا کر دنیا کے بڑے سے بڑے آستانہ سے مستانہ وار، سرفراز و بے نیاز گذر جانا، یہ ہے اس سجدہ کا نتیجہ جو بارگاہِ خداوندی میں ادا کیا جاتا ہے۔ یعنی خدا کی محکومیت اختیار کرنے کا نتیجہ۔

مذہب میں "عبادت" انفرادی ہوتی ہے لیکن دین تو اجتماعیت کا نظام ہے۔ اس میں ہر عمل کا نتیجہ، جہاں انسان کی اپنی ذات کے استحکام کا موجب بنتا ہے، وہاں وہ دین کے نظام کے تمکّن کا ذریعہ بھی قرار پاتا ہے۔ اسی کو اجتماعیت کہتے ہیں، اور اسی قسم کا ہے وہ سجدہ، جس کے متعلق اقبالؒ کہتا ہے کہ:۔ خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو ؛ وہ سجدہ، جس میں ہے ملّت کی زندگی کا پیام

تحریکِ پاکستان کے دوران، نیشنلسٹ علماء اور اقبالؒ اور ان کے ہمنواؤں کے درمیان یہی نکتہ باعثِ نزاع تھا۔ ان علماء کا موقف یہ تھا کہ جب۔ انگریز کے چلے جانے کے بعد اہلِ ہند کی اپنی حکومت قائم ہو جائے گی تو اس میں مسلمانوں کو اعتقادات اور عبادات کی پوری پوری آزادی حاصل ہو گی۔ اس لئے، مسلمانوں کے لئے ان کی الگ آزاد مملکت کا مطالبہ اسلام کا تقاضہ نہیں۔ ان کے برعکس، اقبالؒ کا پیش کردہ نظریہ یہ تھا کہ اسلام ان انفرادی اعتقادات اور عبادات کا نام نہیں۔ اسلام اس دین کا نام ہے جس میں حکمرانی صرف قوانینِ خداوندی کی ہوتی ہے اور اس کے لئے مسلمانوں کی آزاد مملکت کا وجود لاینفک ہے۔ یہی تھی وہ حقیقت، جسے انہوں نے ان چند الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا تھا کہ:-

سیکولر نظام میں سجدہ کی اجازت

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ؛ نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

بہر حال، یہ گفتگو تھی اس سجدہ کے متعلق جس کا حکم اُمّتِ مسلمہ کو دیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہم پھر اپنے موضوع کی طرف پلٹتے ہیں—— یعنی ابلیس و آدم کی آویزش کی طرف۔

ملائکہ نے آدم کو سجدہ کیا۔ ابلیس نے سرکشی اختیار کی، اس پر ابلیس سے کہا گیا: قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُومًا مَّدْحُورًا ۖ لَّمَن تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكُمْ أَجْمَعِينَ (۷/۱۸)۔ "خدا نے کہا کہ تو اس حالت سے نکل جا۔ تو ذلیل دھتکارا ہوا ہے۔ ذُرّیتِ آدم میں سے جو تیرا اتباع کرے گا تم اُن لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہو گا۔ دوسری جگہ ہے: قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ (۳۸/۷۷)۔ "خدا نے اس سے کہا کہ تو یہاں سے نکل جا۔ تو قیامت تک (ہمیشہ ہمیشہ کیلئے) زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہے گا" (۳۸/۷۸)۔

واضح رہے کہ خدا نے ابلیس سے یہ کچھ جو کہا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اسے (خدا کو) (معاذ اللہ) غصہ آ گیا کہ ابلیس نے اس کا حکم کیوں نہ مانا۔ غصہ تو انسانی جذبہ اور کمزوری ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کے جذبات سے منزہ اور بلند ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ابلیس کی طرف سے جس پستیٔ کردار کا مظاہرہ ہوا، یہ اس کا فطری نتیجہ تھا۔ جیسا کہ اس کتاب کی پہلی جلد میں سورۃ الفاتحہ کی تشریح کے ضمن میں بتایا گیا ہے، خدا کا غضب درحقیقت انسان کے غلط اعمال کے فطری نتائج کا نام ہے۔ ہم باب اول میں اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں کہ سرگزشتِ آدم کا سارا بیان تمثیلی ہے اور اس کا انداز محاکاتی۔ لہٰذا خدا کی طرف سے ابلیس کو یہ حکم بھی تمثیلی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ابلیس کی طرف سے کس قسم کی پستیٔ کردار کا مظاہرہ ہوا تھا جس کا فطری نتیجہ زندگی کی خوشگواریوں سے محرومی اور ذلت و خواری تھا؟ پہلی چیز تو یہ کہ اُس نے

ابلیس کے جرائم

اپنے پیدائشی امتیاز کو وجۂ فضیلت بنایا۔ یہ اس کی پست ذہنیت کی دلیل تھی۔ دوسرے یہ کہ اس نے اپنے انکار کے لئے پہلے تو دلیل پیش کی جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اس کا اعتراف کیا کہ یہ انکار اس نے اپنے ارادہ سے کیا ہے جس کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ اور اس کے بعد، جب اس انکار کے عواقب سامنے آئے تو عقیدۂ جبر میں پناہ لینے لگا اور اپنے اس انکار کا ذمہ دار اپنے بجائے خدا کو قرار دیدیا۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ (۱۷/۶۲) "ابلیس نے خدا سے کہا کہ یہ مخلوق جسے تو نے میرے مقابلے میں واجب التکریم قرار دیا ہے؛ تو دیکھ کہ میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں"۔ یہ جذبۂ حسد ہے جو درحقیقت احساسِ کمتری کی دلیل ہوتا ہے۔ دورِ حاضر کے نفسیاتی تجزیہ نے یہ بھی بتایا ہے کہ سرکش اور مستبد حکمرانوں کا جذبۂ رعونت اور انانیت، درحقیقت اُن کے احساسِ کمتری کی تخلیق ہوتا ہے۔ کمتری کا یہ احساس انہیں ہر وقت ستاتا رہتا ہے اور وہ اس کی تسکین دوسروں کو اذیت دیکر حاصل کرتے ہیں اسے اصطلاح میں (SADISM) کہا جاتا ہے۔ وہ جب تک قوت و اقتدار کے مالک رہتے ہیں، بڑے جری اور دلیر نظر آتے ہیں، لیکن جونہی ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے، وہ انتہائی درجہ

مستبدوں کی بزدلی

کے بزدل ثابت ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن نے داستانِ صاحبِ ضربِ کلیم اور فرعون کی ایک کڑی میں بڑے بصیرت افروز انداز میں بیان کیا ہے۔ فرعون کی فرعونیت تو ضرب المثل ہے۔ لیکن اس میں بتایا یہ گیا ہے کہ جب وہ ڈوبنے لگا تو اس نے چلّا کر کہا: اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (۱۰/۹۰) "میں اس حقیقت پر ایمان لاتا ہوں کہ اس خدا کے سوا، جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں، کوئی خدا نہیں۔ اور اس طرح میں زمرۂ مسلمین میں شامل ہوتا ہوں"۔ بظاہر چاہیئے تو یہ تھا کہ خدا کی طرف سے اُسے شاباش دی جاتی کہ تو بالآخر ایمان لے آیا۔ تو نے بہت اچھا کیا۔ لیکن خدا کی طرف سے اس کا جواب یہ ملا آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (۱۰/۹۱) "تو ساری عمر حق و صداقت سے سرکشی برتتا رہا۔ ملک میں فساد برپا کرتا رہا۔ تیری سرکشی اور استبداد حد و دنا آشنا تھے۔ لیکن اب جب موت تیرے سامنے آئی ہے تو تو اس سے بچنے کے لئے ایمان کا اظہار کر رہا ہے۔ یہ تیرے کردار کی انتہائی پستی کی دلیل ہے۔ یہ ضعفِ خودی ہے۔ اس لئے تیرے اس اقرار و اعلان کا ہماری میزان میں "پرِ کاہ جتنا بھی وزن نہیں"۔

یہی وہ کردار ہے جس کا مظاہرہ ابلیس کی طرف سے ہوا۔ اسی لئے خدا نے اس سے کہا تھا: اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ (۷/۱۳)۔ "تو بڑا ہی پست فطرت ثابت ہوا"۔ یہ ہیں وہ حقائق، جو ابلیس کو راندۂ درگاہ قرار دیئے جانے کے سلسلہ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ آپ ان حقائق پر غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ دنیا کے بڑے بڑے سرکش اور مستبد فراعنہ کا صحیح کردار کس طرح بے نقاب ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

ابلیس کا جذبۂ انتقام

بہرحال، ابلیس کو جب اس طرح دھتکارا گیا تو وہ انتقام پر اتر آیا۔ اس نے بدرگاہِ خداوندی عرض کیا کہ آپ مجھے اور آدم کو رزم گاہِ حیات میں آزاد چھوڑ دیجئے اور پھر دیکھئے کہ میں اُسے کس طرح ننگی کا ناچ نچاتا ہوں۔ لیکن اس کے لئے ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ اس مقابلہ میں ایسا نہ ہو کہ جب میں اُسے پچھاڑ کر اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھوں تو آپ میرا ٹینٹوا دبا دیں۔ یہ تو منصفانہ کُشتی قرار نہیں پائے گی۔ آپ مجھے اس کا اطمینان دلائیے کہ جب تک کرۂ ارض پر آدم کا وجود باقی رہے گا، مجھے بھی اس وقت تک مہلت دی جائے گی۔ قَالَ اَنۡظِرۡنِیۡۤ اِلٰی

قیامت تک مہلت

یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ ۔ قَالَ اِنَّکَ مِنَ الۡمُنۡظَرِیۡنَ (۷/۱۴-۱۵)۔ "ابلیس نے کہا کہ مجھے آخری وقت تک مہلت دیجئے اور خدا نے اس سے کہا کہ ہمیں یہ شرط منظور ہے۔ تمہیں اور آدم کو برابر کی مہلت دی جائے گی"۔ یہی الفاظ دیگر مقامات پر بھی آئے ہیں (دیکھئے ۱۵/۳۶؛ ۱۷/۶۲؛ ۳۸/۷۹)۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ابلیس کا محلِ انتقام بھی سراسر بے جا تھا۔ آدمؑ نے اس کے خلاف کچھ نہیں کیا تھا۔ اس لئے اس سے انتقام کس بات کا؟ اسے (ابلیس کو) شکایت یہ تھی کہ خدا نے آدم کو اس سے افضل کیوں قرار دیا ہے؟ اگر وہ اسے اپنے خلاف زیادتی سمجھتا تھا تو اسے اس کے لئے (معاذ اللہ) خدا سے انتقام لینا چاہئے تھا۔ لیکن خدا کے سامنے پنجہ کشی کی تو اُسے نہ جرأت تھی، نہ اس کی ہمت۔ وہ اس کی (خدا کی) قوتوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے آدم (بیچارے) کو کمزور اسامی دیکھ کر اُسے، اپنی آتشِ انتقام کے فرو کرنے کا ذریعہ بنایا۔ یہ بھی اس کی پستیٔ کردار کی علامت تھی۔ دوں ہمت مستبد سرکشوں کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ طاقتور حریف کو تو کچھ نہیں کہتے۔ اپنا غصہ کمزوروں اور ناتوانوں پر نکالتے ہیں خواہ ان کا کوئی قصور بھی نہ ہو۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید، انسانی کیریکٹر کی کمزوریوں کو کس طرح ابلیس کے روپ میں پیش کئے چلا جاتا ہے!

بہرحال، ابلیس نے خدا سے مہلت مانگی جو اُسے مل گئی۔ جب وہ اس سے مطمئن ہو گیا۔ تو اس نے اپنے چیلنج کو دُھرایا اور کہا کہ اب تو دیکھ کہ میں بنی آدم کو تیرے سیدھے راستہ سے بہکانے کے لئے کس کس قسم کی راہزنی سے کام لیتا ہوں۔ میں ان کے دائیں طرف سے حملہ کروں گا اور بائیں طرف سے۔ ان کے سامنے سے آؤں گا اور ان کے پیچھے سے۔ چاروں طرف سے انہیں گھیر لوں گا اور پھر تو دیکھے گا کہ ان میں اکثریت کس طرح تیری ناشکر گزار ہوتی اور میرے اشاروں پر ناچتی ہے (۷/۱۶-۱۷)۔ دوسرے مقام پر ہے کہ میں ان کے ہر غلط فیصلہ اور اقدام کو ان کی نگاہوں میں بڑا مزیّن بنا کر دکھاؤں گا اور اس طرح انہیں تیرے راستہ سے گمراہ کر دوں گا (۱۵/۳۹)۔ سورۃ صٓ میں ہے کہ جب اس سے کہا گیا کہ تو یہاں سے دور ہو جا! اور اس کے بعد اس کی مہلت طلبی کی درخواست کو منظور کر لیا گیا تو: فَبِعِزَّتِکَ لَاُغۡوِیَنَّہُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ (۳۸/۸۲)۔ "اس نے کہا تیری عزت جبروت کی قسم! تو دیکھ کہ میں انہیں کس طرح گمراہ کرتا ہوں"۔ اس آیت میں فَبِعِزَّتِکَ (۳۸/۸۲) کا لفظ بڑا ہی پُر معنی ہے۔

ابلیس خدا کے جلال و جبروت کا قائل ہے۔ اس کی لامحدود قوتوں کا معترف ہے۔ اس کی عزت و اقتدار کی قسم کھاتا ہے اور اس کے بعد کہتا ہے کہ دیکھ! میں تیری اس چہیتی مخلوق کو کس طرح گمراہ کرتا ہوں؟ ابلیس کو یہ کہنے کی جرأت کس وقت ہوئی؟ اس وقت جب خدا کی طرف سے اُسے یہ ضمانت مل گئی کہ اُسے اور آدم کو برابر کی مہلت دی جاتی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی کشمکش اور آویزش میں خدا دخل نہیں دے گا۔ اور اس کے بعد جو خدا کی طرف سے کہا گیا، اور خود ابلیس نے بھی اس کا اقرار کیا کہ "خدا کے مخلص بندوں پر اس کا کوئی زور نہیں چل سکے گا" تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ بندے اپنے جذبات کو اقدارِ خداوندی کے ساحلوں میں محدود رکھیں گے اور شر کی قوتوں کو اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیں گے۔ یہ ان کی اس قوت کا نتیجہ ہوگا جو انہیں اقدارِ خداوندی کی اطاعت سے حاصل ہوگی۔ یہ نہیں کہ شر کی قوتوں کو خدا خود مغلوب کر دے گا اور اس کا کریڈٹ (CREDIT) اس کے مخلص بندوں کو ملے گا۔ خیر و شر کی یہ کشمکش نہایت منصفانہ ہوگی۔ اس میں نہ کسی سے رعایت برتی جائے گی نہ کسی کا راستہ روکا جائے گا۔ یہاں، بلا رُو رعایت، قوت کا مقابلہ قوت سے ہوگا۔ اسی کا نام قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ ان امور کی تشریح بابِ اول میں، ابلیس کے عنوان میں ہو چکی ہے۔ اس میں البتہ ایک لفظ ایسا آیا تھا جس کی وضاحت کو ہم نے موجودہ مقام پر اٹھا رکھا تھا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ ابلیس نے خدا سے کہا کہ تو مجھے یومِ قیامت تک مہلت دے اور پھر دیکھ کہ میں کس طرح لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۷/۶۲)۔ اس میں اَحْتَنِكَنَّ کا لفظ غور طلب ہے۔ ابلیس نے کہا یہ کہ تو دیکھ کہ میں کس طرح اس پر کاٹھی ڈالتا ہوں۔ اسے اپنا مرکب بناتا ہوں۔ اس پر سواری کرتا ہوں۔ کسی کو اپنے تابع فرمان بنانے کے لئے عام طور پر یہی الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن گھوڑے پر سواری کرنے کے بھی مختلف انداز ہوتے ہیں۔ ایک انداز تو یہ کہ گھوڑے پر نہایت خوشنما، قیمتی زین کسی جائے۔ اس کے منہ میں مرصع لگام دی جائے۔ ماتھے پر طاؤسی کلغی لگائی جائے اور اس انداز سے اس پر سواری کی جائے۔ سواری تو اس طرح بھی ہوتی ہے لیکن اس میں پھر بھی گھوڑے کا کچھ وقار قائم رہتا ہے۔ دوسری طرف آپ اس منظر کو سامنے لائیے کہ گاؤں کے کچھ لڑکے کسی ٹٹو کو گھیر لیں۔ ان کے پاس نہ زین ہو نہ لگام۔ ایسے میں وہ کرتے یہ ہیں کہ کہیں سے کوئی ٹوٹی پھوٹی رسی لیکر اس سے گھوڑے کا منہ اور ٹھوڑی باندھ دیتے ہیں اور اُسے لگام کے طور پر ہاتھ میں تھام کر اس پر سواری کرتے ہیں۔ آپ دیکھئے کہ اس انداز کی سواری، اس گھوڑے کے لئے اذیت رساں ہی نہیں بلکہ اس کی ذلت و رسوائی کی تصویر بھی سامنے لاتی ہے۔ سواری کے اس انداز کو عربوں کے ہاں "اِحتناک" کہا جاتا تھا۔ اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آ جائے گی کہ ابلیس نے خدا سے جو یہ کہا کہ: اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ (۱۷/۶۲) "یہ مخلوق جسے تو، اس قدر واجب التکریم بتا رہا ہے،

خدا دخل نہیں دے گا

اِحتناک کی رسوائیاں

تو دیکھیگا کہ میں اس سے کس طرح احتناک کا سلوک کرکے اسے ذلیل وخوار کرتا ہوں" تو اس کا عملی مفہوم کیا تھا۔

ضمناً۔ عصرِ حاضر کے ماہرینِ علم النفس کا تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ (SADISTIC TENDENCIES) رکھنے والے مستبد ارباب قوت (ڈکٹیٹروں) کا مسلک یہی نہیں ہوتا کہ وہ اپنے مخالفین کو جسمانی اذیت دیکر ہلاک کریں۔ انہیں جتنی لذت اپنے زیرِ نفوذ کو ذلیل وخوار کرنے سے حاصل ہوتی ہے، اتنی لذت ان کی موت سے نہیں ملتی۔ وہ انہیں زیادہ سے زیادہ عرصہ تک زندہ رکھنا چاہتے ہیں، لیکن انتہائی ذلت وخواری کی زندگی میں! اس سے انہیں انتہائی سرور وکیف حاصل ہوتا ہے۔ ابلیس کے احتناک سے بھی مقصود ہے۔

بہرحال، ابلیس نے یہ کہا۔ اس پر بارگاہِ ایزدی سے جواب ملا کہ ہم جانتے ہیں کہ تو اس کے لئے کیا کیا حربے استعمال کرے گا۔ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ ۔ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ ۔ وَرَجِلِكَ ۔ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۔ وَعِدْهُمْ ۔ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (۱۷/۶۴)۔ "ان میں بعض کو تم اپنے پروپیگنڈے کے زور سے گڑبڑا کر ان کے مقام سے ہٹا دوگے۔ جو اس طرح خائف نہ ہوں گے، ان پر بڑے بڑے لشکرے کر چڑھ دوڑو گے ——— ایسے لشکر، جن میں سوار اور پیادے سب شامل ہوں گے ——— بعض مقامات پر تم انہیں مالی امداد دینا شروع کردو گے اور انہیں کاروبار میں اپنا شریک کرلوگے اور اس طرح اقتصادی تغلب سے انہیں اپنا ہمنوا بنالو گے۔ بعض جگہ ایسی تعلیم گاہیں کھول دو گے جن سے ان کی آنے والی نسلیں خود بخود تمہارے رنگ میں رنگی جائیں۔ تم ان سے بڑے بڑے دلکش وعدے کرو گے حالانکہ تمہارے وعدے سب فریب پر مبنی ہوں گے۔ اور یہ تمہارے فریب میں آجائیں گے۔ یہ ہیں وہ طریقے، جنہیں تم بنی آدم کے 'احتناک' کے لئے اختیار کرو گے"۔ (جیسا کہ ہم پہلے باب میں ابلیس کے زیرِ عنوان لکھ چکے ہیں) یہ وہ ابلیسی حربے ہیں، جنہیں اقوامِ غالب، کمزور قوموں کو مغلوب کرنے کے لئے اختیار کرتی ہیں، اور عصرِ حاضر میں اس کے مظاہرے نمایاں طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ لیکن ابلیس کے اس چیلنج کے جواب میں، ہر مقام پر یہی کہا گیا کہ: اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (۱۷/۶۵)۔ "میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چل سکے گا"۔ ——— اور "عبادی" کی تشریح سابقہ صفحات میں ہمارے سامنے آچکی ہے۔ یعنی ایک خدا کی محکومیت اختیار کرکے، ساری کائنات پر حکومت کرنے والے۔

بہرحال، شیطان نے یہ چیلنج دیا، جسے خدا نے قبول کرلیا اور پھر:-

۲/۳۵ وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ۔

"اور ہم نے آدم سے کہا کہ تو اور تیری زوج، جنت میں رہو۔ اس میں سے جہاں سے جی چاہے، سیر ہو کر کھاؤ، پیو۔ پابندی صرف اتنی ہے کہ اس شجر کے قریب نہ پھٹکنا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ بڑی زیادتی ہو جائے گی۔" انہی الفاظ کو (۷/۱۹) میں بھی دہرایا گیا ہے۔ اور یہاں سے ایک اور عظیم حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس "جنت" کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس میں، جہاں سے جی چاہے کھاؤ اور سیر ہو کر کھاؤ۔ یعنی یہاں تمہیں، رزق فراوانی اور کشادگی سے ملے گا۔ اور اس میں "میری اور تیری" کی کوئی تفریق نہیں ہوگی۔ جہاں تمہیں بھوک لگے وہاں یہ رزق موجود ہوگا، اور کوئی یہ نہیں کہے گا کہ یہ میری ملکیت ہے تم نے اسے کیسے لے لیا۔

ہم گذشتہ باب میں بتا چکے ہیں کہ "سرگزشت آدم" میں انسانی زندگی کے اس قدیم دور سے آغاز سخن کیا گیا ہے جب اس نے پہلے پہل، مل جل کر رہنا شروع کیا۔ یعنی قدیم قبائلی زندگی کا دور۔ ماہرین علم الانسان کی تحقیق یہ ہے کہ قدیم قبائلی زندگی میں ذاتی ملکیت کا تصور نہیں تھا۔ حتیٰ کہ ان کی زبان میں "ملکیت" کے لئے کوئی لفظ ہی نہیں تھا۔ اس میں "استعمال" کا لفظ ملتا ہے، "ملکیت" کا نہیں۔ اس دور میں آبادی ہنوز کم تھی اور زمین بڑی کشادہ۔ اس لئے سامان زیست کی بڑی فراوانی تھی۔ اور چونکہ کسی نے زمین پر لکیریں کھینچ کر ان خطوں کو اپنی ذاتی ملکیت میں نہیں لیا تھا، اس لئے معاش کی کیفیت یہی تھی کہ جہاں سے کسی کا جی چاہے، پیٹ بھر کر کھالے ــــ پیٹ بھر کر کھالے (رَغَدًا) کے معنی یہ ہیں کہ اس دور میں سامان رزق کے جمع کر کے رکھنے (HOARDING) کا تصور بھی نہیں تھا۔ رزق سے مقصود اپنی ضرورت پوری کرنا تھا، نہ کہ خزائن و دفائن کی رو سے دوسروں کو اس سے محروم رکھنا۔ یہ تھی وہ جنتی زندگی جس کا ذکر قصۂ آدم میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس جنت کی مزید تفصیل سورۃ طٰهٰ میں ان الفاظ میں دی گئی ہے کہ: إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ۔ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ (۲۰/۱۱۸-۱۱۹)۔ "اس میں تمہیں نہ تو روٹی کی فکر ستائے گی نہ کپڑے کی، نہ پیاس کا

جنت آدم

خوف ہوگا نہ سورج کی گرمی کا۔ تمہارے لئے کھانے کو روٹی، پینے کو پانی، پہننے کو کپڑا اور رہنے کو مکان، سب کچھ بلا تردد اور بلا مشقت موجود ہوگا۔" لیکن ابلیس کی کوشش یہ ہوگی کہ تمہیں ان سے محروم کر دے۔ اس لئے کہیں اس کے پھندے میں نہ پھنس جانا (۲۰/۱۱۷)۔ اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ تم ہماری راہنمائی کی پیروی کرو۔ یاد رکھو! وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ (۲۰/۱۲۴)۔ "جو ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی، اور جس کی یہاں روزی تنگ

ہوگی وہ قیامت میں بھی اندھا ہی اٹھایا جائے گا۔" آپ نے غور فرمایا کہ آدم کی جنت کیا تھی اور ابلیس نے اُسے اُس جنت سے نکال دینے کے لئے کیا کیا ترکیبیں سوچی تھیں۔ پھر آپ نے اس پر بھی غور کیا کہ اللہ تعالیٰ نے قوانینِ خداوندی کے اتباع کا نتیجہ رزق کی فراوانیاں بتایا ہے، اور ان سے اعراض برتنے کا نتیجہ معیشت کی تنگی قرار دیا ہے۔ سورۃ النحل میں ہے:۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۱۶/۱۱۲)

"خدا اس حقیقت کو ایک مثال کے ذریعہ واضح کرتا ہے۔ ایک بستی تھی جس کے رہنے والے نہایت امن اور اطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس میں ہر طرف سے سامانِ رزق بڑی فراوانی سے چلا آتا تھا۔ لیکن انہوں نے خدا کی ان نعمتوں کی ناشکر گزاری کی۔ ان سے کفر برتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہوگئے۔ اور یہ نتیجہ تھا ان کے اُس معاشی نظام کا، جسے انہوں نے خود وضع کیا تھا۔ خدا کا متعین فرمودہ نظام ایسا نہیں ہوتا۔"

وہ تھی آدم کی جنت، جس میں امن بھی تھا اور اطمینان بھی اور اس کے ساتھ رزق کی فراوانی بھی۔ اس کے بعد، جب انسانوں نے اپنا وضع کردہ معاشی نظام اختیار کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان سے امن بھی چھن گیا اور اطمینان بھی ——— اور بھوک کا عذاب ان پر مسلط ہوگیا۔ یہ تھا آدم کا اس جنت سے نکل جانا، جس کا ذکر ذرا آگے چل کر سامنے آتا ہے۔ ہم مطالب الفرقان جلد اول میں زیرِ آیت (۲/۲۲ صفحہ ۲۹۶) وضاحت سے بتا چکے ہیں کہ نظام خداوندی میں ذرائع رزق پر ذاتی ملکیت نہیں ہوتی۔ زمین رزق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اور اس سے مقصود یہ کہ تمام مخلوق کو ان کی ضرورت کے مطابق سامانِ پرورش میسر آتا ہے۔ یہ ہے نظامِ خداوندی۔ اس کے برعکس، انسانوں کا خود ساختہ نظام ہے جس میں بالادست طبقہ، زمین کے لامحدود رقبوں کو اپنی ذاتی ملکیت میں لے لیتا ہے تاکہ زیر دست طبقہ اپنی روٹی تک کے لئے ان کا محتاج اور دست نگر رہے۔ اور پھر یہ (زبردست) لوگ، ان کمزوروں اور ناداروں کی احتیاج کا ناجائز فائدہ اٹھا کر انہیں اپنی غلامی اور محکومی کی زنجیروں میں جکڑے رکھیں۔

مرد اور عورتیں دونوں

یہاں ایک اور حقیقت بھی غور طلب ہے۔ قرآن کریم نے جب جنتِ آدم کے متعلق کہا کہ اس میں "آدم اور اس کی زوج" دونوں یکساں طور پر رہیں گے تو اس سے یہ بتانا مقصود تھا کہ سامانِ زیست میں مردوں اور عورتوں، دونوں، کا حصہ ہوگا۔ یہ نہیں کہ مرد سامانِ زیست کا مالک بن بیٹھے اور عورت اس کی محتاج رہے۔

آیت (۲۰/۱۲۴) میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ قوانینِ خداوندی سے اعراض برتیں گے ان کی روزی تنگ ہو جائے گی اور

وہ قیامت کے دن بھی اندھے اٹھائے جائیں گے۔ اس سے ایک اور عظیم حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ، جو قوم یہاں ذلت و خواری اور تنگی اور مفلسی کے عذابِ خداوندی میں مبتلا ہوگی وہ عاقبت میں بھی ذلیل و خوار ہوگی۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (۱۷/۷۲)۔ "یہاں کا اندھا قیامت میں بھی اندھا ہوگا بلکہ اس سے بھی گیا گزرا"۔ اس سے واضح ہے کہ جو قوم اس دنیا میں ذلیل و خوار اور محتاج ہوگی (اور اس ہیچ زندگی پر مطمئن ہو کر بیٹھ رہے گی) اس کی عاقبت بھی خراب ہوگی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا ∴ جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا ∴ جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

چونکہ ہم اس موضوع پر جلد اول میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ اس لئے اس کی مزید تشریح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ آدم سے کہا گیا کہ تم اس جنت میں خوش و خرم رہو سہو۔ اس میں سے، جہاں سے جی چاہے، کھاؤ پیو۔ لیکن دیکھنا اس "شجر" کے قریب نہ جانا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ جنتی زندگی تم سے چھین لی جائے گی۔

سوال یہ ہے کہ یہ "شجر" کونسا تھا جس کے قریب جانے سے آدم کو منع کیا گیا تھا؟ اس کی تفسیر میں بہت

شجر سے کیا مراد تھا

کچھ کہا گیا ہے۔ بائبل میں تو اسے "علم کا درخت" (TREE OF KNOWLEDGE) بتایا گیا ہے۔ لیکن یہ تو بالبداہت غلط ہے۔ قرآن کریم نے تو آدم کی پہلی خصوصیت ہی یہ بتائی ہے کہ اُسے خدا نے تحصیلِ علم کی صلاحیت عطا فرمائی (۲/۳۱)۔ اور یہی علم تھا جس کی بنا پر اُسے ملائکہ پر فضیلت حاصل ہوئی۔ قرآنِ کریم میں علم کی اس قدر فضیلت بیان کی گئی ہے کہ اس کی روشنی میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ خدا نے آدم کو علم کے قریب جانے سے منع کر دیا تھا۔

بائبل میں یہ بھی ہے کہ وہ درخت "خیر و شر کی تمیز" کا تھا۔ یہ بھی غلط ہے۔ اگر آدم کو خیر و شر میں تمیز کرنے سے روکا گیا تھا تو یہ مقامِ آدم کیا حیوانات سے بھی پست سطح زندگی ہوئی۔ قرآنِ کریم کی رو سے تو قصۂ ابلیس و آدم سے بنیادی طور پر مقصود ہی خیر و شر کی تمیز ہے۔

یہ بائبل میں تھا۔ اور ہمارے ہاں یہ کہہ کر قصہ ہی ختم کر دیا گیا کہ یہ گیہوں کا درخت تھا۔[1] یہ مفہوم ایسا سطحی ہے کہ

---

[1] ان حضرات کو اتنا بھی معلوم نہیں تھا کہ گیہوں کا درخت نہیں ہوتا، پودا ہوتا ہے۔

اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

عربی زبان میں ہر وہ چیز، جو مجتمع ہو کر، کسی وجہ سے متفرق ہو جائے "شَجَرٌ" کہلاتی ہے۔ درخت کو بھی شجر اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنی جڑ اور تنے کی حد تک مجتمع ہوتا ہے اور اس کے بعد مختلف شاخوں میں بٹ جاتا ہے۔ اسی لئے شَجَرَ بَيْنَهُمْ کے معنی ہیں باہمی اختلاف کی وجہ سے آپس میں جھگڑنا، تفرقہ پیدا کر لینا۔ چنانچہ سورۃ النساء میں ہے: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (۴/۶۵)۔ "اے رسول! تیرا خدا اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن قرار نہیں پا سکتے تاوقتیکہ یہ اپنے ان معاملات میں، جن میں یہ باہمی اختلاف کرتے ہوں، تجھے اپنا حَکم تسلیم نہ کر لیں اور پھر اس کے بعد ان کی کیفیت یہ ہو کہ تیرے فیصلے سے سرتابی تو ایک طرف، یہ اس سے اپنے دل میں بھی کسی قسم کی گرانی محسوس نہ کریں۔ ان کا مسلک یہ ہو کہ تیرے فیصلے کے سامنے، اپنا سر ہی نہیں، دل بھی جھکا دیں۔" اس آیت میں "شَجَرَ بَيْنَهُمْ" کا مفہوم واضح ہے۔ "مُشاجرت" کہتے ہی باہمی منازعت اور مخاصمت کو ہیں۔

"شَجَرٌ" کا جو مفہوم اوپر بیان کیا گیا ہے اسے ایک بار پھر سامنے لائیے۔ یعنی کسی شے کا پہلے مجتمع ہونا اور پھر پھٹ کر الگ الگ ہو جانا۔ باہمی تفرقہ پیدا کر لینا۔ قرآن کریم میں نوعِ انسانی کی ابتدائی زندگی اور اس کے بعد اس مشاجرت کے متعلق سورۃ یونس میں کہا ہے: وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا (۱۰/۱۹)۔ "شروع میں تمام نوعِ انسان، امت واحدہ تھی۔ یعنی ایک عالمگیر برادری۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے باہمی اختلاف کیا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔" اور دوسری جگہ کہا ہے کہ ان کے اختلافات کو رفع کر کے انہیں پھر سے امتِ واحدہ بنا دینے کے لئے خدا نے آسمانی سلسلۂ رُشد و ہدایت شروع کیا (۲/۲۱۳)۔ اس سے اُس مشاجرت کا نقشہ سامنے آگیا جس سے آدم کو منع کیا گیا تھا۔ اس سے کہا یہ گیا تھا کہ تم ایک عالمگیر برادری بن کر رہنا۔ ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جانا۔ اگر تم نے ایسی روش اختیار کر لی تو یاد رکھو! اس جنتی زندگی کا سارا نقشہ بگڑ جائے گا۔ کوئی شے اپنے مقام پر نہیں رہے گی۔ (ظلم کے بنیادی معنی یہی ہیں) تمہاری معیشت تنگ ہو جائے گی۔ افلاس اور بھوک عام ہو جائے گی۔ تم طبقات میں بٹ جاؤ گے اور تم میں جنگ و جدال شروع ہو جائیں گے، اور ملائکہ نے جس خدشہ کا اظہار کیا تھا کہ یہ نئی مخلوق فساد انگیزیاں اور خون ریزیاں شروع کر دے گی، وہ حقیقت بن کر سامنے آجائے گا۔ یاد رکھو! ابلیس کی پوری پوری کوشش یہ ہو گی کہ تم میں باہمی اختلاف پیدا ہو جائے۔ تم خاندانوں، قبیلوں، نسلوں اور قوموں میں بٹ جاؤ اور پھر ایک خاندان دوسرے خاندان کا، ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا اور ایک قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی ہو جائے۔ دیکھنا، ایسا نہ کرنا، ورنہ یہ جنت چھن جائے گی

اور دنیا جہنم بن جائے گی۔

غور کیجئے۔ قرآن کریم نے ابلیسی سازش کی تمام تفاصیل کو کس طرح ایک لفظ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ "مشاجرت" یعنی نوعِ انسان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ اسی بنا پر اقبالؒ نے (جاوید نامہ میں) ابلیس کو "خواجۂ اہلِ فراق" کے لقب سے ملقب کیا ہے۔ "تفرقہ ڈالنے والوں کا سرخیل"۔

اور اس کے بعد ہے:۔

۲/۳۶ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا۔ فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ۔ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا۔ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ۔

"شیطان نے ان کے پاؤں میں لغزش پیدا کر دی، وہ پھسل گئے" ایک جگہ ہے: وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى (۲۰/۱۲۱)۔ "اور آدم نے ارشادِ خداوندی سے معصیت کی اور اس طرح صحیح راستہ سے بھٹک گیا" دوسری جگہ ہے: فَنَسِيَ۔ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (۲۰/۱۱۵)۔ "آدم نے صحیح راستہ کو ترک کر دیا۔ ہم نے اُسے پختہ ارادے والا نہ پایا"۔

ابلیس نے آدم سے کہا کہ: مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ (۷/۲۰)۔ "خدا نے جو تمہیں اس شجر کے قریب جانے سے منع کر دیا ہے تو یہ اس لئے کہ تم کہیں ملائکہ نہ بن جاؤ یا تمہیں حیاتِ جاوداں حاصل نہ ہو جائے"۔ دوسری جگہ ہے: قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (۲۰/۱۲۰)۔ "شیطان نے آدم سے کہا کہ میں تجھے ایک ایسے درخت کا پتہ نشان بتاتا ہوں جس کا پھل کھانے سے تمہیں حیاتِ جاوید حاصل ہو جائے گا اور ایسی مملکت مل جائے گی جس پر کبھی زوال نہ آئے گا"۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان مرنا نہیں چاہتا۔ حیاتِ دوام کی خواہش اس کے دل میں ہمیشہ انگڑائیاں لیتی رہتی ہے۔ آبِ حیات کی تلاش اور خضر و سکندر کی ملاقاتوں کے افسانے، اس کی اس خوابیدہ آرزو کی بیدار تعبیریں ہیں۔ لیکن اس کی یہ آرزو، نہ آج تک پوری ہوئی ہے نہ ہوگی۔ جو انسان اس دنیا میں آیا وہ موت کا شکار ہو گیا۔ لہٰذا طبعی طور پر تو کسی فرد کا ہمیشہ کے لئے زندہ رہنا ممکن نہیں۔ اس کے لئے اس کے خود غرضی کے جذبات نے ایک اور راہ سجھائی اور اس سے کہا کہ تم اپنی اولاد کے ذریعے مرنے کے بعد بھی زندہ رہ سکتے ہو۔ اولاد سے تمہارا نام روشن ہوگا۔ یہ وہ "بُوٹا" ہے جو آگے چلتا ہے۔ اولاد سے خاندان کی طرح پڑتی ہے۔ خاندان پھیل کر قبیلہ بنتا ہے۔ قبیلہ کی وسعتیں، نسل کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور ان کے ذریعہ ان کے مورثِ اعلیٰ، ان کے آباؤ اجداد، ان کے اسلاف کا نام روشن رہتا ہے۔ ابلیس نے آدم کے کان میں یہی افسوں پھونکا۔ اس نے کہا کہ عالمگیر برادری کا تصوّ

حیاتِ جاوید بوساطتِ اولاد

ایک فریب ہے۔ انسانیت کے ہجوم میں گم ہو کر، ایک فرد اپنا جداگانہ تشخص کھو دیتا ہے۔ اس ازدحام میں تمہیں حیاتِ دوام کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ اس کا ذریعہ تمہاری اولاد ہے اور اس کے بعد اولاد در اولاد کا منفرد اور متمیز سلسلہ۔ یہ ہے وہ ابلیسی وسوسہ، جسے قرآن کریم نے "جنسی اختلاط" کی ایمائیت (SUGGESTIVENESS) سے مختلف مقامات پر بیان کیا ہے۔ سورۃ الاعراف میں ہے:

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا۔ وَقَالَ۔ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ۔ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ وَقَاسَمَهُمَاۤ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ (۷/۲۰-۲۱)

"شیطان نے آدم کے کان میں یہ افسوں پھونکا کہ خدا نے جو تمہیں کہا ہے کہ تمام انسانوں کو ایک عالمگیر برادری کی حیثیت سے رہنا چاہیئے تو اس سے اس کا مقصد یہ ہے کہ تم کہیں بہت بڑی قوتوں کے مالک نہ بن جاؤ، یا حیاتِ جاوید حاصل نہ کر لو۔ تم ہمیشہ زندہ رہنا چاہتے ہو تو آؤ میں تمہیں اس کا طریق بتاتا ہوں۔ تم زندہ رہ سکتے ہو۔ اپنی اولاد کے ذریعہ۔ یوں وہ افزائشِ نسل کو مقصودِ حیات بتا کر، انسان کو حیوان کی سطح پر لے آیا اور زندگی کے بلند مقصد کو اس کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔ اس نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس میں میرا اپنا کوئی فائدہ نہیں۔ میں یہ سب کچھ تمہاری خیرخواہی کیلئے کہہ رہا ہوں"۔

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ۔ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا۔ وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ۔ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَاۤ۔ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ۔ وَاَقُلْ لَّكُمَاۤ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (۷/۲۲)۔

"چنانچہ اس نے اس قسم کی باتوں سے انسان (مرد اور عورت) کو بہکا دیا اور انہیں ان کے مقامِ بلند سے گرا دیا۔ ان کے ستر کے مقام بے پردہ ہو گئے اور (چونکہ انسانی سطحِ زندگی پر حیا کا جذبہ بھی نمودار ہو جاتا ہے اس لئے (تمثیلی انداز میں یوں سمجھو کہ) انہوں نے ستر کے ان مقامات کو پتوں سے چھپانے کی کوشش کی۔ اس پر خدا نے ان سے کہا کہ میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ تم انسانی زندگی کے بلند مقصد کو چھوڑ کر، حیوانی سطحِ زندگی پر نہ آ جانا؟ میں نے تمہیں (WARN) کر دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اس کے فریب میں مت آ جانا"۔ اسی حقیقت کو آیت (۲۰/۱۲۱) میں بھی دہرایا گیا ہے۔

یہ تھا وہ فریب، جس سے انسان کے پست جذبات نے اسے، بلند انسانی سطح سے گرا کر زندگی کی حیوانی سطح پر پہنچا دیا۔

یاد رہے کہ جنسی جذبات کی تسکین اور افزائشِ نسل (اولاد پیدا کرنا) معیوب و ممنوع نہیں. قرآنِ کریم نے تو انہیں وجۂ زینت قرار دیا ہے (۱۸/۴۶)۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہدیا ہے کہ اگر مال اور اولاد تمہارے بلند انسانی مقاصد کے راستے میں حائل ہو جائیں تو یہ بہت بڑا فتنہ بن جاتے ہیں (۸/۲۸)"۔ بہرحال، یہ ہے آدم کے "ستر کھل جانے" کا وہ مفہوم، جو ہم سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کا ایک اور پہلو بھی نظر آتا ہے۔ اور وہ یہ کہ قرآنِ کریم نے جو کہا ہے کہ ابلیس کی افسوں سازی سے آدم کے مقاماتِ ستر برہنہ ہو گئے تو اس کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ محض افزائشِ نسل کو مقصودِ حیات سمجھ لینے کے معیوب اور مذموم نتائج جب انسان کے سامنے آئے تو، بجائے اس کے کہ وہ اس روشِ زندگی کو ترک کر دیتا، اس نے ان عیوبِ برہنگی کو چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ذاتوں، برادریوں، نسلوں اور نسل کی بنا پر قومیتوں کے جس قدر فوائد گنائے جاتے ہیں، وہ انہی عیوب کی پردہ پوشی کی ناکام کوششیں ہیں۔

بہرحال، قرآنِ کریم نے جو کچھ کہا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ انسان سے کہا یہ گیا کہ تم ایک عالمگیر برادری کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا۔ اس سے تمہاری زندگی جنت کی خوشگواریوں کی حامل رہے گی۔ لیکن اگر تم نسل پرستی کی بنا پر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تو اس سے یہ جنت تم سے چھن جائے گی۔ اگر تم نے اس نسل پرستی کو منطقی دلائل کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کی تو یہ خود فریبی ہو گی۔ اس سے تم انسانیت کے بلند مقام سے نیچے گر جاؤ گے۔ اسی کو "ہبوطِ آدم" سے تعبیر کیا گیا ہے جس کا ذکر اسی آیت کے اگلے حصہ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ لیکن اس تک پہنچنے سے پہلے ایک اور نکتہ بھی غور طلب ہے۔

آیۂ زیرِ نظر میں ایک لفظ ایسا ہے جس میں حقائق کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ اس میں کہا گیا ہے: فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ (۲/۳۶) اس میں "هُمَا" کی ضمیر وہ نقطہ ہے جس میں (جیسا کہ ہم نے کہا ہے) بڑے اہم اور بصیرت افروز حقائق پوشیدہ ہیں۔ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ شیطان نے ان دونوں (مرد اور عورت) کے پاؤں میں لغزش پیدا کر دی[1]۔ بائبل میں یہ کہا گیا ہے کہ شیطان نے آدم کی بیوی کو بہکایا اور آدم اپنی بیوی کی باتوں میں آ گیا۔ اس بنا پر عیسائیت

---

[1] دیگر زبانوں میں واحد اور جمع۔ دو صیغے ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں تین ـــ یعنی واحد (ایک کے لئے)۔ تثنیہ (دو کے لئے) اور جمع (دو سے زیادہ کیلئے)۔ ضمیر (هُوَ) واحد غائب (مذکر) ضمیر ہے جس کے معنی ہیں "وہ ایک"۔ هُمَا ضمیر تثنیہ غائب (مذکر اور مؤنث) ہے جس کے معنے ہیں "وہ دونوں"۔ اور هُمْ ضمیر جمع غائب (مذکر) ہے جس کے معنی ہیں "وہ سب"۔ قرآنِ کریم میں لغزشِ آدم کے سلسلہ میں هُمَا کی ضمیر آئی ہے جس سے مراد یہ ہے کہ شیطان نے آدم اور اس کی زوج (مرد اور عورت) دونوں کو بہکایا۔

عیسائیت میں عورت کا مقام

گناہِ اوّل کا مجرم عورت کو قرار دیتی ہے اور مرد کو اس سے بری الذمہ ٹھہراتی ہے۔ اس جرم کی بنا پر اس کے نزدیک عورت دنیا میں تمام مصائب کا سرچشمہ ہے، اس لئے انتہائی قابلِ نفرت مخلوق۔ عیسائیت کا مقدس لٹریچر، عورت کے خلاف طعن و تشنیع سے بھرا پڑا ہے۔ ان کے بڑے بڑے (SAINTS) عورت کو ملعون و مردود قرار دینے میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی تجرد کی زندگی بسر کی اور وہ بھی تجرد کی زندگی کو وجہ تقرب خداوندی سمجھتے ہیں۔ انہی کے تتبع میں، ان کے ہاں کی (NUNS) بھی تجرد کی زندگی بسر کرتی ہیں یعنی "جنسی آلائش" سے دور رہتی ہیں۔ دنیائے عیسائیت میں، صدیوں تک یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ عورت میں روح بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ سینٹ پال کا قول ہے کہ "جو عورتیں غیر شادی شدہ ہیں یا بیوہ، میں انہیں تلقین کروں گا کہ میری طرح غیر شادی شدہ رہیں"۔ اِسی کے بعد اُس نے کہا:-

> آدمی عورت سے پیدا نہیں کیا گیا، عورت آدمی سے پیدا کی گئی ہے۔ آدمی عورت کے لئے پیدا نہیں کیا گیا، عورت آدمی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ گرجے میں عورتوں کو خاموش بیٹھے رہنا چاہئے۔ انہیں بولنے کی اجازت نہیں۔ قانون کی رُو سے انہیں مردوں کے مقابلہ میں کمتر درجہ پر رہنا چاہئے۔ اگر انہیں کسی بات کے معلوم کرنے کی ضرورت پڑے تو گھر جا کر اپنے خاوندوں سے پوچھ لیا کریں۔ عورت کے لئے یہ بات بڑی بے عزتی کی ہے کہ وہ گرجے میں بات کرے۔ (سینٹ پال)

ایک اور سینٹ (HIEVONYMUS) کا قول ہے کہ "عورت، شیطان کا دروازہ، برائیوں کی راہ اور بچھو کا ڈنک ہے"۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ عورتیں بہشت میں نہیں جا سکتیں۔ اس سے یہ دشواری پیش آئی کہ پھر حضرت مریمؑ کے متعلق کیا کیا جائے۔ سینٹ (THOMAS) نے اس کا حل یہ بتایا کہ حضرت مریمؑ اور ان کے ساتھ ان تمام عورتوں کو جو کفارہ پر ایمان رکھنے کی بنا پر بہشت میں جانے کے قابل قرار دی جائیں گی، مرد بنا دیا جائے گا۔ بلکہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہاں تذکیر و تانیث کا امتیاز ہی اٹھ جائے گا۔[1]

عورت کی حیثیت خود ہمارے ہاں

عیسائیوں کے ہاں تو ایسے عقائد پیدا ہونے ہی تھے لیکن انتہائی بدقسمتی کہ خود ہم (مسلمان) بھی اس سے محفوظ نہ رہے۔ ہم نے ان عقائد کو ان سے مستعار لیا اور پھر انہیں اسلام کا جزو بنا کر اپنے لٹریچر میں شامل کر لیا۔ عیسائیت کا عقیدہ یہ

---

[1] ان امور کی تفصیل کے لئے دیکھئے کتاب "WOMAN IN ANTIQUITY-BY CHARLES SELTMAN".

تھا کہ پہلے آدم کو پیدا کیا گیا اور جب اس نے تنہائی محسوس کی تو پھر اس کی پسلی سے اس کی بیوی نکالی گئی۔ آپ غور کیجئے کہ یہی تصور، خود ہمارے ہاں بھی کس طرح حقیقت تسلیم کر لیا گیا۔ تفسیر ابن کثیر کا شمار ہمارے ہاں کی مستند ترین تفاسیر میں ہوتا ہے۔ اس میں پیدائشِ آدم کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ :-

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ ابلیس کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کا علم ظاہر کر کے پھر ان پر اونگھ ڈال دی گئی اور ان کی بائیں پسلی سے حضرت حوّا کو پیدا کیا۔ جب آنکھ کھول کر حضرت آدم نے انہیں دیکھا تو اپنے خون اور گوشت کی وجہ سے اُن سے اُنس و محبت پیدا ہوئی۔ پھر پروردگار نے انہیں ان کے نکاح میں دیا اور جنت میں رہائش کا حکم عطا ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کے جنت میں داخل ہو جانے کے بعد حضرتِ حوّا پیدا کی گئیں۔ حضرت ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ وغیرہ صحابہ سے مروی ہے کہ ابلیس کو جنت سے نکالنے کے بعد حضرتِ آدم علیہ السلام کو جنّت میں جگہ دی گئی لیکن تن تنہا تھے۔ اس وجہ سے ان کی نیند میں حضرت حوّا کو ان کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ جاگ کر انہیں دیکھ کر پوچھنے لگے کہ تم کون ہو اور کیوں پیدا کی گئی ہو۔ حضرت حوّا نے فرمایا کہ میں ایک عورت ہوں اور آپ کے ساتھ رہنے اور تسکین کے لئے پیدا کی گئی ہوں۔ [1]

دوسری جگہ ہے کہ :-

صحیح حدیث میں ہے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور سب سے بلند پسلی سب سے زیادہ ٹیڑھی ہے۔ پس تو اگر اسے سیدھی کرنے کی کوشش کرے گا تو تُو اسے توڑ دے گا اور اگر اس میں کچھ کجی باقی چھوڑتے ہوئے فائدہ اُٹھانا چاہے گا تو بیشک فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ [2]

اس تفسیر اور روایات کی رو سے (جن کے متعلق بدقسمتی سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں، حالانکہ ان کے وضعی ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں رہ جاتا)۔ ایک تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت کا وجود مقصود بالذات نہیں۔ وہ مرد کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ اور دوسرے یہ کہ چونکہ وہ ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے، اس لئے وہ سیدھی ہو ہی نہیں سکتی۔ جو شخص اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرے گا وہ اسے توڑ دے گا۔ یعنی یہ ٹوٹتے ٹوٹ جائے گی لیکن سیدھی نہیں ہو گی۔ لہٰذا اس کی کجی کو برداشت کرتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھا لینا چاہئے۔

---

[1] ترجمہ اُردو مولانا محمد جوناگڑھی پارہ اول صفحہ ۸۵۔

[2] " " " " پارہ چہارم صفحہ ۲۶۔

اس کے بعد آپ دیکھئے کہ اس "ٹیڑھی پسلی" کو سیدھا کرنے کے لئے کس قسم کی (وضعی) روایات حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی حیثیت سے ہمارے ہاں راہ پاگئیں اور ہماری تفسیروں کا حصہ بن گئیں۔ سورۃ النساء میں ایک آیت ہے: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (۴/۳۴)۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "مرد عورتوں پر حاکم یا داروغہ ہیں"۔[1] اس ترجمہ کا مدار ان روایات پر ہے جو اس ضمن میں ہمارے ہاں متداول ہیں۔ تفسیر ابن کثیر (سورۃ النساء پارہ پنجم) میں ہے کہ:۔

> حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ عورتوں کو مردوں کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک عورت نے نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے خاوند کی شکایت کی کہ اس نے اسے تھپڑ مارا ہے۔ پس آپ نے اُسے بدلہ لینے کا حکم دیا ہی تھا جو یہ آیت اتری، اور بدلہ نہ دلوایا گیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک انصاری اپنی بیوی صاحبہ کو لئے ہوئے حاضر خدمت ہوئے۔ اس عورت نے حضورؐ سے کہا کہ یا رسولؐ اللہ! میرے اس خاوند نے مجھے تھپڑ مارا، جس کا نشان اب تک میرے چہرے پر موجود ہے۔ آپ نے فرمایا اِسے حق نہ تھا۔ وہیں یہ آیت اتری کہ ادب سکھانے کے لئے مرد عورتوں پر حاکم ہیں تو آپ نے فرمایا کہ میں نے اور چاہا تھا اللہ نے اور چاہا۔ (ص۲۰)

آگے بڑھنے سے پیشتر، ذرا دل تھام کر سوچئے کہ اس فقرہ کی زد کہاں جا کر پڑتی۔ یعنی (اس روایت کی رُو سے) ..... حضورؐ نے فرمایا یہ کہ میں تو چاہتا تھا کہ عورتوں کو بدلہ لینے کا حق مل جائے لیکن جب خدا ہی چاہے تو میں کیا کروں (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)۔ اسی تفسیر میں آگے چل کر لکھا گیا ہے کہ:۔

> ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ لونڈیوں[2] کو مارو نہیں۔ اس کے بعد ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ آئے اور عرض کرنے لگے یا رسولؐ اللہ! عورتیں آپ کے اس حکم کو سن کر اپنے مردوں پر دلیر ہو گئی ہیں۔ اس پر حضورؐ نے انہیں مارنے کی اجازت دیدی۔ اب مردوں کی طرف سے دھڑا دھڑ مار پیٹ شروع ہوئی اور بہت سی عورتیں شکایتیں لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں تو آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ سنو! میرے پاس عورتوں کی فریاد پہنچی ہے۔ یاد رکھو! تم میں سے جو اپنی عورتوں کو زد و کوب کرتے ہیں وہ اچھے آدمی نہیں۔

---

[1] اس کا صحیح مفہوم اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا۔

[2] بات بیویوں کی ہو رہی ہے۔ کیا انہی کو "لونڈیاں" کہہ کر پکارا گیا ہے؟

حضرت اشعثؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت فاروقؓ اعظم کا مہمان ہوا۔ اتفاقاً اس روز میاں بیوی میں کچھ ناچاقی ہوگئی۔ اور حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی صاحبہ کو مارا۔ پھر مجھ سے فرمانے لگے اشعثؓ: تین باتیں یاد رکھ! جو میں نے آنحضرتؐ سے سن کر یاد رکھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مرد سے یہ نہ پوچھا جائے کہ اس نے اپنی عورت کو کس بنا پر مارا ہے، دوسری یہ کہ وتر پڑھے بغیر سونا مت اور تیسری بات راوی کے ذہن سے نکل گئی۔ (ص ۲۱-۲۰)

اسی تفسیر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ:-

رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے کہ اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ ماسوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے کو سجدہ کرے۔ تو عورت کو حکم کرتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ بخاری شریف میں ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے اور وہ انکار کردے تو صبح تک فرشتے اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔ صحیح مسلم میں ہے کہ جس رات کوئی عورت بطور روٹھنے کے اپنے خاوند کے بستر کو چھوڑے رہے تو صبح تک اللہ تعالیٰ کی رحمت کے فرشتے اس پر لعنتیں کرتے رہتے ہیں (ص ۲۱)۔

یہ تو (ہمارے ہاں کے مروجہ مذہب کی رو سے) عورت کی حیثیت ہے مردوں کے مقابلہ میں۔ جہاں تک عورتوں کے گناہوں اور برائیوں کے سرچشمہ ہونے کا تعلق ہے اس سے بھی ہماری کتب روایات بھری پڑی ہیں۔ مثلاً (احادیث کی صحیح ترین کتاب) بخاری شریف میں کہا گیا ہے کہ:-

حضرت ابوہریرہ مروی ہیں کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت کبھی نہ سڑتا اور اگر حوّا نہ ہوتیں تو کوئی عورت اپنے شوہر سے خیانت نہ کرتی۔ (بخاری۔ کتاب پیدائش انبیاء)

دوسری روایت ہے:-

حضورؐ نے فرمایا کہ میرے پیچھے، مردوں پر کوئی فتنہ عورتوں سے زیادہ باعث مضرت نہیں۔ (بخاری کتاب النکاح)

ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "نحوست تین چیزوں میں ہے، عورت، گھر، گھوڑا"۔ (بخاری کتاب النکاح)

اسی سلسلہ میں ایک اور روایت ہے کہ:-

حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے جنت میں دیکھا تو وہاں اکثریت فقیروں کی پائی گئی اور دوزخ میں دیکھا تو اکثریت عورتوں کی نظر آئی[1] (بخاری۔ کتاب الانبیاء)۔

---

[1] ایک طرف کہا جاتا ہے کہ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ "جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے"۔ اور دوسری طرف بتایا جاتا ہے (بقیہ بر صفحہ ۱۲۲)

یہ روایات وضعی ہیں

صاف نظر آ رہا ہے کہ اس مقصد کے پیشِ نظر، کہ مسلمان اس پر اعتراض نہ کرسکیں کہ بائبل میں یا عیسائیت کے عقائد کی رُو سے عورت کو کس قدر قابلِ نفرت ٹھہرایا گیا ہے، یہودیوں اور عیسائیوں نے خاص سازش کے ماتحت اس قسم کی روایات وضع کیں اور انہیں ہماری کتبِ احادیث میں داخل کر دیا۔ انہوں نے تو ایسا کیا ہی تھا لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ان وضعی روایات کو احادیثِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قرار دیکر سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ اس قسم کی روایات کی نسبت، حضور رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم کیطرف کس طرح صحیح قرار پاسکتی ہے۔ یہی نہیں کہ خود نہیں سوچتے، جو "سوختہ بخت" یہ کہدے کہ ایسی روایات کی نسبت، حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح معلوم نہیں ہوتی، اُسے "منکرِ حدیث" قرار دیکر دائرہ اسلام سے خارج کر دیتے ہیں!

ظاہر ہے کہ اس قسم کی روایات اور تفاسیر کا اثر آگے بھی بڑھنا تھا۔ چنانچہ ہمارے ہاں کے "احکامِ شریعت" میں دیکھئے کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی کیا حیثیت قرار دی گئی ہے۔ شریعت سے آگے بڑھ کر، تصوف کی طرف آئیے تو وہاں عیسائیوں کے (SAINTS) کے خیالات صوفیائے کرام میں عام نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی تجرد کو متاہل زندگی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ عورتوں کے متعلق حضرت علی ہجویری (داتا گنج بخش) کا ارشاد ہے کہ:-

> بہشت میں پہلا فتنہ جو آدم پر مقدر ہوا، اس کا اصل سبب عورت تھی۔ پہلے پہل جو فتنہ دنیا میں ظاہر ہوا یعنی ہابیل و قابیل کی لڑائی۔ اس کا سبب بھی عورت تھی۔ اور جب خدا نے چاہا کہ دو فرشتوں (ہاروت و ماروت) کو سزا دے تو اس کا سبب بھی عورت کو قرار دیا۔ اور آج دینی اور دنیاوی تمام فتنوں کے اسباب کا ذریعہ بھی عورتیں ہیں[1]۔

روایات و تفاسیر اور شریعت و طریقت سے جب بات آگے بڑھ کر شاعری تک پہنچی تو پھر ——— اللہ دے اور بندہ لے ——— پوچھئے مت کہ اس مجبور و مقہور مخلوق کے خلاف کیا کیا نہ کہا گیا۔ ارشاد ہوا:-

چہ خوش گفت جمشید بارائے زن　　　کہ یا پردہ یا گور بہ جائے زن
اگر نیک بودے سر احوالِ زن　　　زناں را مزن نام بودے نہ زن

(بقیہ حاشیہ ص۱۲۱) کہ حضورؐ نے جہنم میں عورتوں کی اکثریت دیکھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ عورتیں، دنیا میں "مائیں" نہیں تھیں؟ اگر مائیں تھیں ——— اگر سب کی سب نہیں تو ان میں سے بیشتر مائیں ہوں گی ——— تو پھر اس کا کیا جواب کہ ان کے پاؤں کے نیچے تو جنت تھی لیکن وہ خود جہنم میں تھیں! صاف نظر آتا ہے کہ ایسی وضعی روایات کو پیش کرنے والے جب عورت کے متعلق بات کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں "بیوی" ہوتی ہے۔ عورت کی کوئی اور پوزیشن نہیں ہوتی ——— اور "بیوی" ہمارے اربابِ شریعت کے نزدیک جنس کا رسد سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

[1] یہ اقتباس غالباً "کشف المحجوب" کا ہے۔ لیکن ہم نے اسے ہفتہ وار مجلہ "منہاج" لاہور کی اشاعت بابت ۱۲ ستمبر ۱۹۵۸ء سے لیا ہے۔

مثنوی، ایمن از زن کہ زن پارساست کہ خرسندہ بہ، گرچہ، وزد آشناست[1]

قرآن کریم نے نہ تو کہیں یہ کہا ہے کہ عورت کو مرد کی پسلی سے پیدا کیا گیا، اور نہ ہی یہ کہ گناہ اول کا موجب عورت تھی۔ اس نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ (۲/۳۶)۔ شیطان نے عورت کو نہیں بہکایا۔ عورت اور مرد دونوں اس کے فریب میں آ گئے۔[2] اس سے آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم نے مرد اور عورت، دونوں کی حیثیت یکساں قرار دی ہے۔ اس نے جب کہا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) ہم نے بنی آدم کو واجب التکریم پیدا کیا ہے۔" تو اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔

مرد اور عورت ہم دوش

قرآن کریم نے ان دونوں کی حیثیت یکساں قرار دی ہے اور انہیں یکساں انسانی صلاحیتوں کا پیکر بتایا ہے۔ اس موضوع پر، ہم تفصیل سے تو اس کے اپنے مقام پر لکھیں گے۔ اس وقت صرف دو ایک آیات ملاحظہ فرمائیے:-

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ ۔ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۔ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ ۔ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ ۔ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ ۔ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ ۔ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ ۔ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ ۔ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ ۔ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۔ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا (۳۳/۳۵)

"اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ قانونِ خداوندی کی اطاعت سے اپنی ذات کی تکمیل کر سکتے ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے (الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ)۔ اگر مرد اس پارٹی (جماعت) کے رکن بن سکتے ہیں جو خدا کے قانون کے اٹل نتائج پر یقین رکھتے ہوئے امنِ عالم کی ذمہ دار ہو تو عورتیں بھی اس جماعت کی اسی طرح رکن ہو سکتی ہیں (الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ)۔ اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنی استعداد کو اس طرح سنبھال کر رکھیں کہ ان کا استعمال صرف قانونِ خداوندی کے مطابق ہو تو یہی صلاحیت عورتوں میں بھی ہے (وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ)۔ اگر مرد اپنے دعویٰ ایمان کو سچ کر دکھانے کے اہل ہیں، تو عورتیں بھی اس کی اہل ہیں (وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ)۔ اگر مرد ثابت قدم رہ سکتے ہیں تو عورتیں بھی رہ سکتی ہیں (وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ)۔ اگر مرد اس خصوصیت کے حامل ہو سکتے ہیں کہ جوں جوں

---

[1] میں تحقیق سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ اشعار نظامی گنجوی کے ہیں یا فردوسی کے۔ بہرحال یہ ہیں ہمارے ہاں رائج۔

[2] جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے قرآن کریم نے اس کے لئے تثنیہ کا صیغہ (یا ضمیر) استعمال کیا ہے۔ جہاں واحد کا صیغہ ہے وہاں بصراحت آدم کہا گیا ہے۔ (دیکھئے ۲۰/۱۱۵، ۲۰/۱۲۱)

اُن کی صلاحیتیں بڑھتی جائیں، وہ شاخِ ثمردار کی طرح قانونِ خداوندی کی اطاعت میں جھکتے چلے جائیں، تو یہ خصوصیت عورتوں میں بھی ہے (وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ) - اگر مردوں میں ایثار کا مادہ ہے تو عورتوں میں بھی ہے ..... (وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ)- اگر مرد اپنے آپ پر ایسا کنٹرول رکھ سکتے ہیں کہ انہیں جہاں سے روکا جائے وہ رُک جائیں تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے (وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ) - اگر مرد اپنے جنسی میلانات کو ضوابط کی پابندی میں رکھ سکتے ہیں تو عورتیں بھی ایسا کرسکتی ہیں (وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ) - اگر مرد قانونِ خداوندی کو شعوری طور پر سمجھنے اور اسے ہر وقت پیشِ نظر رکھنے کے اہل ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی اہلیت ہے (وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ) جب یہ صلاحیتیں، دونوں میں موجود ہیں تو ان کے نتائج بھی دونوں کے لئے یکساں طور پر موجود ہونے چاہئیں۔ فلہٰذا نظامِ خداوندی میں دونوں کے لئے حفاظت کا سامان اور اجرِ عظیم موجود ہے (اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا) -

قرآن کی ان تفاصیل پر غور کریں اور پھر سوچیں کہ زندگی کا وہ کونسا گوشہ ہے جس کے متعلق یہ کہا گیا ہو کہ مرد میں تو اس کی صلاحیت ہے اور عورت میں نہیں۔ مرد تو یہ کچھ کرسکتا ہے اور عورت نہیں کرسکتی۔ مرد تو یہ کچھ بن سکتا ہے لیکن عورت نہیں بن سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ مرد اور عورت دونوں کے صلاحیت بخش اعمال نتیجہ خیز ہوں گے اور دونوں دوش بدوش جنت میں داخل ہوں گے۔ گھر کی جنت میں، معاشرے کی جنت میں اور پھر اس زندگی کے بعد، اگلی زندگی کی جنت میں (وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا (۴/۱۲۴)) - ان میں سے کسی کے کام کا نتیجہ ضائع نہیں گا۔ (لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى (۳/۱۹۴)) -

اس میں شبہ نہیں کہ تقسیمِ کار کے اصول کے مطابق زندگی کے کچھ وظائف ایسے ہیں جو عورتوں کے لئے مختص ہیں۔ (مثلاً جنین کی حفاظت، بچہ کی پرورش اور ابتدائی تربیت وغیرہ) اس کے لئے اس کی جسمانی ساخت کے بعض گوشے بھی مردوں سے مختلف ہیں اور نفسیاتی طور پر بھی بعض ایسی منفرد خصوصیات، جو اس کے ان فرائض زندگی کی ادائیگی کے لئے معاون بن سکیں۔ مثلاً بچے کے لئے محبت اور پیار کا جذبہ اور ایثار و ستر بانی کی صلاحیت۔ ایثار اس قسم کا کہ جنین ماں کے خون سے مترتب ہوتا ہے۔ اس کی پیدائش کے بعد اس کی پرورش کا انحصار ماں ہی کے عطا کردہ رزق (دودھ) پر ہوتا ہے۔ ماں میں سہارا اور برداشت کا مادہ اس قدر فراواں ہوتا ہے کہ وہ بچے کے ہر قسم کے تقاضہ کو نہایت تحمل اور خندہ پیشانی سے پورا کئے جاتی ہے اور اس کے لئے اس سے کسی صلہ یا معاوضہ کی متمنی نہیں ہوتی۔ یہ، اور اسی قسم کی دیگر خصوصیات ہیں۔

جن میں عورت منفرد ہوتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس میں زندگی کے دوسرے گوشوں میں کارفرمائی کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ قرآنِ کریم نے امتِ مسلمہ (مملکتِ اسلامیہ) کا سب سے اہم فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرار دیا ہے۔ اس میں اس نے مرد اور عورت دونوں کو برابر کا شریک ٹھہرایا ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے: وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۹/۷۱)۔ "مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق اور دوست ہیں۔ یہ دونوں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ نظامِ صلوٰۃ قائم کرتے اور زکوٰۃ دہی کا اہتمام کرتے ہیں۔ یعنی یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جنہیں اللہ اپنی رحمتوں کے سایۂ عاطفت میں رکھے گا اور یہ سب اس کی بے پایاں قوت و حکمت کی رو سے ہوگا۔" آپ سوچئے کہ اس سے بڑھ کر (مردوں اور عورتوں کی) مساوات کی شہادت اور کونسی ہو سکتی ہے؟

اس ضمنی گوشے کے بعد پھر آئیے اصل موضوع کی طرف۔ آیت (۲/۳۵) پہلے پوری درج کی جاچکی ہے۔ اس میں خدا نے آدم سے کہا تھا کہ تم نوعِ انسان کی عالمگیر برادری کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا۔ اس سے تمہاری جنتی زندگی برقرار رہے گی۔ لیکن اس کی خود غرضی کے جذبات نے اُسے بہکا دیا اور اس نے نسلی امتیازات کی رو سے اس برادری کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

ہبوطِ آدم سے مُراد

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس جنت سے نکال دیا گیا۔ قرآنِ کریم میں اسے "ہبوط" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہاں بھی یہ لفظ آیا ہے اور اس کے بعد (۲/۳۸) اور (۲/۱۲۳) میں بھی "ہبوطٌ" کے معنے ہوتے ہیں کسی بلند سطح سے پست سطح کی طرف آجانا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ زندگی، جس میں نوعِ انسانی ٹکڑوں میں نہیں بٹی تھی اور اس طرح ان میں میری اور تیری کی تمیز پیدا نہیں ہوئی تھی، بلند سطح زندگی تھی —— ایسی زندگی جس میں کسی فرد کو اپنی طبیعی ضروریاتِ زندگی کی طرف سے کوئی تردد نہیں تھا۔ نہ ہی اُسے کسی قسم کا خوف اور حزن تھا۔ وہ اس بلند مقام سے نیچے گرا۔ اس کی وحدت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانوں کا ایک گروہ اپنے ہی جیسے انسانوں کے دوسرے گروہ کے خون کا پیاسا ہوگیا۔ اس سے قتل و غارت گری عام ہوئی۔ دوسری طرف "میری اور تیری" کی تفریق کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالادست گروہوں نے وسائلِ رزق کو اپنے قبضہ میں لے لیا جس سے زیردست گروہ نانِ شبینہ تک کے لئے ان کے محتاج ہوگئے۔ قرآنِ کریم نے اس پست سطحِ زندگی کا نقشہ اِن دو لفظوں میں کھینچ کر رکھ دیا ہے کہ:۔ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۶) "تمہارا ایک گروہ دوسرے گروہ کا دشمن اور حریف بن جائے گا"۔ یہی الفاظ

غیر اشتراکی مملکتیں ہیں جن کے قریب ۷۵ کروڑ شہری، دنیا کے ذرائع پیداوار کا بیشتر حصہ ہتھیا لیتے ہیں۔ یہ لوگ باقی دنیا کے لئے ساز و سامان تیار کرتے ہیں اور اس سے حاصل کردہ دولت کی بنا پر، ایسے بلند معیار کی زندگی بسر کرتے ہیں جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان کے مدمقابل ایک سو ترقی پذیر (UN-DEVELOPED) غریب مملکتوں کی قریب ۲ ارب آبادی ہے جس میں سے کروڑوں نفوس بھوک اور امراض کی وجہ سے موت کے سائے تلے زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس وقت تک یہ تصادم بین الاقوامی مذاکروں میں تقریروں اور قراردادوں، تجویزوں اور معاشی مشوروں تک محدود ہے۔ لیکن ان محروم قوموں کا دباؤ اس قدر بڑھتا جا رہا ہے کہ بعض مغربی سیاستدان اسے پوری کی پوری نسل انسانی کے لئے "ٹائم بم" قرار دے رہے ہیں۔ ان سیاستدانوں میں مملکت برطانیہ کا وزیر (REG PRENTICE) جیسا مدبر بھی شامل ہے۔ خطرہ کے اس بڑھتے ہوئے احساس کا نتیجہ ہے کہ بعض سیاستدانوں کا خیال ہے کہ ان مفلس اور نادار قوموں کے ہاتھ میں اگر ایٹمی توانائی کے بم آ گئے تو یہ دولتمند قوموں کو چیلنج دیدیں گے کہ یا تو اپنی جمع شدہ دولت ہمارے حوالے کر دو ورنہ ہم پورے کرۂ ارض کو تباہ کر کے رکھ دیں گے۔ اگر ایسا نہ بھی ہوا تو بھی یہ قومیں دنیا کے معاشی نظام کو تو۔۔۔۔۔ تہ و بالا کر کے ضرور رکھ دیں گی۔

اوائل فروری ۱۹۷۶ء میں، منیلا کے مقام پر، اقوامِ متحدہ کے زیرِ اہتمام، ان ۷۷ اقوام کے نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جو معاشی امور میں ترقی پذیر اقوام سے بہت پیچھے (UN-DEVELOPED) ہیں۔ اس کانفرنس کے چیرمین۔۔۔ (فرڈیننڈ مارکس) نے اپنے افتتاحی خطاب میں کہا کہ دنیا کی آبادی کا ستر فی صد حصہ غریبوں پر مشتمل ہے:-

اگر دنیا کے ذرائع رزق کی منصفانہ تقسیم نہ ہوئی تو سوال یہ نہیں ہو گا کہ "ایسا ہو گا یا نہیں"، سوال یہ ہو گا کہ ایسا کس وقت ہو گا کہ دنیا کے غریب اٹھیں گے اور دولتمند کو چیلنج دیں گے کہ ان ذرائع رزق سے ہمارا پورا پورا حصہ ہمارے حوالے کر دو۔ یاد رکھو! "جنگ یا موت" کا تباہ کن خطرہ ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ (بحوالہ پاکستان ٹائمز، ۳ فروری ۱۹۷۶ء)

اقبالؒ نے بہت پہلے، استحصال پسند اقوام سے کہہ دیا تھا کہ یاد رکھو! خدا نے ملائکہ کو حکم دے دیا ہے کہ:-

اٹھو! مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو ؛ کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو

وہ وقت اب آ گیا ہے۔

بہرحال، بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۶) کی یہ محسوس و مشہود تفسیر ہم سب کے سامنے ہے، اور یہ پیدا کردہ ہے اس مناجرت کی، جس کے تباہ کن نتائج سے قرآنِ کریم نے آدم کو آگاہ کیا تھا۔

آدم سے کہا گیا کہ تم نے بہر حال ایک مدت تک کے لئے اس زمین پر زندگی بسر کرنی ہے۔ اس سے تمہیں مفر نہیں۔ لہٰذا تمہارے لئے سوچنے کا مقام ہے کہ تم اسی قسم کی کرب و اذیت کی جہنمی زندگی بسر کرنا چاہو گے یا ایسی زندگی، جو پھر سے تمہارے فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کا موجب بن سکے۔

قرآن کریم نے یہاں کہا ہے کہ: وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (۲/۳۶) "مستقر" کا لفظ کس قدر حقیقت کشا ہے، اسے ہم جلد اول میں (نظریۂ ارتقاء کے تحت) واضح طور پر بیان کر چکے ہیں (ملاحظہ ہوں آیات ۶/۹۸؛ ۱۱/۶؛ ۲/۳۶)۔ اس کے علاوہ اس کا ذکر، اسی جلد کے بابِ اول میں بھی آچکا ہے۔ اگر کوئی شے ایک ہی مقام پر ٹھہری ہوئی ہو تو اُسے جامد کہا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی ایسی شے ہو جو حرکت کرتی چلی آرہی ہو اور کچھ وقت تک سستانے کے لئے کسی ایک مقام پر ٹھہر جائے، اور اس کے بعد اسے پھر آگے چلنا ہو، تو اس کی اس وقتی آرام گاہ کو اس کا مستقر کہا جائے گا۔ قرآن کریم نے اس ایک لفظ میں زندگی کے ارتقائی مراحل کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے اور مغرب کے اُس مادی نظریہ کی تردید بھی کر دی جس کی رُو سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی اس کے سفرِ ارتقاء کی آخری منزل ہے، اس کے بعد اسے آگے نہیں بڑھنا۔ قرآن کریم نے کہا کہ تم نے کرۂ ارض پر کچھ وقت کے لئے زندگی بسر کرنی ہے۔ یہ زندگی اس نہج کی بسر کرو کہ تمہاری موجودہ ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں اور اس کے ساتھ ہی تم اس قابل بھی بن جاؤ کہ زندگی کی اگلی منزلیں بھی بحسن و خوبی طے کر سکو۔

اس آیت میں دوسرا لفظ "متاع" آیا ہے۔ اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں، وہ سامان جو ضروریاتِ سفر کے لئے کافی ہو۔ اسی لئے اَلْمَتَاعُ اس چیز کو کہتے ہیں، جس سے تھوڑے سے وقت کے لئے فائدہ حاصل کیا جائے۔ (تمتّع کے معنی فائدہ حاصل کرنے (UTILITY) کے ہیں، ملکیت کے نہیں) اس سے بھی قرآن کریم نے اپنے پیش کردہ معاشی نظام کی طرف اشارہ کر دیا۔ یعنی یہ بتا دیا کہ دنیا میں سامانِ رزق فائدہ حاصل کرنے کے لئے ہے، ملکیت میں لینے کے لئے نہیں۔ اور اس فائدہ حاصل کرنے میں تمام بنی آدم یکساں طور پر شریک ہیں، کیونکہ اس کا خطاب آدم سے ہے —— یعنی پوری نوعِ انسان سے۔

سوال یہ ہے کہ اس تنذیر کے بعد آدم کو ویسے ہی چھوڑ دیا گیا یا اسے یہ بھی بتایا گیا کہ جو جنت اس سے چھن چکی ہے اس کی بازیابی کی کوئی صورت بھی ہے؟ اُسے یہ بتایا گیا، کیونکہ ابدی مایوسی تو ابلیس کے لئے تھی جس میں اصلاح کی صلاحیت نہیں تھی۔ آدم میں اصلاح کی گنجائش تھی اِس لئے اسے اپنی اس محرومی کو فائز المرامی میں بدلنے کا طریق بتایا گیا۔ اور وہ اگلی آیت میں ہمارے سامنے آتا ہے:-

۲/۳۷ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۔

یہاں سے ایک عظیم انقلاب ہمارے سامنے آتا ہے۔ اشیائے کائنات کے متعلق قرآن کریم نے بتا دیا کہ جس نہج پر انہوں نے زندگی بسر کرنی ہے اس کا علم، خود ان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ اُسے اُن کی جبلّت (INSTINCTS) کہتے ہیں۔ اشیائے کائنات کی تسخیر کے سلسلہ میں کہدیا کہ انسان کو اس امر کی صلاحیت دیدی گئی کہ وہ ان کا علم حاصل کر کے انہیں مسخر کرے۔ لیکن یہ جو انسان نے باہمی مشاجرت سے اپنی زندگی کو جہنم بنا لیا تھا، اس سے نکلنے کے لئے ——— یا یوں کہئے کہ فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کے لئے انسان کو خدا کی راہنمائی کی ضرورت تھی، اسے وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وحی کے متعلق

وحی کی راہنمائی کی ضرورت

تفصیلی گفتگو تو اس کے اپنے مقام پر آئے گی۔ اس وقت صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ وحی وہ راہنمائی ہے جس میں کسی انسان کی ذاتی فکر اور اکتسابی علم کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس کے لئے خدا کسی برگزیدہ شخصیت کو منتخب کر لیتا تھا۔ اسے یہ راہنمائی خدا کی طرف سے براہِ راست ملتی تھی اور وہ اُسے، کسی قسم کی آمیزش کے بغیر، دوسرے انسانوں تک پہنچا دیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ انسانوں نے جو باہمی اختلافات پیدا کر لئے تو ان کا مٹانا، ان کے اپنے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے لئے خدا کی راہنمائی کی ضرورت تھی جس کا سلسلہ اس زمانے سے شروع کر دیا گیا جب انسانوں میں یہ اختلافات نمودار ہوئے۔ آپ سورۃ یونس اور سورۃ بقرۃ کی اُن دو آیات کو ملا کر پڑھئے جو پہلے بھی گذر چکی ہیں۔ ان سے یہ مفہوم واضح ہو جائے گا۔ سورۃ یونس میں کہا گیا ہے کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (۱۰/۱۹)۔ "تمام انسان ایک برادری کی شکل میں رہتے تھے۔ لیکن بعد میں انہوں نے باہمی اختلافات پیدا کر لئے"۔ اور سورۃ بقرۃ میں ہے: كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (۲/۲۱۳)۔ "تمام انسان امتِ واحدہ کی شکل میں رہتے تھے (پھر انہوں نے باہمی اختلافات پیدا کر لئے اور مختلف گروہوں میں بٹ گئے تو ان اختلافات کو مٹانے کیلئے) خدا نے انبیائے کرامؑ کی بعثت کا سلسلہ شروع کیا جو انہیں آکر بتاتے تھے کہ وحیِ خداوندی کی روشنی میں زندگی بسر کرنے کا نتیجہ کس قدر خوشگوار ہوگا اور اس کی خلاف ورزی کے نتائج کس قدر تباہ کن ہوں گے۔ ان (انبیاء) کے ساتھ خدا نے ضوابط و قوانین نازل کئے تاکہ وہ انسانوں کے باہمی اختلافی معاملات کا، حق و صداقت کے ساتھ فیصلہ کریں"۔ یہی ہے وہ حقیقت، جس کے لئے کہا ہے: فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ (۲/۳۷) یعنی "آدم کو خدا کی طرف سے راہنمائی ملی"۔

تَلَقّٰی (مادہ ل۔ق۔ی) کے بنیادی معنی ہیں کسی کے سامنے آنا۔ یا کسی سے کچھ حاصل کرنا۔ خدا کی طرف سے انسانوں کو جو راہنمائی بذریعہ وحی ملتی تھی اس کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے۔ سورۃ القصص میں ہے: وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ (۲۸/۸۶)۔ اے رسول! تو اس کی توقع ہی نہیں رکھتا تھا کہ تجھے خدا کی طرف سے ضابطۂ قوانین القا کیا جائیگا[1] ــــ یعنی بذریعہ وحی دیا جائے گا۔" دوسری جگہ ہے: يُلْقِى الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (۴۰/۱۵) "خدا اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اپنے امر کے مطابق وحی عطا کر دیتا ہے۔" علاوہ بریں خود زیر نظر آیت (۲/۳۷) سے اگلی آیت میں یہ کہکر بات بالکل واضح کر دی کہ: فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى (۲/۳۸)۔ "جب میری طرف سے تمہیں ہدایت ملے گی۔" "مِنِّىْ هُدًى" نے بات واضح کر دی کہ اس سے مراد خدا کی طرف سے ملنے والی راہنمائی ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ خدا نے آدم (انسان) سے کہدیا کہ یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہو گی کہ تم اپنے اختلافات کو خود مٹا سکو۔ یہ اختلافات ہماری وحی کی روشنی ہی میں مٹ سکیں گے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے تسلیم کرنے پر خود یورپ کے مفکرین اور مدبرین بھی مجبور ہو رہے ہیں۔ اقوامِ عالم میں جو اختلافات پیدا ہو چکے ہیں انہوں نے انتہائی کوشش کر دیکھی کہ انہیں وہ خود مٹا سکیں لیکن وہ اپنی ان کوششوں میں ناکام رہے۔ انہوں نے پہلے لیگ آف نیشنز قائم کی لیکن وہ بھی اس مقصد کے حصول میں بری طرح ناکام رہی۔ مسٹر (EMERY REVES) نے (THE ANATOMY OF PEACE) کے نام سے ایک مختصر لیکن بڑی اہم کتاب لکھی ہے۔ وہ اس میں کہتا ہے:۔

> لیگ آف نیشنز ناکام رہ گئی۔ اس لئے کہ وہ انٹرنیشنلزم کے غلط عقیدہ پر قائم ہوئی تھی۔ اس عقیدہ پر کہ مختلف قوموں کے درمیان صلح قائم رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے نمائندوں کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے اختلافی معاملات کا تصفیہ باہمی مذاکرات کے ذریعہ کر لیا کریں۔ (کس قدر غلط تھا یہ تصور)۔ ان تنازعات کا حل ممکن ہی نہیں جب تک قوموں کے باہمی تعلقات کی بنیاد میں اصلاح نہ ہو جائے (اور وہ بنیاد ہے نیشنلزم)۔ (P. 161)

اس کے بعد وہ کہتا ہے:۔

> ہم انٹرنیشنلزم سے کافی کھیل چکے ہیں۔ جو مسئلہ دنیا کے سامنے پیش ہے وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو قوموں

---

[1] ہمارے ہاں صوفیاء کے متعلق کشف والہام کے ساتھ "القا" کا لفظ بھی بولا جاتا ہے اور جس سے مراد خدا کی طرف سے علم حاصل ہونا لیا جاتا ہے۔ ہم متعدد مقامات پر بتا چکے ہیں کہ ختمِ نبوت کے بعد، خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملنے کا تصور ہی غلط ہے، خواہ اس کے لئے کوئی اصطلاح بھی کیوں نہ استعمال کی جائے۔ نام بدل دینے سے حقیقت نہیں بدل جایا کرتی۔

کے حل کرنے ہو (وہ تو خود قوموں کا پیدا کردہ ہے) وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی معاشرہ میں ایک فساد برپا کر دیا ہے۔ لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ خود نیشنلزم، خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے، اس کا حل دریافت کرے۔ اس مسئلہ کا حل انسانی عالمگیریت (UNIVERSALISM) میں ہے۔ ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے اوپر جا کر، خالص انسانی سطح پر، دنیا میں امن قائم کرنا چاہتی ہے۔ (P.164)

"خالص انسانی سطح" پر یہ مقصد کیسے حل ہو سکے گا؟ اس کے متعلق یورپ کا ایک اور مفکر (J.M.MURRAY) کہتا ہے کہ:-

چونکہ انسانوں کے دل سے خدا کا عقیدہ نکل گیا ہے اس لئے اس خالی مکان پر نیشنلزم کے شیطان نے قبضہ کر لیا ہے۔ اب انسانوں کو ایک ایسے مذہب کی ضرورت ہے جو نیشنلزم کے جذبہ پر غالب آسکے۔

(ADAM AND EVE. P. 66-67)

کلماتُ اللہ قرآن کریم نے اسے وحی کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ جو اب اپنی حقیقی، منزہ اور مکمل.... شکل میں، قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ یہی وہ "کلمٰت" ہیں جن کا ذکر آیت (۲/۳۷) میں کیا گیا ہے۔ کلمہ (جس کی جمع کلمات ہے) کے عام معنی بات کے ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ وحی خداوندی کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ سورۃ الاعراف میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا ہے: یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ (۷/۱۵۸)۔ "وہ خدا اور اس کی وحی پر ایمان رکھتا ہے"۔ یہی وہ کلمٰتُ اللہ ہیں جن کے متعلق سورۃ الانعام میں کہا ہے: وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۶/۱۱۶)۔ "تیرے رب کے قوانین، صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ اس کے کلمات میں کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں۔ خدا سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے"۔ (نیز دیکھئے ۱۰/۶۴؛ ۱۸/۲۷)۔

وہ نظریۂ حیات، یا نظامِ زندگی، جو وحی خداوندی پر مبنی ہو، اسے بھی قرآن کریم نے کلمہ کہہ کر پکارا ہے اور اس کی محکمیت اور خوشگوار نتائج کو ایک مثال کی رو سے یوں سمجھایا ہے: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۔ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۗ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۱۴/۲۴-۲۵)۔ "ذرا اس مثال پر غور کرو۔ طیب نظریۂ زندگی کی مثال، ایک ایسے عمدہ پھلدار درخت کی سی ہے جس کی جڑیں پاتال میں، محکم اور استوار ہوں، اور اس کی شاخیں فضائے آسمانی میں جھوے جھول رہی ہوں۔ وہ درخت قانونِ خداوندی کے مطابق ہر زمانہ اور ہر موسم میں پھل دیئے جاتا ہے۔ اللہ اس طرح، مجرد حقائق کو محسوس مثالوں کے ذریعہ واضح کر دیتا ہے تاکہ لوگ انہیں اچھی طرح سمجھ سکیں"۔

اس کے برعکس وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ
يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ
الظّٰلِمِيْنَ ۚ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ (۲۷-۲۶/۱۴)۔ غلط نظریۂ زندگی اور نظامِ حیات کی مثال ایک ایسے نکمے درخت کی سی ہے جس کی کھوکھلی سی جڑ زمین کے اوپر ہی ہو جو یونہی ایک جھٹکے سے اکھڑ جائے۔"

"اس طرح اللہ اس محکم نظریۂ زندگی کی رو سے، جماعت مومنین کو ان کی دنیاوی اور اخروی زندگی، دونوں میں ثبات اور تمکن عطا کر دیتا ہے۔ اور جو لوگ، اس نظام سے سرکشی برتتے ہیں، ان کی کوششیں رائیگاں چلی جاتی ہیں، یہ سب کچھ ان کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے"۔ صحیح اور غلط نظریاتِ زندگی اور نظامِ حیات میں باہمی کشمکش شروع سے چلی آ رہی ہے۔ اس کشمکش میں، بعض اوقات، جماعتِ مومنین کو میدانِ جنگ میں بھی اترنا پڑتا ہے۔ اُن کی اس جنگ کا مقصد یہ بتایا ہے کہ: وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۚ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا (۹/۴۰)۔ "تاکہ خدا کفار کے نظریۂ زندگی کو مغلوب کر دے اور اللہ کی طرف سے عطا کردہ نظامِ حیات غالب آ جائے"۔ اسی قسم کی جنگ کے متعلق دوسری جگہ ہے:
وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۔ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (۸/۷-۸)۔ "اللہ یہ چاہتا ہے کہ اپنے کلمات (قوانین) کے ذریعے حق کو ثابت کر دے اور اس سے سرکشی برتنے والوں کی جڑ تک کاٹ دے۔ یاد رکھو! ان لڑائیوں سے مقصد حق کو ثابت اور متمکن، اور باطل کو محو کر دینا ہے۔ خواہ یہ بات مجرمین پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرتی ہو"۔ (نیز دیکھئے ۸۲/۱۰؛ ۴۲/۲۴)۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ کلمات اللہ سے مراد وہ قوانین خداوندی ہیں جو وحی کی رو سے عطا کئے گئے ہوں اور کلمہ سے مراد وہ نظریۂ زندگی یا نظامِ حیات، جو ان قوانین کی بنیادوں پر استوار ہو۔ اس حکم یا نظریۂ زندگی کا اصل الاصول یہ ہے کہ: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ "اقتدار کا حق، خدا کے سوا کسی کو نہیں"۔ یہ کلمہ کا حقیقی مفہوم ہے۔ لیکن جب کسی نظریہ کی روح گم ہو جاتی اور اس کے صرف الفاظ باقی رہ جائیں تو پھر کلمۂ خداوندی، اس کلمہ میں تبدیل ہو جاتا ہے جس کے الفاظ ہم دن رات دہراتے رہتے ہیں اور اس کا کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔ حالانکہ خدا نے یہ کہا تھا کہ کلمۂ طیبہ کی مثال، اس درخت کی سی ہے جو ہر زمانے میں اپنے پھل دیتا ہے۔ اور یہ پھل، دنیا کی زندگی اور آخرت دونوں میں حاصل ہوتے ہیں۔ دنیا میں اس کی محسوس اور مرئی شکل جماعتِ مومنین کا ثبات اور استحکام ہے (۲۷-۲۴/۱۴۔ یہ آیات پہلے درج کی جا چکی ہیں) قرآنِ کریم نے دوسری جگہ کہا ہے: اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ ۔ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (۳۵/۱۰)۔ خدا کے عطا کردہ طیب نظریۂ حیات میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ اپنے زورِ دروں سے بلند ہوتا جائے۔ لیکن اگر اس کے ساتھ انسانوں کے اعمالِ صالحہ بھی شریک ہو جائیں تو پھر وہ برق رفتاری

سے رفعت اور بلندی حاصل کر لیتا ہے۔" خدا کا متعین فرمودہ نظریۂ حیات از خود آگے بڑھتا چلا آ رہا ہے اور زمانے کے تقاضوں سے انسان اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ اسے اختیار کرے۔ لیکن اس کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔ (خدا کا ایک ایک یوم ہمارے حساب و شمار سے ہزار ہزار برس (۳۲/۵) بلکہ پچاس پچاس ہزار برس (۷۰/۴) کا ہوتا ہے) لیکن جب اس کے ساتھ حق و صداقت پر چلنے والی جماعت کا زورِ بازو شامل ہو جاتا ہے تو یہ اپنے نتائج ہمارے حساب اور شمار کے مطابق مرتب کر دیتا ہے۔ جیسا کہ عہدِ محمدؐ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم والذین معہٗ میں ہوا۔ (لیکن یہ ایک جداگانہ موضوع ہے جس پر تفصیلی گفتگو اپنے مقام پر آئے گی)۔

آدم نے جب خدائی راہنمائی اختیار کر لی تو (یوں سمجھئے کہ) اس کی توبہ قبول ہو گئی۔ یعنی وہ صحیح راستہ پر چل پڑا۔ توبہ کا تفصیلی مفہوم، مطالب الفرقان، جلد اول میں بڑی تفصیل سے آ چکا ہے۔ (دیکھئے تشریح زیر آیت (۴/۱) صفحہ ۲۶) آیت ۱۴ میں کہا گیا ہے کہ جب آدم نے اپنا رخ صحیح سمت کی طرف کر لیا تو خدا نے بھی اپنی توجہ اس کی طرف منعطف کر دی۔ وہ توّاب اور رحیم ہے۔ ہم جلد اول میں مسئلہ تقدیر پر بحث کرتے ہوئے یہ بتا چکے ہیں کہ انسان، جس قسم کا راستہ اختیار کرتا ہے، اسی قسم کے قوانینِ خداوندی کا اطلاق اس پر ہو جاتا ہے۔ (دیکھئے جلد اول آیات (۱/۷) و (۲/۴) و (۲/۷) صفحات ۵۲، ۹۳، ۱۰۸) اس مقام پر بھی انسان سے یہی کہا گیا ہے کہ جب تمہیں اس امر کا احساس ہو جائے کہ تم سے غلطی سرزد ہو گئی ہے اور تم اپنی اصلاح کرنا چاہو، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس غلط راستے پر تم چل رہے تھے اس سے منہ موڑ کر پھر اسی دوراہے پر آ جاؤ، جہاں سے تمہارا قدم اس غلط راستہ کی طرف مڑ گیا تھا۔ اس سے تمہاری سابقہ غلطی کا ازالہ ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد صحیح راستہ اختیار کر لو۔ اس سے تم منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔ اسی حقیقت کو اگلی آیت میں دہرایا گیا ہے، جہاں کہا:-

۲/۳۸ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔

"ہم نے آدم سے کہا کہ زندگی کے اس بلند مقام سے گر کر تم اس کی پست سطح پر تو آ گئے ہو لیکن تمہاری یہ گراوٹ ابدی محرومی نہیں۔ ہماری طرف سے تمہیں (ہمارے رسولوں کی معرفت) راہنمائی ملے گی۔ سو جو بھی اس راہنمائی کا اتباع کرے گا تو وہ لوگ خوف اور حزن سے مامون ہو جائیں گے۔"

خوف اور حزن سے مامونیت

"ھدایت" کی تفصیل تو پہلی جلد میں گزر چکی ہے۔ یہاں اتباعِ ہدایت کا جو نتیجہ بتایا گیا ہے وہ بڑا اہم ہے۔ یعنی خوف اور حزن دونوں سے مامونیت۔ خوف، عام طور پر بیرونی خطرات اور نقصانات کے احساس کو کہا جاتا ہے،

اور حزن کے معنی ہوتے ہیں، افسردگی، پژمردگی، پریشانی خاطر، اندوہ و ملال، جسے عام الفاظ میں دل کا ڈوب جانا کہتے ہیں۔ ہر چند یہ لفظ ہر قسم کے حزن ملال کے لئے بولا جاتا ہے لیکن عرب اسے معاشی پریشانی کے لئے خاص طور پر بولتے تھے۔ چنانچہ حَزَانَةُ الرَّجُلِ انسان کے اُن متعلقین، اہل و عیال کو کہا جاتا ہے جن کی تکلیف سے اُسے پریشانی ہوتی ہو اور وہ ان کے لئے سامانِ رزق کا اہتمام کرے۔

عصرِ حاضر کے علم النفس کی تحقیق یہ ہے کہ انسان کی کم و بیش تمام نفسیاتی اُلجھنوں اور اعصابی عوارض کا بنیادی سبب خوف ہے۔ (یاد رہے کہ انگریزی زبان میں خوف کو (FEAR) اور حزن کو (GRIEF) کہا جاتا ہے)۔ خوف سے انسانی ذات یوں کہیئے کہ گھُٹ کے مر جاتی ہے اور اس کا لازمی نتیجہ حزن ہوتا ہے — قرآنِ کریم نے اس نظام کی بنیادی خصوصیت جو قوانینِ خداوندی پر مبنی ہو، یہ بتائی ہے کہ اس میں کسی کو نہ کسی قسم کا خوف ہو گا نہ حزن۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے: وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا (۲۰/۱۱۲) ۔ "جو شخص قوانینِ خداوندی کی صداقتوں کو تسلیم کر کے، اُن کے مطابق صلاحیت بخش کام کرے گا تو اُسے نہ کسی قسم کی نا انصافی اور دھاندلی کا خوف ہو گا، نہ استحصال کا ڈر"۔ دوسری جگہ ہے: فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا (۷۲/۱۳) "جو کوئی خدا پر ایمان لے آتا ہے، اُسے نہ اپنے حقوق میں کمی یا سلب و نہب کا اندیشہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کی ذلت و رسوائی کا خوف"۔ اسی کو اس نے جنتی زندگی سے تعبیر کیا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ (۷/۴۹) "تم جنتی معاشرہ میں داخل ہو جاؤ جہاں تمہیں نہ کسی قسم کا خوف ہو گا نہ حزن"۔ بارگاہِ ایزدی سے پکار کر کہا جائے گا کہ: يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ (۴۳/۶۸) "اے میرے بندو! اب تمہیں نہ کسی قسم کا خوف ہو گا نہ حزن"۔ یہ زندگی حاصل کس طرح سے ہو گی، اس کے متعلق سورۃ حٰمٓ میں کہہ دیا کہ:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ. نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ. وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ (۴۱/۳۰-۳۱)۔

جو لوگ اِس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے اور پھر اپنے اس اقرار اور ایمان پر اس طرح جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہیں کر سکتی تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ جو ان سے کہتے ہیں کہ تم نہ کسی قسم کا خوف کرو اور نہ ہی افسردہ خاطر ہو۔ تمہارے لئے

اس جنتی معاشرہ کی خوشخبری ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہوں گے۔ اُس جنتی زندگی میں ویسا ہی ہوگا جیسا تم چاہو گے۔ اور وہ سب کچھ ملے گا، جسے تم طلب کرو گے۔

اولیاء اللہ

یہی ہیں وہ خوش نصیب، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنا دوست (اولیاء اللہ) کہا ہے اور ان کی خصوصیت یہ بتائی ہے: لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۱۰/۶۲)۔ ضمناً اس نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا ہے کہ اولیاء اللہ کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا۔ یہ وہی لوگ ہیں: الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ (۱۰/۶۳)۔ جنہیں مومن اور متقی کہا جاتا ہے اور ان کی پہچان یہ ہے کہ: لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ (۱۰/۶۴)۔ "ان کی اس دنیا کی زندگی بھی ہر قسم کی خوشگواریوں کی حامل ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی۔ اس کے بعد کہا کہ یہ کوئی ہنگامی یا عارضی بات نہیں کہ کبھی ایسا ہوگا اور کبھی ایسا نہیں ہوگا۔ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (۱۰/۶۴)۔ "یہ خدا کا غیر متبدل قانون ہے۔ اور یہ بڑی عظیم کامرانی ہے، جسے حاصل ہو جائے۔" دنیاوی زندگی میں خوشگواریوں کے متعلق قرآن کریم نے دوسری جگہ کہہ دیا کہ: وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (۳/۱۳۸)۔ "تمہیں نہ افسردہ خاطر ہونے کی ضرورت ہے نہ غمگین۔ اگر تم مومن ہو تو تم سب پر غالب آکر رہو گے۔" یعنی "لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ" کا عملی ثبوت یہ ہے کہ وہ قوم تمام مخالفین پر بالادست ہو۔ مغلوب محکوم ہر قسم کے خوف اور حزن کا شکار ہوتا ہے اور مومن کی زندگی مغلوب محکوم کی نہیں، غالب اور بالادست کی زندگی ہے۔ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ (۲۱/۱۰۳)۔ "بڑے سے بڑا حادثہ بھی ان کے دل میں پریشانی اور افسردگی پیدا نہیں کر سکتا۔" وہ نہایت استقامت سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں اور اس پر غالب آجانے کے بعد، یہ کہتے ہوئے، بحضور رب العزت سجدۂ شکر بجا لاتے ہیں۔ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (۳۵/۳۴)۔ "کس قدر قابلِ حمد و ستائش ہے وہ ذات، جس نے ہمارا حزن دور کر دیا۔" لفظ مومن کا تو مادہ ہی، امن (ا۔م۔ن) ہے اور امن اور خوف باہمدگر متضاد ہیں۔ اس لئے مومن، خوف اور حزن سے مامون ہوتا ہے۔ اور جس کی زندگی خوف سے مامون ہو، وہ کسی نفسیاتی الجھن کا شکار نہیں ہو سکتا۔ (ERICH FROMM) کی یہ تحقیق پہلے سامنے آچکی ہے کہ مثالی زندگی وہ ہے جس میں کسی کو کسی قسم کا خوف نہ ہو۔ اسی کو قرآن کریم نے "نفسِ مطمئنہ" سے تعبیر کیا ہے۔ (۸۹/۲۷)۔

یہ ہے وہ زندگی، جس کا وعدہ آدم سے کیا گیا، اس شرط کے ساتھ کہ وہ خدا کی طرف سے عطا کردہ راہنمائی کا اتباع

کرے۔ جو ایسا نہ کریں، ان کے متعلق وہیں کہدیا :-

وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَکَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ۔ ۲/۳۹

"جو لوگ، اس حقیقت کی صداقت سے انکار اور ہمارے قوانین کی تکذیب کریں گے، تو ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس جائیں گی، اور وہ مستقل عذاب کی زندگی جیئیں گے"۔ یعنی جب تک وہ اس غلط روش کو ترک نہیں کریں گے، ذلت و خواری اور تباہی و بربادی کی زندگی سے نکل نہیں سکیں گے۔

یہاں کفر کے ساتھ تکذیب بھی کہا گیا ہے۔ تکذیب کا مفہوم تو تفصیل طلب ہے جو اپنے مقام پر آئے گا۔ یہاں اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ کفر قوانینِ خداوندی (قرآنی صداقتوں) سے یکسر انکار ہے۔ اور اس میں تکذیب خود بخود آجاتی ہے۔ لیکن جب کفر اور تکذیب کا الگ الگ بیان ہو تو وہاں تکذیب کا مفہوم یہ ہوگا کہ زبان سے تو ان صداقتوں کا اقرار کیا جائے لیکن عمل ان کے خلاف کیا جائے۔ یعنی عملاً اپنے دعوئے ایمان کی تکذیب کی جائے۔ جیسا کہ سورۃ الماعون میں کہا گیا ہے کہ: "تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا ہے جو زبان سے تو دین کا اقرار کرتے ہیں لیکن عملاً اُسے جھٹلاتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جو ان لوگوں کو جو معاشرہ میں بے یار و مددگار رہ جائیں، دھتکارتے ہیں اور جو کسی وجہ سے محتاج ہو جائیں ان کی روٹی کا انتظام نہیں کرتے۔ یہ وہ نمازی ہیں جو رسمی نمازیں تو پڑھتے ہیں لیکن صلوٰۃ کی غرض و غایت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ اور رزق کے ان سرچشموں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح رواں دواں رہنا چاہیئے تھا بند لگا کر روک لیتے ہیں (۱۰۷:۱-۷)"۔ یہ ہے تکذیب کی نمایاں مثال۔

لہٰذا قرآنِ کریم کی رو سے، کفر اور تکذیب دونوں کا نتیجہ عذابِ جہنم ہے۔

نگہ بازگشت

یہ ہے وہ سرگزشتِ آدم، جو قرآن کریم میں، انتہائی حسین اور بلیغ، تمثیلی انداز میں بیان کی گئی ہے یہ سرگزشتِ آدم نہیں، انسانیت کی تاریخ ہے۔ آپ اس تاریخ پر غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ اس کی ایک ایک تفصیل کس طرح قرآنی صداقتوں کی شہادت بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ جہاں تک اس طبعی کائنات کا تعلق ہے، انسان نے علومِ فطرت کی تحصیل سے اس مٹی کے گھروندے کو کیا سے کیا نہیں بنا دیا۔ ذرا اس دور کو سامنے لائیے جب انسان نے پہلے پہل اس زمین پر تمدنی زندگی شروع کی اور اس کے بعد اس کی آج کی زندگی پر غور کیجئے۔ آپ کو صاف نظر آجائے گا کہ اس کی مشاطگی نے کائنات کے گیسوؤں کو کس طرح سنوارا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے مخصوص، شوخ انداز

میں ایک نظم لکھی ہے جس کا عنوان ہے " محاورہ مابین خدا اور انسان " — اور وہ یوں ہے :-

خُدا

جہاں رازِ یک آب و گِل آفریدم — تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولادِ ناب آفریدم — تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہالِ چمن را
قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

اِنسان

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

(پیامِ مشرق)

اس حقیقت سے قطع نظر کہ انسان نے اس خارجی کائنات کے حسن میں، کسقدر اضافہ کیا ہے، اس نظم میں ایک بڑا پُر معنی اشارہ ہے۔ انسان نے خدا کے ان اعتراضات کا جواب تو دیدیا جن کا تعلق خارجی کائنات سے تھا، لیکن اس کے عائد کردہ پہلے اعتراض کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اعتراض یہ تھا کہ

جہاں رازِ یک آب و گِل آفریدم — تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی

انسان کے پاس اس کا جواب ہے ہی نہیں۔ خدا نے نوعِ انسان کو امت واحدہ کی شکل میں پیدا کیا تھا۔ اس نے اُسے ٹکڑوں میں بانٹ دیا اور پھر ان ٹکڑوں کو یکجا کرنے کے لئے اس کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ انسانی تاریخ کے یہ دونوں گوشے باہمدگر اس قدر متضاد و متخالف ہیں کہ ان پر غور کرنے سے انسان محوِ حیرت رہ جاتا ہے کہ ایک گوشے میں اسقدر بلندی اور دوسرے میں اسقدر پستی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تسخیرِ کائنات تو اس علم کی رُو سے کی جاسکتی تھی (اور کرلی گئی) جس کی تحصیل کی صلاحیت اس کے اندر رکھ دی گئی تھی۔ لیکن اس کی ذاتی اور تمدنی زندگی صحیح خطوط پر، وحی کی راہنمائی ہی میں جادہ پیما ہوسکتی تھی جسے اس نے نظر انداز کردیا۔ اس کا عبرت آموز نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ اقبالؒ نے ان دونوں گوشوں کے تقابل کو ان الفاظ میں اجاگر کیا ہے :-

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار — عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

زندگی کی شبِ تاریک تو، سائنس کے علوم سے نہیں، وحی کی شمعِ جہانتاب ہی سے روشن ہو سکتی ہے۔ اسی لئے اقبالؒ نے اقوامِ مغرب کو مخاطب کرکے کہا تھا کہ :-

چارہ این است کہ از عشق گشادے طلبیم — پیشِ اُو سجدہ گزاریم و مُرادے طلبیم

اقوامِ مغرب آج اس روشنی کے لئے تڑپ رہی ہیں۔ اے کاش! کوئی اللہ کا بندہ شمعِ قرآنی ہاتھ میں لے کر اُن کی راہنمائی کرے تو آدم کو پھر سے وہ جنت مل جائے، جس کی بازیابی کے لئے وہ اس قدر وقفِ اضطراب ہے۔

پھر اس طرح خود حاصل کردہ جنت، اور جنتِ آدم میں ایک معیاری فرق بھی ہے۔ وہ جنت آدم کو اُس کے حسنِ عمل کے نتیجہ میں نہیں ملی تھی۔ "بخشش" کے طور پر عطا ہوگئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ ایک لغزش سے چھن گئی۔ لیکن جو جنت انسانی اعمال کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے، وہ دائمی ہوتی ہے۔ اس جنت کے متعلق بارگاہِ خداوندی سے اعلان ہوگا کہ

جنتِ آدم اور جنتِ مومن میں فرق

تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۴۳/۷۲)۔ "یہ وہ جنت ہے جسکا تمہیں تمہارے اعمال کے بدلے میں مالک بنایا جارہا ہے"۔ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۔ یہ لوگ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے جو مبنی برحقیقت ہے۔ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيلًا (۴/۱۲۲) اور خدا سے زیادہ بات کا سچا کون ہو سکتا ہے۔

یہ ہے دونوں جنتوں میں فرق — ایک بخشش کے طور پر ملی ہوئی دوسری اپنے حسنِ کردار کے صلہ (نتیجہ) میں حاصل کی ہوئی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ — تا جزائے عملِ تست جہاں چیزے ہست

یہ جنت وہ ہے جس کے متعلق "روحِ ارضی" نے آدم کے استقبالیہ میں کہا تھا کہ :-

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں — آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں — جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

اے پیکرِ گل! کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

لہٰذا یہ جنت چھن کیسے سکتی ہے!

موضوع تو ختم ہو گیا لیکن اس کا ایک ضمیمہ باقی ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جب مختلف مذاہب کے پاس، ان کی (مبینہ) آسمانی کتابیں موجود ہیں تو پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ اب حق و صداقت کی راہ، صرف قرآن کریم کے اندر ہے اور کہیں نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا کی کسی قوم کے پاس وہ کتاب اپنی اصلی اور غیر محرّف شکل میں موجود نہیں جو ان کے دین کے داعی نے انہیں خدا کی طرف سے دی تھی[1] ان کتابوں کو انسانی تحریف نے کچھ کا کچھ بنا کر رکھ دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سرگزشتِ آدم، سابقہ انبیائے کرامؑ کی طرف وحی میں بھی بیان کی گئی تھی۔ چنانچہ

تورات میں قصۂ آدم

بائبل میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ لیکن آپ یہ دیکھئے کہ اس کتاب میں یہ قصہ کس انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ اُس میں پہلے تو یہ کہا گیا ہے کہ:-

خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا (تورات کتاب پیدائش ۱/۲۷)۔

اس کے بعد قصۂ آدم کی بعض تفصیلات ملاحظہ فرمایئے۔ جنتِ آدم کے متعلق ہے:-

اور خداوند خدا نے عدن میں، پورب کی طرف ایک باغ لگایا اور آدم کو جسے اس نے بنایا تھا وہاں رکھا۔ اور خداوند خدا نے ہر درخت کو جو دیکھنے میں خوشنما اور کھانے میں خوب تھا اور باغ کے بیچوں بیچ حیات کے درخت اور نیک و بد کی پہچان کے درخت کو زمین سے اُگایا۔ اور عدن سے ایک ندی باغ کے سیراب کرنے کو نکلی اور وہاں سے تقسیم ہو کر چار سرے نہروں کے بنی۔ پہلی کا نام فیسون جو حویلہ کی ساری زمین کو گھیرتی ہے۔ وہاں سونا ہوتا ہے۔ اور اس زمین کا سونا اچھا ہے۔ اور وہاں موتی اور بلور بھی ہیں اور دوسری نہر کا نام جیحو ہے جو کوش کی ساری زمین کو گھیرتی، اور تیسری کا نام دجلہ ہے جو اسور کے پورب جاتی ہے اور چوتھی نہر کا نام فرات ہے (پیدائش ۲/۱۴)۔

قرآن نے انسانی سرگزشت کو تمثیلی رنگ میں بیان کیا ہے اس لئے اس میں کسی قسم کا نام نہیں لیا گیا۔ کیونکہ اس طرح وہ تمثیل نہ رہتی، تاریخ کا واقعہ بن جاتی۔

شجرِ ممنوعہ کے متعلق لکھا ہے:-

اور خداوند خدا نے آدم کو لے کر باغ عدن میں رکھا کہ اس کی باغبانی اور نگہبانی کرے۔ اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دیکر کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل کھایا کر لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت سے نہ کھانا کیونکہ جس

---

[1] اس کی تفصیل میری اس کتاب میں دیکھئے جس کا عنوان ہے۔ "مذاہبِ عالم کی مبینہ آسمانی کتابیں"۔

دن تو اسے کھائے گا، ضرور مرے گا (پیدائش ۲/۱۷)۔

انسان کو نیک و بد کی پہچان وحی کے ذریعہ کرائی جانی مقصود تھی۔ لہٰذا، اس شجر کے قریب آنے سے منع کرنے کے کیا معنیٰ ؟

آدم کی بیوی کی پیدائش کے متعلق لکھا ہے :۔

اور خداوند خدا نے آدم پر بھاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند خدا اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی، ایک عورت بنا کر آدم کے پاس لایا۔ اور آدم نے کہا کہ اب یہ میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور گوشت میں سے گوشت ہے۔ اس سبب سے وہ ناری کہلائے گی کیونکہ وہ نر سے نکالی گئی۔ اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑ دے گا اور اپنی جورو سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے۔ اور وہ دونوں آدم اور اس کی جورو ننگے تھے اور شرماتے نہ تھے (پیدائش ۲/۲۱-۲۵)۔

اس کے بعد یہ مذکور ہے کہ کس طرح سانپ نے (ابلیس نے نہیں بلکہ سانپ نے) اس عورت کو بہکایا اور اس نے شجرِ ممنوعہ کا پھل خود بھی کھایا اور اپنے خاوند کو بھی کھلایا۔ اس کے بعد :۔

اور انہوں نے خداوند خدا کی آواز، جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا، سُنی۔ اور آدم اور اس کی جورو نے آپ کو خداوند خدا کے سامنے سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔ تب خداوند خدا نے آدم کو پکارا اور اس سے کہا کہ تو کہاں ہے؟ وہ بولا کہ میں نے باغ میں تیری آواز سنی اور ڈرا کیونکہ میں ننگا ہوں۔ اس لئے میں نے اپنے آپ کو چھپایا۔ اور اس نے کہا کہ تجھے کس نے جتایا کہ تو ننگا ہے؟ کیا تو نے اس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھ کو حکم کیا تھا کہ اسے نہ کھانا؟ آدم نے کہا کہ اس عورت نے جسے تو نے میری ساتھی کر دیا مجھے اس درخت سے دیا اور میں نے کھایا۔ تب خداوند خدا نے عورت سے کہا کہ تو نے یہ کیا کیا؟ عورت بولی کہ سانپ نے مجھ کو بہکایا تو میں نے کھایا۔ (پیدائش ۳/۸-۱۳)

چنانچہ اس جرم کی پاداش میں :۔

اس نے (یعنی خداوند خدا نے) عورت سے کہا کہ میں تیرے حمل میں تیرے درد کو بہت بڑھاؤں گا اور درد سے تو لڑکے جنے گی اور اپنے خصم کی طرف تیرا اشتیاق ہوگا اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔ (پیدائش ۳/۱۶)

اور آدم سے کہا کہ :۔

اس واسطے کہ تو نے اپنی جورو کی بات سنی اور اس درخت سے کھایا، جس کی بابت میں نے تجھے حکم کیا کہ اسے مت کھانا۔ زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی اور تکلیف کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس سے کھائے گا اور

وہ تیرے لئے کانٹے اور اونٹ کٹارا اُگائے گی اور تو کھیت کی نباتات کھائے گا۔

اِس کے بعد مذکور ہے کہ:۔

اور خداوند خدا نے کہا۔ دیکھو کہ انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک ہو گیا اور اب ایسا نہ ہو کہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے بھی کچھ لے اور کچھ کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے۔ اس لئے خداوند خدا نے اس کو باغِ عدن سے باہر کر دیا تاکہ وہ زمین کی، جس میں سے وہ لیا گیا تھا کھیتی کرے۔ چنانچہ اس نے آدم کو نکال دیا اور باغِ عدن کی پورب کی طرف کروبیوں کو چمکتی تلوار کے ساتھ جو چاروں طرف پھرتی تھی مقرر کیا کہ درختِ حیات کی نگہبانی کریں۔ (پیدائش ۳/۲۲-۲۴)

آپ نے غور فرمایا کہ اس قصہ کی مذکورہ صدر تفاصیل میں کس طرح زمین کی پستی اور خاک کی کثافت جھلک رہی ہے صاف نظر آتا ہے کہ یہ انسانی تخیلات کی عکاسی ہے وحی کا بیان نہیں۔ اتنا ہی نہیں، اس کے بعد، کتاب پیدائش کے چھٹے باب کی پانچویں سے آٹھویں آیت میں ہے:

اور خداوند نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی اور اُسکے دل کے تصور اور خیال روز بروز بد ہی ہوتے جاتے ہیں۔ تب خداوند زمین پر انسان کے پیدا کرنے سے پچھتایا اور نہایت دلگیر ہوا۔ اور خداوند نے کہا کہ میں انسان کو جسے میں نے پیدا کیا، روئے زمین پر سے مٹا ڈالوں گا۔ انسان کو اور حیوان کو بھی اور کیڑے مکوڑے اور آسمان کے پرندوں تک، کیونکہ ان کے بنانے سے پچھتاتا ہوں۔ مگر نوح پر خداوند نے مہربانی سے نظر کی۔

یہ "حقائق" کسی تبصرہ کے محتاج نہیں۔

وحیٔ خداوندی میں آمیزش سابقہ آسمانی کتابوں کے ساتھ ایسا کچھ کیوں ہوا اس کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِى الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۔ (۲۲/۵۲)۔

اے رسولؐ! ہماری وحی کے ساتھ ہوتا یہ رہا ہے کہ ہمارا ایک فرستادہ نبی آتا، لوگوں تک ہمارا پیغام پہنچاتا، اس کے بعد شیطان صفت لوگ اس کی وحی میں اپنی طرف سے آمیزش کر کے اُسے کچھ سے کچھ بنا دیتے۔ اس کے بعد خدا ایک اور رسول بھیج دیتا اور سابقہ وحی کو اس آمیزش سے پاک اور صاف کر کے اپنے قوانین کو پھر سے محکم کر دیتا۔ اس لئے کہ خدا کو ہر بات کا علم ہوتا ہے اور اس کے سب کام حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔

یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے دینِ خالص، حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے، قرآن کریم میں محفوظ کر دیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا کہ اس میں کوئی تحریف یا آمیزش نہ کر سکے۔ اور اس کے بعد وحی کے سلسلہ کو ختم کر دیا۔ اسے ختمِ نبوت کہا جاتا ہے۔

چونکہ قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا تھا اس لئے یہ تو ممکن نہیں تھا کہ اس کتاب میں کسی قسم کا رد و بدل کیا جا سکے لیکن شیطان صفت لوگوں نے اس کیلئے ایک اور تدبیر نکالی۔ اس تدبیر کے متعلق قرآن کریم نے سورۃ الانعام میں کہا ہے کہ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ۔ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (۶/۱۱۳)۔ "جو نبی بھی آیا، شیطان صفت لوگ، خواہ اُن کا تعلق شہری بستیوں سے تھا یا صحرائی آبادیوں سے، اس کی مخالفت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے، اس کیلئے وہ باہمی خفیہ سازشیں کرتے اور عوام کو بہکانے کے لئے طرح طرح کی ملمع سازی کی باتیں کرتے"۔ یہ ملمع سازی کی باتیں وہ ہیں، جو وضعی روایات کی شکل میں ہماری کتبِ احادیث میں داخل کر دی گئیں اور پھر انہیں کی بنیادوں پر قرآن کریم کی تفسیریں لکھی گئیں۔ چونکہ ان روایات کو حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے اس لئے انہیں تقدس حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اب حالت یہاں تک بگڑ چکی ہے کہ یہی ملمع سازی کی باتیں اصلِ اسلام بن گئی ہیں اور قرآن کا مصرف صرف اشارہ گیا ہے — کہ از یاسینش او آساں بمیری —

وضعی روایات

انہی ملمع سازوں کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ:-

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے جسے ٭ بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لئے

قصۂ آدم میں اس "زیبِ داستاں" کے لئے کیا کچھ بڑھایا دیا گیا ہے اس کی کچھ مثالیں ہم پہلے دیکھ چکے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ حوّا کو کس طرح آدم کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ اسی تفسیر (ابن کثیر) میں خود تخلیق آدم کے متعلق، روایات کی سند سے، کہا گیا ہے کہ:-

> پھر آدم علیہ السلام کی مٹی اُٹھائی گئی جو چکنی اور اچھی تھی۔ جب اس کا خمیر اٹھا تب اس سے حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور چالیس دن تک وہ یونہی پتلے کی شکل میں رہے۔ ابلیس آتا تھا اور اس پر لات مار کر دیکھتا تھا کہ وہ بجتی مٹی تھی، جیسے کوئی کھوکھلی چیز ہو۔ پھر منہ کے سوراخ سے گھس کر پیچھے کے سوراخ سے اور اس کے خلاف آتا جاتا رہا اور کہتا رہا کہ درحقیقت یہ کوئی چیز نہیں اور اگر میں اس پر مسلط ہو گیا تو اسے برباد کر کے چھوڑوں گا اور اسے مجھ پر مسلط کیا گیا تو میں ہرگز تسلیم نہ کروں گا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان میں روح پھونکی اور وہ سر کی طرف سے نیچے کی طرف آئی تو جہاں جہاں تک پہنچتی

رہی، خون گوشت بنتا گیا، جب ناف تک روح پہنچی تو اپنے جسم کو دیکھ کر خوش ہوئے اور جھٹ سے اٹھنا چاہا لیکن نیچے کے دھڑ میں روح نہیں پہنچی تھی اس لئے اُٹھ نہ سکے۔ اسی جلدی کا بیان اس آیت میں ہے: وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا۔ یعنی انسان بے صبرا اور جلد باز ہے۔ نہ تو خوشی میں صبر نہ رنج میں۔ جب روح جسم میں پہنچی اور چھینک آئی تو کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا یَرْحَمُكَ اللّٰهُ۔

(ابن کثیر۔ پارہ اول۔ ص ۸۳)

یہ آج سے چھ سات سو سال پہلے کی بات تھی (حافظ عماد الدین ابن کثیر کی وفات ۷۷۴ھ میں ہوئی) عصرِ حاضر کے "مفسرین" ان سے آگے بڑھے اور ان کی طرح پر یہ مصرعہ لگایا کہ:۔

حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تخلیق کے بعد حضرت آدم نے اپنے گرد و پیش کو دیکھا تو انہیں ہر قسم کی مخلوق نظر آئی۔ طرح طرح کے جانور، چرندے و پرندے نظر آئے۔ لیکن ایسی کوئی مخلوق جو ان کی ہم جنس ہو اور جس سے انس و سکون حاصل ہو، نظر نہ آئی۔ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بڑی وحشت سی ہوئی اور دل ہی دل میں یہ تمنا اور آرزو پیدا ہوئی کہ مجھے کوئی ایسی مخلوق نصیب ہو جائے جس کی رفاقت اور معیت سے مجھے چین اور سکون ملے۔ چنانچہ دوسرے جمعہ کو جب کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام عالمِ خواب میں تھے اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے بائیں پہلو کو چیر کر ایک حسین و جمیل اور خوبصورت عورت پیدا کر دو جو آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے موجبِ تسکین ہو۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرتِ حوّا کو آدم کی بائیں پسلی سے پیدا کیا گیا۔ بہرحال آدم کے بائیں پہلو کو چیر کر پیدا کیا گیا ہو یا بائیں پسلی سے پیدا کیا گیا ہو، دونوں صورتوں میں حضرت آدم کو کوئی تکلیف اور کوئی درد محسوس نہیں ہوا اور بغیر تکلیف کے اللہ نے حضرت حوّا کو پیدا فرما دیا۔ حضرت آدم جب نیند سے بیدار ہوئے تو دیکھا کہ انہیں کی جنس سے ایک مخلوق عورت کی شکل میں، ان کے پہلو میں بیٹھی ہوئی ہے۔

حضرت آدم نے پوچھا کہ تو کون ہے؟ غیب سے آواز آئی کہ یہ ہماری کنیز اور بندی ہے۔ اس کا نام حوّا ہے اور اس کو ہم نے تمہاری رفاقت اور تمہارے انس کے لئے پیدا کیا ہے۔ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو چھونے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا تو وحی کے ذریعے اللہ کا حکم پہنچا کہ آپ اس وقت تک اسے نہیں چھو سکتے جب تک اس کا مہر ادا نہ کر دیں۔ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوچھا کہ اے پروردگار! اس کا مہر کیا ہے۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس کا مہر یہ ہے کہ محمد اور آلِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر دس بار درود بھیجا جائے۔ حضرت آدم نے دریافت کیا کہ اے اللہ! محمدؐ کون ہیں؟ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

آپ کی اولاد میں سے وہ ذات ہے جو خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں اور ان کی اہمیت یہ ہے کہ اگر ان کو پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو تمہیں یعنی آدم کو بھی پیدا نہ کیا جاتا۔ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دس مرتبہ محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر درود بھیجا اور ملائکہ کی شہادت کے ساتھ دونوں کے مابین عقدِ نکاح قائم ہوا، اور اس جمعہ کے آخری حصہ میں فرشتوں کو حکم ملا کہ یاقوت اور سچے موتیوں کے زیور اور لباس زینت سے حضرت حوّا کو آراستہ کر کے دونوں کو جنت میں داخل کر دیا جائے۔

یہ اقتباس ہے اُس درسِ قرآن کا جو کراچی کے (مشہور مولانا) احتشام الحق تھانوی صاحب نے ارزاں فرمایا تھا اور جو اخبار "سیرت" (لاہور) کی تیس ۳۰ مئی ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ یہ اقتباس ہم نے محض مثالاً پیش کر دیا ہے ورنہ اس میں کسی خاص "مولانا" کی تخصیص نہیں۔ ہمارے ہاں کے دارالعلوموں میں یہی کتبِ روایات و تفاسیر پڑھائی جاتی ہیں۔ اور انہی کی بنا پر وہاں کے فارغ التحصیل طلباء کو "علماء" کے زمرے میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ اس لئے ہمارے ہاں کے ہر محراب و منبر سے یہی قصے دہرائے جاتے ہیں۔ ان کی انہی افسانہ طرازیوں کے پیشِ نظر اقبالؒ نے کہا تھا کہ:-

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر ⁂ تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

غنیمت ہے کہ خدا کی کتاب کے الفاظ ان کی دستبرد سے محفوظ ہیں۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذَالِكَ۔

خُلاصہ

جب زندگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی پیکرِ انسانی میں پہنچی، اور مشیت کے پروگرام کے مطابق وہ وقت آیا کہ انسان، اپنے سے پہلی آبادیوں کی جگہ زمین میں آباد ہو (۱۵/۲۶)، تو کائناتی قوتوں کو اس پر تعجب ہوا۔ اس لئے کہ اس سے پہلے کائنات میں کوئی ایسی مخلوق نہیں تھی جسے قوانینِ خداوندی میں مجال سرتابی ہو (۱۶/۴۹-۵۰)۔ لیکن اس جدید مخلوق کو صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا جا رہا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی بھی کر سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے عرض کیا کہ بار الٰہا! یہ کس قسم کی مخلوق ہے جسے اب زمین میں بسایا جا رہا ہے؟ یہ تیرے قانون سے سرکشی برتے گا جس کا نتیجہ ناہمواریاں اور خونریزیاں ہو گا۔ اس کے برخلاف ہم ہیں کہ جو فرائض ہمارے سپرد کئے گئے ہیں ہم ان کی سرانجام دہی میں ہمیشہ سرگرمِ عمل رہتے ہیں (۱۶/۵۰) اور تیرے پروگراموں کو وجہِ حمد و ستائش بنانے کے لئے جہاں تک جانا پڑے جاتے ہیں۔ اس پر خالقِ کائنات نے کہا کہ تم ہمارے اس جدید پروگرام کو تم نہیں سمجھ سکتے۔ ہم یہ سب کچھ جانتے ہیں۔

انسان میں اس امر کی امکانی استعداد رکھ دی گئی تھی کہ یہ ان قوانین کا علم حاصل کر سکے جن کے مطابق مختلف اشیائے کائنات سرگرم عمل ہیں۔ اشیائے کائنات میں سے ہر ایک صرف اپنی خصوصیات سے باخبر ہوتی ہے دیگر خصوصیات کا انہیں کوئی علم نہیں ہوتا۔ لیکن آدم میں جملہ اشیائے کائنات کی خصوصیات کا علم حاصل کرنے کی استعداد رکھ دی گئی جس سے اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان اشیاء میں ربط باہمی کیا ہے۔ اور ان میں اس قسم کے اور روابط پیدا کر کے کیا کچھ ظہور میں لایا جا سکتا ہے۔ اُن کائناتی قوتوں سے کہا گیا کہ اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ یہ جدید مخلوق تمہارے مقابلہ میں فروتر ہے، تو بتاؤ کیا تمہیں بھی یہ استعداد حاصل ہے؟

اس پر انہوں نے عجز سے اپنی گردن جھکا دی اور کہا کہ تیرے پروگرام ہماری حدِ نگاہ سے آگے ہوتے ہیں۔ ہم تو صرف اُتنا ہی جانتے ہیں جتنا ہمیں علم دیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ اکتساباً کچھ معلوم کر لینے کی ہم میں استعداد ہی نہیں۔ تجھے کائنات کا کلی علم ہے اور تو ہی اپنے پروگرام کی غرض و غایت سے باخبر ہے۔

جب اس طرح انسانی ممکنات کی یہ پہلی جھلک ان کے سامنے آگئی تو ان سے کہا گیا کہ ہم کائنات اور اس میں پیدا کی جانے والی مخلوق کے متعلق وہ کچھ جانتے ہیں جو تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ ہوتا ہے۔ دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تم سے سرِدست کیا کچھ ظہور میں آرہا ہے اور تمہاری مضمر صلاحیتیں کیا ہیں (جن کی نمود انسان کے ہاتھوں ہو گی)۔

اس پر کائناتی قوتیں سب انسان کے سامنے جھک گئیں، لیکن ایک چیز ایسی بھی تھی جس نے اس کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اس نے سرکشی اختیار کی۔ یہ تھے انسان کے خود اپنے جذبات جن کے غالب آجانے سے اس کی عقل و فکر ماؤف ہو جاتی ہے اور، اتنی بڑی قوتوں کا مالک، خود اپنے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے، اور اس پر چاروں طرف سے مایوسیاں چھا جاتی ہیں۔

ان صلاحیتوں کے ساتھ انسان کو دنیا میں بسایا گیا۔ اس کی ابتدائی زندگی کا نقشہ یہ تھا کہ اس کی ضروریات بہت محدود تھیں اور سامانِ نشوونما کی بڑی فراوانی تھی (۲۰/۱۱۸) اس نظامِ معیشت کی خصوصیات یہ تھیں کہ:

(۱) اس میں "میری" اور "تیری" کا امتیاز نہیں تھا۔

(۲) "رزق" کھانے پینے کے لئے تھا، ذخیرہ کرنے کے لئے نہیں

(۳) "رزق" ہر جگہ میسر تھا اور پیٹ بھر کر کھانے کے لئے میسر (۲۰/۱۱۸)

اس اندازِ معیشت کا نتیجہ یہ تھا کہ ان میں نہ باہمی تصادم تھا، نہ تزاحم۔ نہ اختلاف تھا، نہ افتراق۔ تمام انسان ایک برادری کی طرح رہتے تھے (۲/۲۱۳ ؛ ۱۰/۱۹)۔ چنانچہ ان سے کہہ دیا گیا کہ اگر تم نے باہمی اختلاف شروع کر دیئے تو یہ جنتی زندگی تم سے

چھن جائے گی اور تم (زندگی کے بلند مقاصد تو ایک طرف) سامانِ زیست کے حصول کے لئے بھی جانکاہ مشقتوں میں مبتلا ہو جاؤ گے (۲۰/۱۱۸) کوئی شے اپنے صحیح مقام پر نہیں رہے گی اور اس طرح تم خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھو گے۔

لیکن انسان پر اس کی انفرادی مفاد پرستیوں کے جذبات غالب آ گئے اور اس نے اپنے خود ساختہ نظام کے مطابق زندگی بسر کرنی شروع کر دی۔ انسانی برادری نسلوں، قبیلوں اور قوموں میں تقسیم ہو گئی۔ جس نے زیادہ قوت فراہم کر لی وہ رزق کے سرچشموں پر قابض ہو گیا۔ اس سے اس کی وہ جنتی زندگی چھن گئی۔ انسان مختلف گروہوں میں بٹ گیا، اور ایک گروہ دوسرے گروہ کا دشمن ہو گیا۔ ان میں مفادِ خویش کی پچریں حائل ہو گئیں۔

لیکن دنیا میں، انسانی زندگی کوئی ایک آدھ دن کی بات نہ تھی کہ یوں بھی گذر ہو جاتا۔ اس نے یہاں ایک مدت تک رہنا اور سامانِ زیست سے ہر ایک نے فائدہ اُٹھانا تھا۔ تو کیا انسان کے لئے اس کی خود پیدا کردہ مصیبت کا کوئی حل نہیں تھا؟ اس کا حل تو تھا لیکن یہ، اس کے عقل کے بس کی بات نہیں تھی۔ عقلِ انسانی، ہر فرد کو اس کے مفاد کے تحفظ کی راہیں تو بتا سکتی ہے، عالمگیر انسانیت کے امن و سلامتی کا طریق نہیں بتا سکتی۔ یہ اس نظریۂ زندگی اور نظامِ حیات کی رُو سے ممکن تھا جو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی مل سکتا تھا، اور جسے اختیار کرنے سے اسے پھر سے وہی جنتی زندگی حاصل ہو سکتی تھی۔

چنانچہ جب وہ جنت کی زندگی اس سے چھن گئی تو اس سے کہہ دیا گیا کہ تمہارے لئے مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں — خواہ تم سب کے سب غلط راستے پر چل نکلو پھر بھی مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ ہماری طرف سے، ہمارے رسولوں کی معرفت (۷/۳۵) تمہاری طرف راہنمائی آتی رہے گی۔ جو لوگ اس راہنمائی کے مطابق زندگی بسر کریں گے وہ ہر قسم کے خوف و ہراس سے محفوظ رہیں گے (۲۰/۱۲۳-۱۲۴)

لیکن جو لوگ اس راہنمائی کے قبول کرنے سے انکار کریں گے اور اس کی صداقتوں کو جھٹلائیں گے، تو، ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق وہ مستقل عذاب کی زندگی جئیں گے —— اس دنیا میں بھی، اور اس کے بعد بھی ——

کائناتی قوتوں کو مسخر کر لینا مقامِ آدم ہے (یعنی کائنات میں انسان کا صحیح مقام) اور ان قوتوں کو وحیِ خداوندی کے مطابق عالمگیر انسانیت کی بہبود کی خاطر استعمال کرنا، مقامِ مؤمن ہے۔ اگر ان قوتوں کو مختلف قومیں اپنی خواہشات اور ذاتی مفاد کے لئے استعمال کریں تو اس کا نتیجہ عالمگیر فساد ہے۔

یہ ہے سرگذشتِ آدم کا تمثیلی بیان اور اس کا ماحصل۔

تیسرا باب

(داستانِ بنی اسرائیل — منزلِ اوّل)

آیات ۴۰/۲ - ۴۶/۲

۱— تاریخ کی اہمیت
۲— تاریخ اور قرآن کریم
۳— مارکس کا نظریۂ تاریخ
۴— قانونِ مکافاتِ عمل
۵— قوموں کے عروج و زوال کے اصول
۶— بنی اسرائیل کی تاریخ
۷— حضرت موسیٰؑ کی داستانِ حیات
۸— بنی اسرائیل پر انعاماتِ خداوندی
۹— تورات کی تاریخ
۱۰— دین کا سب سے بڑا مخالف ۔ مذہب پرست طبقہ
۱۱— حق و باطل کی کشمکش
۱۲— زکوٰۃ کا مفہوم
۱۳— دین اجتماعی نظام کا نام ہے
۱۴— تشکیلِ اُمّت
۱۵— مرکزِ ملّت ۔ قبلہ۔

تیسرا باب

داستانِ بنی اسرائیل ——— منزلِ اوّل

۲/۴۰ یٰبَنِیٓ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ۔ وَاَوۡفُوۡا بِعَہۡدِیۡٓ۔ اُوۡفِ بِعَہۡدِکُمۡ۔ وَاِیَّایَ فَارۡہَبُوۡنِ۔

سابقہ باب کا اختتام اُن دو آیات پر ہوا ہے جن میں نوعِ انسان سے کہا گیا ہے کہ "تمہاری طرف ہدایاتِ خداوندی آتی رہیں گی جو قوم ان کے مطابق زندگی بسر کرے گی اسے نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن، اور جو قوم ان کی خلاف ورزی کرے گی اس کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس جائیں گی، وہ تباہی اور بربادی کے جہنم کی زندگی بسر کرے گی" (۲/۳۸-۳۹)۔ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی تمام بنیادی تعلیم اسی قسم کے دعاوی پر مشتمل ہے۔ یعنی اس میں کہا یہ گیا ہے کہ "اگر یوں کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا، اور یہ بات محض ہنگامی یا وقتی نہیں ہو گی بلکہ ہمیشہ ایسا ہی ہوگا" قرآن کریم میں قانون کا لفظ نہیں آیا لیکن آج کی اصطلاح میں اسی کو قانون کہا جاتا ہے۔ بنابریں قرآن کریم کی بنیادی تعلیم اسی قسم کے غیر متبدل قوانین پر مشتمل ہے۔ اسے قانونِ مکافاتِ عمل بھی کہا جاتا ہے اور مستقل اقدارِ خداوندی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان قوانین کی صداقت پر یقینِ محکم کو ایمان کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ لیکن یہ ایمان علیٰ وجہ البصیرت لایا جاتا ہے یہ اندھی عقیدت کا نام نہیں ہوتا (۱۲/۱۰۸)۔ سوال یہ ہے کہ ان قوانین کی صداقت پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان لایا کس طرح جاتا ہے؟ اسے خود قرآن کریم نے آیت (۱۰/۳۹) میں ان الفاظ میں واضح کر دیا کہ: بَلۡ کَذَّبُوۡا بِمَا لَمۡ یُحِیۡطُوۡا بِعِلۡمِہٖ وَلَمَّا یَاۡتِہِمۡ تَاۡوِیۡلُہٗ۔ کَذٰلِکَ کَذَّبَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الظّٰلِمِیۡنَ (۱۰/۳۹)

قرآن فہمی کے طریق

اس آیۂ جلیلہ میں قرآنی دعاوی کے پرکھنے کے تین طریقے بتائے گئے ہیں۔ پہلا طریق یہ ہے کہ انسان کو اسقدر علم حاصل ہو کہ وہ اس کی روشنی میں ان دعاوی پر غور و فکر کر سکے۔ جب انہیں علم و بصیرت کی روشنی میں، خالی الذہن ہو کر، پرکھا جائے گا تو ان کی صداقت نکھر کر سامنے آجائے گی۔ یہ وہ طریق ہے جس کی رو سے قرآنی قوانین کو ان دانشوروں کے سامنے پیش کئے جانا چاہیے جو کسی حقیقت کو معروضی طریق پر (OBJECTIVELY) سمجھنے اور پرکھنے کے مدعی ہوں، یا اس کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ علامہ اقبالؒ نے جب نطشے کے متعلق کہا تھا کہ:-

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں ٭ تو اقبالؔ اُسکو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

تو اس سے یہی طریقِ افہام و تفہیم مقصود تھا۔

لیکن مذہب پرست طبقہ اس طریق کی طرف بشکل آسکتا ہے۔ وہ اپنے ذہن کو ان معتقدات سے بآسانی پاک اور صاف نہیں کرسکتا جو اس میں روایتاً اور وراثتاً سما چکے ہوں۔ وہ انہیں ابدی حقائق اور غیر متبدل صداقتیں سمجھتا ہے اور ان پر ذراسی تنقیدی نگاہ ڈالنے کو بھی کفر اور الحاد قرار دیتا ہے اس طبقہ کو علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی رو سے قرآنی حقائق سمجھاتے جا ہی نہیں سکتے۔ انہی کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ:

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے ٭ تیرے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہیے

اس کے لئے قرآن کریم میں بیان کردہ دوسرے طریق کو لیجئے۔ قرآن کا پیش کردہ دین محض ایک نظریہ نہیں، وہ ایک عملی نظام ہے۔ یا بالفاظِ دیگر سائنٹیفک طریق کار۔ اس نقطۂ نگاہ سے قرآن کے دعاوی بنیادی فارمولوں کی حیثیت اختیار کرلیں گے جن کی صداقت کے پرکھنے کا طریق یہ ہوگا کہ ان پر عمل کر کے دکھا دیا جائے کہ ان سے وہی نتائج مرتب ہوتے ہیں یا نہیں، جن کا اس نے دعویٰ کیا ہے۔ اسے اصطلاح میں استنتاجی طریق کار کہتے ہیں۔ یہ ہے وہ طریق، جس کے متعلق نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے اعلان کرایا گیا کہ: قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ۔ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶/۱۳۶)۔ "اے رسولؐ! اپنی قوم سے کہدو کہ جو دعاوی میں پیش کرتا ہوں ان کے متعلق نظری بحث و جدل کی ضرورت نہیں۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ جو پروگرام میں پیش کرتا ہوں اس کا عملی نتیجہ زندگی کی خوشگواریاں ہوں گی۔ تم کہتے ہو کہ نہیں یہ دعویٰ غلط ہے۔ جو پروگرام ہم پیش کرتے ہیں اس کا نتیجہ فلاح و بہبود ہوگا۔ اس بحث کو فیصلہ تک پہنچانے کا طریق یہ ہے کہ تم اپنے پروگرام پر عمل کرتے رہو، میں اس میں دخل نہیں دوں گا۔ اور مجھے اپنے پروگرام پر عمل کرنے دو، اور اس میں تم مداخلت نہ کرو۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ کون سچا اور کون جھوٹا ہے"۔

اس کے بعد کہا کہ اگر تم اس کے لئے بھی تیار نہیں ہوتے تو پھر تیسرا طریق کار یہ ہے کہ تم اقوام گزشتہ کے احوال و کوائف پر نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ جس قوم نے اس پروگرام کی مخالفت کی، جو میں پیش کر رہا ہوں (کیونکہ ان کی طرف مبعوث انبیائے کرام نے بھی ایسا ہی پروگرام پیش کیا تھا) اس کا انجام کیا ہوا۔ اس کے لئے تمہیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ اقوام تمہارے گردوپیش کے علاقوں میں آباد تھیں۔ تمہیں ان کی سرگزشتوں کا بھی علم ہے اور ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات اُن شاہراہوں پر اب تک موجود ہیں جن پر تم صبح شام سفر کرتے رہتے ہو۔ ان اقوام کا مآل، خود میرے دعاوی

کی صداقت کا ثبوت بن جائے گا۔

قرآنی قوانین کی صداقت کے پرکھنے کے یہ تین طریق خود قرآن مجید نے بتاتے ہیں۔ ان میں سے تیسرے طریق کار کو تاریخی شواہد کہا جاتا ہے اور اس سے تاریخ کی اہمیت ہماری سمجھ میں آجاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حیوان اور انسان میں ایک

تاریخ کی اہمیت

اہم امتیازی نشان تاریخ بھی ہے۔ حیوانات کی حالت یہ ہے کہ وہ ہزارہا سال گزرنے کے بعد بھی اسی مقام پر ہوتے ہیں جہاں ان کی نوع کا پہلا حیوان تھا (مثلاً جو بکری آج ہمارے سامنے آتی ہے وہ انہیں خاصیتوں اور صلاحیتوں کی حامل ہوتی ہے جو دس ہزار سال پہلے کی بکری میں پائی جاتی تھیں)۔ لیکن، اس کے برعکس، آج کا انسان خاصیتوں اور صلاحیتوں، نیز احوال وظروف کے اعتبار سے دس ہزار سال پہلے کے انسان سے یکسر مختلف ہے۔ وہ انسان کپڑے پہننا اور گھر بنانا تک بھی نہیں جانتا تھا۔ آج کا انسان چاند کی سیر بھی کر آیا ہے۔ انسان کی اس ترقی کا راز اس میں ہے کہ ایک نسل یا ایک زمانہ کا انسان اپنے تجربات و مشاہدات کو اگلی نسل تک منتقل کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس علمی، تجرباتی، مشاہداتی نتائج کے منتقل کرنے کی روئیداد کو تاریخ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی کا صدقہ ہے کہ ہر نسل کے انسان کو اپنی زندگی اور اس کی جدوجہد کا آغاز، ابجد سے نہیں کرنا پڑتا۔ قرنہا قرن کی انسانی جدوجہد کا ماحصل، ہزارہا سال کی مسلسل تگ و تاز کا نچوڑ، اقوام و ملل کی سینکڑوں پشتوں اور نسلوں کا اندوختہ، ہر نئی نسل کو وراثتاً مل جاتا ہے اور وہ اپنی جدوجہد کا آغاز وہاں سے کرتی ہے جہاں اُسے سابقہ نسل نے چھوڑا تھا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ انسان اپنے تاریخی سرمایہ سے جو اس قدر فیضیاب ہوتا ہے تو اس کا راز کیا ہے؟ اس کا راز یہ ہے کہ کائنات میں خدا کے غیر متبدل قوانین کارفرما ہیں۔ اس لئے جس بات کا جو نتیجہ آج سے ہزارہا سال پہلے برآمد ہوا تھا وہی بات اگر آج دہرائی جائے گی تو اس کا وہی نتیجہ مرتب ہوگا۔ انسان کی طبیعی زندگی میں یہ حقیقت ایک ایسا مسلمہ ہے جس کے ثبوت کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ سنکھیا جسطرح آج سے دس ہزار سال پہلے مہلک تھا اسی طرح آج بھی قاطعِ حیات ہے۔ سیلاب جو تباہیاں حضرتِ نوح علیہ السلام کے زمانے میں لایا کرتا تھا وہی تباہیاں ہماری آنکھوں کے سامنے راوی، چناب اور سندھ کی طغیانیوں سے برپا ہو جاتی ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم اس سے ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ جس طرح تمہاری طبیعی زندگی میں خدا کے اٹل قوانینِ فطرت کارفرما ہیں، اسی طرح تمہاری اجتماعی زندگی بھی اس کے متعین کردہ قوانین کے تابع رہتی ہے۔ جن قوانین کے اتباع سے آج سے پانچ ہزار سال پہلے کی قوموں نے سربلندی و سرفرازی حاصل کی تھی ان کے اتباع سے آج بھی وہی نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس، جن قوانین کی خلاف ورزی سے اس زمانہ کی قومیں تباہ ہوئی تھیں ان سے روگردانی کا نتیجہ آج بھی تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

یہ کلیہ، کہ جو عمل ایک دفعہ ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے اس سے ہر بار ویسا ہی نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ سائنس یا فلسفہ کہلاتا ہے۔ ہم آج (SCIENCE OF HISTORY) یا (PHILOSOPHY OF HISTORY) کے الفاظ عام طور پر سنتے ہیں اور ہمیں بتایا یہ جاتا ہے کہ یہ علوم عصرِ حاضر کے سائنسدانوں یا فلاسفروں کی تحقیق و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ ہیگل کی (PHILOSOPHY OF HISTORY) اس باب میں مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ لیکن کم لوگوں کو معلوم ہے کہ تاریخ کو بطورِ ایک سائنس یا فلسفہ کے، پہلی بار، قرآن کریم نے پیش کیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن، تاریخ کے مطالعہ پر اسقدر زور دیتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ: وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ (۲۴/۳۴)۔ "ہم نے تمہاری طرف اپنے واضح قوانین نازل کئے، جن کے تابع تمہاری حیاتِ اجتماعیہ کارفرما رہتی ہے" اور ان قوانین کے ساتھ، وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ (۲۴/۳۴)۔ "اقوامِ سابقہ کے حالات اور کوائف بھی نازل کئے، جن میں، ان لوگوں کے لئے، جو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے بچنا چاہتے ہیں، سامانِ عبرت و موعظت ہے"۔ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ (۲۴/۳۴)۔

اسی حقیقت کو قرآن کریم نے دوسرے مقام پر ایک اور انداز میں بیان کیا ہے۔ آپ نے یہ الفاظ تو اکثر سنے ہوں گے کہ "تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے" (HISTORY REPEATS ITSELF)۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ تاریخی واقعات اسی شکل و صورت میں بار بار رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ بار بار اس حقیقت کا ثبوت بہم پہنچاتی رہتی ہے کہ فلاں اندازِ زندگی کا نتیجہ فلاں قسم کا ہوگا اور فلاں روش کے نتائج فلاں نوعیت کے۔ قرآن کریم نے سورۃ الحجر میں اقوامِ سابقہ کی سرگزشتیں پیش کرنے کے بعد کہا کہ: وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (۱۵/۸۷)۔ "اے رسولؐ! ہم نے تجھے زندگی کے وہ بنیادی اصول دیئے جن کے مطابق اعمالِ حیات اپنا نتیجہ مرتب کرتے ہیں اور دوسرے وہ متعدد تاریخی واقعات، جو اس امر شہادت پیش کرتے ہیں کہ ان قوانین کی رو سے فی الواقعہ اسی قسم کے نتائج مرتب ہوں گے"۔ قرآن کریم میں اقوامِ سابقہ کے احوال و کوائف اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج اس کثرت سے بیان ہوتے ہیں کہ ان کی تفصیل پیش کرنے کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہوگی[۱]۔ عدمِ گنجائش کی بنا پر، ہم اس مقام پر ان میں سے چند ایک واقعات اور ان کے نتائج پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں لیکن، قبل اس کے کہ ہم اس وضاحت کی طرف آئیں، ضمناً

مارکس کا نظریۂ تاریخ

ایک اور نکتہ کا پیش کرنا بھی ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ ہمارے دور میں ایک اور گوشہ کی طرف سے بھی تاریخ کی اہمیت کی آواز بلند کی گئی۔ اور وہ ہے مارکسزم کا گوشہ۔ مارکس نے تاریخ کا

---

[۱] اقوامِ سابقہ کے ان کوائف و احوال کے لئے میری تصانیف۔ جوئے نور۔ برقِ طور۔ شعلۂ مستور ملاحظہ فرمایئے۔

ایک خاص نظریہ پیش کیا ہے۔ اس نظریہ کا بانی تو جرمن فلاسفر ہیگل ہے لیکن اس وقت، چونکہ دنیا میں عام چرچا مارکسی نظریہ کا ہے، اس لئے ہم اسی کے تعارف تک اپنے آپ کو محدود رکھتے ہیں۔ اس نظریہ کا ملخص یہ ہے کہ ایک معاشی نظام پیدا ہوتا ہے، پروان چڑھتا ہے، پھلتا پھولتا ہے لیکن جب وہ اپنے عہدِ شباب کو پہنچتا ہے تو اس میں سے ایک اور نظام نمودار ہو جاتا ہے جو اس سے پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے، اور وہ اس پہلے نظام کی جگہ لے لیتا ہے۔ پھر اس نظام کی جگہ ایک اور نظام لے لیتا ہے جو اس کے ماسبق نظام کی ضد ہوتا ہے۔ یہ سلسلۂ تغیرات واضداد ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری وساری رہے گا۔ کائنات میں نہ کوئی نظریہ، تصور یا عقیدہ غیر متبدل ہے، نہ ان پر متفرع کوئی نظام تغیر نا آشنا۔ یہاں ہر شئے تغیر پذیر ہے۔ اس نظریہ کو جدلیت یا (DIALECTICISM) کہا جاتا ہے۔ جب مارکس سے پوچھا گیا کہ وہ کونسی قوت ہے جو سلسلۂ تغیرات واضداد کو اس نظم و ضبط کے ساتھ روبہ عمل لاتی چلی جاتی ہے تو اس نے کہا ایسا "تاریخی وجوب" (HISTORICAL NECESSITY) کی رُو سے ہوتا ہے۔ "تاریخی وجوب" ایک ایسی اصطلاح ہے جو استعمال تو اس کثرت اور شد و مد سے کی جاتی ہے لیکن جس کا متعین مفہوم آج تک نہیں بتایا جا سکا۔ (NECESSITY) یا وجوب کے معنی ہوتے ہیں ایسی بات جو بہر حال ہو کر رہے۔ اِسے (HISTORICAL DETERMINISM) بھی کہتے ہیں۔ یعنی تاریخی جبریت۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں، ایسا بہر حال ہو کر رہتا ہے۔ کوئی قوت اسے روک نہیں سکتی۔ انسان اس کے خلاف کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ یعنی اس نظریہ کی رُو سے، انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہونے کی بجائے مجبورِ محض بن کر رہ جاتا ہے۔ اِسے تاریخ کی مادی تعبیر بھی کہا جاتا ہے۔ اس تصور کی رُو سے کہا یہ جاتا ہے کہ انسانی تاریخ میں جس قدر ٹکراؤ سامنے آتے ہیں، ان کا جذبۂ محرکہ محض معاشی تھا۔ انسان کے سامنے مسئلہ سارا روٹی کا ہے، اس کے سوا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ حق و باطل، خیر و شر، ہدایت و ضلالت، نیکی اور بدی وغیرہ کے تصورات یا امتیازات، سب واہمہ ہیں۔ بالفاظِ دیگر، اس نظریہ کی رُو سے انسان اور حیوان میں کوئی فرق ہی نہیں رہتا۔ دونوں کا مسئلہ روٹی کا ہے، اور اس کا حل ہو جانا مقصودِ حیات۔

اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی ہو گی کہ مارکسی نظریۂ تاریخ، نہ صرف قرآنی نظریہ کی ضد ہے بلکہ یکسر غیر سائنسی (UN-SCIENTIFIC) بھی ہے۔ قرآنی نظریہ کی رُو سے، انسان کے ہر عمل کا ایک مخصوص نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مارکسی نظریہ کی رُو سے تاریخِ انسانیت میں، انسان کے اختیار و عمل کا کوئی دخل نہیں۔ تاریخی وجوب کی اندھی قوت ایک نظام متشکل کرتی ہے اور کچھ عرصہ کے بعد، اس نظام کی عمارت کو خود ہی مسمار کر کے اس کی جگہ اس کے خلاف دوسرا نظام متشکل کر دیتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو تاریخِ انسانیت، انسانی اعمال و کردار کے نتائج کی تاریخ نہیں، تاریخی وجوب کی اندھی قوت کی کارفرمائی کی داستان ہے۔ اس نظریہ کی کمزوری بدیہی ہے۔

اس ضمنی گوشہ کے بعد پھر آجائیے پیشِ نظر موضوع کی طرف، جس میں کہا یہ جارہا تھا کہ قرآنِ کریم نے اقوامِ سابقہ کی سرگزشت کو بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے اور مقصد اس سے یہ بتانا ہے کہ قوموں کا انجام اس روش کے مطابق ہوتا ہے جسے وہ اپنی اجتماعی زندگی کے لئے اختیار کرتی ہیں۔ قانونِ خداوندی کی اس کارفرمائی کو وہ "سنت اللہ" سے تعبیر کرتا ہے۔ مثلاً وہ سورۃ المؤمن میں آغازِ کلام اس طرح کرتا ہے: اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ کَانُوْٓا اَکْثَرَ مِنْهُمْ وَ اَشَدَّ قُوَّۃً وَّ اٰثَارًا فِی الْاَرْضِ۔ فَمَآ اَغْنٰی عَنْهُمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (۴۰/۸۲)۔ "اے رسولؐ! کیا یہ لوگ، جو قرآنی قوانین کی صداقت کے خلاف اس قدر سرکشی برت رہے ہیں، زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان لوگوں کا انجام دیکھ لیتے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ وہ لوگ تعداد میں بھی ان سے زیادہ تھے اور قوت اور ملکی استحکام میں بھی ان سے بڑھ چڑھ کر۔ لیکن جب اُن کی غلط روش کے نتائج ان کے سامنے آئے تو ان کی یہ قوتیں ان کے کسی کام نہ آسکیں"۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ: فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ۔ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا کَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ (۴۰/۸۳)۔ "جب ان کے رسول، ان کے پاس واضح قوانینِ خداوندی لیکر آئے تو بجائے اس کے کہ یہ اُن پر غور و فکر کرتے، وہ اسی میں مگن ہو کر بیٹھے رہے جو آباؤ اجداد سے ان کے ہاں وراثتاً چلا آرہا تھا۔ انہوں نے ان رسولوں کا مذاق اڑایا لیکن اس استہزاء نے خود انہی کو چاروں سے گھیر لیا۔ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَکَفَرْنَا بِمَا کُنَّا بِهٖ مُشْرِکِیْنَ (۴۰/۸۴)۔ "جب ان کی تباہی محسوس شکل میں ان کے سامنے آگئی تو چلانے لگے کہ ہم خدائے یکتا و یگانہ پر ایمان لاتے ہیں اور ان جھوٹے خداؤں کا انکار کرتے ہیں جنہیں ہم خدائی اقتدار میں شریک تصور کیا کرتے تھے"۔ لیکن ان کا یہ ایمان و اقرار مہلت کا وقفہ گزر جانے کے بعد تھا، اس لئے یہ انہیں تباہی سے بچا نہ سکا۔ فَلَمْ یَکُ یَنْفَعُهُمْ اِیْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا۔ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ فِیْ عِبَادِهٖ۔ وَخَسِرَ هُنَالِکَ الْکٰفِرُوْنَ (۴۰/۸۵)۔ "جب تباہی ان کے سر پر آن کھڑی ہوئی تو ان کا یہ ایمان انہیں کچھ فائدہ نہ دے سکا۔ یہ کوئی ہنگامی حادثہ نہیں تھا۔ یہ سنت اللہ ہے یعنی خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل جو اسی انداز سے کار فرما چلا آرہا ہے اور جس سے انکار کرنے والے آخر الامر تباہی کا شکار ہو کر رہتے ہیں"۔

سنت اللہ

یہ سنت اللہ کسی ایک جماعت، ایک زمانہ یا ایک مقام تک محدود نہ تھی۔ یہ عالمگیر قانونِ خداوندی ہے۔ اس لئے جہاں کہیں بھی انسان تھا، خدا کا یہ قانون کارفرما رہا ــــ اممِ گزشتہ میں بھی اور آج بھی ــــ سُنَّۃَ اللّٰهِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا (۳۳/۶۲)۔ "خدا کا یہ مقررہ قانون ان لوگوں

میں بھی کار فرما رہا جو پہلے گذر چکے ہیں اور آئندہ بھی تم اس قانونِ خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ (اس غیر متبدل، سنّت اللہ کی مزید وضاحت کے لئے دیکھئے آیات ۸/۳۸ ؛ ۱۷/۷۷ ؛ ۱۸/۵۵ ؛ ۳۵/۴۳ ؛ ۴۸/۲۳)۔

اقوامِ سابقہ کی سرگزشتوں کا علم حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تو وہ ہے جسے تاریخی نوشتے ——— یعنی تاریخ کے تحریری ریکارڈز ——— کہا جاتا ہے، لیکن عصرِ حاضر میں تاریخی حقائق کی نقاب کشائی کا ایک اور طریق بھی عمل میں لایا جا رہا ہے۔ جسے اثری انکشافات (ARCHAEOLOGICAL DISCOVERIES) کہا جاتا ہے۔ دنیا نے یہی سمجھا ہے کہ یہ عظیم المنزلت علمی کارنامہ بھی عصرِ حاضر ہی کی ایجاد ہے لیکن جس کی نگاہیں قرآنِ مجید پر ہیں وہ جانتا ہے کہ اس کی اولیت کا سہرا بھی اسی سرچشمۂ علمِ خداوندی کے سر ہے۔ قرآن کے اوراق کو الٹیئے اور دیکھیئے کہ اس نے کس کس انداز سے کہا ہے کہ ان مخالفین سے کہو کہ تم مختلف

اثری انکشافات

ممالک میں چلو پھرو اور جن اقوامِ گذشتہ کے افسانے تمہارے کانوں تک پہنچے ہیں ان کی اجڑی ہوئی بستیوں میں جاؤ اور ان کے کھنڈرات پر غور کرو اور دیکھو کہ ان کی ٹھیکریوں پر عبرت اور موعظت کی کتنی اثر انگیز اور دلدوز داستانیں منقوش ہیں۔ ان نقوش کو دیکھو اور ان کے آئینہ میں ان اقوام کے حالات اور ان کے انجام کا مطالعہ کرو۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ. فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ. هَٰذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ (۳/۱۳۶-۱۳۷) "تم سے پہلے بھی دنیا میں قومیں گزر چکی ہیں۔ تم ان کی بستیوں میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جو لوگ قوانینِ خداوندی کی تکذیب کرتے تھے ان کا انجام کیا ہوا اور پاداشِ عمل کے کیسے نتائج پیش آئے۔ اس میں عالم لوگوں کے لئے بھی تبیانِ حقیقت کا سامان موجود ہے اور وہ لوگ جو زندگی کے خطرات سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں ان کے لئے بھی ہدایت اور موعظت کا سامان۔" اور اس کے ایک ہی آیت بعد فرمایا کہ: وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (۳/۱۳۹)۔ "یہ تاریخ کی گردش دولابی ہے۔ تم اس پر غور کرو اور دیکھو کہ اقوام و ملل کے عروج و زوال کا یہ قانون کس قدر عالمگیر اور اٹل ہے۔" "سنّت اللہ" کی طرح "سِيرُوا فِي الْأَرْضِ" کی آیات بھی قرآنِ کریم میں بکثرت آئی ہیں جو متعلقہ مقامات پر سامنے آتی جائیں گی۔ سرِدست ان کے حوالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ (دیکھئے ۱۲/۱۰۹ ؛ ۱۶/۳۶ ؛ ۲۲/۴۵ ؛ ۲۷/۵۲ ؛ ۳۷/۱۳۷-۱۳۸ وغیرہ) اس "سِيرُوا فِي الْأَرْضِ" سے مقصد کیا ہے اسے سورۃ الحج کی اس آیت میں بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے جہاں کہا ہے کہ: أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا. فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (۲۲/۴۶)۔ "کیا یہ لوگ ملکوں میں چلے پھرے نہیں کہ عبرت حاصل کرتے۔ لیکن محض چلنے پھرنے سے کیا ہوتا ہے۔ اگر ان کے سینے میں دلِ زندہ ہوتا تو یہ اس سے سمجھنے سوچنے کا کام لیتے۔ اگر ان کے گوشِ نصیحت نیوش ہوتے تو یہ ان سے سن بھی سکتے۔

مشکل یہ ہے کہ جب کوئی شخص عقل کا اندھا بن جائے تو اس کی وہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں جو ماتھے میں گڑی ہوتی ہیں، ایسے لوگوں کے دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں مستور ہیں۔"

قرآن کریم نے اتنا ہی نہیں کیا کہ تاریخ کی اہمیت پر زور دیا اور لوگوں کو اقوامِ گذشتہ کی سرگزشتوں کے مطالعہ کی تاکید کی۔ اس نے ان اصول و قوانین کی بھی وضاحت کر دی جن کے مطابق قوموں کو سرفرازیاں اور خوشگواریاں حاصل ہوتی ہیں اور جن کی خلاف ورزی سے وہ تباہ اور برباد ہو جاتی ہیں۔ ان کا تفصیلی ذکر تو اپنے اپنے مقام پر آئے گا۔ یہاں ہم چند ایک کا ذکر مثال کے طور پر کرتے ہیں۔ پہلی بات تو اس نے یہ کہی کہ

قوموں کے عروج وزوال کے اصول

قوموں کی موت و حیات (یعنی عروج وزوال) کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہوتا جو بغیر کسی سبب اور علت کے وجود میں آجائے۔ اس نے کہا کہ یاد رکھو! لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۸/۴۲)۔ "اس کارگہ سعی وعمل میں جو زندہ رہتا ہے دلیل و برہان کی رو سے زندہ رہتا ہے اور جو ہلاک ہوتا ہے وہ بھی قاعدہ اور قانون کے مطابق ہلاک ہوتا ہے۔ یہ اس خدا کا متعین فرمودہ قانون ہے جو سب کچھ جانتا اور سنتا ہے۔" اس قانون کا اصل الاصول یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱)۔ "کسی قوم کی جو حالت بھی ہو، خدا اس میں کبھی تبدیلی نہیں کرتا تاوقتیکہ وہ قوم، خود اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا کرلے۔" یہاں اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا کہ قوموں کا عمل اور کردار ان کی ذہنیت (نفسیات) کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں "ایمان" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس اصولی نکتہ کے بعد اس نے پھر وہ جرائم بتائے جن کے نتیجہ میں قومیں تباہ ہوتی ہیں۔ کہیں کہا کہ: وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ (۱۱/۱۱۷)۔ "یاد رکھو! ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ تمہارا نشوونما دینے والا کسی قوم کو یونہی ناحق ہلاک کر دے درآنحالیکہ اس قوم میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہو۔" دوسری جگہ فرمایا: فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ (۴۶/۳۵)۔ "وہی قوم ہلاک ہوتی ہے جو حق وصداقت کے راستے چھوڑ کر غلط راہیں اختیار کرلیتی ہے۔" کہیں کہا کہ یہ یاد رکھو! تباہیاں اور بربادیاں یونہی تقدیر کی رُو سے نہیں آجاتیں۔ یہ انسانوں کی خود اپنی لائی ہوئی ہوتی ہیں۔ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۹/۷۰)۔ "خدا کسی قوم پر ظلم وزیادتی نہیں کرتا۔ لوگ اپنے اوپر خود ہی زیادتی کرتے ہیں۔" سورۃ الشوریٰ میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کر دیا: وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (۴۲/۳۰)۔ "جو مصیبت بھی تمہیں پہنچتی ہے وہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہے۔"

قوموں کی ہلاکت کا مفہوم

اس موضوع کو ختم کرنے سے پہلے ایک اور نکتہ کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ قرآن کریم

میں قوموں کی تباہی اور بربادی کے لئے "ہلاکت"، اور ان کی سرفرازی و کامرانی کے لئے "حیات" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں. ہلاکت کے یہ معنی نہیں کہ وہ قوم طبیعی طور پر (PHYSICALLY) اس دنیا سے مٹ جاتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قوم پوری کی پوری صفحۂ ارض سے مٹ جائے اور اس کی صرف داستانیں باقی رہ جائیں۔ لیکن ہلاکت کے معنی اس سے وسیع ہیں۔ قرآنِ کریم کی رو سے قوموں کی ہلاکت کے یہ معنی بھی ہیں کہ وہ حکومت و سطوت، عزت و اقبال کی بلندیوں سے گر کر نکبت و زوال کے جہنم میں جا گریں۔ ایسی قوم کے افراد زندہ رہتے ہیں، سانس لیتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں لیکن ان کی حیاتِ اجتماعیہ (ملّی زندگی) مٹ چکی ہوتی ہے، خواہ تعداد کے لحاظ سے وہ کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ ہے قوموں کی ہلاکت۔ بعض قومیں اس طرح تباہ ہوتی ہیں کہ ان میں حیاتِ نو کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ لیکن جن قوموں میں اس کی صلاحیت موجود ہو، باز آفرینی کے مواقع اُن کے سامنے آتے ہیں اگر وہ ان سے فائدہ اٹھائے تو اپنی کھوئی ہوئی عظمتوں کو دوبارہ حاصل کر سکتی ہے۔ اور یہی ہے وہ مقصد، جس کے لئے قرآنِ کریم داستانِ بنی اسرائیل کو سامنے لایا ہے، جس کا آغاز آیتِ زیرِ نظر، یعنی (۲/۴۰) سے ہوتا ہے۔

داستانِ بنی اسرائیل

سوال یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اس اہم حقیقت کی وضاحت کے لئے آغازِ کلام داستانِ بنی اسرائیل ہی سے کیوں کیا ہے؟ حالانکہ ان سے بھی پہلے کی متعدد اقوام کا ذکر قرآنِ کریم کے مختلف مقامات پر موجود ہے۔ اس کی دو بیّن وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآنِ کریم کی اولین مخاطب قوم (عربوں) کے ہاں قدیم اقوام کی یا تو زبانی داستانیں مشہور تھیں اور یا ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات۔ اُن اقوام کے زندہ افراد ان کے سامنے نہیں تھے۔ اس کے برعکس یہودی ان کے گرد و پیش بڑی تعداد میں آباد تھے اور ان کی اس وقت کی زندگی بھی، قرآنِ کریم کے دعاوی کی متحرک شہادت کی طرح اُن کی نگاہوں کے سامنے تھی — دوسرے یہ کہ قدیم اقوام کے متعلق قرآنِ کریم نے یہی بتایا ہے کہ جب ان کے جرائم حد سے بڑھ گئے تو ایک رسول ان کی طرف آیا جس نے انہیں، ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا اور صحیح روش اختیار کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے اس سے سرکشی برتی اور تباہ ہو گئیں۔ اس کے برعکس بنی اسرائیل وہ قوم ہے جو مصر میں فراعنہ کی غلامی میں جکڑی ہوئی تھی۔ وہاں سے انہیں آزادی ملی، فلسطین میں با اختیار زندگی بسر کرنے لگے اور آہستہ آہستہ عروج و اقبال کی ان بلندیوں تک پہنچے جو سطوتِ داؤدی اور شوکتِ سلیمانی کے پیکروں میں تاریخ کے اوراق پر جلوہ ریز دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے بعد وہ پھر قعرِ مذلّت میں گر گئے اور گرتے ہی چلے گئے۔ بالفاظِ دیگر، یہ وہ قوم ہے جس کی تاریخ اس امر کی شہادت بہم پہنچاتی ہے کہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے کس قسم

کی سرفرازیاں حاصل ہوتی ہیں اور ان کے خلاف ورزی سے قوم پر کس قسم کی تباہیاں آتی ہیں۔ یہ وجہ ہے جو قرآنِ کریم نے تاریخی شواہد کا آغاز بھی داستانِ بنی اسرائیل سے کیا ہے اور اس کے بعد اس کے اہم ٹکڑے بھی مختلف مقامات پر سامنے لایا ہے۔ ان کی داستانِ زندگی کے یہ گوشے تو اپنے اپنے مقام پر سامنے آتے رہیں گے لیکن ان کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس قوم کا اجمالی سا تعارف بھی کرا دیا جائے۔

تعارف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا ذکر قرآن کریم میں آتا ہے ــــ حضرت اسحٰق علیہ السلام، جن کے حصہ میں سرزمینِ فلسطین کی سرداریاں آئیں۔ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جنہیں دنیا میں "خدا کے اولین گھر" کی تولیت نصیب ہوئی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت اسحٰق علیہ السلام کے بیٹے تھے اور اُن کا لقب اسرائیل تھا۔ اسی نسبت سے اُن کی ذرّیت، دنیا میں، بنی اسرائیل کے نام سے متعارف ہوئی۔ حضرت یعقوبؑ کے چوتھے بیٹے کا نام یہودہ (JUDA) تھا۔ ان کی نسل کا قبیلہ جس علاقہ پر حکمران تھا اُسے بھی (JUDA) کہا جاتا تھا۔ اسی نسبت سے انہیں (اور ان کے ساتھ حضرت یعقوبؑ کے ایک اور بیٹے بن یامین کی نسل کو) یہودی کہتے تھے اور باقی قبائل کو بنی اسرائیل۔ لیکن بعد میں یہ تفریق باقی نہ رہی اور بنی اسرائیل اور یہودی سے عام طور پر ایک ہی مفہوم لیا جانے لگا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا وطن کنعان (فلسطین) تھا۔ ہم آگے چل کر (سورۃ یوسف میں) دیکھیں گے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے حضرتِ یوسف علیہ السلام کس طرح غلامی کی حالت میں مصر پہنچے اور پھر اپنے حسنِ سیرت اور بلند صلاحیتوں کی بنا پر وہاں تمکن حاصل کیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے والد بزرگوار اور قبیلہ کو مصر بلا لیا۔ چار سو برس تک یہ مصر میں رہے۔ یہیں بڑھے، پھولے پھلے اور جو قبیلہ پہلے چند نفوس پر مشتمل تھا، اس عرصہ میں ایک کثیر التعداد قوم بن گیا۔ یہ ہے وہ زمانہ، جس سے قرآن کریم میں بیان کردہ داستانِ بنی اسرائیل کی ابتداء ہوتی ہے۔ تاریخی قیاسات بتاتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا زمانہ قریب (۲۱۰۰ سنہ ق۔م) تھا۔ اس اعتبار سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ قریب (۱۷۰۰-۱۶۰۰ سنہ ق۔م) ہونا چاہیئے۔

فرعونِ مصر اس داستان میں فرعون کا لفظ بھی بار بار آتا ہے۔ یہ کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں بلکہ شاہانِ مصر کا لقب تھا۔ مصر کے لوگ دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ آمن راع (سورج کا دیوتا) ان سب میں بڑا تھا۔ مصر کے بادشاہ، دیوتاؤں کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا لقب فاراع (یعنی سورج دیوتا کا اوتار) قرار پا گیا۔ قریب تین ہزار سال قبل مسیح سے لے کر سکندر کے زمانے تک فراعنہ کے قریب تیس خاندان مصر پر حکمران رہے۔ ان کا آخری خاندان اہلِ فارس کا تھا جسے سکندر نے ۳۳۲ سنہ ق۔م میں شکست

دی تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں (عام قیاس کے مطابق) ہیکسوس (HYKSOS) کا خاندان برسرِ حکومت تھا، جنہیں عمالقہ کہتے تھے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں یہی خاندان مصر پر حکمران تھا اور یہ کہ ان کے (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے) ابتدائی زمانہ کے فرعون کا نام ریمیسیس ثانی (RAMESES-II) تھا، اور خروج کے وقت کا بادشاہ، اس کا بیٹا منفتاح (MERNE-PTAH)، اگرچہ بعض شواہد اس کی تردید کرتے ہیں۔ بہرحال یہ سب قیاسات ہیں جن سے قرآن کریم بحث نہیں کرتا۔ اس لئے کہ اس کا کام۔۔۔۔۔ اُن حقائق اور نتائج کو پیش کرنا ہے، جو ان داستانوں میں مضمر ہیں۔ اس کا منصب وقائع نگاری نہیں۔

ہم کہہ رہے تھے کہ اس چار سو سال کے عرصہ میں، بنی اسرائیل مصر میں ایک مستقل قوم کی حیثیت اختیار کر گئے تھے اور اہلِ مصر سے الگ تھلگ نظر آتے تھے۔ جب یہ (حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں) مصر میں آئے تھے تو یہ بڑی عزت و تکریم کے مالک تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ وہاں کے بادشاہوں نے انہیں اپنی محکومی اور غلامی کے شکنجہ میں جکڑ لیا۔ ان کی اسی کربِ الم کی شدت اور ذلت و پستی کی انتہا کا زمانہ تھا جب ان میں صاحبِ ضربِ کلیم، حضرت موسیٰ علیہ السلام، مبعوث ہوئے۔ میں نے اپنی کتاب ——— برقِ طور ——— میں ان کی اس زمانہ کی زندگی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

فسادِ آدمیت کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ تین گوشے نمایاں طور پر اُبھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ اِستبدادِ حکومت کی سرکش طغیانیاں۔ برہمنیت کی خواب آور فریب کاریاں اور سرمایہ داری کی پُر سکوت خون آشامیاں۔ ان میں سے ہر فتنہ بجائے خویش گلا گھونٹنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن ذرا سوچئے کہ جس دور میں بیک وقت سطحِ ارض پر سبعیت اور بربریت کے ایسے ہولناک عفریت، فضا میں تباہی و بربادی کے ایسے ہلاکت انگیز جراثیم اور دریا کی پرسکون روانیوں کے نیچے ایسے خونناک نہنگ و اژدر موجود ہوں، وہاں مخلوقِ خدا پر کیا گزر رہی ہوگی؟ تاریخِ مصر کا یہی دور تھا جس کا تذکرہ قرآن کریم میں اس شرح و بسط سے آیا ہے۔ فرعون، استبدادِ ملوکیت کا مجسمہ۔ ہامان، برہمنیت کی ابلیسانہ روباہ بازیوں کا پیکر۔ اور قارون سرمایہ داری کی لعنت کا بہت بڑا نمائندہ۔ تینوں یک جا، اور ان کے آہنی پنجے میں (بنی اسرائیل کی شکل میں) تڑپتی پھڑکتی، بلبلاتی انسانیت!

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں اس محکومیت کی زندگی سے نجات دلا کر، سینا کی وادیوں میں آزادی سے ہمکنار کرایا۔ وہاں یہ بڑھے، پھولے، پھلے۔ ایک عظیم مملکت کے مالک ہوئے جو حضرتِ داؤد علیہ السلام اور حضرتِ سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں انتہائی عروج پر پہنچ گئی۔ اس کے بعد یہ قوم باہمی تشتت و افتراق کے عذاب میں گرفتار ہوئی۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ان کے دو اسباط (یہودہ اور بن یامین) پر مشتمل ایک سلطنت تھی جس کا مرکز یروشلم تھا۔

اور ان کے باقی دس اسباط (بنی اسرائیل) پر مشتمل دوسری سلطنت، جس کا دارالحکومت سماریہ تھا۔ آٹھویں صدی قبل مسیح میں اہل سیریا نے سماریہ کی سلطنت کو تباہ کر دیا اور بنی اسرائیل کو گرفتار کرکے نینوا لے گئے۔ قومیں اپنی مرکزیت کو کھو کر، کس طرح ریت کے ذروں کی طرح اڑتی پھرتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ ان کا نام ونشان تک صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے، اس کی عبرت انگیز شہادت ان دس اسباط پر مشتمل قومِ بنی اسرائیل کا انجام ہے۔ آج محققین کی بڑی سے بڑی غور دبین بھی یہ نہیں بتا سکتی کہ یہ دس اسباط، بالآخر کہاں گم ہوگئے۔ اِدھر اُدھر سے قیاسی سراغ لگائے جاتے ہیں۔

گم گشتہ اسباط

کچھ حصہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ افغانستان اور سرحد کی پہاڑیوں میں افغانوں کی صورت میں منتقل ہے، حال ہی (۱۹۷۶ء) میں پشتو اکاڈمی پشاور یونیورسٹی کی طرف سے ایک ضخیم کتاب شائع ہوئی ہے جس کا عنوان ہے —— تواریخ حافظ رحمت خانی —— مع حواشی۔ اس کے حواشی میں بڑی تفصیل سے لکھا گیا ہے کہ جملہ افغان، حضرت یعقوبؑ کی اولاد، بنی اسرائیل سے ہیں۔ اور ایک حصہ کے متعلق قیاس ہے کہ وہ ہندوستان میں ہندوؤں کا روپ دھارے ہوئے ہے۔ یہ بہرحال محض قیاسات ہیں۔ یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اپنی مرکزیت کھو کر یہ عظیم الشان قوم کن کن صحراؤں میں جذب اور کون کون سے بیابانوں میں دفن ہوگئی۔ جو قوم بھی اپنی ملی مرکزیت کی حفاظت نہیں کرتی اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔ وہ دوسری قوموں میں اس طرح مدغم ہو جاتی ہے کہ بعد میں ان کی جداگانہ ہستی کا سراغ تک نہیں ملتا۔ یہ تھا انجام بنی اسرائیل کے ایک حصہ کا۔ اب اس کے دوسرے حصہ کی طرف آیئے جو یہودہ کے نام سے متعارف تھا۔ ان پر چھوٹی چھوٹی تباہیاں تو آتی رہیں۔ لیکن دو حادثات ایسے گزرے جنکی ہلاکت آفرینی کی نظیر آسمان کی آنکھ نے شاید اس سے پہلے کہیں نہ دیکھی ہوگی۔[1] قرآن کریم نے ان دو حوادث کی طرف خصوصیت سے اشارہ کیا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا (۱۷/۴)۔ "ہم نے کتاب (یعنی تورات) میں بنی اسرائیل کو اس سے آگاہ کر دیا تھا کہ تم ضرور ملک میں دو مرتبہ فساد برپا کرو گے اور بڑی ہی سخت درجہ کی سرکشی اختیار کرو گے۔" ضمناً یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ بات ان کی تباہی کی تھی لیکن ذکر ان کی سرکشی کا کیا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ ان کی تباہی قوانین خداوندی سے سرکشی برتنے ہی کا نتیجہ تھی۔ دوسری جگہ کہا ہے: لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ۔ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (۵/۷۸)۔ "جب بنی اسرائیل نے

---

[1] ان کے بعد البتہ ہمارے زوال نے انہیں بھی مات کر دیا ہے۔

حق و صداقت سے کفر اختیار کیا تو پہلے حضرت داؤد علیہ السلام نے اور پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں وانشگاف الفاظ میں کہدیا کہ ان کی اس سرکشی اور حدود فراموشی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جائیں گے"

بخت نصر کا حملہ

ان میں سے پہلی تباہی بابل کے بادشاہ بنوکدنصر (بخت نصر) کے ہاتھوں رونما ہوئی اس نے ۵۹۹ قبل مسیح قم میں حملہ کیا اور یہودیوں کے دینی اور سیاسی مرکز یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ یہ قتل و غارت گری اور سلب و نہب کا ایسا جانگداز سانحہ تھا جو تاریخ انسانیت میں ضرب المثل بن چکا ہے۔ اس سے نہ صرف یہودیوں کی سلطنت تباہ ہوئی بلکہ اُن کی قومیت کا بھی شیرازہ بکھر گیا۔ ان کی مرکزیت فنا ہو گئی۔ اور غلامی اور محکومی کی بڑی سے بڑی اذیتیں اور مصیبتیں جو کسی قوم پر آسکتی ہیں، سب یکجا ہوگئیں یہی وہ قیامت صغریٰ تھی جس کے متعلق قرآن نے کہا کہ: فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَاهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ ۔ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ ۔ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا (۱۷/۵) "جب ان دو حادثوں میں سے پہلا حادثہ رونما ہوا تو ہم نے بنی اسرائیل پر ایسے لوگوں کو مسلط کر دیا جو بڑے ہی خوفناک اور طاقتور تھے۔ وہ ان کی آبادیوں کے اندر گھس گئے اور انہیں تباہ برباد کر کے رکھدیا یہ ان کے انہی جرائم کا نتیجہ تھا جس سے انہیں پہلے متنبّہ کر دیا گیا تھا لیکن وہ ان سے باز نہ آئے تو یہ وارننگ پوری ہو کر رہی"۔ بخت نصر نے یروشلم کو لوٹا، جلایا، یہودیوں کا قتل عام کیا اور بقیۃ السیف کو قید کر کے اپنے ساتھ بابل لے گیا۔ یہ یہودیوں کے لئے پہلی وارننگ تھی۔ ان پر اس کا اچھا اثر ہوا اور ان کے دل، ایک حد تک، اطاعتِ خداوندی کی طرف مائل ہو گئے۔ چنانچہ ایک سو برس کے اندر فارس کے تین شہنشاہ ــ خورس۔ دارا اور ارتخشتا ان کی امداد پر آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے یروشلم کی دوبارہ آبادی اور ہیکل کی تعمیر کی اجازت دیدی۔ چنانچہ ہیکل کی تعمیر ۵۳۷ قبل مسیح قم میں شروع ہو کر ۵۱۵ قبل مسیح قم میں تکمیل کو پہنچی اور اس کے بعد خانماں خراب اور آوارۂ وطن یہودی پھر سے اپنی اجڑی ہوئی بستیوں میں آکر آباد ہونے شروع ہو گئے اور یوں ان کی مردہ جماعت نے قریب ایک صدی کے انقلاب کے بعد دوبارہ زندگی حاصل کرلی۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم نے کہا ہے ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ ۔ وَأَمْدَدْنَاكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ ۔ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا (۱۷/۶) "پھر ہم نے زمانہ کی گردش تمہارے دشمنوں کے خلاف اور تمہارے حق میں کر دی۔ اور مال و دولت کی فراوانی اور افرادی قوت کی کثرت سے تمہاری مدد کی اور اس طرح تم پھر ایک بڑی قوم بن گئے"۔

ملّتِ یہودیہ کی بازآفرینی کی یہی داستان ہے جسے تورات میں حزقی ایل نبی کے خواب کے استعارہ میں یوں بیان کیا گیا ہے:

حزقی ایل نبی کا خواب

خدا کا ہاتھ مجھ پر تھا اور اس نے مجھے خدا کی روح میں اٹھا لیا اور اس وادی میں جو ہڈیوں سے بھرپور تھی، مجھے اتار دیا اور مجھے ان کے آس پاس چوگرد پھرایا۔ اور دیکھ، وہ وادی کے میدان میں بہت تھیں۔ اور دیکھ، وہ نہایت سوکھی تھیں۔ اور اس نے مجھے کہا کہ آدم زاد! کیا یہ ہڈیاں جی سکتی ہیں؟ میں نے جواب میں کہا کہ اے خداوند یہوداہ تو ہی جانتا ہے۔ پھر اس نے مجھے کہا کہ تو ان ہڈیوں کے اوپر نبوت کر اور ان سے کہہ کہ اے سوکھی ہڈیوں تم خداوند کا کلام سنو۔ خداوند یہوداہ ان ہڈیوں کو یوں فرماتا ہے کہ دیکھو میں تمہارے اندر روح داخل کروں گا اور تم جیوگے اور تم پر نسیں بٹھلاؤں گا اور گوشت چڑھاؤں گا اور تمہیں چمڑے سے مڑھوں گا۔ اور تم میں روح ڈالوں گا اور تم جیوگے اور جانوگے کہ میں خداوند ہوں۔ سو میں نے حکم کے بموجب نبوت کی اور جب میں نبوت کرتا تھا تو ایک شور ہوا اور دیکھ ایک جنبش اور ہڈیاں آپس میں مل گئیں۔ ہر ایک ہڈی اپنی ہڈی سے۔ اور جو میں نے نگاہ کی تو دیکھ نسیں اور گوشت ان پر چڑھ آئے اور چمڑے کی ان پر پوشش ہو گئی۔ پھر ان میں روح نہ تھی۔ تب اس نے مجھے کہا کہ نبوت کر۔ تو ہوا سے نبوت کر اے آدم زاد! اور ہوا سے کہہ کہ خداوند یہودا یوں کہتا ہے کہ اے سانس! تو چاروں ہواؤں میں سے آ! اور ان مقتولوں پر پھونک کہ وہ جئیں سو میں نے حکم کے موجب نبوت کی اور ان میں روح آئی اور وہ جی اُٹھے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے۔ ایک نہایت بڑا لشکر۔ تب اس نے مجھے کہا کہ اے آدم زاد! یہ ہڈیاں سارے اہلِ اسرائیل ہیں۔ دیکھ یہ کہتے ہیں کہ ہماری ہڈیاں سوکھ گئیں اور ہماری امید جاتی رہی۔ ہم تو بالکل فنا ہو گئے۔ اس لئے تو نبوت کر اور ان سے کہہ کہ خداوند یہودا یوں کہتا ہے کہ دیکھ اے میرے لوگ میں تمہاری قبروں کو کھولوں گا اور تمہیں تمہاری قبروں سے باہر نکالوں گا اور اسرائیل کی سرزمین میں لاؤں گا۔ اور اے میرے لوگ جب میں تمہاری قبروں کو کھولوں گا اور تم کو تمہاری قبروں سے باہر نکالوں گا تب جانوگے کہ خداوند میں ہوں اور میں اپنی روح تم میں ڈالوں گا اور تم جیوگے اور میں تم کو تمہاری سرزمین میں بساؤں گا۔ تب تم جانو گے کہ مجھ سے خداوند نے کہا اور پورا کیا۔ (حزقی ایل ۳۷/۱-۱۴)

قرآن میں ذکر

اور اس واقعہ کو قرآن کریم نے اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:۔

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا. قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ

بَعْدَ مَوْتِهَا ۔ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ۔ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۔ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۔ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۔ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ ۔ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ۔ ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ۔ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲/۲۵۹)۔

ایک شخص کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا جس کے مکانات مسمار ہو کر کھنڈر بن چکے تھے۔ اس نے کہا کہ کیا اس قسم کی ویران بستی کو، اس کی موت کے بعد، پھر سے زندگی مل سکتی ہے؟ اللہ نے اسے ایک سو سال تک موت کی حالت میں رکھا اور اس کے بعد اسے دوبارہ زندگی عطا کر دی۔ اس سے پوچھا گیا کہ تم بھلا کتنی مدت تک اس حالت میں رہے ہو؟ اس نے کہا بس ایک آدھ دن۔ اللہ نے کہا تم سو سال تک اس حالت میں رہے ہو۔ بایں ہمہ دیکھو، کہ تمہارا کھانا اور پانی تک خراب نہیں ہوا۔ اسی طرح تمہارا گدھا بھی (ویسے کا ویسا) کھڑا ہے۔ یہ اس لئے کیا گیا ہے کہ تم لوگوں کے لئے اس بات کی نشانی بن جاؤ (کہ قانونِ خداوندی کی رو سے مردہ اقوام کو بھی زندگی مل سکتی ہے)۔ کیا تم جنین کی حالت پر غور نہیں کرتے کہ ہم کس طرح، خون کے لوتھڑے سے ہڈیاں ابھارتے ہیں۔ انہیں سخت کرتے ہیں۔ اور پھر ان پر گوشت پوست چڑھا کر، انہیں ایک جیتا جاگتا بچہ بنا دیتے ہیں۔

جب اس مثال کے ذریعے اس پر بات واضح ہو گئی تو اس نے کہا کہ ہاں! اب میں نے سمجھ لیا ہے کہ اللہ نے ہر شے کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں اور ان پر، اس کا پورا پورا کنٹرول ہے۔ موت اور حیات کے فیصلے بھی انہی پیمانوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ جب تک ہم ان پیمانوں کو نہیں سمجھتے ایک بات کو مستبعد خیال کر لیتے ہیں۔ جب وہ سمجھ میں آجاتے ہیں، وہی ناممکن بات، ممکن نظر آنے لگ جاتی ہے۔

لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہودیوں کی پھر سے وہی حالت ہو گئی اور وہ اسی نہج زندگی کی طرف لوٹ گئے جس کی پاداش میں ان کی پہلی بربادی ظہور میں آئی تھی۔ اہل فارس کے زیر اقتدار انہوں نے جو تھوڑی بہت آزادی حاصل کی تھی، سکندر نے ۳۳۲ ق م میں اس پر ضرب کاری لگائی اور ان کا شیرازہ پھر منتشر ہونے لگا۔ پھر ۳۲۰ ق م میں بطلیموس (PTOLEMY) نے مصر کے راستے حملہ کر کے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ انٹی گونس کے عہد میں یہ تمام علاقہ یونانیوں کے قبضہ میں آگیا اور یہودیوں پر سخت مظالم شروع ہو گئے حتیٰ کہ ۶۶ء ق م میں اس دوسری اور آخری تباہی کی تمہید شروع ہو گئی جو رومیوں کے ہاتھوں ظہور میں آئی تھی۔ اس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا

تَتۡبِيۡرًا (۷۔۱۷)۔"پھر جب دوسرے وعدہ کا وقت آیا تو پھر تم پر ایک اور قوم مسلط ہو گئی جس نے مار مار کر تمہارا حلیہ بگاڑ دیا۔ وہ تمہارے ہیکل تک میں داخل ہو گئے۔ جس طرح پہلے حملہ آوروں نے کیا تھا انہوں نے بھی سب کچھ توڑ پھوڑ کر رکھ دیا؛ رومیوں کا گورنر پامپائی اُٹھا اور اس نے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ اس تاخت و تاراج میں قریب بارہ ہزار یہودی تباہ ہو گئے۔ پھر ۱۵ھ ق۔م کے قریب ایک اور یورش میں قریب تیس ہزار یہودی غلام بنا لئے گئے اور ڈھور ڈنگر کی طرح فروخت ہوئے۔ مشیت کی طرف سے انہیں ان کی بازآفرینی کا ایک آخری موقعہ دیا گیا اور ان کی طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر رسول مبعوث ہوئے۔ لیکن انہوں نے آپؑ کے ساتھ جو کچھ کیا وہ ایک دنیا پر روشن ہے۔

اقتدار کے زمانہ میں قومیں ظلم و استبداد، دھاندلی اور ناانصافی، سلب و نہب، غصب و استحصال کے انسانیت کش جرائم کی مرتکب ہوتی ہیں، جن کے نتیجہ میں ان پر تباہی مسلط ہو جاتی ہے۔ لیکن محکومیت کے زمانہ میں، ان کی مذہبی پیشوائیت ایسی تباہ کن روش اختیار کرتی ہے جو انہیں ابھرنے ہی نہیں دیتی اور آہستہ آہستہ تباہی کے جہنم میں جا گراتی ہے یہی تھی ان کے احبار و رہبان کی وہ انسانیت کش روش، جس کے خلاف مسیحا نفس حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک صدائے انقلاب بن کر اٹھے۔ انجیل میں اس کا نقشہ بڑے بصیرت افروز انداز میں کھینچا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

حضرت عیسیٰؑ کا نعرۂ انقلابؑ

ہیکل کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو جاتے اور ایک بے باک، حق گو، پیامبرِ انقلاب کی طرح ان کے مذہبی پیشواؤں کو مخاطب کر کے کہتے :-

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لئے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔

اے اندھے راہ بتانے والو! تم پر افسوس ہے جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں، لیکن اگر وہ مقدس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہو گا اے احمقو اور اندھو! کونسا بڑا ہے ؟ سونا یا مقدس جسنے سونے کو مقدس کیا۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ پودینے اور سونف اور زیرے پر دہ یکی دیتے ہو۔ اور تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف، رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے . . . . . اے اندھے راہ بتانے

والو جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ نگل جاتے ہو۔

کبھی ان سے کہتے :۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر قسم کی نجاست سے بھری ہوتی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوتے ہو ..... اے سانپو، اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچوگے۔ (متی باب ۲۳، آیات ۳۶-۱)

اور کبھی وہ اپنے متبعین کو متنبہ کرتے کہ:

دیکھو! یہ فقیہہ اور فریسی جو موسیٰؑ کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ جو کچھ وہ بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو....... وہ اپنے سب کام لوگوں کو دکھانے کے لئے کرتے ہیں۔ وہ اپنے بڑے بڑے تعویذ بناتے ہیں اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں۔ ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام لینا اور ربیؔ کہلانا پسند کرتے ہیں۔ (ایضاً)

یہ تھی بنی اسرائیل کے علما اور مشائخ کی حالت اور یہ تھا وہ مشن، جسے لے کر حضرت مسیح علیہ السلام تشریف لائے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ مذہبی پیشوا، جو وہاں خدائی کر رہے تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس حق گوئی کو کس طرح برداشت کر لیتے انہوں نے ان کے خلاف متحدہ محاذ کھڑا کر لیا۔ وہ عوام کو تو یہ کہکر بھڑکاتے کہ یہ شخص تمہارے عقائد خراب کرتا ہے لیکن ان کی مخالفت کی جو حقیقی وجہ تھی اس کی پردہ کشائی انجیل برنباس میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:۔

تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ شخص بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ یہ ہم پر بڑی مصیبت ہوگی اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقے کے مطابق اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ ...... تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے اس لئے کہ ہم خدمت سے نکال دیئے جائیں گے اور ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں (برنباس فصل ۱۴۲)

یہ جو انہوں نے کہا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام "اللہ کی عبادت میں قدیم طریقہ کے مطابق اصلاح کرنا چاہتے تھے"۔ تو

سیکولرازم کے خلاف

اس سے ان کی مراد کیا تھی۔ یا یوں کہیئے کہ اس کے خلاف انہیں اعتراض کیا تھا؟ اس کے لئے وہاں کے نظامِ معاشرت و سیاست کو سامنے لانا چاہیئے۔ وہاں

رومیوں کی حکومت تھی لیکن وہ حکومت سیکولر تھی جس کی رو سے انہوں نے امورِ مملکت تو اپنے ہاتھ میں رکھے تھے لیکن مذہبی امور یہودیوں کے احبار و رہبان کے زیر اقتدار تھے۔ یہ (یہودی) حکومت کے دائرہ اختیار میں مداخلت نہیں کر سکتے تھے اور حکومت ان کے حیطۂ حکمرانی میں دخل انداز نہیں ہوتی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اس کے خلاف، دین کا نظام قائم کرنا چاہتے تھے جس میں سیاست اور مذہب دونوں حکومتِ خداوندی کے تابع آ جاتے تھے اور اس طرح مذہبی پیشوائیت کا وجود باقی نہیں رہتا تھا۔ آپ کی دعوتِ انقلاب کی طرف سے یہی وہ خطرہ تھا جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہودی آپس میں کہتے تھے کہ:-

> اس وقت خدا کا شکر ہے کہ ہمارا بادشاہ اور حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے جیسے ہم ان کی شریعت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے اور اس سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں کر لیں پس اگر ہم نے غلطی کی تو ہمارا اللہ رحیم ہے۔ قربانی اور روزہ کے ساتھ اس کا راضی کر لینا ممکن ہے مگر جب یہ شخص بادشاہ ہو گیا تو ہرگز نہ راضی کیا جا سکے گا جب تک وہ اللہ کی عبادت ویسے ہی نہ ہوتے دیکھے جیسی موسیٰؑ نے لکھی ہے۔ (انجیل برنباس ص ۱۴۲)

آخری تباہی

مختصراً، یہودیوں نے اپنی بازآفرینی کے اس موقعہ کو بھی ہاتھ سے گنوا دیا وہ اپنے جرائم میں آگے ہی آگے بڑھتے گئے تا آنکہ ان کی آخری بربادی کا وقت آ گیا۔ چنانچہ رومیوں کے گورنر طیطوس (طیٹس) نے ۷۰ء عیسوی میں ایک ایسا وار کیا جس نے اس سوختہ بخت قوم پر اجتماعی ہلاکت کی مہر ثبت کر دی۔ [1]

اور یہ تھی وہ قوم جس سے (بعثتِ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں) قرآن کریم نے خطاب کر کے کہا تھا کہ تمہارے لئے حیاتِ نو حاصل کرنے کا ایک اور موقعہ آ گیا ہے۔ اگر تم اب بھی اپنے جرائم سے اجتناب برت کر اس نظام کے تابع آ جاؤ جسے یہ نبی آخر الزمان صلے اللہ علیہ وسلم وحیٔ خداوندی کے مطابق قائم کر رہا ہے تو تمہاری ذلت و نکبت پھر سے عظمت و رفعت میں تبدیل ہو جائے گی۔ ان کے یہ جرائم کیا تھے جنکی طرف ان کی بار بار توجہ منعطف کرائی جاتی تھی؛ قرآن کریم نے ان کا بڑی شرح و بسط سے تذکرہ کیا ہے۔ وہ تفاصیل تو اپنے اپنے مقامات پر سامنے آئیں گی لیکن ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ان کی ایک سمٹائی ہوئی فہرست اس جگہ پیش کر دی جاتے تاکہ حقیقت واضح طور پر سامنے آ جائے کہ وہ جرائم کیا ہوتے

---

[1] یہاں یہ واقعات اجمالاً بیان کئے گئے ہیں۔ تفصیل ان امور کی، میری کتاب ـــــ برقِ طور ـــــ میں ملے گی۔

ہیں جو قوموں کے آخری تباہی کا موجب بنتے ہیں۔ اس فہرست کو ذرا غور سے دیکھئے کیونکہ اس میں ہمارے لئے عبرت اور موعظت کے ہزار سامان پوشیدہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ ہم متعدد بار کہہ چکے ہیں) قرآن کریم ان تاریخی شواہد کو پیش ہی اس لئے کرتا ہے کہ ہم ان کی روشنی میں اپنا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ کہیں ہم میں بھی تو وہ خرابیاں پیدا نہیں ہو رہیں جن کے نتیجہ میں سابقہ اقوام تباہ ہو گئی تھیں۔ اور یہی ہے وہ مقصد جس کے لئے ہم ان جرائم کی فہرست کو نمایاں طور پر سامنے لانا چاہتے ہیں۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ یہودیوں کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ :-

جرائم کی فہرست

(۱) اُن کے معاشرہ کی بنیاد سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کے اقتدار پر تھی۔ (۹/۳۴)۔

(۲) نظام سرمایہ داری کی بنیاد، ربٰو پر ہوتی ہے۔ یعنی اس اصول پر کہ معاوضہ محنت کا نہیں بلکہ سرمایہ کا ہوتا ہے۔ ان کے ہاں ربٰو کا چلن عام تھا، حالانکہ ان کے رسولوں نے انہیں اس سے سختی سے روکا تھا (۴/۱۶۱)۔

(۳) ربٰو کے علاوہ، وہ دوسروں کا مال ہر جائز و ناجائز طریقے سے ہتھیا لیتے اور ہضم کر جاتے تھے (۴/۱۶۱ ؛ ۵/۴۲) اس سلسلہ میں، ان کی ہوسِ زر پرستی کس حد تک پہنچ چکی تھی، قرآن کریم نے اسے اس مقدمہ کے ضمن میں بیان کیا ہے جو حضرت داؤدؑ کے سامنے پیش ہوا تھا۔ مدعی کی فریاد یہ تھی کہ مدعا علیہ مجھے کہتا ہے کہ میں تمہارا بھائی ہوں۔ اور ہے بھی یہ میرا بھائی۔ اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس صرف ایک بھیڑ ہے۔ یہ میرا بھائی مجھ سے کہتا ہے کہ تم یہ ایک بھیڑ بھی مجھے دے دو، تم نے اسے رکھ کر کیا کرنا ہے۔ یہ تھی اس قوم کی ذہنیت یا ان کا معاشی نظام۔ (۳۸/۲۱-۲۴)

(۴) غریبوں اور محنت کشوں کی گاڑھے پسینے کی کمائی کے سلب و نہب سے، سرمایہ داروں کے دل میں اگر کبھی کوئی کھٹک پیدا ہوتی تھی تو مذہبی پیشوا اسے یہ کہہ کر مٹا دیتے تھے کہ تم صدقہ خیرات سے جو نیکی کے کام کرتے ہو، ان کا ثواب بہت بڑا ہے۔ قرآن کریم نے ان کی اس خود فریبی کی بڑے دلنشین انداز سے نقاب کشائی کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارا حال یہ ہے کہ تم پہلے، اپنے ہاں کے غریب اور کمزور لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال دیتے ہو اور جب انہیں دوسرے لوگ پکڑ کر لے جاتے ہیں تو تم انہیں فدیہ دے کر چھڑا لاتے ہو اور اپنے دل میں خوش ہو جاتے ہو کہ ہم نے بہت بڑا ثواب کا کام کیا ہے اور اسے فراموش کر دیتے ہو کہ جس مصیبت میں یہ غریب گرفتار ہیں اس کے ذمہ دار تم خود ہو۔ یاد رکھو! تمہارے صدقہ و خیرات کے اس قسم کے کام، اس جرم کا کفارہ کبھی نہیں بن سکتے تمہاری اس روش کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تم خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلیل و خوار ہو گے اور آخرت میں بھی سخت عذاب میں مبتلا۔ (۲/۸۵)

(۵) معاشرہ میں جو برائیاں پیدا ہو جاتی تھیں، نہ تو وہ ایک دوسرے کو ان سے روکتے تھے (۵/۷۹) اور نہ ہی ان کے مذہبی پیشوا انہیں ان سے باز رہنے کی تلقین کرتے تھے (۵/۶۳) کیونکہ ان کے اپنے مفاد ان کے ساتھ وابستہ ہوتے تھے۔

(۶) ان کے اکابرین ملت (لیڈرانِ کرام) کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ لوگ ان کاموں پر ان کی تعریف کریں، جو وہ کر کے نہ دکھائیں۔ لوگ ان کی تعریف میں قصیدے پڑھتے رہتے تھے اور وہ ان قصیدوں کو سن کر خوش ہوتے تھے (۳/۱۸۷)۔

(۷) مذہبی پیشوائیت کے اقتدار کا یہ عالم تھا کہ لوگوں نے علماء اور مشائخ کو اپنا خدا بنا رکھا تھا۔ (۹/۳۱)۔ کسی کو ان کے فیصلوں سے مجالِ سرتابی نہ تھی۔

(۸) عوام کی یہ حالت تھی، اور مذہبی پیشواؤں کی یہ کیفیت کہ:-

(ا) وہ غرور، نفرت اور تکبر و تمرّد کے پیکر تھے۔ ان سے اگر کوئی علم و عقل کی بات کی جاتی تو وہ اُسے یہ کہہ کر دھتکار دیتے کہ ہمارا علم مکمل ہے۔ ہمیں کسی سے کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں (۲/۸۸)۔

(ب) مذہب ان کا پیشہ تھا اور وہ چند ٹکوں کی خاطر، جس قسم کا چاہو، فتویٰ دے دیتے تھے۔ (۷/۱۶۹)۔ اور پھر تماشہ یہ کہ وہ ان فتووں کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے، لیکن لوگوں سے کہتے یہ تھے کہ یہ خدا کی شریعت ہے جسے ہم تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ (۲/۷۹)

(ج) اسی دین فروشی کا نتیجہ تھا کہ ان کی ہر ممکن کوشش یہ ہوتی تھی کہ لوگ خدا کے راستہ کی طرف نہ آنے پائیں اس لئے وہ ہر اس آواز کو سختی سے دبا دینے کی کوشش کرتے تھے جو لوگوں کو حق و صداقت کی دعوت دے۔ (۹/۳۴)۔

(د) وہ مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے جن میں ہمیشہ سرپھٹول ہوتی رہتی تھی ان کی یہ فرقہ بندی اور اختلاف انگیزی کسی اصول کی بنا پر نہیں تھی بلکہ باہمی ضد اور رقابت کی وجہ سے تھی۔ (۱۵/۱۴)۔ ان کا سارا وقت ایک دوسرے کو کافر قرار دینے میں صرف ہو جاتا تھا۔ (۲/۱۱۴)۔

(س) وہ جو کچھ دوسروں سے کہتے تھے اس پر خود عمل نہیں کرتے تھے۔ ان کے علم و فضل کی کیفیت بس یوں سمجھئے جیسے کسی نے گدھے پر مقدس کتابوں کا انبار لاد دیا ہو۔ (۶۲/۵)

(ش) وہ لوگوں کو اس خوش فہمی میں بتلا رکھتے تھے کہ تم جو کچھ جی میں آئے کرو۔ جنت تمہارے نام الاٹ ہو چکی ہے۔ تم کبھی جہنم میں نہیں جاؤ گے۔ اور اگر کسی وجہ سے تمہیں جہنم میں بھیج بھی دیا گیا تو تمہارے بزرگ فوراً جا کر تمہیں چھڑا لائیں گے۔ (۲/۸)۔ تم تو خدا کی چہیتی اولاد ہو۔ وہ تمہیں کیسے جہنم میں ڈال دے گا۔ (۵/۱۸)۔

(۹) قوم کو اعمال سے بیگانہ بنا دینے کا نتیجہ یہ تھا کہ قانون اور ضابطہ کی چھوٹی چھوٹی پابندیاں بھی ان پر شاق گزرتی تھیں۔ مثلاً انہیں کہا گیا کہ ہفتے میں ایک دن کاروبار کا ناغہ کیا کرو (جسے سبت کہتے ہیں) تو وہ ایسے حیلے بہانے اختیار کرنے لگ جاتے جن سے وہ کسی نہ کسی طرح اس پابندی سے بچ جائیں۔ قانون سے گریز کی راہیں

نکالنا ان کا عام معمول بن چکا تھا۔ (۷/۱۶۳-۱۶۴)۔

(۱۰) ظاہر ہے کہ جس قوم کی یہ حالت ہو چکی ہو، وہ کسی بلند مقصد کی خاطر ذرا سی قربانی بھی نہیں دے سکتی۔ اور جب وہ کسی چھوٹی موٹی قربانی کے لئے بھی آمادہ نہیں ہو سکتی تو حق کی خاطر جان دینے کا تو ان کے ہاں سوال ہی ... پیدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ کیفیت ان کی یہ تھی کہ موت کے نام سے ان کی جان جاتی تھی۔ (۲/۹۵ ؛ ۶۲/۸)۔ نتیجہ یہ کہ ان کی ہزاروں لاکھوں کی جمعیت باہر نکلتی تھی۔ لیکن جب دشمن سامنے سے آتا دکھائی دیتا تو وہ بھیڑ بکریوں کی طرح بھاگ اٹھتے اور ذلت کی موت مر جاتے۔ (۲/۲۴۳)۔

(۱۱) اسی ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ ان کے ہاں، اور تو اور، فوج کی جرنیلی کا معیار بھی دولت بن چکا تھا۔ یعنی ان مناصب کے لئے امیروں اور رئیسوں کے لڑکے منتخب کئے جاتے تھے جوہر ذاتی کو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ (۲/۲۴۷)۔ اور سپاہیوں میں ڈسپلن اس حد تک مفقود تھا کہ اگر ان سے کہا جاتا کہ کچھ وقت کے لئے پیاس کو روکو، پانی مت پیو تو وہ اتنی سی پابندی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ (۲/۲۴۹)

یہ تھے یہودیوں کے وہ جرائم، جن کی پاداش میں قرآن کریم نے کہا تھا کہ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوْا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ ۔ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۔ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۔ (۳/۱۱۱)۔ وہ جہاں بھی گئے ذلت و مسکنت سائے کی طرح ان کے پیچھے رہی اور انہیں خدا کے غضب سے کہیں پناہ نہ مل سکی۔ اور نبی اکرمؐ کے بعد بھی ان کی یہی حالت رہی۔

کیا یہودیوں کی حکومت کبھی قائم نہیں ہو سکتی؟

اس مقام پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے یہ، اور قرآن کریم کی اسی قسم کی دیگر آیات کے غلط استنتاج سے ہمارے ہاں یہ عقیدہ پیدا ہو گیا، اور وہ متوارث چلا آ رہا ہے، کہ خدا کا یہ فیصلہ ہے کہ یہودیوں کو کبھی حکومت نہیں مل سکتی —— یہ خدا کا فیصلہ نہیں۔ ہمارا اپنا وضع کردہ عقیدہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے) زمانہ نزولِ قرآن کریم سے قریب ایک ہزار سال پہلے سے بنی اسرائیل میں جو اجتماعی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں ان کا فطری نتیجہ محکومی و محتاجی تھا۔ یہ ذلت و خواری انہیں مختلف اقوام کے ہاتھوں اٹھانی پڑی۔ نزولِ قرآن کریم کے وقت ان کی یہ خرابیاں اور بھی زیادہ ہو چکی تھیں۔ اس لئے قرآن کریم نے ان کی ذلت و رسوائی کی زندگی کو اپنے اس دعویٰ کی صداقت میں بطورِ شہادت پیش کر کے کہا کہ دیکھ لو، قوانینِ خداوندی سے انحراف کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے۔ اب رہا ان کے مستقبل کا سوال، تو (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) قوموں کی تباہی دو قسم

کی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس تباہی کے بعد اس قوم کا نام و نشان تک باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی قوموں کے لئے بازآفرینی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن دوسری قسم کی قومیں وہ ہیں جو تباہی کے باوجود اپنا قومی تشخص قائم رکھتی ہیں۔ ان قوموں کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اگر وہ ان خرابیوں کو دور کر لیں جن کی وجہ سے ان پر ذلّت و ادبار کے بادل اُمڈ آئے تھے اور ان کی جگہ وہ صلاحیتیں پیدا کر لیں جن سے (قرآن کے الفاظ میں) "مردہ قومیں زندگی حاصل کر لیتی ہیں" تو انہیں پھر حیاتِ تازہ مل سکتی ہے۔ خدا کا قانونِ مکافات یہ نہیں کہ اگر کسی قوم کے اسلاف میں کسی زمانہ میں خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں تو ان کی آنے والی نسلوں میں اس کا امکان ہی نہ رہے کہ وہ ان خرابیوں کو دور کر کے ازسرِنو اپنی صلاحیتیں بیدار کر لیں؛ صدیوں پہلے کی کسی نسل (GENERATION) کی غلطیوں کی پاداش میں اس کی آنے والی تمام نسلوں پر بازآفرینی کے دروازے بند کر دینا، می نہ سزد خدائے را ——— بنا بریں جس طرح ہمارے اسلاف کے درخشندہ کارنامے ہمارے لئے شوکت و سطوت کی زندگی کا موجب نہیں بن سکتے، ہمیں شوکت و سطوت اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب ہم خود وہ کام کریں جن کا نتیجہ شوکت و سطوت ہوتا ہے۔ اسی طرح یہودیوں کے اسلاف کے ذلّت و خواری کا موجب بننے والے جرائم، ان کے بعد کی نسلوں کے لئے ذلّت و خواری کا سبب نہیں بن سکتے۔ اگر وہ اپنے اسلاف کی غلط روش کو چھوڑ کر صحیح روش اختیار کر لیں تو انہیں اپنے کاموں کا بدلہ ضرور ملے گا۔ اس باب میں قرآن کریم کا فیصلہ بڑا واضح ہے۔ جب اس نے کہا کہ: تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۲/۱۴۱)۔ "یہ تمہارے اسلاف اپنے اپنے وقت میں دنیا سے چلے گئے۔ ان کے اعمال ان کے ساتھ تھے۔ تمہارے اعمال تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم تم سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ تمہارے متعلق فیصلہ اس سے ہوگا کہ تم نے کیا کیا ہے؟"

اور یہودیوں کے متعلق تو قرآن نے ایک اور وضاحت بھی کر دی۔ اس آیت میں، جس میں کہا گیا ہے کہ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا (۳/۱۱۱) "وہ جہاں بھی جائیں گے ذلّت و رسوائی کی لعنت ان کا پیچھا کرے گی" کے بعد کہا گیا کہ إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ (۳/۱۱۱)۔ "اس ذلّت و مسکنت سے نکلنے کی دو صورتیں ہو سکیں گی، ایک تو یہ کہ وہ ضابطۂ خداوندی کو تھام لیں۔ اس سے انہیں باعزت طریق سے حیاتِ نو حاصل ہو جائے گی اور دوسری صورت یہ کہ کوئی قوم اپنی کسی مصلحت کی بنا پر ان کا سہارا بن جائے۔ اس صورت میں بھی ان کی ذلّت مبدل بہ قوت ہو جائے گی۔ لیکن اس میں غیروں کی محکومیت کی غیر مرئی رسوائی ضرور باقی رہے گی ——— وہ عزت اور وقار، جس میں کوئی قوم کسی دوسری قوم کی رہینِ منت نہ ہو، صرف ضابطۂ خداوندی کے اتباع سے حاصل ہو سکتی ہے۔"

بہر حال ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اس کی خود تصریح کر دی تھی کہ اس، ایں سو راندہ (اور سو در ماندہ) قوم کی نجات کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس قوم نے ضابطۂ خداوندی کی اطاعت تو اختیار نہ کی لیکن (ایک قوم (یا بعض قومیں) اپنی مصلحتوں کی خاطر ان کا سہارا بن گئیں اور اس طرح فلسطین میں ان کی حکومت قائم ہو گئی۔

حضرتِ موسیٰ کی داستانِ حیات

اس تمہیدی تعارف کے بعد ہمیں اصل موضوع کی طرف آ جانا چاہیئے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ بات پوری طرح واضح نہیں ہو سکے گی جب تک خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی داستانِ حیات کی نمایاں کڑیاں بھی سامنے نہ لائی جائیں۔ داستانِ بنی اسرائیل اور سرگزشت حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور قرآن کریم میں یہ دونوں سرگزشتیں دوش بدوش سامنے آتی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوتِ انقلاب اور کشمکش کی تفاصیل تو اپنے اپنے مقام پر بیان کی جائیں گی، یہاں صرف ان پر طائرانہ نگاہ ڈالی جاتی ہے۔

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام مصر میں بنی اسرائیل کے ایک ممتاز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی رسول کی وساطت سے ان کی والدہ کی طرف پیغام بھیجا کہ وہ اس بچے کو صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دیں۔ ان کی والدہ نے اس ارشادِ خداوندی کی تعمیل میں ایسا ہی کیا۔ اس صندوق کو بادشاہ کے کارندوں نے دریا سے باہر نکالا اور اس طرح بنی اسرائیل کی محکوم قوم کا یہ بچہ شاہی محلات میں پہنچ گیا —— اس میں مصلحت یہ تھی کہ چونکہ آخر الامر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے اربابِ حکومت کے ساتھ ٹکر لینی تھی۔ اس لئے ضروری تھا کہ وہ محلاتی سیاست اور امورِ مملکت کے سربستہ رازوں سے واقف ہو جائیں۔ یہ چیز محکوم قوم کے گھرانے میں پرورش پانے سے حاصل نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے اس بچہ کو خود شاہی محلات میں پہنچا دیا گیا۔ یہ وہیں بڑھے، جوان ہوئے تو وہاں ان کے ہاتھوں ایک (بالادست) قبطی کا قتل ہو گیا۔ اس سے آپ مصر کو چھوڑ کر مدین کی طرف چلے آئے۔ وہاں انہوں نے ایک غریب سے گھرانے میں شادی کی (کہا جاتا ہے کہ ان کے خسر حضرت شعیب علیہ السلام تھے) معاہدہ کی رو سے برسوں ان کی بھیڑیں چرائیں۔ وہاں سے ندائے جمال نے انہیں طور کی چوٹیوں پر بلا کر شرفِ نبوت سے سرفراز فرمایا اور فرعون کے ساتھ .... نبرد آزمائی کا حکم دیا۔ وہ واپس مصر تشریف لائے، قومِ بنی اسرائیل کی تربیت کی۔ فرعون سے ٹکر لی اور آخر الامر بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر سینا کی وادیوں کی طرف دوبارہ آ گئے۔ وہاں اس قوم کی از سرِ نو تعلیم و تربیت کر کے انہیں آزادی اور سرفرازی کی زندگی بسر کرنے کا اہل بنا دیا۔ ان کے بھائی حضرت ہارون

علیہ السلام اس تمام مہم میں ان کے ساتھ تھے۔ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی داستان تو یہیں تک بیان ہوئی ہے لیکن بنی اسرائیل کی طول طویل سرگزشت کا سلسلہ زمانہ نزولِ قرآن تک آیا ہے۔ اور اس کا آغاز اس آیت سے کیا گیا ہے جو ہمارے اس باب کی زیبِ عنوان ہے۔ تجدیدِ یادداشت کے لئے اسے یہاں دوبارہ درج کیا جاتا ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ (۲/۴۰)

اس آیت کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "اے قومِ بنی اسرائیل! تم میری ان نعمتوں کو یاد کرو جن سے میں نے تمہیں سرفراز کیا تھا۔ تم میرے عہد کو پورا کرو، میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا اور تم میرے سوا کسی سے مت ڈرو۔"

یہاں بنی اسرائیل کو نعمائے خداوندی کی یاد دلائی گئی ہے۔ انعاماتِ خداوندی کی تشریح و تفصیل مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں زیرِ آیت (۲/۴۰) بیان کی جا چکی ہے (دیکھئے صفحات ۴۵-۴۸) بنی اسرائیل کو جن نعمائے خداوندی کی خصوصیت سے یاد دلائی گئی ہے۔ ان کی تفصیل قرآن مجید کے متعدد مقامات پر آئی ہے اور ان کا اجمالی تذکرہ چند سطور آگے جا کر آپ کے سامنے آجائے گا۔ ان نعماء کی ابتداء قرآن کریم نے یہ کہہ کر کرائی ہے۔ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْۗءَ الْعَذَابِ (۲/۴۹) "اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس عذاب سے نجات دلائی جس میں قومِ فرعون نے تمہیں مبتلا کر رکھا تھا۔" یہ عذاب کیا تھا؟ اس کی تفصیلات بھی متعدد مقامات پر سامنے آئیں گی، لیکن اس کی اصل الاصول، یا علّت العلل قرآن کریم نے ایک لفظ میں سمٹا کر رکھ دی ہے۔ جب حضرتِ موسیٰ علیہ السلام فرعون کی طرف گئے تو اس سے کہا: اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ (۲۶/۱۷)۔ "میں اس لئے آیا ہوں کہ بنی اسرائیل کو یہاں سے نکال کر لے جاؤں۔ تم ان کے راستہ میں رکاوٹ نہ پیدا کرو۔ انہیں جانے دو۔" اس کے جواب میں فرعون نے کہا کہ اے موسیٰؑ! ہم نے تم پر اتنے احسانات کئے اور تم ان احسانات کا بدلہ اس طرح دے رہے ہو کہ ہماری حکومت کی جڑیں ہی کھوکھلی ہو جائیں۔ سوچو کہ اگر بنی اسرائیل، جو ہماری محکوم قوم ہے، یہاں سے چلی جائے تو پھر ہم حکومت کس پر کریں گے؟ محکوموں کے بغیر حکومت کا تصور ممکن نہیں۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تم نے اور تو بہت سے احسانات گنائے جو (بقول تمہارے) تم نے ہمارے حال پر کئے تھے لیکن وہ احسان تمہیں یاد نہ رہا جو ان میں سب سے زیادہ "گراں بہا" ہے۔

غلامی کا عذاب

اور وہ یہ ہے کہ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ (۲۶/۲۲)۔ "تم نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام اور محکوم بنا رکھا ہے۔" یہ ہے سب سے بڑا احسان، جو تم نے مجھ پر اور میری قوم

پر کر رکھا ہے۔ اس کی یاد بھی تو دلاؤ؟

آپ نے غور فرمایا کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے کس طرح ایک لفظ میں اس عذاب کی تفصیل کو سمٹا کر رکھدیا جس میں بنی اسرائیل ماخوذ تھے ـــــ یعنی غلامی اور محکومی کا عذاب! اسی کو قرآن کریم نے دوسری جگہ اَلْعَذَابُ الْمُهِيْنُ (۴۴/۳۰) کہا ہے یعنی ذلت آمیز عذاب۔ ہم اس جلد کے پہلے باب میں بتا چکے ہیں کہ مستبد اربابِ اقتدار کو انتہائی خوشی اس سے حاصل ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو ذلیل اور خوار کریں۔ حکمران قوم کی مسرت کا راز اسی میں پنہاں ہوتا ہے کہ وہ محکوم قوم کو ذلیل کرتے ہیں۔ جہاں تک ان طبیعی یا محسوس تکالیف کا تعلق ہے جو بنی اسرائیل کو پہنچائی جاتی تھیں، ان کی تفاصیل تورات میں شرح و بسط سے بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ کہا ہے:۔

> لیکن اسرائیل کی اولاد برومند ہوئی اور بہت بڑھی اور فراواں ہوئی اور نہایت زور پیدا کیا۔ اور وہ زمین ان سے معمور ہوگئی۔ تب مصر میں ایک نیا بادشاہ جو یوسفؑ کو نہ جانتا تھا، پیدا ہوا۔ اور اس نے اپنے لوگوں سے کہا۔ دیکھو کہ بنی اسرائیل کے لوگ ہم سے زیادہ اور قوی تر ہیں۔ آؤ ہم ان سے دانشمندانہ معاملہ کریں تاکہ یہ نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہوں اور جنگ پڑے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل جاویں اور ہم سے لڑیں اور ملک سے نکل جائیں۔ اس لئے انہوں نے ان پر خراج کے لئے محصل بٹھلائے تاکہ انہیں اپنے سخت کاموں کے بوجھوں سے ستائیں۔ اور انہوں نے فرعون کے لئے خزانے کے شہر پتوم اور رعمسیس بنائے۔ پر انہوں نے جتنا انہیں دکھ دیا وہ زیادہ تر بڑھے اور فراواں ہوئے۔ اور وہ بنی اسرائیل کے سبب ناخوش ہوتے۔ اور مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انہوں نے سخت محنت سے گارا اینٹ کا کام اور سب قسم کی خدمت کھیت کی کروا کے ان کی زندگی تلخ کی۔ ان کی ساری خدمتیں، جو وہ ان سے کراتے تھے، مشقت کی تھیں۔ (خروج ۱/۱۴)

اس میں کہا گیا ہے کہ فرعون کو اس کا خدشہ لاحق ہوگیا تھا کہ اگر بنی اسرائیل قوت پکڑ گئے تو وہ ان کی حکومت کے لئے بہت بڑے خطرے کا موجب بن جائیں گے۔ اسی خطرہ سے بچنے کے لئے انہوں نے وہی تدبیر اختیار کی جو مستبد حکمرانوں کا عام سیاسی حربہ ہے یعنی وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ (۲۸/۴) "وہ بنی اسرائیل میں پارٹیاں پیدا کرتا رہتا تھا۔ ایک پارٹی کو معزز اور مکرم بنا کر آگے بڑھاتا اور دوسری کو کمزور کر کے پیچھے ہٹاتا اور اس طرح انہیں آپس میں لڑاتا رہتا۔"

پارٹیوں میں بٹ جانا ـــــ عذاب

اس باہمی اختلاف اور تصادم کا نتیجہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل دن بدن کمزور ہوتے چلے گئے۔ وہ اس محکوم قوم میں سے کس قسم

کے لوگوں کو آگے بڑھاتا اور کن لوگوں کو پیچھے ہٹاتا۔ اسے قرآن نے یہ کہہ کر بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے کہ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَ هُمْ وَيَسْتَحْيِ نِسَآءَ هُمْ إِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (۴/۲۸)۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "وہ ان کے ابناء کو ذبح کرتا اور ان کی نساء کو زندہ رکھتا اور اس طرح ان میں فساد برپا کرتا رہتا" یہ الفاظ دو ایک دیگر مقامات پر بھی آئے ہیں (مثلاً ۲/۴۹ و ۱۴/۶)۔ ہمارے ہاں ان الفاظ کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ فرعون نے حکم دے رکھا تھا کہ بنی اسرائیل کے ہاں جتنے

ذبح ابناء کا مطلب

بچے پیدا ہوں ان میں سے لڑکوں کو پیدا ہونے کے ساتھ ہی قتل کر دیا جائے اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے۔ یہ مفہوم صحیح نہیں۔ اسے تورات سے لیا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے:

> تب مصر کے بادشاہ نے عبرانی دائی جنائیوں کو، جن میں سے ایک کا نام سفرہ اور دوسری کا نام فوعہ تھا، یوں کہا کہ جب عبرانی عورتوں کے لئے تم دائی کا کام کرتی ہو اور تم انہیں پتھروں پر دیکھو، اگر بیٹا ہو تو اسے ہلاک کر دو اور اگر بیٹی ہو تو اسے جینے دو۔
>
> (خروج ۱/۱۵-۱۶)

یہودیوں نے تو اس افسانہ کی کمزوری کو خود ہی بھانپ لیا اور یہ لکھ دیا کہ:

> پر، دائی جنائیاں خدا سے ڈریں اور جیسا کہ مصر کے بادشاہ نے انہیں حکم کیا تھا، نہ کیا اور لڑکوں کو جیتا رہنے دیا۔ (خروج ۱/۱۷)

لیکن ہمارے ہاں کے مفسرین اُس بات پر جمے رہے جسے سب سے پہلے مفسر نے لکھ دیا تھا (تقلید میں ہوتا ہی یہ ہے) اور کبھی کھڑے ہو کر یہ سوچنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ اگر فرعون کے اس حکم پر ایک نسل تک بھی عمل ہوتا تو مصر سے بنی اسرائیل کا نام و نشان تک مٹ جاتا لیکن وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بھی اتنی کثیر تعداد میں موجود تھے۔ نیز اُن کے ساتھ ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام بھی موجود تھے جو ان سے بڑے تھے۔ اگر لڑکے قتل کر دیئے جاتے تو حضرت ہارون علیہ السلام کس طرح زندہ بچ جاتے! پھر قرآن کریم نے دوسرے مقام پر کہا ہے کہ فرعون نے حکم یہ دیا تھا کہ جو لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائیں ان کے ابناء کو ذبح کیا جائے (۴۰/۲۵)

اصل یہ ہے کہ عربی زبان میں ذبح اور قتل کے الفاظ جان سے مار دینے کے لئے ہی استعمال نہیں ہوتے۔ ان سے مراد ہوتا ہے کسی کو ذلیل و خوار کرنا۔ اس کی صلاحیتوں کو ابھرنے نہ دینا۔ اسے جوہر انسانیت سے محروم رکھنا۔ اور ابناء قوم کے معنی قوم کے لڑکے ہی نہیں بلکہ مجازی معانی کے اعتبار سے اس سے مراد، قوم کے معزز افراد ہوتے ہیں۔ (بناء، عمارت یا عمارت کی بنیاد کو کہا جاتا ہے) لہٰذا ان الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ فرعون کرتا یہ تھا کہ قوم بنی اسرائیل کے جن

افراد میں جوہرِ مردانگی کی نمود دیکھتا انہیں ذلیل و خوار کرتا، پیچھے ہٹاتا، اور آگے ان لوگوں کو بڑھاتا جو ان صلاحیتوں سے عاری ہوتے۔ حکمران طبقہ کی اس قسم کی دسیسہ کاری ہمیشہ سے چلی آرہی ہے۔ وہ محکوم قوم میں سے انہی کو اپنا مقرب اور معزز بناتے ہیں جو انسانی صلاحیتوں سے عاری ہوں۔ اور جن کے متعلق ذرا سا احساس بھی ہو کہ وہ سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہیں۔ انہیں ابھرنے نہ دیا جائے۔ یہ تھی فرعون کی وہ چال، جس سے وہ بنی اسرائیل کو کمزور سے کمزور تر کرتا چلا جاتا تھا۔ (آیت ۵/۲۸) میں اَلَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا کہہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا۔ یعنی وہ قوم جسے وہ کمزور سے کمزور تر کئے جاتا تھا۔ لہٰذا بنی اسرائیل پر خدا کا پہلا انعام یہ تھا کہ اس نے انہیں غلامی کے اس ذلت آمیز عذاب سے نجات دلائی۔

لیکن یہ تو صرف منفیانہ پہلو ہے۔ غلامی کے عذاب سے نجات ملنے سے قوم کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں کچھ حاصل کرنے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب نظر آتا ہے کہ نجات کے اُس مفہوم کے متعلق بھی مختصر الفاظ میں بات کر لی جائے

نجات کا مفہوم

جو ہمارے ہاں عام طور پر رائج ہے اگرچہ اس پر تفصیلی بحث اس کے مقام پر آئے گی جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، عیسائیوں کے ہاں عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ پیدائشی طور پر اپنے اولین ماں باپ کے گناہ کی آلائش اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اس سے اس آلائش کو دور کر دینا نجات کہلاتا ہے، اور یہ حاصل ہوتی ہے حضرت مسیح کے کفارے پر ایمان لانے سے۔ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ ہمیں ہمارے اسلاف کے بعض گناہوں کی وجہ سے کچھ دنوں کے لئے جہنم میں ڈال دیا جائے گا تاکہ ان گناہوں کے جراثیم تلف ہو جائیں اور اس کے بعد ہمیں جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ اس کا نام ہے نجات ——— یعنی عذابِ جہنم سے چھٹکارا پانا۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ ہر بچہ اپنے پچھلے جنم کے کرموں (اعمال) کی پاداش میں مختلف ورنوں (ذاتوں) میں جنم لیتا ہے۔ وہ کروڑہا کروڑ سال تک آواگون (تناسخ) کے ان چکروں میں گردش کرتا رہتا ہے اور آخرالامر اس سے چھٹکارا حاصل کر کے مُکتی (نجات) حاصل کر لیتا ہے۔ ویدانت یا تصوف کا عقیدہ یہ ہے کہ روحِ خداوندی انسانی پیکر میں پہنچ کر مادہ کی کثافتوں سے ملوث ہو جاتی ہے۔ اس کثافت کو مختلف قسم کی ریاضتوں اور مشقتوں سے دور کیا جاتا ہے تاکہ یہ روح پھر اپنی اصل کے ساتھ مل جانے کے قابل ہو جائے۔ مادہ کی کثافت کے اس طرح دور ہو جانے کا نام نجات ہے۔

آپ نے دیکھا کہ دنیا کے تمام مذاہب اور مسالک میں "نجات" کا تصور یہ ہے کہ انسان پہلے پاک اور صاف تھا۔ پھر بعض آلائشوں اور کثافتوں سے ملوث ہو گیا۔ (خواہ یہ کثافتیں پیدائشی ہوں یا گناہوں کی پیدا کردہ) انسانی زندگی کا مقصد ہے کہ ان آلائشوں کو دور کر کے پھر ویسا انسان بن جائے جو آلائشوں سے ملوث نہیں تھا ———

خواہ یہ چیز اس دنیا میں ریاضتوں اور مشقتوں سے حاصل ہو جائے اور خواہ آخرت میں کچھ وقت کے لئے جہنم کی سزا بھگتنے کے بعد ——— طریقِ کار اس کا کوئی بھی ہو، مقصد اس سارے پروگرام کا یہ ہے کہ انسان جیسا پہلے تھا پھر سے ویسا ہی بن جائے۔ مثال کے طور پر آپ یوں سمجھئے کہ صبح کے وقت آپ تندرست اور توانا تھے۔ پھر کسی وجہ سے آپ کو بخار ہو گیا۔ آپ نے اس کی تکلیف برداشت کی، علاج معالجہ کیا۔ شام کو بخار اتر گیا اور آپ پھر ویسے کے ویسے ہو گئے جیسے صبح کے تھے۔ اس تمام پروگرام میں آپ نے کچھ حاصل نہیں کیا۔ یہ ہے نجات کا وہ عام تصور، جو بدقسمتی سے ہمارے ہاں بھی مروج ہے۔ آپ سوچئے کہ اس نظریہ کی رو سے خود خدا کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے؟

خدا پاک اور صاف روحوں کو، انسانی پیکر میں، دنیا میں بھیجتا ہے کہ وہ یہاں پہنچکر گناہوں کی آلائش میں ملوث ہو جائیں۔ پھر انبیاء کرام کی بعثت کا سلسلہ شروع کرتا ہے کہ وہ لوگوں اس آلائش کے دور کرنے کے طریقے بتائیں۔ یہ آلائشیں یہاں صاف نہیں ہوتیں تو انہیں مرنے کے بعد داخلِ جہنم کر دیتا ہے تاکہ اُس بھٹی میں یہ آلائشیں صاف ہو جائیں۔ اور اس طول طویل پروگرام کے بعد جب انسان پھر ویسے ہی بن جائیں جیسے وہ دنیا میں آنے سے پہلے تھے تو انہیں جنت میں بھیج دیتا ہے۔ اور اس پر اس پروگرام کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ آپ سوچئے کہ کیا اس قسم کا پروگرام اس خدا کے شایانِ شان ہو سکتا ہے جو بار بار کہتا ہے کہ ہم نے اس سلسلۂ کائنات کو عبث اور باطل پیدا نہیں کیا۔ اسے تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لئے بالحق پیدا کیا ہے۔

قرآن کریم کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ انسان دنیا میں کسی قسم کے گناہ کی آلائش کے بغیر سادہ لوح کے ساتھ، کچھ مضمر صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتا ہے۔ دنیاوی زندگی میں اس کے سامنے پروگرام یہ ہوتا ہے کہ وہ ان مضمر صلاحیتوں کی اس طرح نشوونما کرے کہ وہ زندگی کی اگلی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ اس اگلی ارتقائی منزل کا نام جنت ہے۔ اسے اس نے "فوز" کہکر پکارا ہے اور فوز کے معنی کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے نہیں بلکہ مثبت طور پر کچھ حاصل کرنے (ACHIEVEMENT) کے ہیں۔ ان اشارات سے آپ نے سمجھ لیا ہو گا کہ قرآنی پروگرام کا مقصد انسان کی "نجات" نہیں، اس کی فوز و فلاح ہے (فلاح کے معنی ہوتے ہیں کھیتی کا برومند اور ثمربار ہونا)۔ اس اجمال کی تفصیل اس مقام پر آئے گی جہاں اُخروی زندگی سے متعلق گفتگو ہو گی۔ یہاں اتنی مزید وضاحت کافی ہو گی کہ "نجات" کے معنی کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بھی ہیں اور مصیبت سے دور رکھنے کے بھی۔ اُخروی نجات اس دوسرے معانی میں ہے۔

اس ضمنی گفتگو کے بعد پھر آیئے اصل موضوع کی طرف۔ قرآن کریم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ خدا نے تمہیں فرعون

کی غلامی کے عذاب سے نجات دلائی۔ یہ پہلی کڑی تھی اس سلسلۂ انعامات کی جس کا ذکر آگے چل کر آتا ہے۔ غلامی کی زندگی میں تمہیں اپنی صلاحیتوں کو نشوونما دینے کے مواقع حاصل نہیں تھے۔ اس سے چھٹکارا پانے کے بعد تمہیں اس کے مواقع حاصل ہوں گے۔ جب تم نے ان مواقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے معاشرہ کو قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل کیا تو اس سے زندگی کے مثبت نتائج تمہارے سامنے آنے شروع ہو گئے۔ اس سلسلہ میں اس نے کہا:۔

تمکن فی الارض

وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۔ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُم مَّا كَانُوا يَحْذَرُونَ (۲۸/۵-۶)

چنانچہ اس مقام پر ہم نے ارادہ کیا کہ وہ قوم جسے فرعون کے استبداد نے کچل کر رکھدیا تھا، اسے اپنی نعمتوں سے نوازا جائے۔ اُسے نہ صرف یہ کہ دوبارہ زندگی مل جائے۔ اسے سربراہی اور سرداری عطا کی جائے۔ اُسے ایک خطۂ زمین کا مالک بنا دیا جائے جس میں وہ اپنی با اختیار مملکت قائم کرے اور فرعون اور اس کے مذہبی پیشواؤں کے سردار، ہامان اور ان کے سب لاؤ لشکر کو وہ کچھ دکھا دیا جائے جسے دیکھنے سے وہ اس قدر خائف تھے۔ اور جس سے محفوظ رہنے کے لئے وہ اس قدر فریب کارانہ حربے استعمال کیا کرتے تھے۔

یہاں سے ہم نے دیکھ لیا کہ انعامِ خداوندی یہی نہیں تھا کہ اس قوم کو فرعون کی محکومیت سے نجات دلائی گئی۔ یہ تو قدمِ اوّل تھا۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ حصولِ آزادی کے بعد اپنی با اختیار مملکت قائم کریں۔ انہیں تمکن فی الارض حاصل ہو۔ اور تمکن بھی اس سرزمین پر حاصل ہو جس پر پہلے قومِ فرعون قابض تھی۔ چنانچہ سورۃ الشعراء میں ہے فَأَخْرَجْنَاهُم مِّن جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ وَكُنُوزٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ ۔ كَذَٰلِكَ ۔ وَأَوْرَثْنَاهَا بَنِي إِسْرَائِيلَ (۲۶/۵۷-۵۹)۔" اور ہم نے قومِ فرعون کو ان کے سرسبز و شاداب باغات، صاف اور شفاف چشموں اور ان کی زمین کے ذخائر و دفائن سے نکال باہر کیا اور ان سے تمام عزت و تکریم کے مقامات چھین لئے اور ان سب کا بنی اسرائیل کو مالک بنا دیا۔" وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مُبَوَّأَ صِدْقٍ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ (۱۰/۹۳)۔" ہم نے بنی اسرائیل کو ایسا تمکن عطا کیا جو سراب نہیں تھا، حقیقت پر مبنی تھا۔ اور ہم نے انہیں نہایت خوشگوار اور پاکیزہ سامانِ زیست عطا کیا ــــــ وہ سامانِ زیست، جس سے پرواز میں کوتاہی آنے کے بجائے۔ حدود ناآشنا قوتیں پیدا ہو جائیں۔"

قرآن کریم نے جماعت مومنین کی خصوصیت ــــــ یا ایمان و عملِ صالحہ کا لازمی نتیجہ ــــــ یہ بتایا ہے کہ یہ

اُمت دنیا کی ہر قوم پر غالب اور ان کے مقابلہ میں سر بلند اور سرفراز ہوگی۔ وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ (۳/۱۳۸) اقبالؒ نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:-

مؤمنے بالائے ہر بالا ترے غیرتِ اُو برنتابد ہمسرے

جماعتِ مومنین، دنیا کی ہر قوم کے مقابلہ میں بلند تر ہوتی ہے کسی کا اس کے آگے نکل جانا تو درکنار، اس کی غیرت اسے بھی برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی اور قوم اس کی ہمدوش ہو۔ یہی وہ انعامِ خداوندی تھا جس سے بنی اسرائیل کو نوازا گیا تھا، جب اس سے کہا کہ اِنِّىۡ فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ (۲/۴۷ ؛ ۲/۱۲۲) "ہم نے تمہیں تمہاری ہم عصر اقوام پر برتری عطا فرمائی"۔ دوسرے مقام پر کہا ہے۔ وَلَقَدِ اخۡتَرۡنٰهُمۡ عَلٰى عِلۡمٍ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ (۴۴/۳۲) "یہ قوم دیگر ہم عصر اقوامِ عالم کے مقابلہ میں منتخب قوم تھی اور ان کا یہ انتخاب یونہی "مرحمتِ خسروانہ" کے طور پر عمل میں نہیں لایا گیا تھا۔ یہ علم و بصیرت پر مبنی تھا"۔

حکومت تو محض قوت کے بل بوتے پر بھی حاصل ہو سکتی ہے، اور اگر اس قوت میں اضافہ ہوتا چلا جائے تو اس سے دیگر اقوام پر غلبہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے ——— تاریخ انسانیت، چنگیز اور ہلاکو قسم کے پیکرانِ غلبہ و تسلط کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ لیکن جس حکومت کو قرآنِ کریم نعمتِ خداوندی قرار دیتا ہے اس کی بنیاد محض قوت پر نہیں ہوتی۔ اس کی بنیاد اس پر ہوتی ہے کہ قوت کو ان قوانین کے ساحلوں میں محصور رکھا جائے جو وحی کی رُو سے عطا ہوں۔ اس مملکت کو اس نے "ایمان اور اعمالِ صالحہ" کا نتیجہ بتایا ہے (۲۴/۵۵)۔ چنانچہ بنی اسرائیل کی افضلیت کے سلسلہ میں اس حقیقت کو بڑے واضح الفاظ میں بیان کر دیا جہاں کہا کہ:-

کتاب و حکومت و نبوّت

وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ الۡكِتٰبَ وَالۡحُكۡمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقۡنٰهُمۡ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلۡنٰهُمۡ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ (۴۵/۱۶)۔

اور ہم نے بنی اسرائیل کو ضابطۂ قوانین عطا کیا۔ انہیں حکومت اور مملکت دی اور ان میں انبیاء کو مبعوث کیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ انہیں نہایت خوشگوار اور پاکیزہ سامانِ زیست میسر آیا اور اپنی ہم عصر اقوام پر برتری بھی حاصل ہوگئی۔

یہ تھے وہ انعاماتِ خداوندی، جن کی یاد بنی اسرائیل کو دلائی گئی۔ سوال یہ ہے کہ اس یاد دہانی سے مقصود کیا تھا؟ اس سے انہیں یہ بتانا مقصود تھا کہ تم نے جب قوانینِ خداوندی کو پسِ پشت ڈالا تو قومِ فرعون کی ذلّت آمیز،

رسواکن اور اذیت رساں محکومی کے عذاب میں مبتلا ہوگئے۔ اُس کے بعد جب تم نے اُن قوانین کا اتباع کیا تو تمہیں مملکت، حکومت، رزقِ طیب، غلبہ و برتری غرضیکہ دنیا کی تمام نعمتیں حاصل ہوگئیں۔ اس کے بعد تم نے پھر قوانینِ خداوندی سے منہ موڑ لیا تو تمہاری یہ حالت ہوگئی جس میں تم اِس وقت زندگی گزار رہے ہو۔ حکومت و سطوت تو ایک طرف، تمہیں اس آسمان کے نیچے، اور خدا کی وسیع سرزمین پر، کہیں ٹک کر بیٹھنے کو جگہ نہیں مل رہی۔ تمہیں دنیا نہایت نفرت اور حقارت کی نگاہوں سے دیکھتی اور صحرانورد، خانماں خراب (WANDERING JEWS) کہہ کر پکارتی ہے لیکن تمہاری یہ محرومی اور نامرادی ابدی نہیں۔ اس سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے سلسلہ میں تمہارے لئے بازآفرینی کا ایک موقعہ آیا تھا، تم نے اسے ضائع کر دیا۔ اب پھر ایک موقعہ آیا ہے۔ اگر تم اس سے فائدہ اٹھا لو تو تمہیں پھر وہی سرفرازیاں اور سربلندیاں حاصل ہو جائیں گی۔ تمہیں یاد ہوگا (اور اس حقیقت کے بچے کھچے آثار تو تمہاری محرف کتابوں میں آج تک موجود ہیں کہ) جب تمہارے مورثِ اعلیٰ، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا مانگی تھی کہ دنیا اور آخرت کی خوشگواریاں تمہارے نام لکھ دی جائیں۔ تو ہم نے کہا تھا کہ یہ خوشگواریاں یونہی ابدی طور پر کسی قوم کے نام نہیں لکھی جایا کرتیں۔ اگر یہ قوم ہماری متعین روش پر چلتی رہی تو ان خوشگواریوں سے بہرہ یاب رہے گی۔ لیکن اگر اس نے اس راستہ کو چھوڑ دیا تو پھر مصائب و آلام کے بادل اُمڈ کر آجائیں گے۔ بایں ہمہ، ان کی یہ محرومی ابدی نہیں ہو گی۔ ان کے لئے آخرالامر بازآفرینی کا ایک موقع آئے گا اور وہ اس طرح کہ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ (۷/۱۵۷)۔ "انہیں اس رسول کا اتباع کرنا ہوگا جس کی نشاندہی تورات اور انجیل میں کرا دی گئی ہے۔ یعنی رسولِ آخرالزمان نبیٔ امّی کا اتباع"۔ اور یہ ان کے لئے آخری موقعہ ہوگا کیونکہ اس کے بعد کوئی رسول نہیں آئے گا۔[1] اسی کے لئے کہا گیا وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (۲/۴۰)۔ "تم نے جو وعدہ مجھ سے کیا تھا، اُسے پورا کرو تو میں نے جو وعدہ تم سے کیا تھا، میں وہ پورا کر دوں گا"۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ دیکھئے کہ یہاں جو کہا گیا ہے کہ "تم یہ کرو تو میں وہ کر دوں گا"۔ اس کی تشریح مطالب الفرقان

---

[1] یہود اور نصاریٰ، دونوں اس آنے والے کا انتظار کر رہے تھے، اور اب تک انتظار کر رہے ہیں، جس کا وعدہ ان کی کتابوں میں موجود تھا (اور موجود ہے)۔ وہ آنے والا (صلی اللہ علیہ وسلم) آ کر چلا بھی گیا اور یہ اب تک اس کا انتظار کر رہے ہیں —— اور جائے عبرت کہ ان کی دیکھا دیکھی، خود مسلمان بھی ایک آنے والے کا انتظار کر رہے ہیں۔ یا للعجب! ۔

جلد اول میں "تقدیر" کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے بڑی شرح وبسط سے کی گئی ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لینا ضروری ہے۔ (ملاحظہ ہوں صفحات ۱۶۲ اور ۱۸۵–۱۸۰)۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کا اتباع کرو تو اس کے نتائج خود بخود تمہارے سامنے آجائیں گے۔

میثاقِ بنی اسرائیل

بنی اسرائیل کے اس عہد کو "میثاق" کہہ کر بھی پکارا گیا ہے۔ بنیادی طور پر وہ یہ تھا کہ ——— وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ (۲/۸۳)۔ یعنی "بنی اسرائیل سے یہ عہد لیا گیا تھا: انہیں حکم یہ دیا گیا تھا کہ قوانینِ خداوندی کے سوا کسی کی اطاعت نہ کریں"۔ چونکہ وہ قوانین اب نبیٔ اکرم (صلے اللہ علیہ وسلم) کی وساطت سے عطا کئے گئے ہیں اس لئے ان کی اطاعت اسی رسولؐ کی اتباع کی شکل میں ہو سکتی ہے۔ یہ تو اُس میثاق یا عہد کا مرکزی نقطہ تھا۔ اس کی تفاصیل مختلف مقامات پر دی گئی ہیں مثلاً (۲/۸۳؛ ۵/۱۲) میں اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ وغیرہ کو سامنے لایا گیا ہے۔ (۵/۱۲) میں رسولوں کے اتباع کی تائید کی گئی ہے۔ (۴/۱۵۴) میں سبت کی پابندی کی تاکید ہے۔ (۲/۸۴) میں کہا گیا ہے کہ وہ باہمی خونریزی نہ کریں اور اپنی ہی قوم کے کمزور لوگوں کو ان کے گھر بار سے نہ نکال باہر کریں۔ (۲/۶۳؛ ۲/۹۳) میں کہا گیا ہے کہ وہ اس کتابِ خداوندی کو محکم طور پر تھام لیں جو اُن کی طرف نازل کی گئی ہے۔ (۷/۱۶۹) میں کہا گیا ہے کہ وہ خدا کے خلاف افترا پردازی سے کام نہ لیں۔ یعنی خود ہی مختلف احکامات وضع کرکے انہیں شریعتِ خداوندی کا نام دے کر لوگوں سے اپنی اطاعت نہ کرائیں۔

یہ تھے وہ عہد جو اُن سے لئے گئے تھے لیکن انہوں نے اِس عہد و میثاق کو اُٹھا کر پھینک دیا (۳/۱۸۶)۔ یہی وہ نقضِ عہد تھا جس کے نتیجہ میں دنیا بھر کی ذلتیں اور رسوائیاں سائے کی طرح ان کے پیچھے لگ گئیں (۴/۱۵۵)۔ اور ان کے دل پتھر ہو گئے (۵/۱۳)۔

محکومی اور غلامی، نکبت و زبوں حالی، ذلّت اور پستی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم احساسِ کمتری کے نفسیاتی مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس سے جرأت اور بسالت، حق گوئی اور بیباکی کے جوہرِ انسانیت تلف ہو جاتے یا دب کر رہ جاتے ہیں۔ ان کے قلوب خوف و حزن کے کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ توہم پرستی کی رسیاں انہیں سانپ بن کر ڈراتی ہیں۔ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ (۶۳/۴)۔ "کہیں کوئی پتہ کھڑکے تو ان کی جان جاتی ہے کہ آئی کوئی نئی مصیبت!" اسی ڈر اور خوف کی وجہ سے وہ منافقت کا شیوہ اختیار کر لیتے ہیں۔ نزولِ قرآن کے زمانہ میں یہودیوں کی یہی حالت ہو چکی تھی اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا تھا کہ تم نے جو عہد میرے ساتھ

کیا تھا اُسے پورا کرو۔ تم کسی سے مت ڈرو۔ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ (۲/۴۰) اس کا عام ترجمہ ہے "صرف مجھ سے ڈرو" اور یہ نکتہ تھوڑی سی وضاحت چاہتا ہے۔

خوف، خشیت، رہب وغیرہ کا ترجمہ خوف یا ڈر ہی کیا جاتا ہے لیکن مادہ کے اعتبار سے ان کے معانی میں خفیف اور لطیف سا فرق ہوتا ہے اور اسی وجہ سے قرآن کریم میں یہ الفاظ مختلف مواقع پر مختلف مفاہیم کے ساتھ آئے ہیں۔ انسان میں جب کوئی کمزوری پیدا ہو جائے تو اُسے اپنے غیر محفوظ ہونے کا خطرہ لاحق رہتا ہے اور وہ ہر وقت اپنی حفاظت کی تدابیر سوچتا رہتا، اور اس وجہ سے لرزاں و ترساں رہتا ہے اس کی اس کیفیت کو رَهْبٌ کہتے ہیں، اس عدمِ تحفظ کے احساس کا نتیجہ منافقت ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے منافقین کے متعلق کہا ہے کہ، لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِي صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۵۹/۱۳) "ان کے دلوں میں خدا کے مقابلہ میں انسانوں کا خوف زیادہ شدید ہوتا ہے اور یہ اس لئے کہ یہ پیش آئند معاملات پر فہم و فراست سے غور و فکر نہیں کرتے۔ موہوم خطرات کی وجہ سے ڈرتے رہتے ہیں۔"

خدا سے ڈرنے کا مفہوم

اس مقام پر ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہم آیت (۲/۳۸) میں دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ ہدایاتِ خداوندی کے اتباع کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ہر قسم کے خوف اور حزن سے مامون ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآنِ کریم میں دیگر مقامات پر بھی دہرایا گیا، اور اسے بہت بڑا انعامِ خداوندی قرار دیا گیا ہے۔ ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ خوف کے احساس سے کس قدر تباہ کن نفسیاتی امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جب "خوف" اس قدر تباہیوں کا موجب ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ کیوں کہا ہے کہ "مجھ سے خوف کھاؤ" خوف بہرحال خوف ہے، خواہ وہ کسی کی طرف سے بھی کیوں نہ ہو۔ یہ سوال اس لئے ابھرتا ہے کہ ہم "خوف" کے ایک ہی معنی لیتے ہیں، حالانکہ خوف اور خوف میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ایک خوف وہ ہے جو کسی مستبد حکمران کی دھاندلی اور تشدد کے احساس سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسری قسم کا خوف وہ ہے جو کسی غلط اقدام کے تباہ کن نتیجہ کے احساس سے لاحق ہوتا ہے۔ ہم بچے کو ڈراتے ہیں کہ آگ کے پاس نہ جانا، تمہاری انگلی جل جائے گی، اسے خوف نہیں کہا جائے گا بلکہ غلط اقدامات سے احتیاط برتنے کا احساس کہا جائے گا۔ اسے اندیشہ یا خدشہ کہہ لیجئے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ چنانچہ عربی زبان میں "خوف" کا یہ مفہوم بھی ہے۔ اس اعتبار سے اَلْخَافَةُ اس چرمی جبّہ کو کہتے ہیں جسے چھتے سے شہد نکالنے والا

اوڑھ لیتا ہے تاکہ وہ مکھیوں کے ڈنگ سے محفوظ رہے۔ نیز اس تھیلے کو بھی کہتے ہیں جس میں کسی شے کو محفوظ رکھنے کے لئے، بند کر دیا جائے۔ اس نہج سے دیکھئے تو خدا سے ڈرنے کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس کے قوانین کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج کا احساس کر کے ان سے اجتناب کیا جائے، بچا جائے۔ قرآن کریم کے متعلقہ مقامات پر غور کرنے سے "خوفِ خدا" کا یہ مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً سورۃ النّٰزعٰت میں ہے: وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى (۷۹/۴۰)۔ "جو شخص مقامِ خداوندی سے ڈرتا ہے اور اپنے آپ کو پست جذبات سے باز رکھتا ہے" یہاں خوف کے معنی بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی اپنے پست جذبات کے اتباع کے نقصان رساں نتائج کا احساس کرتے ہوئے ان سے احتیاط برتنا۔ سورۃ بقرۃ میں ہے: فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ.... (۲/۲۲۹) "اگر تمہیں اس کا ڈر ہو کہ تم حدود اللہ کو قائم نہیں رکھ سکو گے تو........" یہاں بھی خوف کے معنی واضح ہیں (نیز دیکھئے ۴/۳ و ۴/۳۵)۔ سورۃ الانعام میں نبی اکرم (صلے اللہ علیہ وسلم) کی زبانِ مبارک سے کہلایا گیا کہ: اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۶/۱۵)۔ "اگر میں بھی قوانینِ خداوندی کی نافرمانی کروں تو مجھے بھی یومِ عظیم کے عذاب سے ڈرنا ہوگا" (نیز دیکھئے ۱۰/۱۵ و ۳۹/۱۳)۔

یہی مفہوم "خشیتِ الٰہی" کا بھی ہے۔ عربوں کے ہاں شَجَرَةٌ خَاشِيَةٌ ایسے درخت کو کہتے تھے جو پانی نہ ملنے کی وجہ سے خشک ہو جائے، لیکن اس طرح خشک نہ کہ اس کے پھر سے سرسبز ہو جانے کی توقع ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے بھی وہی مراد ہے۔ یعنی تم اس احساس سے غافل نہ ہو کہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی سے تمہاری کھیتیاں جھلس جائیں گی؛ تمہارا نخلِ تمنا خشک ہو جائے گا۔

ان مقامات سے واضح ہے کہ خدا کے خوف، خشیت یا رَهْبٌ کا مفہوم اُس خوف اور ڈر سے مختلف ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان سے لاحق ہوتا ہے۔ یہ خوف اس انسان کی طرف سے لاحق ہوتا ہے جس سے یا تو تمہاری کچھ امیدیں وابستہ ہوں یا جس سے تمہیں کسی نقصان کا اندیشہ ہو۔ ان وجوہات سے پیدا ہونے والے خوف سے محفوظ اور مامون رہنے والوں کے متعلق کہا کہ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۚ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ (۲۱/۹۰)۔ "یہ لوگ جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت، دونوں صورتوں میں، ہمارے قوانین کو پکارتے تھے اور ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے تھے۔ ان کی اطاعت کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان کے سینے میں انسانوں کا خوف باقی نہیں رہتا تھا" اس نے دوسرے مقام پر کہا کہ انسان انہی لوگوں سے خائف ہوتا ہے جنہیں وہ صاحبِ اقتدار سمجھ لیتا ہے۔ اگر اس کا ایمان ہو کہ اقتدار صرف خدا کو حاصل تو پھر وہ کسی انسان سے خائف نہیں ہوتا۔ سورۃ النّحل میں ہے:

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰـهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ (۱۶/۵۱)۔ "خدا کا حکم یہ ہے کہ تم اپنے لئے دو اِلٰہ تجویز نہ کرو۔ اِلٰہ صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے اللہ کی ذات۔ لہٰذا تم صرف اس کے قوانین کی خلاف ورزی کے نتائج سے ڈرو"۔ یہ جو یہاں اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ (دو اِلٰہ) کہا گیا ہے تو اس کی تشریح دوسرے مقام پر ان الفاظ میں کر دی کہ: وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ (۴۳/۸۴)۔ "سماء میں بھی وہی اللہ ہے اور ارض میں بھی وہی اِلٰہ"۔ اس نکتہ کی وضاحت مطالب الفرقان (جلد اول) میں زیرِ آیت (۱/۱) (صفحات ۱۰-۹ پر) کی گئی ہے۔ یہاں اتنا دہرا دینا کافی ہے کہ مذہب میں یہی ثنویت رائج ہوتی ہے۔ خدا کے متعلق سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس کا حیطۂ اقتدار آسمانوں پر ہے اور دنیاوی معاملات کا تعلق انسانی حکومتوں سے ہے۔ اس میں آسمانی اِلٰہ کا تصور محض نظری حیثیت لئے رہتا ہے۔ لیکن ارضی خداؤں کا خوف ہر وقت اعصاب پر مسلط رہتا ہے۔ اسی کا نام شرک ہے اور شرک کا لازمی نتیجہ خوف۔ اقبال کے الفاظ میں:-

آنکہ رمزِ مصطفیٰؐ فہمیدہ است — شرک را در خوف مضمر دیدہ است

(اسرار و رموز ص۱۱۱)

بنا بریں، جب اللہ تعالیٰ نے یہودیوں سے کہا کہ: وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ (۲/۴۰) تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت تم نے دنیا میں مختلف اِلٰہ تجویز کر رکھے ہیں جن سے تم ہر وقت ڈرے اور سہمے رہتے ہو۔ تم اگر قوانینِ خداوندی کی صداقت پر پھر سے ایمان لے آؤ اور ان کے مطابق زندگی بسر کرو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے دل میں کسی انسان کا ڈر اور خوف باقی نہیں رہے گا۔ احساس ہوگا تو فقط اس کا کہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے کیونکہ اس کا نتیجہ واقعی ایسا ہوگا جس سے انسان کو ڈرنا چاہیئے۔ اسی کی تاکید کرتے ہوئے ان سے کہا کہ:-

۲/۴۱ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۖ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ۔

اِس آیت کے پہلے حصہ کا ترجمہ یہ ہے کہ "تم اس قرآن پر ایمان لاؤ جو نُزِّلَ مِنَ اللہ ہے اور جو مصدق ہے، اُس کا جو تمہارے پاس ہے۔ ایسا نہ کرو کہ تم اس سے انکار کرنے والوں میں پیش پیش ہو"۔ ہم مطالب الفرقان

قرآن پر ایمان لانے کی دعوت

کی پہلی جلد میں بتا چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دوسرے انسانوں کیساتھ اہلِ کتاب کو بھی دعوت دی تھی کہ وہ رسالتِ محمدیہ پر ایمان لائیں۔ (دیکھئے جلد اول ص۸۳)۔ سوال یہ ہے کہ جب قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ ایک ہی دین تھا جو حضرت نوح علیہ السلام سے لیکر نبی اکرم

(صلی اللہ علیہ وسلم) تک جملہ انبیاء کرامؑ کو خدا کی طرف سے دیا جاتا رہا تو پھر انبیاء سابقہ کی امتوں (یہود و نصاریٰ وغیرہ) سے یہ کیوں کہا گیا کہ وہ قرآن کریم پر ایمان لائیں۔ ان کے پاس اُن کی کتابیں موجود تھیں جن پر وہ ایمان رکھتے تھے تو اس کے بعد قرآن پر ایمان لانے کا مطالبہ کیوں کیا گیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک اپنی اصل و اساس کے اعتبار سے دین ایک ہی تھا جو مختلف انبیائے کرام کی طرف نازل کردہ کتابوں میں دیا گیا تھا لیکن ان انبیاء کے نام لیواؤں میں سے کسی کے پاس بھی وہ کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں رہی تھی جو ان کے نبی کی وساطت سے انہیں ملی تھی۔ ہمارا یہ دعویٰ یونہی بلا سند اور بلا دلیل (محض قرآن کریم کی عظمت اور افضلیت ثابت کرنے کے لئے) نہیں۔ یہ حقیقت پر مبنی ہے۔ میں نے اپنی کتاب —— مذاہب عالم کی مبینہ آسمانی کتابیں —— میں مختلف مذاہب کے مدعیوں کی تصانیف اور تاریخ کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں سے کسی کے پاس بھی وہ کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں جو ان کے رسول نے انہیں دی تھی۔ چونکہ اس مقام پر بات، یہودیوں کے متعلق ہو رہی ہے اس لئے مناسب سمجھا گیا ہے کہ ان کی مبینہ آسمانی کتاب، تورات کی مختصر سی تاریخ پیش قارئین کر دی جائے۔ لیکن اس تاریخ کو سامنے لانے سے پہلے قرآن کریم کے اس دعویٰ کو دیکھئے جس میں اس نے کہا ہے کہ یہ لوگ اپنی کتابوں میں دیدہ دانستہ تحریف کرتے تھے۔ اس تحریف کی پہلی شکل تو وہ تھی جسے اس نے

تحریف

زیر نظر آیت سے متصل آیت میں ان الفاظ میں بیان کیا کہ: وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (۲/۴۲) "تم نہ تو تلبیس حق و باطل کرو اور نہ ہی دیدہ دانستہ کتمانِ حقیقت"۔ سورۃ آلِ عمران کی آیات (۳/۷۰ ; ۳/۱۹۹) نیز سورۃ المائدۃ کی آیت (۵/۱۲) اور سورۃ الانعام کی آیت (۶/۹۲) میں بھی ان کے انہی اقدامات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ تلبیسِ حق و باطل کے معنے یہ ہیں کہ احکامِ خداوندی اور اپنی خود ساختہ شریعت کو اس طرح خلط ملط کر دینا کہ ان میں امتیاز اور پہچان مشکل ہو جائے۔ اور کتمانِ حقیقت کے معنی ہیں کہ اصل بات کو چھپائے رکھنا۔ یہ مذہبی پیشوائیت کی عام روش ہے، خواہ ان کا تعلق کسی مذہب سے ہو۔ وہ کرتے یہ ہیں کہ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ (۲/۷۹) "خود احکام وضع کرتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ شریعتِ خداوندی ہے"۔ کبھی وہ یہ کرتے ہیں کہ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ (۴/۴۶) "وہ احکامِ خداوندی کو ان کے صحیح مقامات سے ہٹا کر اِدھر اُدھر کر دیتے ہیں اور پھر ان کی من مانی تاویلوں اور تفسیروں سے ان کا کچھ سے کچھ مفہوم متعین کر دیتے ہیں"۔ (نیز دیکھئے ۵/۱۳ ; ۵/۴۱)۔

اللہ تعالیٰ نے منزل من اللہ کتاب کی خصوصیتِ کبریٰ یہ بتائی ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا (۴/۸۲)۔ اور اس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کی ملنے والی امت میں بھی کوئی اختلاف اور تفرقہ پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جب کتابِ خداوندی کے ساتھ وہ کچھ کیا جائے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کتاب میں بھی

اختلافات

اختلافات پیدا ہو جائیں گے اور اس کی ملنے والی قوم بھی فرقوں میں بٹ جائے گی۔ یہی کچھ کتابِ موسیٰؑ کے ساتھ ہوا تھا۔ قرآن کریم کے الفاظ میں وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ (۴۱/۴۵) "یہ حقیقت ہے کہ دیگر انبیائے کرام کی طرح حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو بھی خدا کی طرف سے کتاب دی گئی تھی لیکن اس کتاب میں اختلافات پیدا کر دیئے گئے" اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قوم مختلف فرقوں میں بٹ گئی اور ہر فرقہ کے علماء اور مشائخ خدا بن کر بیٹھ گئے۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۹/۳۱)۔ "ان لوگوں نے اپنے علماء و مشائخ کو خدا سے ورے ہی اپنا معبود بنا لیا"۔

یہ تھے وہ الزامات، جو قرآنِ کریم نے یہودیوں کے خلاف عائد کئے تھے اور انہی کی بناء پر اُن سے کہا تھا کہ انہیں جو تعلیم سابقہ انبیائے کرام کی وساطت سے ملی تھی، وہ ان کے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں، وہ اب قرآنِ کریم ہی میں ملے گی۔ اس لئے اگر وہ حیاتِ نو کے متمنی ہیں تو انہیں چاہیئے کہ وہ اس کتاب پر ایمان لائیں۔ اب یہ دیکھئے کہ قرآنِ کریم کے اس دعویٰ کی تصدیق تاریخی شواہد سے کس طرح ہوتی ہے۔

تورات کی تاریخ

سب سے پہلے اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ تورات صرف اس کتاب کا نام نہیں جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا گیا تھا۔ یہ مجموعہ ہے ان تمام صحف کا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد کے انبیائے بنی اسرائیل کو وقتاً فوقتاً ملتے رہے۔ یہ مجموعہ (۳۹) کتابوں پر مشتمل ہے جنہیں علمائے یہود تین سلسلوں میں منقسم کرتے ہیں:-

(۱) سلسلۂ اوّل۔ تورات (یا قانون)۔ اس میں پانچ کتابیں (اسفار) شامل ہیں جنہیں کتبِ موسیٰ کہا جاتا ہے ــــ پیدائش ــــ خروج ــــ احبار ــــ گنتی اور استثناء ــــ قرآنِ کریم میں تورات (یعنی عہدِ عتیق) کو کہیں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب نہیں کیا گیا۔ ان کے صحف ہی کا ذکر آیا ہے (۵۳/۳۶ ؛ ۸۷/۱۹)۔

(۲) سلسلۂ دوم۔ نبیم۔ اس میں چھوٹی بڑی بائیس کتابیں شامل ہیں ــــ اور

(۳) سلسلۂ سوم۔ کیتبیم۔ اس میں بارہ کتابیں شامل ہیں جن میں سے ایک زبور بھی ہے۔

یہ کتابیں (جیسی کچھ بھی ہیں) آج موجود ہیں، لیکن ان میں بعض ایسی کتابوں کا حوالہ آتا ہے جن کا وجود اس مجموعہ میں کہیں نہیں ملتا۔ اس قسم کی کم از کم گیارہ کتابیں گنائی جا سکتی ہیں۔ جہاں تک ان پانچ کتابوں کا تعلق ہے جنہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات اور اس کے بعد کے حالات بھی موجود ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کتابوں کا کم از کم کچھ حصہ بعد کا اضافہ ہے۔ عہد نامۂ عتیق کی کتابوں کے متعلق یہ تحقیق ثابت نہیں ہو سکا کہ یہ ابتداءً کس عہد میں مدوّن ہوئیں اور ان کے مؤلف کون تھے۔ البتہ اتنا ضرور متحقق ہے کہ ایک زمانہ ایسا آیا تھا جب ان کا وجود ناپید ہو چکا تھا اور اس کے بعد از سرِ نو ان کی تدوین عمل میں آئی تھی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب بخت نصر نے یروشلم پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے الواحِ تورات اور دیگر تبرکات کو (یہودیوں کے قول کے مطابق) ہیکل میں محفوظ رکھا تھا۔ بخت نصر نے ان سب کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیا اور یہودیوں کو گرفتار کر کے بابل لے گیا۔ قریب ایک سو سال کے بعد جب یہودیوں نے یروشلم میں دوبارہ بسنا شروع کیا تو انہیں اپنے گم گشتہ مصاحف کی ترتیبِ نو کی فکر ہوئی۔ تورات کے بیان کے مطابق، عذرا فقیہہ نے اپنی یادداشت کے مطابق سلسلۂ اول کی پانچ کتابوں کو مرتب کیا۔[1] اس کے بعد نحمیاہ نبی[2] نے سلسلۂ دوم کی کتابوں کو مرتب کیا۔ لیکن، اس کے بعد، جب یونانیوں نے فلسطین کو تباہ کیا تو انہوں نے ان تمام صحیفوں کو جلوا دیا اور تورات کی تلاوت کو حکماً بند کر دیا۔ اس کے بعد یہودیوں کے احبار و رہبان نے ان کتابوں کو از سرِ نو مرتب کرنا شروع کیا اور ان انتالیس کتابوں کے سلسلہ کو مکمل کیا جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ لیکن جب ۷۰ء میں رومی گورنر ٹائٹس نے بیت المقدس کو تباہ کیا تو پھر یہودی اس میں آ کر آباد نہ ہو سکے۔ ٹائٹس ان مقدس صحیفوں کو ہیکل سے نکال کر فتح کی یادگار کے طور پر روما کے محلات میں لے گیا۔ یہودیوں کی مرکزیت فنا ہو چکی تھی، ان کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ مختلف مقامات پر ان کے علماء نے انفرادی طور پر پھر ان کتابوں کو مدوّن کیا۔ یہودیوں کی اپنی زبان قدیم عبرانی تھی۔ لیکن بابل سے مراجعت کے بعد ان کی زبان ارامی ہو گئی۔ عذرا فقیہہ نے عہدِ عتیق کی کتابوں کس زبان میں لکھا تھا، یہ بالتحقیق معلوم نہیں۔ اس لئے کہ ان کی مرتب کردہ کتابوں کا بھی دنیا میں کہیں وجود نہیں۔ لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ انہوں نے ان کتابوں کو یا تو یہودیوں کی اصل زبان عبرانی قدیم میں لکھا ہو گا یا پھر بعد کی زبان (ارامی)

---

[1] اس کے مرتب کرنے کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔ اسے میری کتاب — مذاہبِ عالم کی مبینہ آسمانی کتابیں — میں دیکھئے۔

[2] یہودیوں کے ہاں ہیکل کے ایک منصبدار کو بھی نبی کہہ کر پکارتے تھے جس کا منصب پیش گوئیاں کرنا ہوتا تھا۔ یا لوگوں کو ان کی "قسمت" بتانا۔

ہیں۔ لیکن دنیا جن کتابوں سے روشناس ہوئی وہ سب کی سب یونانی زبان میں تھیں۔ اور انہیں سے پھر ان کا ترجمہ عبرانی زبان میں ہوا۔ ان عبرانی نسخوں میں بیحد اختلافات ہیں۔ گیارھویں صدی عیسوی میں ان کے تقابل سے ایک متفق علیہ نسخہ مرتب کیا گیا جو اب تک مروج ہے۔ اس نسخہ میں مذکورہ صدر اختلافات کو حاشیہ پر لکھ دیا گیا۔ ان کا پہلا ایڈیشن ۱۴۸۸ء میں چھپا لیکن جب ۱۵۲۵ء میں دوسرے ایڈیشن کا انتظام کیا گیا تو پہلے ایڈیشن کے نسخہ سے بارہ ہزار جگہ اختلاف کرنا پڑا۔ دوسرے ایڈیشن کا ہی نسخہ اب عام طور پر رائج ہے۔

یہ ہے اس کتاب (یا مجموعۂ کُتب) کی تاریخی حیثیت، جسے یہودی اپنے انبیاء کی کتابیں کہکر، ان پر اپنے مذہب کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ان تاریخی شواہد کے علاوہ، اگر عہدِ عتیق کی ان کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کا ایک ایک ورق پکار پکار کر کہدے گا کہ یہ کسی صورت میں بھی خدا یا انبیائے کرامؑ کی طرف منسوب کی جانے کے قابل نہیں۔

وحی کی دو قسمیں

جہاں تک تلبیسِ حق و باطل کا تعلق ہے، یہودیوں کے ہاں یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وحی کی دراصل دو اقسام تھیں۔ ایک تورہ شب کتب۔ یعنی وحیٔ مکتوب (یا وحیٔ متلو) اور دوسری تورہ شب علفہ۔ یعنی وحیٔ غیر مکتوب (یا وحیٔ غیر متلو)۔ یہ وحیٔ غیر مکتوب حضرتِ ہارون علیہ السلام اور ان کی اولاد کی وساطت سے بسلسلۂ روایات آگے بڑھتی گئی۔ دوسری صدی عیسوی کے آخر تک ان روایات کا ایک طومار اکٹھا ہو گیا تھا جسے ربی یہودہ نے ایک جگہ جمع کیا۔ اس مجموعہ کا نام مشنا ہے پھر اس مجموعہ کی تشریحات و تفسیرات یکجا کی گئیں۔ اس کا نام جمارا ہے۔ ان دونوں کے مجموعہ کو تالمود کہتے ہیں۔ تالمود بھی یہودیوں کے ہاں تورات کی سی اہمیت رکھتا ہے بلکہ تورات سے بھی زیادہ۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ مجموعہ، تورات کی تفسیر ہے اور وحی کا ہم پایہ (مثلہ معہٗ)۔

یہ تو تھا سلسلۂ روایات۔ اس کے علاوہ ایک اور ذخیرہ بھی تھا جو اس سے زیادہ پر پیچ اور مخفی راستوں سے جمع کیا گیا تھا۔ عذرا فقیہہ کے متعلق مشہور تھا کہ جب انہوں نے تورات کی پانچ کتابوں کو مرتب کیا تو اس کے

باطنی علم

ساتھ ستر مخفی ملفوظات بھی مدون کئے تھے جو باطنی علم پر مبنی تھے اور ان کی تعلیم پوشیدہ طور پر خواص تک محدود تھی۔ عذرا فقیہہ کا اپنا بیان ہے کہ ان دوسو چار کتابوں کے متعلق جو اس نے مرتب کی تھیں، اس بلند و بالا ہستی کا ارشاد ہوا کہ:-

> ان کے پہلے حصہ کو عام طور پر شائع کر دو تاکہ اہل اور نا اہل سب انہیں پڑھ سکیں۔ لیکن دوسرے حصہ کی ستر کتابوں کو مخفی رکھو اور صرف انہیں کو دو جو لوگوں میں سمجھ بوجھ کے مالک ہوں۔ کیونکہ یہی

لوگ ہیں جن میں فہم و فراست کا چشمہ، عقل کا منبع اور علم کا دریا ہے۔[1] (عزرا حوالہ ص ۲۲۶ پر دیکھئے)

یہ تھی یہودیوں کے ہاں (مبینہ) آسمانی راہنمائی کی حالت، جس کے پیشِ نظر ان سے کہا گیا تھا کہ اگر وہ حیاتِ نَو کے متمنی ہیں تو انہیں چاہیئے کہ وہ خدا کی اس آخری کتاب (قرآنِ عظیم) اور خدا کے اِس آخری رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لائیں۔

مُصدِّق کے معنی

ضمناً، قرآنِ کریم کے متعلق متعدد مقامات پر کہا گیا ہے: مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ (۲/۴۱)۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "یہ قرآن تصدیق کرتا ہے ان کتابوں کی جو اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کے پاس ہیں"۔ آپ سوچیئے کہ یہود و نصاریٰ[2] کی جن کتابوں کی کیفیت وہ تھی جو اوپر بیان کی گئی ہے اور جن کے متعلق خود قرآن کریم نے بار بار کہا ہے کہ وہ محرف تھیں، کیا قرآنِ کریم ان کتابوں کے سچا ہونے کی تصدیق کریگا؟ لفظِ 'مصدّق' کے معنی تصدیق کرنے والا نہیں۔ اس کے معنی ہیں سچ کر دکھانے والا۔ یہود و نصاریٰ کی آسمانی کتابوں میں (جس شکل میں بھی وہ نزولِ قرآن کے وقت موجود تھیں) بہت سے قرآنی دعاوی کا ذکر تھا۔ مثلاً یہ کہ خدا کی حکومت زمین پر اسی طرح قائم ہوگی جس طرح اس کی حکومت آسمان پر قائم ہے۔ دینِ خداوندی کا غلبہ ہوگا، حق کی فتح ہوگی، باطل شکست کھا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ایک آنے والا آئے گا اور وہ ایسا کرکے دکھائے گا۔ اُن سے کہا گیا کہ جس آنے والے کا تمہیں انتظار تھا، وہ آگیا اور اپنے ساتھ وہ کتاب لایا ہے جو خدا کے ان وعدوں کو عملاً سچ کر دکھائے گی جن کا ذکر تمہاری کتابوں میں آیا ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت (۹/۱۱۱) کو دیکھئے جس میں کہا گیا ہے کہ خدا نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ جو لوگ اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیں گے اُنہیں خدا جنت عطا کر دے گا۔ اور اس کے بعد ہے: وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ (۹/۱۱۱)۔ "یہ وہ خدا کا سچا وعدہ ہے جو اس نے تورات میں بھی کیا تھا، انجیل میں بھی، اور اب اسی کو قرآن میں دہرا رہا ہے"۔ اس قسم کے تھے خدا کے وہ

---

[1] جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے ان تمام امور کی تفصیل، حوالے، سندیں اور شواہد، میری کتاب ——— مذاہبِ عالم کی مبینہ آسمانی کتابیں ——— میں ملے گی۔ وہاں سے یہ حقیقت بھی سامنے آئے گی کہ پھر یہودیوں کے یہ تمام عقائد اور مسالک کس طرح رفتہ رفتہ خود ہمارے ہاں بھی در آئے اور (وضعی روایات، تفاسیر اور صوفیا کے مکاشفات کے ذریعے) مروجہ مذہبِ اسلام کی بنیادیں بن گئے۔ ہمارے ہاں بھی وحی کی یہی دو قسمیں مانی جاتی ہیں۔

[2] انجیل کے متعلق ہم آگے چل کر اس کے مقام پر، اسی تفصیل سے لکھیں گے جس تفصیل سے تورات کے متعلق لکھا گیا ہے۔

وعدے جنہیں خدا کے اس رسولؐ نے سچ کر دکھایا تھا۔ واضح رہے کہ قرآن کریم جہاں نظری طور پر کہتا ہے کہ اس تعلیم پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا، وہاں وہ طریق بھی بتاتا ہے جس پر عمل کرکے وہ نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اس طریق کا نام دین کا نظام یا الاسلام ہے۔ مذہب میں نظری تعلیم تو بچی کھچی کسی نہ کسی حالت میں باقی رہ جاتی ہے لیکن وہ عملی طریق نگاہوں سے یکسر اوجھل ہو جاتا ہے جس کی رو سے ان نظری مواعید نے محسوس نتائج کی شکل اختیار کرنی تھی۔ مذہب میں اس نظری تعلیم کے الفاظ کو دہرا لینے یا رسمی طور پر پرستش کے طور طریقے ادا کر لینے کا نام اطاعتِ خداوندی سمجھ لیا جاتا ہے۔ باقی رہے اس کے نتائج، تو اس کے متعلق یہ کہکر اپنے آپ کو جھوٹا اطمینان دلا لیا جاتا ہے کہ یہ (نتائج) اگلی دنیا میں جاکر مرتب ہوں گے۔ اس دنیا میں نہیں۔ دین کے نظام میں یہ نتائج اس دنیا میں بھی سامنے آجاتے ہیں اور آخرت میں بھی۔ قرآن کو جب مواعیدِ خداوندی کا مصدق کہا گیا ہے تو اس سے یہ مفہوم ہے کہ اس میں وہ طریق بھی بتایا گیا ہے جس کے مطابق عمل کرنے سے خدا کے یہ وعدے اس دنیا میں سچے ثابت ہو کر سامنے آجائیں گے۔

وَلَا تَكُونُوٓا۟ أَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهِۦ (۲/۴۱)

آیت کے اس ٹکڑے میں ایک اور عظیم حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ جب بھی کوئی رسول آیا تو عام طور پر اس کے مخاطب دو گروہ تھے۔ ایک وہ جو کسی پہلے نبی کے پیرو ہونے کے مدعی نہیں تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو خدا، وحی اور آخرت تک کے منکر تھے۔ دوسرا گروہ وہ تھا جنہیں مذہب پرست کہا جاتا ہے۔ وہ کسی سابقہ رسول کے متبع ہونے کے دعویدار تھے اور (بزعم خویش) خدا، رسولؐ، کتاب اور آخرت کے قائل اور شریعتِ خداوندی کے ماننے والے۔ چاہیے یہ تھا کہ یہ گروہ اس نئے رسولؐ کی دعوت پر سب سے پہلے لبیک کہتا کیونکہ وہ انہی صداقتوں کی طرف دعوت دیتا تھا جنہیں یہ خود تسلیم کرتے تھے۔ وہ ان میں اصلاح ہی چاہتا تھا۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ مذہب پرست طبقہ داعیانِ الی اللہ کی مخالفت میں پیش پیش ہوتا تھا اور سب سے زیادہ متشدد۔ اس حد تک کہ ان میں سے بہت کم ایسے افراد نکلتے جو اس رسول کی دعوت کو قبول کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہب کا مدار

مذہب پرست طبقہ کی طرف سے دین کی مخالفت

شخصیت پرستی پر ہوتا ہے اور حضرات انبیائے کرامؑ کی طرف سے پیش کردہ دین، خدائے واحد کی اطاعت کی دعوت دیتا ہے۔ شخصیت پرستی کا تقاضا ہوتا ہے کہ کسی بات کو علم و بصیرت یا دلیل و برہان کی رو سے پرکھنے کے بجائے دیکھا یہ جائے کہ وہ ان کے اسلاف کے اقوال یا مسلک کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر وہ اس کے خلاف ہو تو پھر آپ لاکھ

سرپٹختے وہ اُسے کبھی ماننے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ان کے اسلاف پر زد پڑتی ہے، اور اُسے وہ کسی صورت میں بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ اس مسلک کو حق وصداقت پر مبنی سمجھتے جس میں نام تو خدا کا ہو لیکن پرستش درحقیقت ان شخصیتوں کی ہو جنکی عقیدت ان کے قلب کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکی ہو۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو مختلف مقامات پر بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ وہ سورۃ الزمر میں کہتا ہے کہ ان لوگوں کی کیفیت یہ ہے: وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ ۖ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ (۳۹/۴۵) "جب ان کے سامنے اکیلے خدا (خدائے واحد) کے احکام پیش کئے جاتے ہیں تو یہ بات ان پر سخت گراں گزرتی ہے۔ اس سے انکا سینہ بھینچ جاتا ہے۔ وہ منہ بسور لیتے ہیں۔ لیکن جب ماسوا اللہ (دوسری شخصیتوں) کی بات کی جاتی ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں"۔ قرآن، اس قسم کے "خدا پر ایمان کو ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ ایمان تو، توحید خالص کا نام ہے۔ اگر اس میں کسی شخصیت کی ذرا سی بھی آمیزش ہو جائے تو وہ کفر ہو جاتا ہے، شرک قرار پا جاتا ہے۔ چنانچہ سورۃ المؤمن میں ہے: ذَٰلِكُم بِأَنَّهُ إِذَا دُعِيَ اللَّهُ وَحْدَهُ كَفَرْتُمْ ۖ وَإِن يُشْرَكْ بِهِ تُؤْمِنُوا ۚ فَالْحُكْمُ لِلَّهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ (۴۰/۱۲) "جب انہیں خدائے واحد کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو وہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ اُس سے کفر اختیار

قرآن خالص کی اطاعت

کر لیتے ہیں۔ لیکن جب خدا کے ساتھ اوروں کو بھی ملا دیا جائے تو وہ پھر ایمان لے آتے ہیں۔ ان سے کہو کہ یہ خدا پر ایمان نہیں۔ ایمان یہ ہے کہ خدا کے اقتدار کو اقتدارِ مطلق تسلیم کیا جائے اور اس حقیقت پر یقین رکھا جائے کہ حق حکومت صرف اسی کو حاصل ہے۔ اطاعت صرف اسی کے احکام کی کی جا سکتی ہے"۔ سورۃ بنی اسرائیل میں اسے اور بھی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ پہلے کہا کہ: وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُورًا (۱۷/۴۵) "جب تو ان کے سامنے قرآن پیش کرتا ہے تو یہ لوگ، جو دعوئ ایمان کے باوجود، خدا کے قوانین مکافاتِ عمل اور حیاتِ آخرت کے منکر ہیں، ان کے اور تمہارے درمیان ایک ایسا پردہ لاحق ہو جاتا ہے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے، آنکھوں سے دیکھا نہیں جا سکتا"۔ اس غیر مرئی اور غیر محسوس پردہ سے ہوتا کیا ہے؟ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ وَإِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدَهُ وَلَّوْا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ نُفُورًا (۱۷/۴۶) "ان کے دلوں پر خول چڑھ جاتے ہیں جس سے ان کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے۔ ان کے کانوں میں ڈاٹ لگ جاتے ہیں جس سے صداقت

کی آوازوں کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ تو ان کے سامنے خدائے واحد کا ذکر کرتا ہے۔ ان کی پرستیدہ شخصیتوں کو ساتھ نہیں ملاتا۔ اس سے ان کے دلوں میں نفرت کے طوفان اُمڈ آتے ہیں اور یہ منہ موڑ کر چل دیتے ہیں"۔ جسے لوگ "شریعتِ خداوندی" کہکر پکارتے ہیں وہ خدائے واحد کے احکام پر مشتمل نہیں ہوتی۔ یہ ان کے اسلاف کی وضع کردہ شریعت ہوتی ہے جسے یہ خدا کا شریک ٹھہرا دیتے ہیں۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے: اَمۡ لَهُمۡ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوۡا لَهُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا لَمۡ يَاۡذَنۡۢ بِهِ اللّٰهُ (۴۲/۲۱) "خدا کے یہ شریک وہ ہیں جو ان کے لئے اس قسم کی شریعت وضع کر دیتے ہیں جس کا حکم خدا نے نہیں دیا ہوتا"۔ یہی ہے وہ شریعت جسے ان کے علماء و مشائخ (احبار و رہبان) شریعتِ خداوندی کہہ کر پیش کرتے اور ان سے اس کی اطاعت کراتے ہیں۔ قرآن کریم نے انہی کو خدا کے شریک قرار دیا ہے جب کہا ہے اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (۹/۳۱) "یہ اپنے احبار و رہبان کو خدا کا شریک بنا دیتے ہیں"۔

زمانۂ نزولِ قرآن کی شہادت

ہم نے جو اوپر کہا ہے کہ دینِ خداوندی کی سب سے شدید مخالفت، مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہوتی تھی، اس کی شہادت قرآن کریم کے اوراق سے بین طور پر ملتی ہے۔ حضور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے جب خدائے واحد کی طرف دعوت دی تو آپ کے سامنے ایک تو قریشِ مکہ تھے۔ یہ لوگ کسی سابقہ نبی کے پیرو ہونے کے مدعی نہیں تھے۔ ان میں بت پرستی، اوہام پرستی، رسوم پرستی عام تھی لیکن اصطلاحی طور پر یہ کسی مذہب کے پیرو نہیں تھے۔ دوسرا گروہ وہ تھا جسے قرآن کریم اہلِ کتاب کہکر پکارتا ہے۔ یہ وہ گروہ تھا جسے ہم اصطلاحی طور پر مذہب پرست کہہ سکتے ہیں۔ ان میں یہودی اس مخالفت میں پیش پیش تھے۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن کریم کے معتدبہ حصہ میں انہی اہلِ کتاب کی مخالفتوں، دسیسہ کاریوں، فریب انگیزیوں، پنہاں سازشوں اور کھلی ہوئی بغاوتوں کا ذکر بار بار آتا ہے۔ حضور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور جماعتِ مؤمنین کے ساتھ ان سب کا ٹکراؤ مسلسل رہا لیکن آخرالامر ہم دیکھتے ہیں کہ لامذہب قریش یا دیگر اسی قسم کے عرب قبائل نے تو اسلام قبول کر لیا لیکن ان اہلِ کتاب میں سے بہت کم مسلمان ہوئے۔ ان (یہودیوں) کو پہلے مدینہ سے نکالنا پڑا اور اس کے بعد ملک بدر کرنا پڑا۔ وہ کہتے تھے کہ ہمارے پاس تورات ہے جو ان انبیاء کی تعلیم پر مشتمل ہے جو خدا کی طرف سے مبعوث ہوئے تھے۔ اس کے جواب میں ان سے کہا جاتا کہ تمہاری ان موجودہ کتابوں کی نسبت تو بیشک ان انبیاء کی طرف ہے لیکن ان کے مندرجات خدائے واحد کی وحیٔ خالص پر مشتمل نہیں۔ ان میں بہت کچھ انسانوں کا خود ساختہ شامل ہو چکا ہے۔ اسی کو تلبیسِ حق و باطل کہا جاتا ہے۔ دیکھئے اس حقیقت کو قرآن کیسے بلیغ انداز میں بیان

کرتا ہے جب کہتا ہے: اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۗ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)۔

"یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے تورات نازل کی۔ اس میں ہماری ہدایت اور روشنی موجود تھی جو انسانوں کو سیدھے راستے کی طرف لے جاتی تھی۔ انبیاء اور ان کے بعد تمہارے بزرگوں میں سے وہ لوگ جن کے ذمہ اس تعلیم کی حفاظت کا فریضہ عائد کیا گیا تھا، اس خدا کی تعلیم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے اور اسی کے مطابق تمہارے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ کرتے اور ان فیصلوں کی نگرانی بھی کرتے۔ لیکن بعد میں آنے والوں نے اس میں خود اپنی طرف سے بہت کچھ ملا لیا۔ اس سے نہ وہ تورات، تورات رہی نہ شریعت، شریعتِ خداوندی۔ تمہارے مذہبی پیشواؤں نے اسے اپنا کاروبار بنا لیا۔ تم اس حقیقت کو سمجھتے بھی ہو کہ جو کچھ یہ پیش کرتے ہیں وہ صداقت پر مبنی نہیں لیکن تم پر ان کا خوف اس قدر مسلط ہو چکا ہے کہ تم ان کی مخالفت میں زبان پر کچھ نہیں لانا چاہتے۔ لیکن تمہاری یہ روش بالکل غلط ہے۔ ان کے فتووں سے مت ڈرو۔ ڈرو صرف قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کے تباہ کن عواقب سے۔ اس حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھو کہ اس قسم کی مخلوط شریعت کا نام خدا پر ایمان نہیں۔ خدا پر ایمان صرف اس کا ہے جو تمام امور کے فیصلے منزل من اللہ کتاب کے مطابق کرتا ہے۔ جو لوگ بھی ایسا نہیں کرتے وہ کافر ہیں، خواہ وہ زبان سے اپنے آپ کو مؤمن ہی کیوں نہ کہیں"۔ اسی قسم کے ہیں وہ "مؤمن" جن کے متعلق کہا کہ وہ ایمان کے مدعی ہونے کے باوجود مشرک کے مشرک رہتے ہیں۔ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (۱۲/۱۰۶)۔ ایمان یہ ہے کہ ہر معاملہ کا فیصلہ خدا کی طرف سے نازل شدہ وحی کے مطابق کیا جائے۔ اگر اس وحی کے ساتھ کسی قسم کی بھی آمیزش کر دی جائے تو وہ شرک ہو جاتا ہے، ایمان نہیں رہتا"۔ مذہب میں (خواہ اس کا کوئی نام بھی کیوں نہ ہو) اسی قسم کا شرک کارفرما رہتا ہے۔ خدائے واحد پر ایمان نہیں رہتا۔

جنت آسانی سے مل جاتی ہے

مذہب پرست طبقہ، مذہب کو چھوڑ کر دین کی طرف اس لئے نہیں آتا کہ مذہب میں جنت بڑی آسانی سے مل جاتی ہے اور دین میں ضبطِ خویش کے صبر آزما مراحل سے گزرنا اور خارجی قوتوں کے ہمت شکن تصادمات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ مذہب اپنے پیرووں کو اس فریب میں مبتلا رکھتا ہے کہ تم خدا کی چہیتی قوم ہو۔ وہ تمہیں کبھی جہنم میں نہیں جلائے گا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مخاطب اہل کتاب، یہود و نصاریٰ کا یہی عقیدہ تھا کہ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (۵/۱۸)۔ "ہم خدا کی اولاد اور اس کے محبوب بندے ہیں"۔ وہ ہر مذہب پرست کی طرح اس خوش فہمی میں مگن تھے کہ: وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ

هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی (۲/۱۱۱)۔ "جنت میں صرف یہودی اور عیسائی جائیں گے دوسروں پر اس کے دروازے بند ہوں گے" (ضمناً) ان کے اس دعویٰ کا جواب بھی سننے چاہیئے جو خدا کی طرف سے ملا کہ: تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ۔ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲/۱۱۱)۔ "اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ یہ محض تمہاری خوش فہمی ہے۔ اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو تو اس کی تائید میں کوئی دلیل پیش کرو" اور اس کے بعد پوری تحدّی سے اعلان کر دیا کہ اس قسم کی خوش فہمیاں سب باطل ہیں۔ فریبِ عقیدت ہیں۔ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۱۱۲)۔ "حقیقت وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا جو انسان بھی خلوصِ قلب سے احکامِ خداوندی کے سامنے جھک جائے اور حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرے تو خدا کے ہاں سے اسے اس کا صلہ ملے گا۔ اور وہ صلہ یہ ہو گا کہ ایسے لوگ خوف اور حزن سے مامون ہو جائیں گے"۔ ان سے کہا کہ اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو کہ جنت میں صرف یہودی اور نصاریٰ ہی جا سکیں گے تو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب۔ (علیہم السلام) اور ان کے وابستگان کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ تو نہ یہودی تھے نہ نصاریٰ۔ تمہارے اصول کے مطابق تو وہ بھی جنت میں نہیں جا سکیں گے (نیز دیکھئے ۲/۴۴)

باہمی فرقہ بندی

قرآنِ کریم نے اس ضمن میں ایک اور بھی دلچسپ بات کہی ہے: یہودی اور عیسائی، دونوں اس کے مدعی تھے کہ وہی جنت میں جائیں گے کوئی دوسرا نہیں جا سکے گا۔ لیکن ان کی باہمی مخاصمت کی کیفیت یہ تھی کہ: وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ (۲/۱۱۳)۔ "یہودی کہتے ہیں کہ عیسائی حق و صداقت پر نہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودی حق و صداقت پر نہیں۔ اور تماشہ یہ کہ دونوں اپنے اپنے دعاوی کی تائید میں وہ کتاب پیش کرتے ہیں جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ وہ خدا کی کتاب ہے" اور اس کے بعد قرآن کریم نے یہ کہا کہ: كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ (۲/۱۱۳)۔ "یہ بات یہود و نصاریٰ تک ہی محدود نہیں۔ دنیا کا ہر مذہب پرست یہی کہتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک ہی مذہب کے مختلف فرقے ایک دوسرے کے خلاف بھی کچھ کہتے رہتے ہیں۔ اور ہر فرقہ یہی دعویٰ کرتا ہے کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں وحیِ خداوندی پر مبنی ہے"۔ [1]

---

[1] یعنی ہر مذہب پرست پہلے تو یہ کہتا ہے کہ ہمارا مذہب سچا ہے باقی سب مذاہب جھوٹے ہیں۔ اسی لئے جنت میں ہم ہی جائیں گے۔ دیگر اہلِ مذاہب نہیں جا سکیں گے۔ اور اس کے بعد پھر خود اپنے مذہب کے پیروؤں کے متعلق کہتا ہے کہ جنت میں صرف ہمارا فرقہ جائے گا۔ دوسرے فرقوں کے متبعین اس میں ـــ نہیں جا سکیں گے ـــ مذہب کہیں بھی ہو۔ اس کی خصوصیات ہر جگہ یکساں ہوتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس قسم کی شخصیت پرستی کی وجہ کیا ہے؟ قرآن کریم نے ایک لفظ میں اس کی بنیادی وجہ بیان کر دی جب کہا کہ:
يَآ اَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ (۴/۱۷۱ و ۵/۷۷) "اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں غلو مت کرو"۔

غلو فی الدّین

اس ایک لفظ میں دنیا کے تمام مذاہب کی باطل پرستی کا راز مضمر ہے۔ غلو کے معنی ہیں کسی کو اس کے صحیح مقام سے آگے بڑھا دینا۔ خدا کا مقام تو بلند ترین ہے اس لئے اس کے متعلق (غلط تصورات تو قائم کئے جا سکتے ہیں) غلو نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا دین میں غلو کے معنی ہوں گے انسانوں کو ان کے صحیح مقام سے بلند تر مقام پر بٹھا دینا۔ چنانچہ عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بلکہ خود خدا بنا دیا۔ اور یہودیوں نے عزیر[1] کو ابن اللہ قرار دیدیا (۹/۳۰)۔ اس آیت میں یہود و نصاریٰ کا صراحتاً نام تو اس لئے لیا گیا کہ یہی اس وقت حضورؐ کے اولین مخاطب تھے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے ہر مذہب نے اپنے بانیٔ مذہب کو کسی نہ کسی شکل میں فوق البشر قرار دے رکھا ہے۔ مذہب پرست انسان اسے تسلیم کرنے پر آمادہ ہو ہی نہیں سکتا کہ جس ہستی کو وہ اپنے مذہب کا بانی یا خدا کا نبی اور رسول مانتا ہے وہ عام انسانوں جیسا ہو۔ چنانچہ جب حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے (وحیٔ خداوندی کی رو سے) یہ اعلان کیا کہ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَىَّ (۱۸/۱۱۰) "میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مجھے خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے" تو (اقوام سابقہ کی طرح) ان لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آئی ہی نہیں کہ خدا کا رسول، انسان ہو سکتا ہے۔

اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ

چنانچہ انہوں نے اس پر اعتراض کیا کہ ایسا شخص رسول کس طرح ہو سکتا ہے يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ (۲۳/۳۳) "جو تمہاری طرح کھاتا پیتا ہے" وَيَمْشِىْ فِى الْاَسْوَاقِ (۲۵/۷) "اور تمہاری طرح بازاروں میں چلتا پھرتا ہے"۔

ہم تورات کی تاریخ کے ضمن میں دیکھ چکے ہیں کہ یہودیوں نے یہ عقیدہ بھی وضع کر رکھا تھا کہ وحی کی دو قسمیں تھیں۔ ایک وہ جو تورات میں لکھی جاتی تھی اور دوسری وہ، جو انبیاء کے اپنے اقوال پر مشتمل ہوتی تھی اور تورات میں داخل نہیں کی جاتی تھی۔ یہ وحی روایتاً آگے چلی اور بعد میں اس کے مجموعے تیار ہوئے۔ ان مجموعوں کو تورات کا ہم پایا (مثلہ معہ) قرار دیدیا گیا۔ یہ بھی غلو فی الدین کی ایک کڑی تھی۔ وہ اس سے آگے بڑھے تو انہوں نے کہا کہ ان کے علماء نے جو تفاسیر لکھی ہیں یا فقہی احکام وضع کئے وہ بھی وحیٔ منزل من اللہ کی طرح غیر متبدل ہیں اور ان کی اطاعت، اطاعتِ خداوندی کے مرادف۔

یہ تھا وہ غلو فی الدین، جس سے یہودیوں کو روکا گیا اور کہا گیا کہ دین میں ہر ایک کو اس کے اپنے اپنے مقام پر رکھو کسی کو اس سے آگے نہ بڑھاؤ۔ دین میں خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسانوں کو ان کے مقام سے آگے بڑھا دیا جائے —— خواہ وہ خدا کے رسول ہوں یا علماء اور مشائخ —— اور یہی وہ چیز تھی جسے وہ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے[2]۔ مذہبی پیشوائیت اتنا ہی نہیں کرتی کہ وہ اس دعوت ہے

[1] اس کی تفصیل لغات القرآن میں دیکھئے۔ [2] اس مقام پر مجھے اتنا کہنے کی اجازت دیجئے کہ خود میرے ساتھ بھی یہی ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ میں (بقیہ صفحہ ۱۹۴ پر ملاحظہ فرمایئے)

کے تسلیم کرنے سے انکار کردے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ یہ آواز بلند نہ ہونے پائے۔ اسے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ یہی تھی ان اہلِ کتاب کی وہ روش جس کے سلسلہ میں ان سے کہا گیا تھا کہ: قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۔ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۳/۹۸)۔ "اے رسولؐ! ان سے کہدو کہ جو لوگ خدا کے دین کو قبول کرنا چاہتے ہیں، تم ان کا راستہ روک کر تو کھڑے نہ ہو جاؤ۔ تم چاہتے یہ ہو کہ یہ لوگ بھی تمہاری طرح ٹیڑھے راستے اختیار کرلیں۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ سیدھا راستہ وہی ہے جس پر یہ لوگ چلنا چاہتے ہیں۔ یاد رکھو! خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل تمہاری ہر کرتوت سے واقف ہے اور تمہیں اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔"

مذہبی پیشوائیت ایسا کیوں کرتی ہے۔ اس کا جواب قرآنِ کریم نے (آیت ۲/۴۱ کے) اگلے ٹکڑے میں دیدیا ہے۔ جہاں کہا ہے:

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (۲/۴۱)

"تم دین کو کاروبار نہ بناؤ۔ اس سے دنیا مت کماؤ۔"

آپ قرآنِ کریم کو شروع سے آخر تک دیکھ جائیے۔ ہر رسول کی دعوت یہ ہوتی تھی کہ: يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ (۱۱/۵۰)۔ "اے لوگو! خدا کی محکومیت اختیار کرو۔" اور اسی سانس میں وہ یہ بھی اعلان کردیتے تھے کہ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا (۱۱/۵۱)۔ "میں اس کے لئے تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔" آپ سوچئے کہ یہ کتنی اہم بات ہوگی جسے ہر رسول اپنی دعوت کے ساتھ دہراتا تھا۔ بات ہے ہی بڑی اہم۔ جب دین کو ذریعۂ معاش بنا لیا جائے تو پھر وہ دین رہتا ہی نہیں، مذہب بن جاتا ہے۔ اور یہی وہ چیز تھی جس سے یہودیوں کو اس طرح روکا گیا تھا۔ یہ دین فروشی، مذہب کے پیشوا (علماء و مشائخ) اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے اس کی وضاحت یہ کہکر کردی کہ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۹/۳۴)۔ "اے جماعتِ مومنین! اس حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا کہ اکثر علماء و مشائخ عوام کے مال و دولت کو باطل طور پر کھا جاتے ہیں اور اپنی اسی کمائی کی خاطر وہ لوگوں کو خدا کے راستہ کی طرف نہیں آنے دیتے۔ ان کی راہ میں روک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۳)۔ (قرآنِ کریم کے ارشاد کے مطابق) اتنا ہی کہتا ہوں کہ دین میں غلو نہ کیجئے۔ خدا کو خدا، اس کے رسولؐ کو رسولؐ اور علماء و فقہاء کو عالم اور فقیہہ ہی سمجھیے۔ انہیں اپنے مقام سے آگے نہ بڑھائیے۔ لیکن مذہب پرست طبقہ کے نزدیک ایسا کہنا کفر ہے۔ قرآنِ کریم نے سچ کہا تھا کہ مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہمیشہ ایک سا ردِّ عمل ہوگا خواہ وہ کوئی مذہب ہو۔

بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں" دین فروشی کے اس کاروبار کے متعلق، مطالب الفرقان — جلد اول میں وضاحت سے لکھا جا چکا ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لیجئے۔ (ملاحظہ ہو جلد اول صفحہ ۲۵۰-۲۵۶)۔ وہیں سے یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ "ہماری آیات کو "ثمن قلیل" کے عوض مت بیچو" تو اس کا مفہوم کیا ہے۔ جیسا کہ وہاں بتایا جا چکا ہے، اس سے یہ کہنا مقصود نہیں کہ دین کے عوض تھوڑے پیسے نہ لیا کرو، زیادہ لیا کرو۔ (جب حرام ہی کھانا ہے تو پیٹ بھر کر کیوں نہ کھایا جائے!) ہم نے وہاں بتایا ہے کہ جب مستقل اقدارِ خداوندی اور دنیاوی منفعت میں ٹکراؤ ہو تو اس مستقل قدر کے مقابلہ میں دنیا کی بڑی سے بڑی متاع بھی جنس کاسد اور متاعِ قلیل و حقیر قرار پا جاتی ہے۔ قرآن کہنا ہی یہ چاہتا ہے کہ متاعِ دنیا بیشک حاصل کرو لیکن دین کو بیچ کر نہیں۔ اور یہ چیز اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ :-

وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ (۲/۴۱)

"انسان صرف قوانینِ خداوندی کا اتباع کرے۔ ان کی خلاف ورزی کے نتائج سے بچے"۔ یہی وہ احتیاط ہے جس سے انسان دین فروشی سے بچ سکتا ہے۔

چونکہ دین فروشی التباسِ حق و باطل اور کتمانِ حقیقت ہی سے ممکن ہوتی ہے۔ اس لئے اگلی آیت میں ان سے کہا کہ :-

۲/۴۲ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔

"حق اور باطل کو آپس میں گڈمڈ نہ کرو، نہ ہی حقائق کو چھپاؤ"۔ اگرچہ حق اور باطل کا عام مفہوم واضح ہے اور اس کے ایک گوشہ کو، جو تخلیقِ کائنات سے متعلق ہے، آیت (۲/۲۶) کے ذیل میں بھی واضح کیا جا چکا ہے۔ لیکن چونکہ دین کا سارا دار و مدار حق کو تسلیم کرنے اور باطل کو مسترد کر دینے پر ہے اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کی ان دو بنیادی اصطلاحات کو اور وضاحت سے بیان کر دیا جائے۔

حق کے معانی

عربی زبان میں "حَقٌّ" ایک وسیع المعانی لفظ ہے۔ اس کے بنیادی اور اہم مفاہیم حسبِ ذیل ہیں۔ (۱) کسی شے کا ٹھوس واقعہ یا ایسی حقیقت بن کر سامنے آجانا جس سے کسی کو مجالِ انکار نہ ہو۔ یعنی اس کا محکم طور پر ثابت ہو جانا۔ (۲) ایسا ٹھوس تعمیری واقعہ جو اپنی جگہ پر ثابت اور محکم ہو، امٹ اور غیر متبدل

ہو۔ جو اپنی جگہ پر قائم رہے اور کسی کے بدلانے سے بدل نہ سکے۔ (۳) جو اپنی جگہ تو قائم رہے لیکن جو چیز اس کے دائرہ کے اندر کارفرما ہو وہ زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرتی چلی جائے۔ اسے ایک مثال کے ذریعے سمجھئے۔ آج کل تو دروازوں میں قبضے لگے ہوتے ہیں لیکن پرانے زمانہ میں دروازوں کے اوپر اور نیچے گلّی کی طرح لکڑی ہوتی تھی جو (SOCKET) میں بالکل فٹ ہو جاتی تھی۔ (SOCKET) تو اپنی جگہ قائم رہتی تھی لیکن یہ گلّی اس کے اندر اس طرح گھومتی رہتی تھی کہ دروازہ حسب ضرورت بند بھی کیا جا سکتا تھا اور کھولا بھی۔ "حَقّ" کی یہ خصوصیت اپنے اندر بڑی اہمیت رکھتی ہے جس کی مزید تشریح چند سطور آگے جا کر سامنے آئے گی:

یہ ہے حَقّ، اور جو شے یا نظریہ اس کے خلاف ہو اسے باطل کہا جائے گا۔ لہٰذا باطل کے معنے ہوئے جو حقیقت میں واقع نہ ہو اور اسے محض عقیدۃً مان لیا جائے۔ جس کا یا تو کوئی نتیجہ مرتب نہ ہو اور یا اس سے تخریبی نتائج پیدا ہوں۔ جو محو ہو جانے والا ہو۔ جو ہواؤں کے رُخ کے ساتھ اپنا بھی رُخ بدلتا رہے۔ یا اس طرح جامد ہو کہ انسانی زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکے۔

اب دیکھئے قرآنِ کریم میں یہ لفظ یا اصطلاح کن معانی میں آئی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے آپ کو الحق کہا ہے۔ سورۃ المؤمن میں ہے: فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ (۲۳/۱۱۶) "بلند و بالا، ہر قسم کے غلبہ و تسلط اور اقتدارِ مطلق کا مالک ——— الحق"۔

جو کچھ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے (یعنی وحیِ خداوندی) اسے بھی الحق کہا گیا ہے۔ سورۃ الرعد میں ہے: وَالَّذِيْۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ (۱۳/۱) "جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تیری طرف نازل کیا گیا ہے وہ الحق ہے۔" (نیز دیکھئے ۳۴/۶ و ۳۵/۳۱)۔ سورۃ البقرۃ میں ہے: نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ (۲/۱۷۶) "اللہ نے اِس کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے۔" بعض مقامات پر اِسے صرف الحق کہہ کر پکارا گیا ہے، جیسے لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ (۱۰/۹۴)۔ "تیرے رب کی طرف سے تیری طرف الحق آ گیا۔" (نیز دیکھئے ۴۷/۲ و ۱۰/۱۰۸)۔ سورۃ الکہف میں ہے: وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹)۔ "ان سے کہدو کہ الحق تمہارے رب کی طرف سے آ گیا ہے۔ سو جس کا جی چاہے اسے تسلیم کرے۔ اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔"

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا گیا کہ: اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ (۲/۱۱۹)۔ "ہم نے تجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے۔" اسی کو متعدد مقامات پر "دینِ الحق" بھی کہا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ التوبہ میں ہے: هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۹/۳۳)۔

"خدا وہ ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ضابطہ ہدایت، یعنی دین الحق کے ساتھ بھیجا تاکہ یہ نظام انسانوں کے خود ساختہ تمام نظاموں پر غالب آ جائے۔ خواہ یہ بات ان لوگوں پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے جو خالص قوانینِ خداوندی کے تابع زندگی بسر نہیں کرنا چاہتے۔" (نیز دیکھئے ۴۸/۲۸؛ ۶۱/۹)

انسانی اعمال نامہ کے متعلق بھی یہ کہا کہ: وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ (۲۳/۶۲) "ہمارے پاس ایسی کتاب ہے جو ہر بات حق کے مطابق کہتی ہے۔"

سورۃ النجم میں، حق کے مقابلہ میں ظن کا لفظ لا کر بتایا گیا ہے کہ کوئی ظنی عقیدہ یا نظریہ دین الحق نہیں ہو سکتا۔ آیت کے الفاظ ہیں: وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْــــًٔا (۵۳/۲۸)۔ "ان لوگوں کا عقیدہ، نظریہ یا مسلک علم پر مبنی نہیں ہوتا۔ یہ صرف ظن کا اتباع کرتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ حق کے مقابلہ میں ظن کچھ معنی نہیں رکھتا۔" حق اور ظن کے اسی تقابل کے سلسلہ میں سورۃ الحج میں کہا: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ (۲۲/۶۲) "یہ اس لئے کہ الحق صرف خدا کی ذات ہے اور جسے یہ لوگ اس کے سوا پکارتے ہیں وہ باطل ہے۔" (نیز دیکھئے ۳۱/۳۰) انہی کے متعلق دوسری جگہ کہا: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲۹/۵۲) "جو لوگ اللہ سے انکار کرتے ہیں اور باطل پر ایمان رکھتے ہیں وہ تباہ ہو جاتے ہیں۔" دوسری جگہ کہا کہ ان کا کیا کرایا سب باطل ہو جاتا ہے۔ یعنی رائیگاں جاتا ہے (۱۱/۱۶)۔

کشمکشِ حق و باطل

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قوانینِ خداوندی سب کے سب الحق ہیں اور جو کچھ بھی ان کے خلاف ہے وہ باطل ہے (جیسا کہ پہلے تفصیلاً لکھا جا چکا ہے) قوانینِ خداوندی میں، ایک تو قوانینِ فطرت داخل ہیں اور دوسرے وہ قوانین جن کا تعلق انسان کی انسانی زندگی سے ہے۔ ان دونوں میں تمیز کرنے کی غرض سے ثانی الذکر کو مستقل اقدارِ خداوندی بھی کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ کائنات میں حق و باطل کی کشمکش جاری ہے۔ اس کے لئے کہیں کہا کہ: كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ (۱۳/۱۷) "اس طرح خدا حق و باطل میں ٹکراؤ پیدا کرتا رہتا ہے۔" دوسری جگہ کہا کہ: بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱/۱۸) "خدا باطل پر حق کی ضربیں لگاتا رہتا ہے۔ تاآنکہ حق، باطل کا مغز توڑ دیتا ہے اور اس طرح وہ محو ہو جاتا ہے۔" سورۃ بنی اسرائیل میں ہے: وَقُلْ جَاۗءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۱۷/۸۱)۔ "ان سے کہہ دو کہ الحق آ گیا ہے۔ اور اس کے آنے سے باطل محو ہو گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ باطل، حق کے مقابلہ میں ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ اسے تو مٹ ہی جانا ہے۔ دیر صرف حق کے آنے کی ہوتی

ہے۔" تاریکی اس وقت تک تاریکی رہتی ہے جب تک روشنی نہیں آتی۔ روشنی کی پہلی کرن کے آنے سے تاریکی محو ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ تاریکی، روشنی کے نہ ہونے کا نام تھا۔ جب تک روشنی رہے گی تاریکی آ نہیں سکے گی۔ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ (۳۴/۴۹) "ان سے کہدو کہ الحق آگیا ہے۔ باطل اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکے گا۔ وہ اس کے پہلے حملے ہی سے شکست کھا جائے گا۔ اور جب تک الحق موجود رہے گا، باطل پلٹ کر نہیں آسکے گا۔"

یہ الحق، قرآن کریم کی شکل میں خدا کی طرف سے نازل کیا گیا اور چونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا تھا اس لئے اس کے متعلق کہدیا کہ: لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۔ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ (۴۱/۴۲) "باطل اس کی طرف نہ سامنے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے۔ یہ خدائے حکیم و حمید کی طرف سے نازل شدہ ہے۔"

لیکن قرآن کریم میں الحق صرف الفاظ کی شکل میں موجود اور محفوظ ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسانی دنیا میں یہ ٹھوس حقیقت بن کر کس طرح سامنے آتا ہے؟ (اس وقت تو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم کے موجود اور محفوظ ہونے کے باوجود باطل کا دور دورہ ہے)۔ اس سوال کا تعلق مسئلہ خیر و شر سے ہے جس کے متعلق ہم مطالب الفرقان جلد اول (۲۵۰-۲۵۱ و ۲۶۷-۲۶۲) میں لکھ چکے ہیں۔ نیز کشمکش ابلیس و آدم میں بھی جس کا تفصیلی ذکر سابقہ باب میں آ چکا ہے۔ یہاں اسے ہم، مختصر الفاظ میں دہراتے ہیں۔ پہلے قوانینِ فطرت کو لیجئے۔ یہ قوانین، تخلیقِ کائنات کے ساتھ ہی یہاں موجود تھے لیکن نظری حیثیت سے۔ جب تک انسان ان کا علم حاصل نہیں کر سکا، غلط (باطل) راستوں پر چلتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سخت نقصان اٹھاتا رہا۔ (مثلاً) اس نے سیلاب کے متعلق سمجھا کہ یہ "اِندر دیوتا"، کے غصہ میں آجانے (کف بدہان ہو جانے) کا نتیجہ ہے۔ وہ سیلاب آجانے پر "اِندر دیوتا"، کے بُت کے حضور چڑھاوے چڑھاتا رہا اور سیلاب اسے بدستور تباہ کرتے رہے۔ چیچک کے متعلق اس نے سمجھا کہ یہ "کالی ماتا" کی ناراضگی سے پھوٹتی ہے تو وہ کالی ماتا کے چرنوں میں اپنی شردھا کے پھول چڑھاتا رہا لیکن چیچک اسے اور اس کی اولاد کو موت کی بھینٹ چڑھاتی رہی۔ یہ باطل کا غلبہ تھا۔ لیکن جب اس نے صدیوں کی کاوشوں اور کاہشوں کے بعد ان قوانین کو دریافت کر لیا جن کے مطابق سیلاب آتے اور چیچک پھوٹتی ہے۔ تو اس نے ان پر قابو پا لیا اور اس طرح حق، باطل پر غالب آ گیا۔

قوانینِ فطرت حق ہیں

اور اب تو مرض اور شفا کے متعلق ایک اور نظریہ قائم ہوا ہے۔ وہ یہ کہ تخریبی جراثیم، ہوا۔ پانی۔ غذا۔ چھوت چھات

کے ذریعے انسان کے جسم پر حملہ آور ہوتے ہیں اور اس کی قوتِ مدافعت ان کا مقابلہ کرتی ہے۔ اگر وہ قوت زیادہ قوی ہے تو وہ ان جراثیم کو ہلاک کر دیتی ہے اور انسان کی صحت برقرار رہتی ہے۔ اگر قوتِ مدافعت کمزور ہے تو وہ جراثیم غالب آجاتے ہیں اور انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اس کی قوتِ مدافعت کو بڑھا دیا جائے تاکہ وہ ان جراثیم پر غالب آجائے۔ یہ بھی طبیعی سطح پر حق و باطل کی کشمکش ہے۔ انسانی فکر نے اس نظریہ کا انکشاف بھی صدیوں کے تجربات کے بعد کیا ہے۔

یہی کیفیت اس حق اور باطل کی کشمکش کی ہے جو انسانی زندگی میں بھی کارفرما چلی آرہی ہے۔ انسانوں کے خودساختہ تمدنی، معاشرتی، سیاسی، معاشی نظاموں نے، جو باطل پر مبنی تھے، اسے جس قدر نقصان پہنچایا ہے، تاریخِ عالم کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔ حق پر مبنی نظام، خدا کی طرف سے ملتا رہا، لیکن باطل پرست انسانوں کی مفاد پرستیاں اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی رہیں۔ اسے قرآنِ کریم نے حق اور باطل کی کشمکش یا کفر اور ایمان کے مجادلہ سے تعبیر کیا ہے۔ سورۃ الکہف میں ہے: وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۔ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ ۔ وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا (۱۸/۵۶) "ہم اپنے پیغامبروں کو بھیجتے رہے تاکہ وہ لوگوں کو بتائیں کہ حق کے مطابق زندگی بسر کرنے کے نتائج کس قدر خوشگوار ہوں گے اور باطل کی روش اختیار کرنے کے عواقب کس قدر تباہ کن ہوتے ہیں۔ لیکن وحی سے انکار کرنے والے مفاد پرست، باطل کے حربے لیکر حق کے خلاف نبرد آزما ہو گئے تاکہ وہ حق کو غالب نہ آنے دیں۔ اسے کمزور کر دیں۔ ہمارے پیغامبر ان سے کہتے رہے کہ اس کا نتیجہ ان کے حق میں اچھا نہیں ہوگا لیکن وہ ان تنذیرات کی ہنسی اڑاتے رہے۔" (نیز دیکھئے ۴۷/۵)۔ اس سے ظاہر ہے کہ حق اور باطل کا یہ ٹکراؤ ان دو جماعتوں کے تصادم سے سامنے آتا تھا جن میں سے ایک حق کا علَم بلند کرنے کے لئے اٹھتی تھی اور اس کے مدِ مقابل دوسری جماعت، باطل کے حربوں سے اس کا مقابلہ کرتی تھی۔

جنگ کا مقصد

اس تصادم کی آخری آماجگاہ میدانِ جنگ ہوتا تھا۔ صدرِ اول کی جماعتِ مومنین کے یہی وہ جنگ تھے جن کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ: وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۔ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (۸/۸) "خدا چاہتا تھا کہ اپنے قوانین کی رو سے حق کو ایک ٹھوس حقیقت کی شکل میں سامنے لے آئے اور اس سے انکار کرنے والوں کی جڑیں کاٹ کر رکھدے۔ یہ تصادم اس لئے تھا کہ حق ثابت اور محکم ہو جائے اور باطل مٹ جائے، خواہ مجرموں پر یہ بات کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے۔" اس سے ظاہر ہے کہ الحق بلاشبہ قرآنِ کریم میں نظری طور پر موجود ہے۔ لیکن وہ عملاً

ایک ٹھوس حقیقت اسی صورت میں اختیار کر سکتا ہے، جب حق کی علمبردار جماعت باطل کے مقابلہ کے لئے اُٹھ کھڑی ہو۔ اس جماعت کے ہاتھوں، باطل شکست کھا جاتا ہے اور جب تک یہ جماعت موجود رہتی ہے، باطل پلٹ کر نہیں آسکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر یہ جماعت موجود نہ رہے تو پھر الحق پر مبنی قانونِ خداوندی سر جھکائے خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ ایسا سمجھنا غلط ہے۔ انسان اپنی عقل کے تجرباتی طریق سے ٹھوکریں کھاتا اور ہڈیاں تڑواتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس طرح صدیوں کی جانگسل منازل طے کرنے کے بعد حق تک پہنچ جاتا ہے۔ اِس حقیقت کو ہم مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں واضح طور بیان کر چکے ہیں (دیکھئے صفحات ۱۱۶-۱۱۵)۔

یہ ہے وہ طریق جسے قرآن کریم نے سورۃ الرعد میں برجستہ مثالوں کی رو سے واضح کیا ہے۔ ارشاد ہے:-

اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحۡتَمَلَ السَّيۡلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوۡقِدُوۡنَ عَلَيۡهِ فِى النَّارِ ابۡتِغَآءَ حِلۡيَةٍ اَوۡ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثۡلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡحَقَّ وَالۡبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذۡهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ (۱۳/۱۷)۔

"کائنات میں حق و باطل کی کشمکش کا قانون کارفرما ہے اور اسی کشمکش سے کائنات اپنے ارتقائی منازل طے کرتی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ اسے مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ بادلوں سے مینہ برستا ہے تو ندی نالے اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہہ نکلتے ہیں۔ پانی کے بہاؤ سے زمین کا میل کچیل جھاگ بن کر سطح پر آجاتا ہے تو سیلاب کی رَو اُسے بہا کر لیجاتی ہے اور زمین صاف ستھری رہ جاتی ہے۔

یا یوں سمجھو کہ جب کسی دھات کو آگ میں تپایا جاتا ہے کہ اس سے زیورات یا دیگر ضروریات کی چیزیں بنائی جائیں تو اس کا کھوٹ جھاگ بن کر اُوپر آجاتا ہے اور خالص دھات نیچے رہ جاتی ہے۔

اس طرح کائنات میں خدا کے قانونِ کشمکش کے مطابق تعمیری قوتیں تخریبی قوتوں سے ٹکراتی رہتی ہیں، تو تخریبی قوتیں جھاگ کی طرح رائیگاں چلی جاتی ہیں اور جو کچھ نوعِ انسان کے لئے نفع بخش ہوتا ہے وہ باقی رہ جاتا ہے۔ یہ ہے خدا کا قانونِ محو و ثبات (۱۳/۳۹)۔ اس طرح خدا مثالوں کے ذریعے بات واضح کر دیتا ہے۔"

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ عقل کے تجرباتی طریق کے بعد، وحی کی راہنمائی کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ ضرورت ہر آن رہتی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ ایک تو اس لئے کہ زندگی کے مسائل کسی دور میں ختم نہیں ہو جائیں گے۔ یہ آخری انسان تک سامنے

آتے رہیں گے۔ اور دوسرے اس لئے کہ حق کے نظام کو قائم رکھنے کے لئے اقدارِ خداوندی کی پابندی ضروری ہو گی۔ اس موضوع پر ہم جلد اول میں تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔ (دیکھئے صفحات ۲۶۶—۲۵۷)

یہ تھا وہ الحق، جس کے متعلق بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ نہ تو تم حق کو چھپاؤ اور نہ ہی تلبیسِ حق و باطل کرو۔ اس آیت (۲/۴۲) میں یہ کہا گیا ہے کہ ایسا نہ کرو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا کہ اس کے بعد تم کرو کیا؟ اِس "کرنے" کے لئے اصولی طور پر آیت (۲/۴۱) میں کہا تھا کہ تم قرآنِ مجید اور رسالتِ محمدیہ کی صداقت پر ایمان لاؤ۔ اس کے بعد ایک عملی پروگرام دیا گیا جس کی ابتداء یہ کہہ کر کی گئی کہ:-

۲/۴۳ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ۔

اِس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "تم صلوٰۃ قائم کرو۔ زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو"

دیکھنے میں تو یہ اس پروگرام کی تین چھوٹی چھوٹی کڑیاں ہیں لیکن درحقیقت ان میں دین کے پورے کا پورا نظام سمٹ کر آ گیا ہے۔ قرآن مجید میں اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے الفاظ متعدد مقامات پر اکٹھے آئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دو بنیادی ستون ہیں جن پر دین کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ کے متعلق مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں بڑی شرح و بسط سے گفتگو کی جا چکی ہے۔ (ملاحظہ ہوں صفحات ۱۰۴—۹۷)۔ اس مقام پر یعنی آیت (۲/۳) میں، وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ کے الفاظ آئے تھے۔ ہم نے وہاں صلوٰۃ کے ساتھ انفاق کی بھی تشریح کر دی تھی اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ ان دونوں کا باہمی تعلق کیا ہے (ملاحظہ ہوں جلد اول کے صفحات ۱۴۰—۱۰۵) لیکن چونکہ زکوٰۃ کا لفظ یہاں پہلی دفعہ آیا ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اس کا صحیح تصور واضح طور پر سامنے لے آیا جائے۔ کیونکہ "صلوٰۃ" کی طرح "زکوٰۃ" کا مروجہ مفہوم بھی قرآنی مقصود تک پہنچنے نہیں دیتا۔

زکوٰۃ کا مفہوم

ہم اِس جلد کے پہلے باب میں نفس یا انسانی ذات کے سلسلہ میں یہ بتا چکے ہیں کہ مادہ (ز۔ک۔و) کے معنی ہیں بڑھنا، پھولنا، پھلنا، نشو و نما پانا۔ یہیں سے لفظ الزکوٰۃ ہے جس کے بنیادی معنی ہیں نشو و نما، بالیدگی، پھلنا پھولنا۔ اس جلد کے بابِ اول میں نظریۂ ارتقاء کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اسے ایک بار پھر سامنے لائیے۔ اس کا ملخص یہ ہے کہ سطحِ ارض پر انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ انسانی ذات اس قدر نشو و نما حاصل کرے کہ اس سے یہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل، یا یوں کہیے کہ اگلی منزل، طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ لیکن زندگی کی

موجودہ منزل میں انسانی ذات کی نشو و نما، انسانی جسم کے اندر رہتے ہوئے ہی ممکن ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ انسانی جسم کی بھی مناسب نشو و نما ہوتی جائے۔ قرآن کریم نے ان تمام ذرائع، اسباب، سامان کے لئے، جس سے انسانی جسم اور اس کی ذات کی نشو و نما ہوتی جائے، الزکوٰۃ کی جامع اصطلاح استعمال کی ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس نکتہ کو پھر سے سامنے لے آیئے کہ کمیونزم کا منتہیٰ، انسانی جسم کی پرورش اور نشو و نما ہے اسی لئے ان کے ہاں روٹی کا مسئلہ آخری اور مقصود بالذات مسئلہ ہے۔ یعنی اگر انسان کی طبیعی ضروریاتِ زندگی پوری ہو جائیں تو پھر اس کے سامنے کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ قرآن کریم اسے حیوانی سطحِ زندگی کہکر پکارتا اور کفر سے تعبیر کرتا ہے (۴۷/۱۲)۔ اس کے برعکس قرآن کریم کے نزدیک انسانی جسم کی نشو و نما مقصود بالذات نہیں۔ یہ ذریعہ ہے انسانی ذات کی نشو و نما کا، جو مستقل اقدارِ خداوندی کے اتباع سے ہو سکتی ہے۔ اس سے آپ نے دیکھا کہ کمیونزم اور اسلام دو معاشی نظام نہیں، بلکہ دو نظریاتِ زندگی ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل متضاد اور متناقض ہیں۔

اس تمہید کے بعد آیئے۔ قرآن کی اصطلاح زکوٰۃ کی طرف۔

انبیاء سابقہ کو زکوٰۃ کا حکم

اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا حکم سلسلۂ وحی میں، قرآن کریم میں پہلی بار نہیں آیا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ یہ حکم انبیائے سابقہ کو بھی دیا گیا تھا۔ سورۃ انبیاء میں مختلف انبیائے کرامؑ کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ: وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ۔ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ۔ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ۔ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ (۲۱/۷۳)۔ "ہم نے ان کی طرف وحی کی کہ وہ خیر کے کام کریں اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا نظام قائم کریں اور اس طرح ہماری عبودیت اختیار کریں۔" اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے مخاطبین سے کہا کہ: وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا (۱۹/۳۱)۔ "خدا نے مجھے زندگی بھر صلوٰۃ اور زکوٰۃ پر قائم رہنے کا حکم دیا ہے۔" ذرا آگے چل کر حضرتِ اسمٰعیل علیہ السلام کے تذکرۂ جلیلہ کے ضمن میں کہا: وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ (۱۹/۵۵)۔ "وہ اپنے ساتھیوں کو صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا حکم دیا کرتے تھے۔" بنی اسرائیل کے متعلق کہا کہ "ہم نے ان سے اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا عہد لیا تھا" (۲/۸۳)۔ اور ان سے کہا تھا کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو ان کی ناہمواریاں دور کر کے انہیں جنت میں داخل کر دیا جائے گا (۵/۱۲)۔ یہی حکم حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی وساطت سے جماعتِ مؤمنین کو دیا گیا۔ سورۃ المزّمّل میں خطاب کی ابتدا نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے ہوتی ہے اور اس کے بعد کہا گیا ہے۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (۷۳/۲۰)۔ یہ جمع مخاطب کے صیغے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا حکم حضور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور جماعتِ مؤمنین سب کو دیا گیا تھا۔ سورۃ المائدۃ میں مؤمنین کی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ

الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ (۵/۵۵) "یہ وہ لوگ ہیں جو اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرتے ہیں اور جملہ احکامِ خداوندی کے سامنے سرنگوں ہوتے ہیں۔" اسی طرح سورۃ التوبہ میں ہے کہ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۹/۷۱) "مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست اور مددگار ہیں۔ وہ معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر خدا اپنی رحمتوں کا سایہ کرے گا۔ وہ خدا جو ہر قسم کے غلبہ اور حکمت کا مالک ہے۔" اسی طرح سورۃ الاعراف میں ہے کہ جب حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے خدا سے دنیا اور آخرت کی حسنات کی دعا مانگی تو ان سے کہا گیا کہ: فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ (۷/۱۵۶) "میں ان حسنات کو ان لوگوں کے لئے لکھ دوں گا جو تقویٰ شعار ہوں گے۔ ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ سرانجام دیں گے اور ہمارے قوانین پر پختہ ایمان رکھیں گے۔"

مشرکینِ مکہ اسلامی نظام کی سخت مخالفت کرتے تھے اور اس مخالفت کی انتہا یہ تھی کہ وہ میدانِ جنگ تک میں اتر آئے تھے۔ ان حالات میں ان کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت دی گئی، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہا گیا کہ: فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۹/۵) "اگر یہ اپنی اس روش سے باز آجائیں اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں تو پھر ان کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔ یہ اس لئے کہ قانونِ خداوندی میں حفاظت اور رحمت کی گنجائش رکھی گئی ہے۔" ذرا آگے چل کر کہا گیا کہ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ (۹/۱۱) "اگر یہ اپنی موجودہ روش کو چھوڑ دیں اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں تو پھر وہ تمہارے دینی بھائی بن جائیں گے۔"

دین کے بنیادی ستون

ان دونوں آیتوں میں مشرکین کے حصارِ دین میں داخل ہو جانے کے لئے اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کی شرط عائد کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) یہ دین کے بنیادی ستون ہیں۔ چنانچہ دوسرے مقام پر ان دونوں ستونوں کی اس بنیادی حیثیت کو متعین طور پر واضح کر دیا۔ جہاں کہا وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (۹۸/۵) "اور خدا نے انہیں یہ حکم دیا ہے

کہ وہ دل کے پورے خلوص کے ساتھ خدائے واحد کی محکومیت اختیار کریں۔ اسی کو اپنا نصب العین قرار دے کر سیدھے اس کی طرف چلتے جائیں۔ اِدھر اُدھر مت دیکھیں۔ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں۔ یہ ہے دینِ قیّم جس پر چلنے کا انہیں حکم دیا گیا ہے"۔ سورۃ حٰمٓ میں کہا ہے کہ مشرکین کے لئے تباہی ہے: اَلَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۴۱/۷) "یہ وہ لوگ ہیں جو ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ سرانجام نہیں دیتے اور آخرۃ کے منکر ہیں"۔ یہاں ایتائے زکوٰۃ اور ایمان بالآخرت کو لازم و ملزوم قرار دیا گیا ہے۔ اس سے بھی دین کے اس بنیادی ستون کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

سابقہ باب میں بتایا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ جو لوگ ہدایتِ خداوندی کا اتباع کریں گے ان پر کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں رہے گا۔ اُسی سورۃ (بقرۃ) میں ذرا آگے چل کر کہا کہ: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۲۷۷)۔ "جو لوگ ایمان لاتے اور اُن سے اعمالِ صالحہ سرزد ہوتے ہیں اور وہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرتے ہیں تو اللہ کے ہاں سے انہیں ان کا اجر ملتا ہے۔ اور وہ اجر یہ ہوتا ہے کہ ان پر کسی قسم کا خوف و حزن طاری نہیں ہوتا"۔ دوسری جگہ انہیں کے متعلق کہا کہ: رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ (۲۴/۳۷)۔ "یہ وہ لوگ ہیں کہ خرید و فروخت اور دیگر کاروبار انہیں قوانینِ خداوندی سے غافل نہیں کرتے۔ وہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ انقلاب آجائے گا جس میں انسانوں کے قلوب بھی اُلٹ کر رہ جائیں گے اور نگاہیں بھی"[1]

ان مقامات پر ہم نے ایتائے زکوٰۃ کے قرآنی الفاظ کا ترجمہ نہیں کیا۔ عام طور پر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "وہ زکوٰۃ دیتے ہیں" یا "زکوٰۃ دو"۔ اور چونکہ ہمارے ہاں زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم یہ ہے کہ جس مال پر ایک سال گزر جائے اس میں سے (مجملاً) اڑھائی فیصد کے حساب سے خیرات کے طور پر دیدیا جائے، اس لئے قرآن کی اس اصطلاح سے توجہ اس مفہوم کیطرف منعطف ہو جاتی ہے۔ لیکن قرآنِ کریم کی رو سے ایتائے زکوٰۃ کا یہ مفہوم نہیں۔ یہ تو خیرات ہے جو انفرادی طور پر دیدی جاتی

---

[1] سورۃ الروم میں کہا گیا ہے کہ "ربٰو فی الحقیقت بڑھتا نہیں لیکن زکوٰۃ بڑھتی ہے" (۳۰/۳۹)۔ اس کی تشریح اس مقام پر کی جائے گی جہاں ربٰو کے متعلق گفتگو ہو گی۔

ہے بعض لوگ اس میں اتنی تبدیلی کرتے ہیں کہ زکوٰۃ کا یہ روپیہ انفرادی طور پر خرچ کرنے کے بجائے بیت المال میں جمع ہونا چاہیئے اور حکومت اسے ان مصارف میں خرچ کرے جنہیں قرآن نے متعین کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ یہ کہتے ہیں کہ "بیت المال" حکومت کے خزانہ سے الگ ہوتا ہے اس لئے اس روپے کو حکومت کی آمدنی (GOVERNMENT REVENUES) سے الگ رکھنا چاہیئے، کیونکہ حکومت کی آمدنی دنیاوی ہے اور یہ روپیہ دینی۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس اصطلاح میں ثنویت کا وہ تصور کس طرح اُبھر کر سامنے آجاتا ہے جس کی رو سے دین اور دنیا کو دو الگ الگ دائرے قرار دیدیا گیا ہے اور جس پر سیکولرازم کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس تصور کی رو سے بنیادی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ زکوٰۃ دینا، نماز پڑھنے کی طرح انفرادی فعل ہے جسے ہر حالت میں اور ہر مقام پر عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ لیکن ایتائے زکوٰۃ کا یہ تصور قرآنی تصور کے مطابق نہیں۔ قرآن کریم نے ایتائے زکوٰۃ کو مشروط کر دیا ہے ایک خاص شرط کے ساتھ اور یہ وہ شرط ہے جس سے اس فریضہ کا بنیادی مفہوم واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔ سورۃ الحج میں جماعتِ مؤمنین کو پہلی بار جنگ کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس کا پہلا مقصد تو یہ بتایا گیا کہ اس سے لوگوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو جائے گی۔ اور اس کے بعد پیروانِ اسلام کے متعلق کہا کہ :۔

یہ حکومت کا فریضہ ہے

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ (۲۲/۴۱)۔

"یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں تمکن حاصل ہو جائے گا۔ جب ان کی اپنی آزاد حکومت قائم ہو جائے گی، تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے۔ جسے قرآن جائز تسلیم کرتا ہے، اس کا حکم دیں گے۔ جسے وہ ناجائز قرار دیتا ہے اس سے روکیں گے۔ اور ان کے تمام معاملات کی آخری اتھارٹی قانونِ خداوندی ہوگا" اس آیت سے یہ بات سورج کی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ قرآنِ کریم نے (اقامتِ صلوٰۃ کی طرح) ایتائے زکوٰۃ کے لئے جماعتِ مومنین کی اپنی حکومت کو بنیادی شرط قرار دیا ہے اور ایتائے زکوٰۃ (زکوٰۃ دینا) مملکت کا فریضہ بتایا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ یہ تصور بھی قرآن کے مطابق نہیں کہ لوگ اپنے طور اڑھائی فیصد خیرات کے طور خرچ کر دیں اور یہ بھی صحیح نہیں کہ حکومت "زکوٰۃ" وصول کرے۔ یہاں تو حکومت کا فریضہ ایتائے زکوٰۃ ——— یعنی زکوٰۃ دینا قرار دیا گیا ہے، زکوٰۃ لینا یا وصول کرنا نہیں۔ سورۃ المومنون میں، مومنین کی خصوصیاتِ کبریٰ کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوْنَ (۲۳/۴)۔ "یہ لوگ زکوٰۃ کے لئے مصروفِ کار رہتے ہیں" اس سے بھی معلوم ہوا کہ ایتائے زکوٰۃ ایک پروگرام ہے جس پر جماعت مؤمنین اپنی مملکت میں نظامِ حکومت کے تابع عمل پیرا رہتی ہے۔ یہ پروگرام، یا مملکت اسلامیہ کا فریضہ، زکوٰۃ کے اُس مفہوم کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے جسے شروع میں بیان کیا گیا ہے۔ ہم نے وہاں بتایا ہے کہ الزکوٰۃ کے معنی ہیں وہ سامان، اسباب اور ذرائع جن سے

زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم

افرادِ انسانیہ کی جسمانی نشو و نما بھی ہوتی جائے اور ان کی ذات کی نشو و نما بھی۔ قرآن کریم کی رو سے اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہوگا کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے تمام افرادِ معاشرہ کی طبیعی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں اور ان کی ذات کی نشو و نما بھی۔ یہ اس حکومت کا فریضہ ہی نہیں بلکہ اس کے قیام کا مقصد اور وجہ جواز ہے۔ افرادِ معاشرہ کی طبیعی ضروریات کے متعلق ہم جلدِ اول میں معاشی نظام کے تابع گفتگو کر آتے ہیں۔ (دیکھئے صفحات ۱۹۴؛ ۱۰۵) باقی رہی انسانی ذات کی نشو و نما، سو اس کے متعلق اسی جلد کے پہلے باب میں بات ہو چکی ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کس طرح دینِ قیّم بنتے ہیں۔ دین کا مقصد ایسا نظام قائم کرنا ہے جس میں تمام افراد احکام و قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے رہیں اور جس میں ہر فرد کو وہ سامان اور ذرائع میسر آ جائیں جن سے اس کی طبیعی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں اور اس کی ذات کی نشو و نما بھی ہوتی جائے۔ افرادِ معاشرہ کی طبیعی ضروریات پوری کرنے کے لئے ضروری ہوگا کہ ذرائع رزق، مملکتِ اسلامیہ کی تحویل میں رہیں۔ اور ذات کی نشو و نما کے لئے ضروری ہوگا کہ یہ مملکت افرادِ معاشرہ کی تعلیم و تربیت اس طرح کرے کہ ذات کی نشو و نما کا تقاضہ ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔ اگرچہ انسانی نشو و نما کے یہ دونوں گوشے زکوٰۃ کی جامع اصطلاح میں آ جاتے ہیں لیکن بعض مقامات پر اس نے ان کا الگ الگ بھی ذکر کیا ہے۔ مثلاً سورۃ البقرۃ میں ہے کہ "کشاد اور نیکی کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا رخ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ کشاد کی راہ اس کی ہے جو اللہ، آخرت، ملائکہ، انبیاء اور کتب پر ایمان لائے" اور وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ۔ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ (۲/۱۷۷) "مال کی کشش کے باوجود اسے ذوی القربیٰ، یتامیٰ، مساکین، ابن السبیل، سائلین اور محکوموں اور غلاموں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے۔ اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرے"۔ یہاں ظاہر ہے کہ "ایتائے زکوٰۃ" کے معنی طبیعی ضروریات کا پورا کرنا ہی نہیں۔ کیونکہ یہ مقصد تو روپیہ صرف کرنے سے حاصل ہو جائے گا جس کے لئے "اٰتَى الْمَالَ" کے الفاظ پہلے آ چکے ہیں۔ یہاں ایتائے زکوٰۃ سے مراد اس کا دوسرا گوشہ ہے۔ یعنی مناسب تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا اور ایسی مساعد فضا پیدا کرنا، جس میں ان افرادِ معاشرہ کی ذات کی نشو و نما بھی ہوتی جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ حضور نبئ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جب کہا گیا ہے کہ: وَ يُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۲/۱۵۱؛ ۲/۱۲۹؛ ۳/۱۶۳؛ ۶۲/۲) "وہ کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور اس طرح ان کے تزکیۂ نفس ——— ان کی ذات کی نشو و نما ——— کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ انہیں اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ اپنی ذات کی مناسب نشو و نما کر سکیں" تو اس سے بھی یہی مقصد ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلامی مملکت کے سربراہ کی حیثیت

سے حضورؐ کا فریضہ یہ بھی تھا کہ آپؐ افرادِ معاشرہ کے رزق کا انتظام کریں۔ لیکن اس کے ساتھ، بلکہ اس سے کہیں اہم، یہ فریضہ تھا کہ حضورؐ ان افراد کی ذات کی نشوو نما کا انتظام کریں۔ اور یہ مقصد تعلیمِ کتاب و حکمت کی رُو سے حاصل ہو سکتا تھا۔

ضمناً ہم نے اوپر کہا ہے کہ فریضۂ رسالت یہ بھی تھا کہ لوگوں کو اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ اپنی ذات کی نشوو نما کر سکیں تو یہ چیز قرآنی رہنمائی کے مطابق ہے۔ قرآنِ کریم نے ایک طرف تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ کہا ہے کہ وَيُزَكِّيهِمْ اور دوسری جگہ خود افراد کے متعلق کہا کہ: قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا (۹۱/۹)۔ "اسی کی زندگی کی کھیتی پروان چڑھی جس نے اپنی ذات کی نشوو نما کرلی"۔ (نیز ۸۷/۱۴ ؛ ۳۵/۱۸) ان آیات سے ظاہر ہے کہ اپنی ذات کی نشوو نما ہر فرد کو خود ہی کرنی ہوگی۔ اسلامی نظام ——— باتباعِ رسالتِ محمدیہؐ ——— ایسا انتظام کرے گا جس سے افرادِ معاشرہ اس قابل ہو جائیں کہ اپنی ذات کی نشوو نما کر سکیں۔ اسی کو ہم نے مساعد فضا مہیا کرنا یا مناسب تعلیم و تربیت کے اسباب بہم پہنچانا کہا ہے۔ افراد کی ذات کی نشوو نما کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اسے تو فرد کو خود آپ ہی کرنا ہوگا۔ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ آپ لوگوں کی صحیح راستہ کی طرف راہنمائی کر سکتے ہیں انہیں صحیح راستہ پر چلا نہیں سکتے۔ إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ (۲۸/۵۶)۔ "اور تو اور، وہ بھی جس سے تو خاص طور پر محبت کرے، تو اُسے بھی صحیح راستہ پر چلا نہیں سکتا۔ اسے راستہ دکھا ہی سکتا ہے۔ راستہ پر چلنا تو قانونِ خداوندی کے مطابق ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہی جانتا ہے کہ کون صحیح راستہ پر چلتا ہے"۔

اس ضمنی نکتہ کے بعد ہم پھر اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ ایتائے زکوٰۃ خلافت علیٰ منہاجِ رسالت (اسلامی مملکت) کا فریضہ ہے۔ یہ صدقہ اور خیرات کا انفرادی فعل نہیں ——— ضمناً، جنہیں زکوٰۃ کے قرآنی مصارف کہا جاتا ہے وہ زکوٰۃ کے مصارف نہیں، صدقات کے مصارف ہیں (دیکھیے ۹/۶۰)۔ صدقات اور زکوٰۃ میں کیا فرق ہے اس کی وضاحت اپنے مقام پر کی جائے گی۔

ہم نے کہا ہے کہ ایتائے زکوٰۃ مملکتِ اسلامیہ کا فریضہ ہے۔ مملکتِ اسلامیہ یا قرآنی حکومت پر کسی خاص فرد یا افراد کے کسی گروہ کی اجارہ داری نہیں ہوتی۔ یہ پوری کی پوری امتِ مسلمہ کی مملکت ہوتی ہے اور جسے ہم مملکت کا فریضہ کہتے ہیں وہ درحقیقت پوری امت کا فریضہ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ایتائے زکوٰۃ بھی پوری کی پوری ملّتِ اسلامیہ کا فریضہ قرار پائے گا۔ عملی طور پر یوں سمجھئے کہ اس مملکت میں تمام کارِ کسب افراد ان کاموں کو، جو ان کے سپرد کئے جائیں گے، اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق پوری پوری تندہی سے سرانجام دیں گے۔ اس کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لے کر

زکوٰۃ کا عملی نظام

فاضلہ، اس نظام کی سنٹرل اتھارٹی (مرکزِ ملت) کی تحویل میں دیدیں گے تاکہ وہ اس سے ان لوگوں کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کا انتظام بھی کرے جو اپنی ضروریات خود پورا کرنے کے قابل نہ ہوں۔ اس کے علاوہ، وہ مملکت افرادِ معاشرہ کی مناسب تعلیم و تربیت کا انتظام بھی کرے جس سے وہ اس قابل ہو جائیں کہ اپنی ذات کی نشوونما کر سکیں۔ اس اعتبار سے آپ آج کی اصطلاح میں کہہ سکتے ہیں کہ زکوٰۃ، اسلامی مملکت کی جملہ آمدنی (REVENUE) کو کہا جائے گا اور اسے اس لئے زکوٰۃ کہا جائے گا کہ اس آمدنی کا مقصد افرادِ معاشرہ کی نشوونما ہو گا۔ حکومت کے محاصل کو مقصد کے نام سے تعبیر کرنے میں جو گہری حکمت ہے اس کی تحسین اربابِ نظر ہی کر سکتے ہیں۔

اس مقام پر قارئین کے دل میں یقیناً یہ سوال ابھرے گا کہ پھر یہ "زکوٰۃ" موجودہ شکل میں کس طرح تبدیل ہو گئی؟ "کس طرح تبدیل ہو گئی" کا جواب دینا مشکل ہے۔ اتنا تو واضح ہے کہ قرآنِ کریم میں نہ زکوٰۃ کے نصاب کا کوئی ذکر ہے نہ اس کی شرح کا۔ نہ اس کے مصارف کا تعین کیا گیا ہے۔ یہ تمام چیزیں خارج از قرآن ہیں۔ نصاب وغیرہ تو اس لئے بھی خارج از قرآن ہے کہ قرآنِ کریم نے مال و دولت جمع کرنے کی سخت مخالفت کی ہے۔ اتنی مخالفت کہ اس نے ایک مقام پر کہا ہے کہ "جہنم آوازیں دے دے کر بلائے گا اس شخص کو جَمَعَ فَاَوْعٰی (۷۰/۱۸)" جو مال جمع کر کے اسے برتن میں بند کر لیتا ہے اور پھر اس پر ڈھکنا دے کر اسے اپنے لئے مختص کر لیتا ہے۔" ایسے شخص کو جہنم آوازیں دے دیکر بلائے گا۔ سورۃ الھمزۃ

دولت جمع کرنے کے خلاف

میں ہے کہ سخت تباہی ہے اس کے لئے اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَہٗ (۱۰۴/۲) "جو دولت جمع کرتا ہے اور پھر ننانوے کے پھیر میں پھنس جاتا ہے۔" قرآن کہتا ہے کہ ایسے شخص کو اس آگ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ "جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیا کرتے ہیں۔" سورۃ التوبہ میں اس اجمال کو مزید تفصیل سے بیان کر دیا جہاں کہا کہ: وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ۔ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَجُنُوْبُھُمْ وَظُھُوْرُھُمْ۔ ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ (۹/۳۴-۳۵)۔ "جو لوگ چاندی اور سونا، یعنی مال اور دولت جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں صرف کرنے لئے کھلا نہیں رکھتے، تو اے رسولؐ! تم اعلان کر دو کہ وہ ایک الم انگیز عذاب میں ماخوذ ہوں گے۔ اُس دن اُن کے چاندی اور سونے کے ان ٹکڑوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا۔ اور پھر اس سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشت کو داغا جائے گا اور اُن سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنے لئے مختص کر رکھا تھا۔ لو

آج اپنے خزانہ سے پیدا ہونے والے عذاب کا مزہ چکھو"۔ ہم نے یہ آیات محض مثال کے طور پر درج کر دی ہیں ورنہ قرآن کریم اصولی طور پر زراندوزی کی سخت مخالفت کرتا اور اس طرح نظامِ سرمایہ داری کو اس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتا ہے۔ وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ: یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) "اے رسولؐ! یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنے مال و دولت میں سے کتنا حصہ دوسروں کے لئے دیدیں۔ ان سے کہدو! کہ تمہاری اپنی ضروریات سے جس قدر بھی زائد ہے وہ سب کا سب"۔ قرآن کی اس تعلیم کی روشنی میں ظاہر ہے کہ یہ تصور ہی نہیں پیدا ہوتا کہ مسلمان دولت جمع کرتا رہے اور اس جمع شدہ مال پر ایک سال گزر جانے کے بعد اس میں سے اڑھائی فیصد نکال کر "اللہ واسطے" دیدے۔ یہ تو خالص نظامِ سرمایہ داری ہے۔ نظر آتا ہے کہ جب صدرِ اول کے بعد مسلمانوں میں ملوکیت آئی تو اس کے ساتھ ہی مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری کے عناصر بھی ابھر آئے۔ قرآنی آیات کی رو سے تو اس نظام (سرمایہ داری) کے شائبہ تک کی بھی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔ اس کے لئے لامحالہ روایات وضع کرنی پڑیں اور وہ روایات ہماری کتبِ احادیث میں داخل کر دی گئیں (مثلاً) ہم نے اوپر سورۃ التوبہ کی آیات (۹/۳۴-۳۵) درج کی ہیں جن میں دولت کے اکتناز کو عذابِ جہنم کا موجب بتایا گیا ہے۔ ان کی تفسیر کے سلسلہ میں ذیل کی روایت (مشکوٰۃ۔ کتاب الزکوٰۃ میں) درج ہے:۔

زکوٰۃ کے متعلق وضعی روایات

(حضرت) ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرتِ عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری فکر کو دور کر دونگا اور اس مشکل کو حل کر دونگا پس، عمرؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا نبی اللہ! یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں گزری ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے۔۔۔۔

(حضرت) ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا بیان سنکر (حضرت) عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔

یہ روایت زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ اسے ایک خاص مقصد کے لئے وضع کیا گیا۔ ورنہ آپ سوچئے کہ خدا کی طرف سے حکم نازل ہوتا ہے اور وہ (معاذ اللہ) صحابہ کبارؓ پر معاذ اللہ گراں گزرتا ہے؟ حضرتِ عمرؓ ان کی نمائندگی کرتے ہوئے اس مشکل کے حل کی تلاش کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس جاتے ہیں اور حضورؐ فرما دیتے ہیں کہ تم لوگ خواہ مخواہ پریشان ہو گئے۔ جتنا جی چاہے مال جمع کرو۔ بس اس میں سے، سال کے بعد اڑھائی روپیہ سینکڑہ کے حساب سے خدا کی راہ میں دیدیا کرو۔ باقی سارا مال حلال وطیب ہو جائے گا اور (حضرت) عمرؓ اس حل کو سن کر نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہیں۔

(معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)۔ یہ وہ مومنین ہیں جن کے متعلق قرآن شہادت دیتا ہے کہ انہوں نے اپنا مال اور جان، خدا کے ہاتھ بیچ دیا تھا (9/111) یہ وہ مومنین ہیں کہ خدا کا حکم تو ایک طرف، اس کے رسولؐ کے فیصلے کے متعلق خدا کا یہ ارشادِ گرامی ان کے سامنے تھا کہ: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (4/65) "تیرا رب اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ کبھی مومن نہیں ہوسکتے جب تک ان کی یہ حالت نہ ہو کہ اپنے ہر اختلافی معاملہ میں تجھے اپنا حَکَم بنائیں اور اس کے بعد یہی نہیں کہ تمہارے فیصلہ کو طوعاً وکرہاً تسلیم کرلیں بلکہ اس کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی نہ گزرے۔ وہ دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں"۔ کیا آپ ایک ثانیہ کے لئے بھی یہ تصور کرسکتے ہیں کہ جن لوگوں کے مومن ہونے کے لئے یہ شرط تھی، خدا کا حکم ان کے دل میں کسی قسم کی گرانی پیدا کر دے گا اور پھر وہ اس مصیبت کا حل تلاش کرنے کے لئے اپنا نمائندہ رسول اللہؐ کے پاس بھیجیں گے؟ اور نمائندہ بھی حضرت عمرؓ جیسا، جس کے کرتے پر زمانۂ خلافت میں بھی چار چار پیوند لگے ہوتے تھے؟

اس قسم کی ہیں وہ روایات، جن کی رو سے قرآن کریم کے معاشی نظام (الزکوٰۃ) کو مروجہ زکوٰۃ میں بدل دیا گیا اور جس نے نظامِ سرمایہ داری کے لئے سارے راستے کھول دیئے۔ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ خود ان حضرات کی بیان کردہ سیرت کی رو سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ زکوٰۃ دی ہی نہیں

رسول اللہ اور جمع مال

اس لئے کہ تمام کتبِ سیرت اس کی شہادت دیتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور اپنے اہلِ خانہ کے ضروریات سے زائد ایک پیسہ بھی کبھی گھر میں نہیں رکھا تھا۔ ایک روایت میں یہاں تک کہا گیا ہے:-

> مرض الموت کے وقت، حضورؐ کے ہاں چند دینار کہیں سے آئے تھے، حضورؐ نے فرمایا کہ انہیں صدقہ کر دو۔ (یعنی بیت المال بھیج دو) تاکہ ان سے حاجتمندوں کی ضروریات پوری ہوں، لیکن اس کے بعد حضورؐ پر غشی طاری ہوگئی اور سب لوگ آپ کی تیمارداری میں مصروف ہوگئے۔ آپ کو ہوش آیا تو فرمایا وہ دینار لاؤ۔ دینار کو حضورؐ نے اپنے ہاتھ پر رکھا اور کہا ـــــ خدا کا محمدؐ کے متعلق کیا گمان ہوگا جب وہ اس سے ملے اور کے پاس یہ دینار ہوں۔ اس پر حضورؐ نے انہیں خود بیت المال میں بھجدیا۔ (اصح السیر۔ حکیم دانا پوری)

بخاری میں یہ حدیث بھی موجود ہے کہ حضورؐ نے فرما دیا تھا:-

> میرے ورثہ میں ایک دینار بھی بطور ترکہ تقسیم نہیں ہوگا۔ میری بیویوں کی ضروریات اور منتظم کے اخراجات کے بعد جو کچھ بھی بچے گا، وہ صدقہ ہوگا۔

ظاہر ہے کہ جس ذاتِ اقدسؐ کی یہ کیفیت ہو اور جس گھرانہ کی مالی حالت ایسی ہو وہ اس زکوٰۃ کو کیسے ادا کریں گے جس کی اولیں شرط یہ ہے کہ جمع شدہ مال پر ایک سال بیت چکا ہو۔ کیا اس گھر میں جمع شدہ مال سال بھر کے لئے رکھا رہتا ہوگا؟

اور جب اس گھر کی کیفیت یہ تھی تو اس کے بعد یہ سوچئے کہ اس آیت کا مطلب کیا ہوگا جس میں اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کو یہ حکم دیا تھا کہ[1] وَاَقِمۡنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيۡنَ الزَّكٰوةَ (۳۳/۳۳)۔ "تم اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرو۔" ظاہر ہے کہ یہ ایتائے زکوٰۃ، ہماری مروجہ زکوٰۃ نہیں تھی۔ یہ وہی زکوٰۃ تھی جس کے متعلق ہم حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فریضہ (يُزَكِّيۡهِمۡ) کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ یعنی حضورؐ کے اہلِ خانہؓ سے کہا یہ گیا تھا کہ تم ایسا انتظام کرو جس سے تمہارے دائرۂ اثر میں آنے والے افراد کی ذات کی نشوونما کا انصرام ہوسکے۔ یعنی ضروری تعلیم و تربیت کی رو سے۔

ہم نے اُوپر کہا ہے کہ ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ امتِ مسلمہ کا اجتماعی منصب تھا۔ اس کی تائید زیرِ نظر آیت (۲/۴۳) کا اگلا ٹکڑا کر رہا ہے:۔

وَارۡكَعُوۡا مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ (۲/۴۳)۔

اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "تم رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔" دیکھنے میں تو یہ تین لفظ ہیں لیکن درحقیقت یہ مذہب اور دین کا نقطۂ امتیاز ہیں۔ اس کی وضاحت سے پیشتر آپ پہلے اس لفظ (رکوع) کے معنی اور مفہوم کو دیکھ لیجئے۔

رکوع کے معنی

اس کے مادہ (ر۔ک۔ع) کے معنی جھکنے کے ہیں، جس طرح سجدہ کے معنی بھی جھکنے کے ہیں۔ عام طور پر ان میں فرق یہ کیا جاتا ہے کہ رکوع تھوڑے سے جھکنے کو کہتے ہیں اور سجدہ پورے اور کامل جھکاؤ کو۔ یہ وہی فرق ہے جو نماز میں رکوع اور سجدہ کی محسوس ہیئت میں نظر آتا ہے۔ ان دونوں کے اس فرق کی تشریح بھی ذرا آگے چل کر بیان کی جائے گی۔ جیسا کہ اسی جلد کے دوسرے باب میں "سجدہ" کے ضمن میں بتایا جا چکا ہے۔ سجدہ سے مفہوم قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہے۔ یہی مفہوم رکوع کا بھی ہے۔ سورۃ الحج میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں واضح کیا گیا ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا ارۡكَعُوۡا وَاسۡجُدُوۡا وَاعۡبُدُوۡا رَبَّكُمۡ وَافۡعَلُوا الۡخَيۡرَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ۔ (۲۲/۷۷) اے جماعتِ مومنین! تم رکوع کرو اور سجدہ کرو۔ یعنی اپنے رب کی محکومیت اور اطاعت اختیار کرو۔ اور خیر کے کام کرو تاکہ تمہاری کھیتیاں پروان چڑھیں۔" اس سے اگلی آیت میں اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ اور

---

[1] خطاب "نساء النبی" سے ہے جن میں حضورؐ کی ازواج مطہرات اور دیگر محترم خواتین بھی آجاتی ہیں۔ اسی لئے میں نے اس کا ترجمہ اہل بیت کیا ہے۔

اعتصام باللہ وغیرہ، دین کے بنیادی ارکان کا ذکر آیا ہے۔ سورۃ الفتح میں، مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ کی مختلف خصوصیات اور صفاتِ کبریٰ کے ضمن میں کہا: تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا (۴۸/۲۹) "تو انہیں راکعین اور ساجدین دیکھے گا"۔ ظاہر ہے اس کے معنے بھی اطاعت گزار کے ہیں۔ سورۃ المائدۃ میں مومنین کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرتے ہیں وَهُمْ رٰكِعُوْنَ (۵/۵۵)۔ "وہ خدا کے اطاعت گزار ہوتے ہیں"۔ سورۃ التوبہ میں مومنین کے اوصاف کے سلسلہ میں الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ (۹/۱۱۲) کہا گیا ہے۔ خانہ کعبہ کے سلسلہ میں بھی لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (۲/۱۲۵ ؛ ۲۲/۲۶) کے الفاظ آئے ہیں۔ ایک مقام پر اہلِ جہنم کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کا جرم یہ تھا کہ یہ خدا کی صداقتوں کی تکذیب کرتے تھے وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ۔ (۷۷/۴۸) "جب ان سے کہا جاتا تھا کہ رکوع کرو تو یہ رکوع نہیں کرتے تھے"۔ اس کے معنی واضح ہیں کہ ان سے کہا جاتا تھا کہ احکام و قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرو تو یہ ان کی اطاعت نہیں کرتے تھے۔

ان آیات سے واضح ہے کہ رکوع کرنے کے معنی قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنے کے ہیں —— اس کی محکومیت اختیار کرنے کے —— ہم نے اوپر کہا ہے کہ سجدہ کا مفہوم بھی یہی ہے۔ لیکن لغوی طور پر رکوع تھوڑے سے جھکنے کو کہتے ہیں اور سجدہ پورے کے پورے جھک جانے کو۔ ہر چند یہ دونوں الفاظ اطاعت کے معانی میں مرادف ہیں لیکن قرآن کریم نے جب یہ دو الگ الگ الفاظ استعمال کئے ہیں تو ان کا فرق کچھ یوں سمجھ میں آتا ہے۔ دین کی دعوت کا آغاز اس قوم سے ہوتا ہے جو ان صداقتوں سے یا تو بالکل بیگانہ ہوتی ہے یا ان پر عمل پیرا نہیں ہوتی۔ ان کی روشِ زندگی ان کے یکسر خلاف ہوتی ہے۔ اور چونکہ یہ روش صدیوں سے اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی چلی آ رہی ہوتی ہے، انہیں اس حالت سے نکال کر دین کی غایت

رکوع اور سجدہ میں فرق

تک پہنچانا ایک طویل سفر ہوتا ہے۔ نفسیاتی حکمت کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں یہ تبدیلی بتدریج لائی جائے (مثلاً) ہم قرآن کریم کے معاشی نظام میں دیکھ چکے ہیں کہ اس کا منتہیٰ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) ہے۔ یعنی اپنی ضرورت سے زائد سب کچھ مملکت کے حوالے کر دینا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس غایت تک تو بتدریج پہنچا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں صدقہ اور خیرات اور ضرورتمندوں کے لئے انفرادی امداد وغیرہ کے احکام بھی ملتے ہیں۔ حتیٰ کہ وراثت کے احکام بھی۔ صاف نظر آتا ہے کہ ان احکام کا تعلق اس عبوری دور سے ہے جس میں سے گذار کر اس جماعت کو آخری نصب العین تک پہنچا یا جائے گا[1] جب وہ

---

[1] جیسے ترکِ خمر کے متعلق تاریخ بتاتی ہے کہ اس حکم کو آخری منزل تک پہنچنے کے لئے قریب پندرہ سال کا عرصہ لگ گیا۔

آخری منزل آجائے گی ـــ یعنی تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی کے بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت پر عائد ہو جائے گی اور افرادِ مملکت کے پاس زائد از ضرورت کچھ نہیں رہے گا ـــ اُس وقت اس عبوری دور سے متعلق احکام پر عمل پیرا رہنے اور ہونے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ دین کے اس طریقِ کار کی روشنی میں، ہم کچھ ایسا سمجھتے ہیں کہ رکوع کا تعلق عبوری دور سے ہے اور سجدہ، انتہائی شکل کا نام ہے۔ اطاعت تو دونوں میں ہی ہو گی لیکن ان کے مدارج میں فرق ہو گا۔ یہ بھی واضح رہے کہ انتہائی شکل میں جب عبوری دور سے متعلق احکام پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت نہیں رہے گی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ احکام منسوخ ہو جائیں گے، وہ بدستور اپنی جگہ قائم رہیں گے جب حالات پھر ویسے ہو جائیں تو وہ نافذ العمل ہو جائیں گے ـــ جس طرح پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کا حکم نافذ العمل ہو جاتا ہے اور پانی مل جانے پر یہ حکم ساقط العمل ہو جاتا ہے۔ منسوخ نہیں ہو جاتا۔

اب آئیے اس بنیادی نکتہ کی طرف، جس کے متعلق ہم نے کہا ہے کہ وہ مذہب اور دین میں حدِ فاصل ہے یعنی یہ کہ وَارْكَعُوا کے ساتھ مَعَ الرَّاكِعِينَ کی شرط کیوں لگائی گئی ہے۔

دین اجتماعی نظام کا نام ہے مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ، انفرادی تعلق کا نام ہے، جسے ہر شخص اپنے اپنے طور پر، اپنے اپنے طریق سے ہر جگہ، بزعم خویش قائم کر سکتا ہے، اور مقصد اس سے اپنا اطمینان حاصل کرنا، یا اس سے آگے بڑھ کر اپنی اپنی نجات ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، دین ایک اجتماعی نظام کا نام ہے۔ اس میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت بھی اجتماعی حیثیت سے ہوتی ہے اور اس کے نتائج بھی اجتماعی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اجتماعی معاشرہ یا جماعت بھی افراد ہی کا مجموعہ ہوتی ہے اس لئے ایک صالح نظام، یا طیب جماعت اسی صورت میں متشکل ہو سکتی ہے جب افراد بھی صالح ہوں۔ یہ نکتہ بڑا بنیادی ہے جس کی رو سے دائرہ یوں قائم ہوتا ہے کہ افراد صالح ہوں تو جماعت یا نظام صالح ہوتا ہے اور اجتماعی نظام صالح ہو تو افراد بھی صالح ہوتے ہیں۔ افراد اور جماعت کا یہ تعلق ایک مثال کے ذریعے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ گھڑی، مختلف پرزوں کے ربطِ باہمی کا نام ہے۔ اگر پرزے ٹھیک ٹھیک ہوں تو گھڑی بھی درست ہو گی اور اگر اس کے پرزے درست نہ ہوں تو گھڑی کے درست ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو گا لیکن اگر یہ نہایت عمدہ، پختہ، درست، صحیح و سالم پرزے میز پر بکھرے پڑے ہوں، تو نہ ان کا کوئی فائدہ ہو گا نہ ان سے کوئی نتیجہ مرتب ہو سکے گا۔ انہیں ایک خاص ربط و ضبط کے ساتھ، مشینری کی شکل میں اپنی اپنی جگہ پر فٹ ہونا پڑے گا تب جا کر ان کی افادیت ظہور میں آ سکے گی۔ اسے کہتے ہیں اجتماعی نظام۔

تشکیلِ اُمت قرآنِ کریم نے دین کے قیام کے لئے اُمت کا وجود لازمی قرار دیا ہے۔ اسی لئے اس نے مومنین کو اُمت کہہ کر پکارا ہے۔ جب حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام نے دنیا میں

خدا کے گھر کی عمارت استوار کی تو اس کی تعمیر کے بعد انہوں نے خدا کے حضور اپنی یہ آرزو پیش کی کہ: رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (۲/۱۲۸) "اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں بھی ایسا بنا کہ ہم تیرے اطاعت گذار رہیں اور ہماری ذریت میں سے بھی ایک ایسی امت پیدا کر جو تیرے احکام کے سامنے سربسجود ہو" یعنی تعمیر کعبہ کے بعد پہلی دعا ایک اُمت پیدا کرنے کے لئے کی گئی۔ یہی وہ امت تھی جو اسلام کو بحیثیت دین کے متشکل کرنے کے لئے وجود میں لائی گئی۔ چنانچہ اسی کعبہ کی مرکزیت کے سلسلہ میں کہا گیا کہ: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (۲/۱۴۳) "اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنایا۔ تمہارا نظام یہ ہوگا کہ تم تمام اقوام عالم کے اعمال کی نگرانی کروگے اور یہ رسول تمہارے اعمال و کردار کا نگران ہوگا۔" اس امت کے متعلق دوسری جگہ کہا کہ: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۰۹) "تم وہ بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسان کی فلاح اور بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تمہارا فریضہ ہے۔" سورۃ الاعراف میں ہے: وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ أُمَّةٌ يَّهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُونَ (۷/۱۸۱) "اور ہم نے اپنی مخلوق میں سے ایک امت پیدا کی ہے جو الحق کے ساتھ لوگوں کی راہنمائی کرتی اور اسی کی رُو سے دنیا میں نظامِ عدل قائم کرتی ہے۔"[1]

اعتصام بحبل اللہ

یہ اُمت متشکل کیسے ہوگی، اس کے متعلق سورۃ آلِ عمران میں وضاحت سے بتا دیا کہ: وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا (۳/۱۰۲) "تم تمام کے تمام، اجتماعی حیثیت سے، وحیِ خداوندی (قرآن مجید) کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور باہمی تفرقہ مت پیدا کرو۔ فرقے اور پارٹیاں نہ بن جائیں" یہاں دیکھئے۔ امت کی وحدت کا طریق کار یہ بتایا گیا ہے کہ سب کے سب، کتاب اللہ کے ساتھ متمسک رہیں۔ یہی ان کا نقطہ ماسکہ اور نصب العینِ حیات ہو۔ پھر جَمِيعًا کے لفظ نے واضح کر دیا کہ یہ "اعتصام بحبل اللہ" اجتماعی حیثیت سے ہوگا۔ فرداً فرداً تو ایک طرف، گروہ در گروہ ہو کر بھی، یہ اعتصام نہیں ہو سکے گا۔ اس کے بعد کہا: وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَآءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (۳/۱۰۳) "تم تباہی اور بربادی کے جہنم کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ تم اس میں گرنے ہی والے تھے کہ اس نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ ہم اس طرح تمہیں اپنی باتیں، اپنے احکام، اپنی آیات سمجھاتے رہتے ہیں تاکہ تم صحیح راستہ پر چلتے رہو۔

[1] یہاں سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ عدل اسی فیصلہ کو کہا جائے گا جو وحیِ خداوندی (قرآن کریم) کے مطابق ہو۔

یہ تھا وہ طریق، جس سے ان افراد کو ایک امت کی شکل میں متشکل کیا گیا۔ اس کا بنیادی نکتہ تھا، اجتماعی طور اعتصام بحبل اللہ (۳/۱۰۲ و ۴/۱۴۶)۔ اور نتیجۃً دلوں کے باہمی ملنے سے ایک دوسرے کا بھائی بن جانا۔ اس امت کی تشکیل میں وجۂ جامعیت دین کا اشتراک تھا۔ نسل، رنگ، وطن، زبان میں سے کسی کا اشتراک بھی وجۂ جامعیت نہیں تھا۔ قرآن کریم نے مختلف اقوامِ عالم اور مختلف ادوارِ زمانہ میں پیدا ہونے والے انبیائے کرامؑ کا نام بنام ذکر کرنے کے بعد کہا: اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (۲۱/۹۲)۔ "یہ تمام حضرات ایک امت کے افراد تھے۔ اور ان کے ایک امّت بننے کی بنیاد یہ تھی کہ وہ ایک ہی رب کے بندے تھے اور اسی کے اطاعت گزار تھے"۔ یہی وہ اُمت تھی جسے سلسلہ انبیائے کرامؑ کی آخری کڑی، حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دین کے اشتراک کی بنیادوں پر متشکل فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے ان سے تاکیداً کہا کہ: یٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۳/۱۹۹)۔ "اے جماعتِ مومنین! اے امتِ مسلمہ! تم میں سے ہر فرد دین کی بنیادوں پر ثابت قدم رہے۔ دوسرے افراد کے ثابت قدم رہنے کا ذریعہ بنے۔ اور اس طرح ربط باہمی سے باہوں میں باہیں ڈال کر ایک جماعت کی حیثیت سے سفرِ حیات طے کرے۔ یوں تم سب قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاؤ تاکہ تمہاری کھیتیاں پروان چڑھیں"۔ اس کے بعد تاکید کی کہ: كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (۹/۱۱۹)۔ صادق بننا اور رہنا چاہتے ہو تو گروہِ صادقین کے ساتھ مل کر رہو"۔ اور یہی مفہوم ہے: وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (۲/۴۳) کا۔ قرآن کریم نے تو جنت میں داخل ہونے کی شرط بھی یہ بتائی ہے کہ: فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (۸۹/۲۹-۳۰)۔ "میرے بندوں کے ساتھ مل جا اور یوں جنت میں داخل ہو جا"۔ یاد رہے کہ یہاں نفسِ مطمئنہ کو مخاطب کیا گیا (۸۹/۲۷)۔ مذہب اور تصوف میں تصور یہ ہے کہ نفس کا مطمئن ہو جانا مقصودِ حیات ہے، اور نفس چونکہ ہر فرد کا الگ الگ ہوتا ہے اس لئے اطمینانِ قلب یا اطمینانِ نفس انفرادی چیز ہے جو مختلف قسم کے مجاہدوں اور ریاضتوں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اور جس فرد کو یہ حاصل ہو جائے وہ جنت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے نفسِ مطمئنہ کے جنت میں داخل ہونے کے لئے بھی یہ شرط بتائی کہ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (۸۹/۲۹-۳۰)۔ "تو میرے بندوں کے گروہ میں شامل ہو جا اور یوں جنت میں داخل ہو جا۔ اس کے بغیر تُو جنت میں داخل نہیں ہو سکتا"۔ آپ نے غور فرمایا کہ وہ جو ہم نے گھڑی اور اسکے پرزوں کی مثال سے بات واضح کی تھی، قرآن کریم نے اُسے کس طرح ایک حقیقت کے طور پر بیان کیا ہے۔ یعنی افراد کے نفس (ذات) کا متوازن اور مطمئن ہونا ضروری ہے لیکن یہ نفس الگ الگ مقصدِ حیات حاصل نہیں کر سکتے۔ ان کا جماعت کی مشینری کے اندر فِٹ ہونا نہایت ضروری ہے اس طرح یہ جنتی زندگی حاصل کر سکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جنت و جہنم، دونوں کے متعلق یہ کہا کہ ان میں جماعتیں داخل ہوں

گی (۴۹/۳۲؛ ۲۹/۳۲)۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے پیغام میں اسلام اور جماعتی زندگی کو لازم ملزوم قرار دیا ہے، اور یہ درحقیقت تفسیر ہے اُس قرآنی نکتہ کی، جسے حضرتِ عمرؓ نے ان تین الفاظ میں سمو کر رکھدیا تھا کہ لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَۃِ۔ جماعت کے بغیر اسلام کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ساتھ ہی اقبالؒ نے فرد اور جماعت کے باہمی تعلق پر بھی بڑی شرح و بسط سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ رموزِ بیخودی میں کہتے ہیں :-

فرد را ربطِ جماعت رحمت است ؞ جوہرِ اُو را کمال از ملت است

فرد می گیرد، ز ملت احترام ؞ ملت از افراد می یابد نظام

دین کے اسی اجتماعی نظام کو خلافتِ راشدہ، یا مملکتِ اسلامیہ کہا جاتا ہے۔ یہ مملکت مشتمل ہوگی ایک امت پر، جس میں نہ کوئی مذہبی فرقہ ہوگا نہ سیاسی پارٹی۔ اس امت کا ضابطہ خدا کی کتاب ہوگا اور انہیں

مرکزِ ملّت

اس کتاب کے مطابق چلانے والی اس مملکت کی سنٹرل اتھارٹی، جسے مرکزِ ملت کہکر پکارا جاتا ہے۔ اسی کی تشریح میں اقبالؒ کہتا ہے :-

قوم را ربط و نظام از مرکزے ؞ روزگارش را دوام از مرکزے

محسوسات کے خوگر انسان کے لئے ایک محسوس مرکز کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلام میں یہ محسوس مرکز، کعبہ ہے جسے خدا نے "بَیْتِیْ" (اپنا گھر) کہکر پکارا ہے اور اسے تمام امت کے لئے قبلہ قرار دیا ہے۔ قبلہ کے معنی ہوتے ہیں، وہ نصب العین جو ہر وقت نظروں کے سامنے رہے (مثال کے طور پر جیسے) اگر آج ماسکو کہا جائے تو اِس سے مقصد ایک شہر نہیں ہوتا بلکہ کمیونزم کے نظام کے مرکز کی محسوس شکل ہوتا ہے۔ یہی حیثیت دین کے نظام میں کعبہ کی ہے جس کے متعلق کہا کہ وَحَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (۲/۱۴۴) "تم دنیا میں کہیں بھی ہو، تمہاری نگاہیں اسی مرکز کی طرف ہونی چاہئیں"

آئین (کتاب اللہ) کی وحدت اور مملکت کی وحدت اور اُن کے ساتھ اس محسوس مرکز کی وحدت سے امت کی وحدت برقرار رہتی ہے۔ اقبالؒ نے اس حقیقت کو کیسے حسین انداز میں بیان کیا ہے کہ :-

چیست ملت، اے کہ گوئی لا الٰہ ؞ با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

مردۂ؟ از یک نگاہی زندہ شو ؞ بگذر از بے مرکزی، پائندہ شو

کعبہ کے متعلق وہ کہتا ہے کہ وہ محض مٹی اور پتھر کی عمارت کا نام نہیں۔ وہ ملتِ اسلامیہ کی یک نگہی کی محسوس علامت ہے۔

ارمغانِ حجاز میں ہے :-

حرم جز قبلۂ قلب و نظر نیست   طوافِ اُو طوافِ بام و در نیست

میانِ ما و بیت اللہ رمزیست   کہ جبریلِ امیں را ہم خبر نیست

یہ ہے دین کی رو سے، جماعت، اس کے مرکز اور اس کے نصب العین کی حقیقت ـــــ ایک امت، ایک ضابطۂ حیات، ایک نظامِ زندگی، ایک مملکت اور ایک مرکزِ محسوس۔ لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو ان ارکان و عناصر کی شکلیں تو باقی رہ جاتی ہیں، روح اور مقصد ختم ہو جاتا ہے۔ روزانہ زندگی میں اس اجتماعیت کے مظاہر صلوٰۃ کے اجتماعات تھے لیکن اب اس کا مفہوم "باجماعت نماز" بن کر رہ گیا ہے اگرچہ مروجہ نماز کے لئے جماعت کی شرط بھی لازمی نہیں (نماز انفرادی طور پر بھی ادا کی جاسکتی ہے) لیکن باجماعت نماز کا ثواب زیادہ بتایا جاتا ہے۔ پھر، نماز کی نیت کرتے وقت، "منہ طرف قبلہ شریف کے" بھی کہا جاتا ہے۔ مساجد کا رُخ بھی قبلہ کی سمت رکھا جاتا ہے اور اس کے تعین کے لئے بڑی احتیاط برتی جاتی ہے کہ وہ بالکل صحیح ہو۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن محض رسوم، جن کی روح گم ہو چکی ہے۔

ہماری موجودہ حالت

نماز میں سارے نمازی "باجماعت" کھڑے ہوتے ہیں لیکن ایک نمازی کا دل، دوسرے نمازی کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اسی قسم کی تھی وہ جماعت، جس پر طعن کرتے ہوئے، منافقوں کے متعلق کہا تھا تَحۡسَبُهُمۡ جَمِيۡعًا وَّقُلُوۡبُهُمۡ شَتّٰى (۵۹/۱۴)۔ "تم گمان کرو گے کہ یہ ایک جماعت ہے حالانکہ ان کے دل ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتے ہیں"۔ آپ کو یاد ہو گا کہ قرآنِ کریم نے جماعت کی بنیادی شرط فَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِكُمۡ (۳/۱۰۲) بتائی تھی۔ یعنی جس میں افراد کے دل ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں۔ ایک اجتماع یہ تھا اور ایک اجتماع ہماری نماز کا ہے جس میں ایک دوسرے کے ساتھ کندھے سے کندھا تو ملا ہوتا ہے لیکن قلوب الگ الگ ہوتے ہیں۔ پھر اس جماعت کا ایک امام بھی ہوتا ہے جس کی آواز پر سب نمازی اُٹھتے اور بیٹھتے ہیں۔ لیکن یہ "اطاعتِ امام" نماز کی حرکات و سکنات تک محدود ہوتی ہے۔ دین میں امام یا امیر کی اطاعت، زندگی کے ہر گوشے میں ہوتی ہے کیونکہ وہ امت سے قرآن کی اطاعت کراتا ہے۔ یہی صورت "منہ طرف قبلہ شریف" کی ہے۔ اس میں قبلہ کی طرف رخ کرنے کی شکل تو باقی ہے، اس کا مقصد ختم ہو چکا ہے۔ مقصد، نصب العین کی وحدت تھا۔ قیامت ہے کہ مختلف فرقوں کے مسلمان الگ الگ مسجدوں میں، الگ الگ فرقہ وارانہ نمازیں پڑھتے ہیں اور ہر ایک اپنی نماز کو باجماعت بھی قرار دیتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ ہمارا رُخ قبلہ کی طرف ہے۔ حج کا اجتماع اس سے بھی زیادہ حسرت آمیز منظر پیش کرتا ہے۔ اس میں ساری امت کے افراد، اس مرکزِ محسوس (کعبہ) کے سامنے کھڑے ہوتے اور اس کا طواف کرتے ہیں، لیکن ان کے مذہبی اور سیاسی مراکز بھی الگ الگ ہوتے ہیں، اور ان کے دل بھی ایک دوسرے سے الگ۔

یاد رکھئے! اسلام، بحیثیت دین، اس دن ختم ہوگیا تھا، جب امت میں وحدت نہیں رہی تھی۔ یعنی جب امت مختلف مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں یا حکومتوں میں بٹ گئی تھی۔ قرآن کریم نے اس امت سے تاکید کی تھی کہ: وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ - مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا. كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۱-۳۲)۔ "یاد رکھو! تم مومن ہونے کے بعد پھر مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں مذہبی فرقے یا سیاسی پارٹیاں بنا لیں اور اس کے بعد ہر گروہ اس فریب میں مبتلا ہو کر بیٹھ گیا کہ ہم حق پر ہیں باقی سب باطل پرست ہیں"۔ چونکہ ہمارے ہاں امت کا ہر فرد کسی نہ کسی فرقہ سے وابستہ ہوتا ہے اس لئے قرآن کریم کی اس قسم کی آیات ان پر بڑی گراں گزرتی ہیں۔ ان کے فرقوں کے بندھن، یعنی مذہبی پیشوا، انہیں یہ کہکر مطمئن کرا دیتے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسلام پر کوئی فرقہ بھی قائم نہ ہو؟ ہم اسلام پر قائم ہیں اس لئے ہم پر ان آیتوں کا اطلاق نہیں ہوتا۔ لیکن قرآن کریم نے تو کسی فرقہ کی بھی استثنا نہیں کی۔ اور یہ بات بڑی واضح ہے۔ دین، امتِ واحدہ کی شکل میں ہی قائم اور باقی رہ سکتا ہے۔ جب امت فرقوں میں بٹ گئی تو دین باقی نہ رہا، مذہب رہ گیا۔ لہٰذا کوئی فرقہ یہ کہہ ہی نہیں سکتا کہ ہم دین پر قائم ہیں۔ دین پر قائم امت ہوتی ہے۔ افراد یا فرقے مذہب پرست ہو سکتے ہیں، دین پر قائم نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے اللہ نے رسول اللہ سے کہہ دیا تھا کہ: إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۶/۱۶۰)۔ "جو لوگ دین میں فرقے پیدا کر لیں، اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں رہے گا"۔ رسولؐ کا تعلق یا واسطہ امت سے ہوتا ہے، فرقوں سے نہیں۔

یہودی مذہب پرست تھے۔ ان کی امت کی وحدت ختم ہو چکی تھی حتیٰ کہ قومی مرکزیت تک بھی تباہ ہو چکی تھی۔ ان کا محسوس مرکز ——— یروشلم ——— بھی ان کی تولیت میں نہیں رہا تھا۔ دوسرے الفاظ میں، ان کا دین، مذہب میں تبدیل ہو چکا تھا۔ لہٰذا جب ان سے کہا گیا کہ: وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ (۲/۴۳) تو وہ جواب میں کہہ سکتے تھے کہ ہم تو اپنے طریق پر خدا کی پرستش کرتے ہیں (یہ اقامتِ صلوٰۃ ہے) صدقہ، خیرات بھی دیتے ہیں (یہ ایتائے زکوٰۃ ہے)۔ تو آپ ہم سے اور کیا چاہتے ہیں؟ ان سے کہا گیا کہ نہ یہ صلوٰۃ، صلوٰۃ ہے۔ نہ یہ زکوٰۃ، زکوٰۃ۔ یہ تو رسمی پرستش، یا انفرادی "نیکی کے کام" ہیں یہ دین نہیں۔ دین کی پہلی شرط یہ ہے کہ جو لوگ اجتماعی حیثیت سے دین کا نظام قائم کر رہے ہیں (رَاكِعِينَ)۔ تم ان کے ساتھ شامل ہو کر اطاعتِ خداوندی کرو۔

یہ تھی اسلام کی طرف آنے کی وہ دعوت، جو اہلِ کتاب کو دی گئی تھی۔

زیرِ نظر باب میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآنِ کریم اہلِ کتاب اور بالخصوص ان کے مذہبی پیشواؤں کے غلط معتقدات اور ان کی دسیسہ کاریوں کو نمایاں طور پر سامنے بھی لا...رہا ہے ——— دین فروشی، التباسِ حق و باطل، کتمانِ حقیقت، عہد فراموشی، پیماں شکنی وغیرہ ——— اور اس کے ساتھ انہیں صحیح دینِ خداوندی کی دعوت بھی دے رہا ہے۔ زیرِ نظر آیت (۲/۴۴) اسی دعوت کی بنیادی شق ہے۔ اس کے بعد پھر ان کی باطل روش کے ایک اور ٹکڑے کو سامنے لایا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

۲/۴۴ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔

اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "تم دوسروں کو تو وعظ و نصیحت کرتے رہتے ہو۔ بر و تقویٰ کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھلائے رکھتے ہو۔ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہو۔ کیا تم ذرا بھی عقل و فکر سے کام نہیں لیتے؟"

ہمارے ہاں تو، عام طور پر، ہر مقام پر برائی یا گناہ، اور نیکی یا ثواب کے الفاظ ہی بولے جاتے ہیں، لیکن قرآنِ کریم میں گناہ کے لئے بھی متعدد الفاظ آتے ہیں اور نیکی کے لئے بھی۔ واضح رہے کہ عربی زبان اور قرآنِ کریم میں کوئی دو لفظ بھی مرادف المعنی نہیں۔ یعنی ایسے نہیں کہ ان کے معانی میں ذرا سا بھی فرق نہ ہو۔ وسعت کے اعتبار سے عربی زبان کا یہ عالم ہے کہ اس میں ایک ایک چیز کے لیے سینکڑوں الفاظ موجود ہیں لیکن اُن میں نہایت لطیف اور نازک سا فرق ضرور ہوتا ہے۔ بنا بریں قرآنِ کریم میں جرائم یا حسنات کے لئے جو متعدد الفاظ آتے ہیں اُن کی معنویت میں بڑا لطیف فرق ہے۔ انہی میں ایک لفظ "بِرّ" بھی ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہیں کشادہ یا وسعت۔

بِرّ کے معنی

تنگ نظری بدترین مذموم خصلت اور انتہائی دنائت اور کمینگی کی مظہر لعنت ہے۔ اس کے مقابلہ میں کشادہ نگہی اور وسعتِ قلب، گراں بہا جوہر اور وجہِ شرفِ انسانیت متاعِ حیات ہے۔ اَلْبَرّ کے یہی معنی ہیں اور اسی اعتبار سے خود خدا کی بھی ایک صفت اَلْبَرُّ (۵۲/۲۸) آتی ہے۔ (ب کے زبر کے ساتھ) نیز اس نے اہلِ جنت کی بھی یہی خصوصیت بتائی ہے جب کہا ہے: اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ (۸۲/۱۳؛ ۳/۱۹۲؛ ۳/۱۹۷؛ ۷۶/۵؛ ۸۳/۱۸؛ ۸۳/۲۲)۔ "ابرار جنت کی آسائشوں کے مالک ہوں گے"۔ سورۃ آلِ عمران میں ہے کہ: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (۳/۹۱)۔ "تم البِرّ کو حاصل نہیں کر سکتے تاوقتیکہ تم وہ تمام چیزیں، جنہیں تم نہایت عزیز رکھتے ہو، منفعتِ عامہ کے لئے کھلی نہ چھوڑ دو"۔ اس میں آپ دیکھئے کہ بِرّ کے معانی کس قدر واضح ہو جاتے ہیں۔ تنگ نظر انسان، ایک پائی بھی بطیبِ خاطر دوسروں کو نہیں دیتا۔ اپنی عزیز ترین متاع دوسروں کی منفعت کے لئے وہی دے سکتا ہے جس کی نگاہ میں کشادہ اور ظرف میں وسعت ہو۔ دوسری جگہ کہا کہ تم مذہب

کے رسمی ارکان و فرائض کی ادائیگی سے یہ نہ سمجھ لو کہ تمہیں بِرّ حاصل ہو گیا۔ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (۲/۱۷۷) "بِر یہ نہیں ہے کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف"۔ اس کے بعد کہا کہ بِرّ یہ ہے کہ تم خدا کی صداقتوں پر ایمان لانے کے بعد اپنا مال و دولت تعمیرِ انسانیت کے لئے عام کردو"۔ ذرا آگے چل کر کہا کہ: وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا۔ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى (۲/۱۸۹) "بِرّ یہ نہیں کہ تم اپنی رسم کے مطابق مکان کے سامنے کے دروازے سے آتے ہو یا پچھلے دروازے سے۔ بِرّ یہ ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کس قدر کرتے ہو"۔ اسی کی تاکید جماعتِ مومنین سے کی جب کہا کہ: وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (۵/۲) "تم بِرّ اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کیا کرو"۔ یہی وہ بِرّ کے کام ہیں جن کے لئے باہمی مشاورت کی بھی ضرورت بتائی گئی ہے (۵۸/۹)۔ ضمناً، ان دونوں آیتوں میں بِر کے مقابلہ میں لفظ اِثم آیا ہے۔ اِثم کے معنی ہوتے ہیں اضمحلال، افسردگی، تکان، ضعف اور اس کی وجہ سے صفِ زندگی میں دوسروں سے پیچھے رہ جانا۔ اس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ بِرّ سے کس طرح جوہرِ انسانیت کی نمود اور زندگی میں کشاد پیدا ہوتی ہے۔

بہر حال، یہودیوں سے کہا گیا (اور ظاہر ہے کہ یہاں ان کے مذہبی پیشواؤں سے بالخصوص خطاب ہے) کہ تم دوسروں کو تو بِرّ اور تقویٰ کی تاکید کرتے رہتے ہو، لیکن کبھی نہیں دیکھتے کہ خود تم میں بھی یہ صفات پیدا ہو رہی ہیں یا نہیں۔ یہاں

علماء و مشائخ کی حالت

الفاظ ہیں وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (۲/۴۴)۔ تنسون کے مادہ (ن۔س۔ی) کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو ناقابلِ التفات سمجھ کر اس کی حفاظت ترک کر دینا۔ اس سے بے اعتنائی برتنا۔ انسانی زندگی میں سب سے زیادہ گراں بہا مقام انسان کی ذات (نفس) کا ہے۔ اس لئے اس کی حفاظت کی انتہائی کوشش کرنی چاہئے۔ حفاظتِ نفس کے معنے ہوں گے اقدارِ خداوندی کی پابندی سے اپنی ذات کی نشوونما کرنا۔ قرآن کریم ان مذہبی پیشواؤں کو الزام یہ دیتا ہے کہ تم دوسروں کو تو ان اقدار کی پابندی کی اس قدر تاکید کرتے رہتے ہو لیکن یہ کبھی نہیں سوچتے کہ تم خود ان کی کس قدر پابندی کرتے ہو۔ قرآن کریم نے ان کے علماء کے متعلق کہا ہے: مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا (۶۲/۵)۔ "ان لوگوں کی مثال، جنہیں تورات جیسی کتاب دی گئی تھی، لیکن وہ اس کے احکام کی پابندی نہیں کرتے، ایسی ہے جیسے کسی گدھے پر مقدس کتابیں لاد دی گئی ہوں"۔ وہ کتابوں کی نمائش کرتا پھرے گا لیکن رہے گا گدھے کا گدھا۔ یہی کیفیت ہوتی ہے ان عالموں اور واعظوں کی، جو ساری عمر دوسروں کو وعظ و نصیحت کرتے رہتے ہیں اور اپنی سیرت و کردار میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتے۔ وہ اس وعظ و نصیحت کو اپنے روزگار کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے: اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ

وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ (۹/۳۴) "علماء مشائخ کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ وہ لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے کھا جاتے ہیں اور بجائے اس کے، کہ لوگوں کو خدا کی طرف جانے والے راستہ پر چلائیں، اُلٹے ان کی راہ میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

قرآن کریم نے ان لوگوں کے متعلق ایک اور اہم بات بھی کہی ہے اور وہ یہ کہ یہ عام لوگوں کو وعظ و نصیحت تو کرتے ہیں لیکن عملاً انہیں برائیوں سے روکتے نہیں۔ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۵/۶۳) "ان کے علماء اور مشائخ لوگوں کو معیوب حرکات سے روکتے نہیں۔ یعنی جو لوگ دوسروں کا مال حرام طریقے سے کھا جاتے ہیں (یعنی دولت مند، سرمایہ دار طبقہ) یہ انہیں اس سے نہیں روکتے۔ یہ اس لئے کہ اس سے خود ان کے اپنے روزگار پر زد پڑتی ہے۔" قرآن کہتا ہے کہ "یہ ان کی خدا پرستی نہیں، بلکہ مذہب کو انہوں نے ایک انڈسٹری (صنعت) بنا رکھا ہے" (نیز ۵/۷۹)۔

پھر وہ کہتا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (۳/۱۸۷)۔ "یہ اس سے بہت خوش ہوتے ہیں کہ لوگ ان کی، اُن کے ان کاموں کی وجہ سے تعریف کریں، جنہیں یہ کرتے نہیں۔" آپ اپنے ہاں کے بزرگوں کے جانشینوں کو دیکھئے خواہ ان کا تعلق علمی مراکز سے ہو اور خواہ تصوف کی خانقاہوں سے۔ یہی نہیں کہ ان میں کوئی محاسن نہیں ہوں گے، ان کے کیرکٹر میں دنیا بھر کے عیوب نظر آئیں گے لیکن وہ "اعلیٰ حضرت" کی اولاد یا ان کے مزار مقدس کے مجاور ہونے کی حیثیت سے انتہائی عزت و تکریم کے مستحق سمجھے جائیں گے۔ معتقدین آئیں گے، ان کے حضور نذرانے بھی پیش کریں گے اور ان کے پاؤں بھی چومیں گے۔ اور یہ اس سے بہت خوش ہوں گے۔ یہ تھی حالت یہودیوں کے احبار و رہبان کی۔ واضح رہے کہ ان میں اچھے لوگ بھی تھے اور قرآن کریم کی کشادہ نگہی اور وسعتِ قلب ملاحظہ فرمائیے کہ وہ ان کے ان اچھے لوگوں کی تعریف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ (۷/۱۶۸)۔ "ان میں اچھے لوگ بھی ہیں اور بُرے لوگ بھی"۔ یہ اچھے لوگ الحق کے ذریعہ لوگوں کو ہدایت بھی کرتے ہیں اور اسی کے مطابق انصاف بھی کرتے ہیں" (۷/۱۵۹ نیز ۳۲/۲۴)۔ یہی اچھے لوگ تھے جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا (۳/۱۱۳-۱۱۲ نیز ۴/۱۶۲) لیکن یہ اچھے لوگ خال خال تھے۔ ان کی اکثریت کا یہی عالم تھا کہ وہ "دیگراں را نصیحت خود را فضیحت" کے مسلک پر کاربند تھے اور لوگوں کی نظروں میں پارسا بننے کے لئے الکتاب کی تلاوت بھی کرتے رہتے تھے (تلاوت کا وسیع مفہوم آگے چل کر اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا)۔

قرآن کریم اس منفی پہلو کے بعد پھر مثبت گوشہ کی طرف آیا اور ان سے کہا کہ تم پر جو ذلت و مسکنت اور ادبار در ذل

کا عذاب ملا ہے اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تمہارے جوہرِ انسانیت بیدار ہوں اور تمہاری صلاحیتیں نشو و نما پا جائیں۔ اس کے لئے کہا کہ :-

۲/۴۵-۴۶ وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخٰشِعِينَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلٰقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رٰجِعُونَ -

اِن آیات کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "تم صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ خدا سے معاونت طلب کرو۔ لیکن یہ منزل بڑی کٹھن ہے۔ اس لئے یہ عام لوگوں پر بڑی گراں گزرتی ہے اِسے وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکتے ہیں اور انہیں اس کا خیال رہتا ہے کہ انہیں عدالتِ خداوندی میں اپنے اعمال کا حساب پیش کرنا ہے"۔

یہاں پہلا لفظ استعانت ہے، اور استعانت کے متعلق جلد اول میں آیت (۱/۴) کے تحت بڑی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ (ملاحظہ ہو جلد اول ص ۳۷) وہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ صبر و صلوٰۃ کی رو سے استعانت کس قدر صبر آزما اور ہمت طلب مرحلہ ہے ___ وہ مرحلہ، جس میں ہر قسم کے نقصانات برداشت کرنے اور مصائب جھیلنے پڑتے ہیں۔ حتّٰی کہ بعض اوقات جان تک کی قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔ اسی لئے یہاں کہا کہ یہ منزل بڑی کٹھن ہو گی۔

صلوٰۃ کے متعلق بھی جلد اول میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے کہ اس سے مراد اس نظام کی تشکیل ہے جس میں افرادِ معاشرہ احکامِ خداوندی کی اطاعت کرتے چلے جائیں۔ دوسرا لفظ صبر ہے۔ صبر کے معنی ہوتے ہیں ثبات و استقلال کے ساتھ مخالفتوں کا مقابلہ کرنا۔ اسطرح جم کر کھڑے ہو جانا کہ پائے ہمت میں ذرا سی لغزش نہ آنے پائے۔ اپنی ذات کو ایسا متوازن بنا لینا کہ حوادثِ زمانہ کے ہچکولے اُسے ذرا بھی ڈانوا ڈول نہ کر سکیں۔

اِستقامت

صدیوں کی غلامی، محکومی، خانماں خرابی، لامرکزیت سے بنی اسرائیل میں ثبات و استقامت کی صلاحیتیں مفقود ہو چکی تھیں۔ قرآنِ کریم نے کئی ایک مقامات پر یہ بتایا ہے کہ ان کی کمزوری اور دوں ہمتی کس حد تک پہنچ چکی تھی۔ سورۃ البقرۃ میں، قصۂ آویزش (حضرت) طالوت اور جالوت کے ضمن میں کہا گیا ہے کہ اُن کا کمانڈر انہیں میدان جنگ کی طرف لے چلا تو اُن سے کہا کہ آگے جو ندی آتی ہے اس پر پانی پینے نہ بیٹھ جانا۔ اپنی پیاس کو روکنا۔ لیکن وہ اتنا بھی ضبط نہ کر سکے (۲/۲۴۹-۲۵۲)۔ اس سے ذرا پہلے ہے کہ وہ دشمن کے مقابلہ کے لئے ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکلے لیکن موت کے ڈر سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے (۲/۲۴۳)۔ ان کی یہی بزدلی اور دوں ہمتی تھی جس کی وجہ سے ان کی کیفیت یہ ہو چکی تھی کہ موت کے تصور سے ان کی جان جاتی تھی (۵/۲۲)۔ بنا بریں یہ ضروری تھا کہ ان سے کہا جاتا کہ اگر تم دوبارہ زندگی چاہتے ہو تو اس کے لئے شرطِ اولیں یہ ہے کہ تم احکامِ خداوندی کی اطاعت کرو لیکن اس میں بڑے

استقلال و استقامت کی ضرورت ہوگی۔ قرآن کریم نے دین کے راستہ کو اَلْعَقَبَۃُ سے تعبیر کیا ہے (۹۰: ۱۱)۔ اس کے معنی ہوتے ہیں پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنا۔ آپ غور کیجیے کہ قرآن کریم نے اس ایک لفظ میں ان جملہ تفاصیل کو کس اعجاز سے سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ یہ ہے دین کی وہ گھاٹی جس کے متعلق کہا کہ جب وہ عام لوگوں کے سامنے آتی ہے تو وہ گھبرا جاتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ اس پر کیسے چڑھا جائے گا لیکن جنہیں اس کا یقین ہوتا ہے کہ زندگی کی رفعت و بلندیاں اس پر چڑھے بغیر حاصل نہیں ہو سکتیں، وہ اسے دشوار گزار راستہ نہیں سمجھتے۔ وہ اس پر چڑھتے ہیں اور قدم قدم ہی سہی، چوٹی پر پہنچ کر دم لیتے ہیں۔

ظن کے معنی

آیت (۲/۴۶) میں لفظ یَظُنُّوْنَ آیا ہے۔ عام طور پر ظَنّ کا لفظ حق اور یقین کے مقابلہ میں آتا ہے۔ لیکن علمائے لغت کا کہنا ہے کہ اگر اس کے بعد اَنْ یا اَنَّ کا حرف آئے تو اس کا مفہوم یقین کے قریب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ ہم نے خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے اپنے تمام اقوال و اعمال کا حساب دینا ہے۔ یعنی ان کے نتائج ہمارے سامنے آکر رہیں گے۔ "رب کی ملاقات" اور "الیہ راجعون" کا تفصیلی مفہوم جلد اول (صفحہ ۳۵) پر بیان کیا جا چکا ہے۔ اسے دھرانے کی ضرورت نہیں اس کا مفہوم ہوتا ہے خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق اعمال کے نتائج کا سامنے آنا۔ یہودیوں کو یہ بات واضح طور پر اس لئے سمجھائی اور جتائی گئی کہ وہ قانونِ مکافات کے قائل ہی نہیں رہے تھے۔ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) وہ تو یہ کہتے تھے کہ ہم خدا کی چہیتی اولاد ہیں (۵/۱۸) اور جنت ہمارے لئے (RESERVE) ہو چکی ہے (۲/۱۱۱)۔ لہٰذا ان سے یہ کہا گیا کہ اگر حیات نو چاہتے ہو تو تمہیں ان تمام باطل عقائد و نظریات کو ذہن سے نکالنا ہوگا اور اس حقیقت پر ایمان لانا ہوگا کہ حقیقی زندگی اور اس کی خوشگواریاں، قوانینِ خداوندی کی اطاعت اور مستقل اقدار کی پابندی ہی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ باطل کی فریب انگیز جھوٹی آرزوؤں اور تمناؤں سے نہیں۔ یہودیوں سے یہ بات براہِ راست کہی اور مسلمانوں سے بالواسطہ کہا کہ تم بھی کان کھول کر سن لو کہ: لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَھْلِ الْکِتٰبِ۔ مَنْ

قانونِ مکافات

یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِہٖ۔ وَلَا یَجِدْ لَہٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا (۴/۱۲۳)۔ "فیصلہ نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہوگا اور نہ اہلِ کتاب کی آرزوؤں کے مطابق۔ فیصلہ ہوگا ہمارے اس قانون کے مطابق کہ جو شخص بھی غلط کام کرے گا، کسے باشد، اس کا نتیجہ اس کے سامنے آئے گا۔ وہ اپنے دل میں ہزار یہ سمجھے کہ میرے بزرگ میری سفارش کر دیں گے اور عذاب سے بچا لیں گے، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ کوئی ایسی ہستی اور قوت نہیں جو قانونِ خداوندی کے خلاف کسی کی کوئی مدد کر سکے"۔ دوسری طرف کہا: بَلٰی

مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۱۱۲)۔ جو شخص بھی احکامِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کردے گا اور خلوصِ قلب سے ان کی اطاعت کریگا تو اللہ کے ہاں سے اُسے اِس کا اجر ملے گا۔ اور وہ اجر یہ ہوگا کہ ایسے لوگ خوف اور حزن سے مامون رکھے جائیں گے"

یہاں یہود کو جو وارننگ دی گئی ہے، اس کی مزید تفصیل آئندہ باب میں ہمارے سامنے آئے گی۔

خلاصہ باب سوم

جو اصول اوپر بیان کیا گیا ہے (یعنی یہ کہ جو قوم قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے گی، وہ سرسبز و شاداب رہے گی اور جو ان کے خلاف چلے گی وہ تباہ و برباد ہو جائے گی) اس کی زندہ مثال قومِ بنی اسرائیل ہے جو اس وقت (اے رسول) اِن قوانین کی اس شدّت سے مخالفت کر رہی ہے تم ان سے کہدو کہ تم اپنی تاریخ کے اس عہد کو سامنے لاؤ جب تم قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ تم نے دیکھ لیا تھا کہ اس دور میں تمہیں کسقدر آسائشیں اور راحتیں، سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب تھیں۔

پھر تم نے اس روش کو چھوڑ دیا، تو اس کا نتیجہ بھی تمہارے سامنے ہے — یعنی دنیا بھر کی ذِلّت و رسوائی (۲/۹۱)۔

اب پھر ایسا موقع آیا ہے کہ تم چاہو تو اپنی گم گشتہ جنّت کو دوبارہ حاصل کرسکتے ہو۔ تم (میرے قوانین کی اِتباع سے) اپنے عہد کو پورا کرو اور پھر دیکھو کہ میں کس طرح ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہوں جن کا میں نے تم سے، اس کے بدلے میں، وعدہ کیا تھا (۲/۱۱۱)۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ تم تمام غیر خدائی قوتوں کا خوف اپنے دل سے نکال ڈالو، اور صرف میرے قوانین کے سامنے جھکو، اور ان کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے ڈرو، اور محتاط رہو۔ اس ابدی حقیقت کو یاد رکھو کہ خدا کے قوانین اپنی نتیجہ خیزی میں اٹل ہوتے ہیں۔ جب اور جہاں بھی کوئی

قوم ان پر عمل پیرا ہو گی، ان کے خوشگوار نتائج سے متمتع ہو جائے گی جو خلاف ورزی کرے گی، تباہ و برباد ہو جائے گی اسی کو قوموں کی تقدیر اور تاریخ کہتے ہیں۔ لہٰذا اگر تم اپنی تقدیر بدلنا چاہتے ہو تو اپنی روش کو بدل لو۔

اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ تم اس ضابطۂ قوانین (قرآن) پر ایمان لاؤ جسے ہم نے (اس رسول پر) نازل کیا ہے۔ یہ (علاوہ اور باتوں کے) ان تمام دعاوی کو بھی سچ کر دکھائے گا جو تمہارے ہاں نظری طور پر موجود ہیں۔ چونکہ اس کی تعلیم بنیادی طور پر وہی ہے جو کبھی تمہیں بھی دی گئی تھی (اور جو اب اپنی اصلی شکل میں تمہارے پاس نہیں)، اس لئے تمہیں چاہیئے تھا کہ تم لپک کر اس کی طرف آتے۔ لیکن، اس کے برعکس، تم نے اوروں سے بھی پہلے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ ایسا نہ کرو۔ ہم جانتے ہیں کہ تمہیں مذہبی پیشوائیت کی بنا پر کچھ دنیاوی مفاد حاصل ہیں۔ (۲/۷۹؛ ۵۶/۸۱-۸۲) اور تمہارے خود ساختہ عقائد و رسومات تمہاری قومی گروہ بندی کا موجب بن رہے ہیں جن کا چھوڑنا تم پر گراں گزرتا ہے (۲۹/۲۵) لیکن اس ضابطہ کے اتباع سے جو کلی مفاد حاصل ہوں گے، وہ ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوں گے۔ لہٰذا تم اسی کے مطابق زندگی بسر کرو۔

تمہاری موجودہ روش یہ ہے کہ کہیں تم، حقیقت پر یکسر پردہ پوشی کر کے اُسے لوگوں کے سامنے آنے ہی نہیں دیتے (۲/۱۵۹)، اور کہیں (وحی کے ساتھ اپنی خود ساختہ شریعت کو ملا کر) حق اور باطل کو اس طرح خلط ملط کر دیتے ہو کہ باطل، حق بن کر دکھائی دیتا ہے۔ اور تم یہ سب کچھ اپنے مفاد کی خاطر دیدہ و دانستہ کرتے ہو۔

تم اپنی اس روش کو چھوڑ دو، اور (قرآن کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنانے کے بعد) نظامِ صلوٰۃ قائم کرو، اور نوعِ انسان کی نشوونما کا سامان فراہم کرو، اور اس طرح تم بھی ان کے ساتھی بن جاؤ جو قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں (۹/۱۱۹؛ ۸۹/۲۹)۔ ایسا صرف اس نظام معاشرہ میں ہو سکے گا جو قرآن پر ایمان رکھنے والی جماعت (مومنین) کے ہاتھوں متشکل ہو گا (۲/۴۴)۔

اس کتمانِ حقیقت اور تلبیسِ حق و باطل کی روش کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ تمہاری اپنی زندگی میں عجیب تضاد اور منافقت پیدا ہو چکی ہے۔ تم دوسروں کو تو تاکید کرتے ہو کہ وہ بھلائی اور کشادگی کی راہ اختیار کریں (۲/۱۷۷) لیکن جب اپنی باری آتی ہے تو تمہیں یہ سب وعظ نصیحت بھول جاتی ہے اور اس کے ساتھ تم اس کے بھی مدعی ہو کہ تم کتاب اللہ کا اتباع کرتے ہو۔ ذرا عقل و فکر سے کام لے کر سوچو کہ کیا خدا کی کتاب اس قسم کی روش اختیار کرنے کی تعلیم دے گی؟

یاد رکھو! تمہاری صلاحیتوں کی نشوونما، اور تمہاری زندگی میں صحیح توازن، اُسی صورت میں پیدا ہو سکے گا کہ تم نہایت استقامت اور استقلال سے نظامِ صلوٰۃ پر کاربند رہو (۲/۱۵۳)۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ راستہ تمہیں بڑا دشوار گذار اور یہ منزل بڑی کٹھن نظر آئے گی (اس لئے کہ تم خدا کے عطا کردہ دین کے بجائے مذہبی پیشوائیت کے خود ساختہ

"مذہب"، پر آنکھیں بند کرکے چلنے اور دوسروں کی کمائی پر تن آسانی کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہو چکے ہو (۲/۱۷–۱۶؛ ۹۰/۱۱–۱۴)۔ لیکن اگر تمہیں اس کا خیال رہے کہ تم نے خدا (کے قانونِ مکافات) کا سامنا کرنا ہے۔ تم اس قانون کی زد سے باہر نہیں جا سکتے۔ تمہارا ہر قدم اسی کیطرف اُٹھ رہا ہے، تو پھر تمہارے دل میں یقیناً وہ جھکاؤ پیدا ہو جائے گا جس سے انسان، اپنے ذاتی میلانات کو چھوڑ کر۔ قوانین خداوندی کے سامنے سر جھکا دیا کرتا ہے۔

نوٹ: صفحہ ۱۸۷ سطر اول پر عزرا، کتاب دوم کا حوالہ دیا گیا ہے۔ بائبل کے مروجہ نسخوں میں عزرا کی صرف ایک کتاب ہے لیکن لاطینی نسخوں میں عزرا (ESDRAS) کی دو کتابیں ہیں یہ اقتباس وہیں سے لیا گیا ہے۔ (دیکھئے DR. BROWN کی کتاب RESEARCHES IN ORIENTAL HISTORY P.P 79-82)

چوتھا باب

آیات (۲/۴۷) تا (۲/۵۴)

(داستانِ بنی اسرائیل — سینا کی وادیاں)

۱۔ قانونِ مکافاتِ عمل
۲۔ جزا اور سزا
۳۔ شفاعت کا صحیح مفہوم
۴۔ ابتلا و آزمائش کا قرآنی مفہوم
۵۔ سمندر کیسے پار کیا تھا ؟
۶۔ فرعون کی محفوظ لاش۔
۷۔ فرعون کا ایمان — ضعفِ خودی کا مظاہرہ . . .
۸۔ عزیر کون تھا ؟
۹۔ سامری کون تھا ؟
۱۰۔ گوسالہ پرستی۔
۱۱۔ شکر کا قرآنی مفہوم۔
۱۲۔ حضرت ہارونؑ اور حضرت موسیٰؑ دونوں کو کتاب دی گئی تھی۔
۱۳۔ خدا کی صفت — الباری۔ کا مفہوم۔
۱۴۔ باہمی خوں ریزی کی مذمت ۔

چوتھا باب (آیت ۴۷ تا ۵۴)

داستانِ بنی اسرائیل — سینا کی وادیاں

۲/۴۷ يٰبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔

اس آیت میں بھی، آیت (۲/۴۰) کی طرح بنی اسرائیل کو انعاماتِ خداوندی کی یاد دہانی کرائی گئی ہے۔ ان نعمائے خداوندی کی تفصیل سابقہ باب میں سامنے آچکی ہے۔ اسی قسم کی یاد دہانی آیت (۲/۱۲۲) میں بھی کرائی گئی ہے۔ انعاماتِ خداوندی کی ان یاد دہانیوں سے یہ مقصد نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنے احسانات جتاتے ہیں۔ خدا تو اس قسم کے انسانی جذبات سے بلند و بالا ہے۔ اس سے مراد ان کی دونوں حالتوں کے تقابل سے انہیں آمادہ بہ اصلاح کرنا ہے۔ اسے ایک مثال کی رو سے سمجھیے۔ ایک تندرست و توانا، خوبرو نوجوان اپنی بد احتیاطیوں کی وجہ سے صحت ضائع کر دیتا ہے اور قسم قسم کے امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک ناصح مشفق اس سے کہتا ہے کہ تم اپنی اس حالت کو یاد کرو جب تمہاری صحت قابلِ رشک تھی۔ تمہارے چہرے کی تروتازگی بڑی پُرکشش ہوتی تھی۔ تم ہشاش بشاش زندگی بسر کرتے تھے۔ دن بھر کام کاج کرتے اور کبھی تکان محسوس نہیں کرتے تھے اور آج تمہاری یہ حالت ہو چکی ہے! اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اگر تم اپنی ان بُری عادات کو چھوڑ دو تو پھر سے وہی صحت اور تازگی واپس آسکتی ہے۔ بنی اسرائیل کو جو نعمائے خداوندی کی بار بار یاد دہانی کرائی گئی ہے تو اس سے یہی مقصود تھا۔ انہیں بتایا یہ جا رہا تھا کہ تم نے قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کی تو تمہیں ایسی سرفرازیاں اور خوشگواریاں حاصل ہو گئیں جن کی نظیر تاریخ میں کم ملے گی۔ اس کے بعد جب تم نے ان قوانین سے سرکشی اختیار کی تو تمہاری یہ حالت ہو گئی۔ اگر اب بھی تم اپنی روش بدل لو تو تمہیں وہی سرفرازیاں حاصل ہو سکتی ہیں۔

چنانچہ انعاماتِ خداوندی کی یاد دہانی کے فوری بعد انہیں یہ بتایا گیا کہ تم نے کونسی غلط روش اختیار کی تھی جس کا نتیجہ ذلت و رسوائی کی تمہاری موجودہ زندگی ہے۔ اگلی آیت میں ہے:-

۲/۴۸ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۔

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کو پیشِ نظر رکھو اور اس امر کی احتیاط برتو کہ تمہارا کوئی قدم اس کے قوانین کے خلاف نہ اٹھے۔ یاد رکھو! قانونِ مکافات کی رو سے ہر شخص کو اپنے اعمال کا خمیازہ، خود بھگتنا پڑتا ہے۔ کوئی شخص کسی دوسرے کے جرم کا ذرا سا بوجھ بھی نہیں بٹا سکتا۔ نہ ہی کسی کی سفارش، کسی کے کام آ سکتی ہے۔ نہ ہی مجرم کچھ معاوضہ دے کر، سزا سے بچ سکتا ہے۔ نہ ہی کوئی شخص کسی کی کچھ مدد کر سکتا ہے۔ یہ ہے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل۔

یہودیوں کی ذلت و خواری کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے قانونِ مکافاتِ عمل کو یکسر نظرانداز کر دیا تھا اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہو چکے تھے کہ جنت ہمارے نام لکھی جا چکی ہے (۲/۱۱۱)۔ ہم خدا کی چہیتی اولاد اور اس کی محبوب قوم ہیں (۵/۱۸) اگر ہمیں، اپنے بعض اسلاف کے گناہوں کی پاداش میں جہنم میں جانا بھی پڑے گا تو وہ محض چند دنوں کیلئے ہوگا۔ پھر ہمارے سفارشی ہمیں وہاں سے نکال کر جنت میں لے جائیں گے (۲/۸۰) اس سلسلہ میں انہوں نے عجیب و غریب عقائد وضع کر رکھے تھے۔ ان کی مقدس کتاب تالمود میں ہے:-

یہودیوں کے عجیب و غریب عقائد

آخرت میں (حضرت) ابراہیم علیہ السلام جہنم کے دروازے پر بیٹھے ہوں گے اور کسی مختون اسرائیلی کو اس میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ اب رہے ایسے اسرائیلی، جنہوں نے سخت گناہ کے کام کئے تھے، سو اُن کے لئے وہ ایک کام کریں گے۔ وہ ان بچوں کے ختنہ کی کھال اتار کر، جو ختنہ سے پہلے وفات پا چکے تھے، اس قسم کے اسرائیلیوں کے مقام ختنہ پر چپکا دیں گے اور اس طرح انہیں نامختون بنا کر جہنم میں (چند دنوں کے لئے) بھیج دیں گے۔

(تالمود صفحہ ۴۰۴)

ان اسرائیلیوں کا جہنم میں داخلہ محض ایک رسم پوری کرنے کے لئے ہوگا:-

جہنم کی آگ کا اسرائیلی گناہگاروں پر کچھ اثر نہیں ہوگا۔ (ایضاً صفحہ ۶۰۵)

اور اس کی وجہ، جیوش انسائیکلوپیڈیا میں یہ لکھی ہے:-

اسرائیلی گناہگاروں کو جہنم کی آگ چھو نہیں سکتی۔ اس لئے کہ وہ جہنم کے دروازہ پر گناہوں کا اقرار کر لیں گے اور اس طرح خدا کی طرف لوٹ آئیں گے۔ (جلد پنجم صفحہ ۵۸۳)

اُخروی نجات ہی نہیں، ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اس دنیا کی عزت و فلاح بھی اپنے اعمال کی وجہ سے نہیں ملتی بلکہ:-

بعض کو عزت ان کے آباؤ اجداد کے اعمالِ حسنہ کی بدولت ملتی ہے اور بعض کو ان کی آنے والی نسلوں

کے اعمال کے صدقہ ہیں۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ششم صفحہ ۶۰)

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے کہ "یہودیوں کی امیدوں کا مرکز ان کے آباؤ اجداد کے اعمال ہوتے تھے۔ بالخصوص یہ عقیدہ کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام ہمارے جدِّ امجد ہیں۔" اسی طرح (ENCYCLOPAEDIA OF RELIGIONS AND ETHICS) میں مذکور ہے کہ:۔

> یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق ان کے تمام بزرگوں کے اعمال ایک جگہ اکٹھے کر دیئے جائیں گے اور انہیں پھر تمام بنی اسرائیل پر تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس طرح ان میں سے ہر ایک کے حصہ میں نجات و سعادت آجائے گی۔ (جلد گیارہ صفحہ ۱۴۴)

یہودیوں کے ان عقائد کی روشنی میں دیکھا جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ قرآن کریم نے مندرجہ بالا آیت (نیز آیت ۲/۱۲۲) میں جو کہا ہے کہ نہ یہ بھی نہیں ہو سکے گا اور وہ بھی نہیں، تو اس سے ان کے انہی باطل عقائد کی تردید مقصود تھی۔ جیسا کہ ہم مسلسل لکھتے چلے آرہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ دین کی اساس و بنیاد خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل

قانونِ مکافاتِ عمل

ہے اور سارا قرآن گویا اسی قانون کی تشریح و تفصیل لئے ہوئے ہے۔ اس قانون کا ملخص یہ ہے کہ انسان کا ہر عمل (حتیٰ کہ دل میں گزرنے والا خیال اور ارادہ بھی) اپنا نتیجہ مرتب کرتا رہتا ہے۔ اگر وہ عمل، اقدار و قوانینِ خداوندی کے مطابق ہے تو اس کا نتیجہ خوشگواریاں ہوتی ہیں اور اگر وہ ان کے خلاف ہو تو اس کا نتیجہ تباہیاں اور بربادیاں۔ سورۃ البقرۃ میں ہے: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶)۔ "جو شخص کوئی اچھا کام کرے گا اس کا اچھا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوگا۔ جو غلط کام کرے گا اس کا تباہ کن نتیجہ بھی خود اسی کو بھگتنا پڑے گا۔" سورۃ الانعام میں ہے: وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (۶/۱۶۵)۔ "جو شخص غلط اقدام کرتا ہے اس کا نقصان اسی کو ہوتا ہے۔ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل یہ ہے کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا، کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔" اس باب میں اور تو اور، کائنات کی عظیم ترین ہستی، حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ اقدس سے یہ اعلان کرایا گیا کہ: قُلْ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۶/۱۵؛ ۱۰/۱۵؛ ۳۹/۱۳)۔ "اے رسول! ان سے کہدو کہ اگر میں بھی اپنے رب کے قوانین کی خلاف ورزی کروں تو یوم مکافات کے عذاب سے مجھے بھی چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ میں بھی اس سے ڈرتا ہوں۔" قانون کی اس غیر مرئی حقیقت کو محسوس مثالوں کے ذریعے سے یہ کہہ کر سمجھایا گیا کہ: وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا (۲۱/۴۷)۔ "یوم مکافات کو

ہم عمل کے ترازو کھڑے کر دیں گے اور اس طرح کسی پر ظلم و زیادتی نہیں ہوگی۔ اس ترازو کی کیفیت یہ ہوگی فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۔ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (۷-۸/۹۹)۔ "غلط اور صحیح اعمال کا ایک ایک ذرہ سامنے آ جائے گا۔ اس دن کوئی کسی کو، کسی قسم کا نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکے گا (۴۲/۳۴)۔ اس دن نہ بیٹا باپ کے کام آ سکے گا نہ باپ بیٹے کو بچا سکے گا (۳۱/۳۳)۔ اس دن دوست، اپنے دوست سے بھاگ جائے گا۔ ماں اور باپ اولاد کو چھوڑ دیں گے۔ بیوی اور بچے آنکھیں چرالیں گے۔ اس لئے کہ اس دن سب کو اپنی اپنی پڑی ہوگی (۸۰/۳۴-۳۷ نیز ۷۰/۱۰-۱۴)۔ اس دن نہ کوئی سودے بازی ہو سکے گی نہ کسی کی دوستداری کوئی کام دے سکے گی۔ نہ کسی کی سفارش چلے گی (۲/۲۵۴ نیز ۲۱/۱۴)۔ اس دن ہر فرد، تنہا، صرف اپنی ذات کو لئے ہوئے۔ عدالتِ خداوندی میں حاضر ہوگا (۶/۹۵ نیز ۱۸/۴۸)

یہ ہیں خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے چند اشارات۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، سارا قرآن، اساسی اور بنیادی طور پر، بہ ہیئت مجموعی اسی قانون کی تفصیل اور اسی نکتہ کی تفسیر ہے کہ [1]

گندم از گندم بروید، جو ز جو ∴ از مکافاتِ عمل غافل مشو

اِس تمہیدی گفتگو کے بعد آیۂ زیرِ نظر (۲/۴۸) کے مختلف اجزا کی طرف آیئے۔

پہلا ٹکڑا ہے: يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا (۲/۴۸) اس میں تجزی کا لفظ تشریح طلب ہے اس کا مادہ ہے (ج-ز-ی) جس کے بنیادی معنے کسی چیز کا بدلہ ہیں۔ علمائے لغت نے کہا ہے کہ اس کے معنے ایک چیز کا دوسری چیز کا قائم مقام ہونا ہے۔ یہ مفہوم ایک اہم حقیقت کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ جس چیز کو عام طور پر "عمل کا بدلہ" کہا جاتا ہے۔ وہ درحقیقت اس عمل کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ یعنی نتیجہ، عمل کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ آپ آگ میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ یہ آپ کا عمل ہے۔ آپ کا ہاتھ جل جاتا ہے اور اس میں سخت تکلیف ہوتی ہے یہ اس عمل کا نتیجہ ہے۔ عمل تو فوراً ختم ہو گیا لیکن اس کے نتیجے نے اس کی جگہ لے لی۔ اسے عمل کی جزا کہا جائے گا۔ (ہمارے ہاں عام طور پر اچھے نتیجے یا بدلے کے لئے جزا اور برے نتیجے کے لئے سزا کا لفظ بولا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں، دونوں کے لئے جزا ہی کا لفظ آیا ہے)۔

جزا و سزا

ہاتھ جلنے کی جو مثال ہم نے اوپر دی ہے، اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے نہ سزا خارجی طور پر کہیں باہر سے ملتی ہے نہ جزا ہی کہیں باہر سے انعام ملنے کا نام ہے۔ آپ نے کسی کو گالی دی۔ اس نے آپ کو تھپڑ مارا۔ یہ خارج سے ملی ہوئی سزا ہے۔ اس میں گالی اور تھپڑ میں کوئی ربطِ باہمی نہیں۔ اس کے برعکس، آپ نے آگ میں ہاتھ ڈالا تو اس کے نتیجے میں آپ شدید درد میں مبتلا ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ درد آگ میں ہاتھ ڈالنے کا فطری نتیجہ ہے۔ یہ سزا کہیں خارج سے نہیں ملی۔ خارج سے ملنے والی سزاؤں میں یہ ہو سکتا ہے کہ جس شخص کو آپ نے

[1] اس اجمال کی تفصیل کیلئے میری کتاب — جہانِ فردا — اور مطالب الفرقان (جلد اول صـ ۱۴۶-۱۵۲) ملاحظہ فرمائیں۔

گالی دی تھی وہ آپ کو معاف کر دے۔ کوئی دوسرا شخص آپ کی طرف داری کر کے، آپ کو اس سزا سے بچالے یا آپ اُسے کچھ دے دلا کر معاملہ رفع دفع کرالیں۔ لیکن آگ میں ہاتھ ڈالنے کی جو سزا آپ کو ملی ہے اسے نہ کوئی معاف کر سکتا ہے۔ نہ کسی کی سفارش اس کی کوئی تخفیف کر سکتی ہے۔ نہ کسی کو کچھ دے دلا کر آپ درد سے بچ سکتے ہیں۔ اس سزا کو تو آپکو خود ہی بھگتنا ہوگا۔ (اس سے بچا کیسے جائے گا اس کے متعلق "توبہ" کے عنوان میں بتایا جائے گا)۔ بالفاظِ دیگر، قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے عمل خود آپ اپنی جزا ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے کہا هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۷/۱۴۷؛ ۵۲/۱۶؛ ۳۴/۳۳؛ ۴۵/۲۸)۔ اعمال خود اپنی جزا آپ ہوتے ہیں۔ ہر عمل کا نتیجہ، اس عمل کی جگہ آجاتا ہے۔ اس کا قائم مقام بن جاتا ہے۔ سورۃ الدھر میں اہلِ جنت کے متعلق کہا: وَجَزَاهُم بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا (۷۶/۱۲)۔ "اُن کی استقامت کی جزا جنت کی شکل میں سامنے آجائے گی۔ (نیز ۷۶/۲۲)۔ دوسری طرف غلط اعمال کی سزا کے سلسلے میں کہا: ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِمَا كَفَرُوا وَهَلْ نُجَازِي إِلَّا الْكَفُورَ (۳۴/۱۷)۔ "ہم نے ان کے کفر کا بدلہ یوں دیا اور ایسا بدلہ ہم کفر کی روش اختیار کرنے والوں ہی کو دیا کرتے ہیں"۔ ان آیات میں سزا اور جزا دونوں کے لئے جزا کا لفظ آیا ہے۔ دوسری جگہ جامع طور پر کہا: الْيَوْمَ تُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ (۴۰/۱۷)۔ "اس دن ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ (نیز ۴۵/۲۲)۔ سورۃ یٰسین میں ہے: فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (۳۶/۵۴)۔ "اس دن کسی شخص پر، کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوگی اور تمہیں تمہارے اعمال ہی کا بدلہ ملیگا۔"

آیت (۲/۴۸) میں لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ آیا ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ قانونِ مکافات کی رو سے کوئی شخص، کسی مجرم کا بدل نہیں بن سکے گا۔ یعنی اس کے جرم کی سزا اپنے اوپر نہیں لے سکے گا۔ وہ اس کے کسی کام نہیں آسکے گا۔ دوسرے مقام پر ہے: يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلًى عَن مَّوْلًى شَيْئًا وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (۴۴/۴۱)۔ "جس دن کوئی دوست، کسی دوست کے کام نہیں آسکے گا اور مجرموں کی کوئی شخص مدد نہیں کر سکے گا۔" قانونِ مکافات کے سلسلے میں جو آیات پہلے لکھی جا چکی ہیں اُنہیں ایک بار پھر سامنے لائیے۔ زیرِ نظر آیت کے اس ٹکڑے کا مفہوم اور بھی واضح ہو جائے گا۔ آپ نے دیکھا کہ اِن چار لفظوں میں کس طرح یہودیوں کے باطل عقائد کی جڑ اکھیڑ کر رکھ دی گئی ہے۔

شفاعت کا مفہوم

آیتِ زیرِ نظر کا اگلا ٹکڑا ہے وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ (۲/۴۸)۔ "اس دن کسی کی سفارش قبول نہیں کی جائے گی۔ اس میں شفاعت کا لفظ غور طلب ہے، اس لئے کہ اس میں یہودیوں کے شفاعت سے متعلق باطل عقیدے کا ابطال ہی نہیں بلکہ اس کا خود ہمارے ہاں بھی جو غلط

مفہوم لیا جاتا ہے اس کی تردید بھی مقصود ہے۔

"سفارش" کی روش کس قدر قابلِ مذمت فعل اور تباہ کن نتائج کا موجب ہے، اس کا اندازہ آپ اپنے معاشرہ کی موجودہ حالت سے لگا سکتے ہیں۔ آپ ہر روز یہ شکایت کرتے ہیں کہ صاحب! اب تو کوئی کام بھی قاعدے اور قانون کے مطابق نہیں ہوتا۔ ہر فیصلہ سفارش کی رو سے ہوتا ہے۔ جس کے پاس کوئی بڑی سفارش ہے اس کا ہر کام بآسانی ہو جاتا ہے۔ جس کے پاس سفارش نہیں، وہ لاکھ حق پر ہو، اس کی کوئی نہیں سنتا۔ آپ جب کسی افسر یا حاکم کے متعلق کہتے ہیں کہ اُس کے ہاں تو صرف سفارش چلتی ہے تو آپ کے ذہن میں اس کا نہایت نفرت انگیز تصور قائم ہو جاتا ہے۔ اور جو شخص سفارش کے ذریعے حکام سے لوگوں کے غلط کام کرواتا اور مجرموں کو سزا سے بچا لیتا ہے اُسے بھی بدترین خلائق سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایسی حقیقتیں ہیں جن سے کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ اس کے بعد آپ سوچئے کہ اگر نقشہ کچھ اِس قسم کا ہو کہ قیامت میں عدالتِ خداوندی میں ملزم پیش ہو۔ قانون کی رُو سے اس کے خلاف جرم ثابت ہو جائے۔ عدل کی رو سے اُسے جہنم کی سزا دی جائے ــــ بلکہ اسے جہنم میں بھیج بھی دیا جائے۔ اس کے بعد کوئی بزرگ ہستی خدا سے اس کی سفارش کرے اور خدا اس کی سفارش مان کر اس مجرم کو جہنم سے نکال کر جنت میں بھیج دے تو آپ سوچئے کہ اس سفارش کرنے والے بزرگ اور سفارش ماننے والے خدا کے متعلق کس قسم کا تصور قائم ہوگا؟ لیکن مذہب کی دنیا میں اس بوالعجبی کا تماشہ دیکھئے کہ مذہب پرست طبقہ دنیاوی کاروبار میں سفارش کے اس عمل دخل کو تو اس قدر مذموم اور معیوب قرار دے گا لیکن قیامت میں سفارش کے اسی کاروبار کو بڑا مستحسن جبا(؟) کرے گا۔ چنانچہ شفاعت کا عقیدہ دنیا کے قریب قریب ہر مذہب میں پایا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے شفاعت کے اس باطل عقیدے کی بہ اصرار و تکرار تردید کی ہے۔ کہیں وہ کہتا ہے: يَقُولُونَ هٰؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (۱۰/۱۸) "یہ لوگ اپنے معبودوں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ خدا کے ہاں ان کی سفارش کریں گے"۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ: مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ (۴۰/۱۸) "جنہوں نے ظلم اور زیادتی کی ہو گی ان کا کوئی دوست نہیں ہوگا، نہ ہی کوئی شفاعت کرنے والا جس کی اطاعت انہیں کوئی فائدہ دے سکے"۔ دوسری جگہ ہے: وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا (۳۰/۱۳)۔ "جن لوگوں کو یہ اپنے شرکاء سمجھا کرتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ ان کی شفاعت کریں گے ان میں سے کوئی بھی ان کا شفیع نہیں ہوگا" (نیز ۶/۹۵)۔ اور فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ (۷۴/۴۸) "شفاعت کرنے والوں میں سے کسی کی شفاعت ان کے کام نہ آسکے گی"۔ وہ اس کیفیت کو دیکھ کر پکاریں گے کہ: فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ (۷/۵۳)۔ "کیا آج کوئی شفاعت کرنے والے ہیں جو ہماری شفاعت کر سکیں"، اور اس کے بعد مایوس ہو کر خود

ہی ایک آہِ سرد کے ساتھ کہیں گے: فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ (۲۶/۱۰۰) "آج ہمارا کوئی بھی شفاعت کرنے والا نہیں"

اہل مذہب کے عقیدۂ شفاعت کی اس طرح تردید کرنے کے بعد، جماعتِ مومنین سے کہا کہ:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲/۲۵۴)۔

اے جماعتِ مومنین! جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اسے منفعتِ عام کے لئے کھلا رکھو، قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جب نہ تو جنت مال و دولت کے عوض خریدی جاسکے گی نہ کسی دوست کی دوستی کسی کام آسکے گی۔ نہ ہی کسی کی سفارش چل سکے گی۔ جو لوگ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں، وہ اپنے آپ پر بہت بڑا ظلم کرتے ہیں۔

شفاعت کا قرآنی مفہوم

لیکن اس کے باوجود ہمارے ہاں بھی شفاعت کا عقیدہ موجود ہے اور اس کی تائید میں قرآنِ کریم کی اس قسم کی آیات پیش کر دی جاتی ہیں جن میں (مثلاً) آیا ہے: مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (۲/۲۵۵): "وہ کون ہے جو خدا کے پاس کسی کی شفاعت کرے بجز اس کے، جسے خدا اجازت دے" اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ خدا کی اجازت سے شفاعت کی جاسکے گی اور ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کی شفاعت خدا کی اجازت سے کریں گے۔ لیکن ان آیات سے اس قسم کا نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں۔ سب سے پہلے تو اس لئے کہ اس قسم کی شفاعت کا عقیدہ قانونِ مکافات کے یکسر خلاف ہے جس کی بنیادوں پر دین کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اور دوسرے اس لئے کہ اس سے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ قرآنِ کریم متضاد عقائد کی تعلیم پیش کرتا ہے، حالانکہ قرآنِ کریم نے اپنے منزل من اللہ ہونے کی ایک بنیادی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں تضادات اور اختلافات نہیں (۴/۸۲)۔ سوال یہ ہے کہ اس قسم کی آیات کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اس کیلئے ہمیں پہلے لفظِ شفاعت کے معانی پر غور کرنا ہوگا۔

لفظِ شفاعت کے مادہ (ش۔ ف۔ ع) کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو، کسی دوسری چیز کیساتھ ملا دینا۔ دو چیزوں کا ایک دوسرے کے ساتھ متصل کر دینا۔ کسی شخص کا کسی دوسرے شخص کے ساتھ کھڑے ہو جانا۔

اس "ساتھ کھڑے ہو جانے" کی رُو سے اہلِ مذاہب نے یہ عقیدہ قائم کر لیا کہ ان کے بزرگ مجرموں کے ساتھ کھڑے ہو کر خدا سے اُن کی سفارش کریں گے۔ اس طرح شفاعت کے معنی سفارش ہوگئے۔ لیکن قرآنِ کریم، اس "ساتھ کھڑے ہونے" کے معنی کچھ اور بتاتا ہے۔

قرآنی اصطلاحات کے معانی

آگے بڑھنے سے پہلے ایک بنیادی نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم میں بہت سے الفاظ اور اصطلاحات ایسی ہیں جنہیں باطل پرست بھی استعمال کرتے ہیں اور مؤمنین بھی۔ قرآنِ کریم میں جب وہ لفظ باطل پرستوں کی طرف سے آئے گا تو اس کا وہ مفہوم ہوگا جس مفہوم میں اسے باطل پرست استعمال کرتے ہیں۔ اور جب وہ لفظ خود خدا یا جماعتِ مومنین کی طرف سے بولا جائے گا تو اس سے وہ مفہوم لیا جائے گا، جس مفہوم میں اُسے قرآنِ کریم نے استعمال کیا ہے۔ مثلاً اِلٰہ کا لفظ جب کفار یا مشرکین کی طرف سے آئے گا تو اس سے مراد اُن کے بت یا دیگر معبودانِ باطل ہوں گے۔ لیکن جب یہ لفظ خدا کی طرف ہوگا تو اس سے مراد وہ خدائے حقیقی ہوگا جو ہر قسم کے اقتدار کا مالک ہے۔ عبادت کا لفظ جب کفار، مشرکین یا اہلِ کتاب وغیرہ کی طرف سے بولا جائے گا تو اس کے معنی "پرستش" کے ہوں گے اور جب یہ خدا یا جماعتِ مومنین کی طرف سے استعمال ہوگا تو اس کے معنے احکامِ خداوندی کی اطاعت اور اس کی محکومیت ہوگا (وقِس علیٰ ذالک) الفاظ کے ان مفاہیم کے بنیادی فرق کو سامنے رکھنے کے بعد اب لفظ شفاعت کی طرف آئیے۔ ہم نے اوپر کہا ہے کہ باطل پرست اہلِ مذاہب، اس سے مراد "سفارش کرنا" لیتے ہیں جس کی تردید قرآنِ کریم نے کی ہے۔ اس کے برعکس قرآنِ کریم جماعتِ مومنین کے سلسلے میں اُسے دوسرے معنوں میں استعمال کرتا ہے۔

قرآنِ کریم انفرادی زندگی کے بجائے اجتماعی زندگی پیش کرتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں بِر و تقویٰ کے کاموں میں افرادِ معاشرہ باہمی تعاون کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس تعاون کا حکم خود قرآن میں دیا گیا ہے۔ (۵/۲)۔ دنیاوی زندگی میں اس قسم کے تعاون کو شفاعت کہا جائے گا۔ یعنی کسی کی مدد کے لئے دوسرے کے ساتھ کھڑے ہوجانا، اس فرق کے ساتھ کہ تعاون میں لوگ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور شفاعت میں ایک شخص کسی دوسرے کی مدد کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ بھی اس کی مدد کرے گا یا نہیں۔ جیسے کسی مظلوم کی جائز مدد کے لئے اس کے ساتھ کھڑے ہو جانا۔

باہمی تعاون کے سلسلے میں قرآن کریم نے کہا ہے: وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۵/۲)۔ "بِر اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی معاونت کرو۔ اثم اور عدوان کے کاموں میں معاونت مت کرو"۔ پہلی قسم کی معاونت کو قرآنِ کریم نے مستحسن قرار دیا ہے اور دوسری قسم کے تعاون کو ممنوع۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں سمجھایا گیا ہے مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا (۴/۸۵)۔ "جو شخص کسی اچھے کام میں، دوسرے کے ساتھ

مدد کے لئے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے آتے اس میں حصہ مل جاتا ہے اور جو شخص کسی بُرے کام میں، کسی کا ساتھ دیتا ہے تو اس کو بھی اس میں سے حصہ مل جاتا ہے۔" یہاں سے اِس دنیا میں ایک دوسرے کی شفاعت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

اب آیئے آخرت کی طرف۔ قانونِ مکافات کی رُو سے انسان کے ہر عمل کا نتیجہ ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتا رہتا ہے یعنی اس کی ذات اس سے متاثر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی کو اعمالنامہ کہتے ہیں (تفصیل پہلے گزر چکی ہے) لیکن قرآنِ کریم نے جزا اور سزا کی مجرد حقیقت کو محسوس انداز میں سمجھانے کے لئے ایسا نقشہ کھینچا ہے جیسے ملزموں کی عدالت میں پیشی ہوتی ہے اور مقدمہ کی سماعت کے بعد حکم سنایا جاتا ہے۔ مقدمہ میں حاکم کے علاوہ، مستغیث ہوتا ہے، ملزم ہوتا ہے، گواہ ہوتے ہیں، پولیس کے سپاہی ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے اسی قسم کے استعاروں میں حقیقت کو بیان کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہا ہے کہ: وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيدٌ (۵۰/۲۱)۔ "جب ملزم ہماری عدالت میں لایا جائے گا تو اس کے ساتھ ایک پیچھے سے ہانکنے والا ہوگا اور اس کے علاوہ گواہ بھی ہوگا" یہ گواہ خود بخود اس شخص کے ساتھ کھڑے نہیں ہو جائیں گے۔ (جیسا کہ عدالتوں میں قاعدہ ہے) ان میں سے جسے بلایا جائے گا، وہی آئے گا اور وہی اس کی گواہی دے سکے گا جسے گواہی دینے کی اجازت دی جائے گی۔ اس کے لئے کہ: مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ (۲/۲۵۵)۔ "وہ کون ہے جو خدا کی اجازت کے بغیر اس کے حضور کسی کے ساتھ کھڑا ہو سکے۔" سورۃ الزخرف میں وضاحت سے بتایا کہ اس شفاعت (یا کسی کے ساتھ کھڑے ہو جانے) کے معنی گواہی دینے کے ہیں۔ فرمایا: وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (۴۳/۸۶)۔ "یہ باطل پرست جن ہستیوں کو خدا کے سوا پکارتے ہیں، انہیں ان کے ساتھ کھڑے ہونے کا کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ ایسا وہی کر سکے گا (جسے خدا اس کا حکم یا اجازت دے) جو واقعات کا علم رکھتا ہو۔ اور سچی گواہی دے۔"

شفاعت سے مُراد شہادت دینا

یہاں سے آپ نے دیکھ لیا کہ خدا کے ہاں شفاعت کے معنی شہادت یا گواہی دینے کے ہیں۔ یہ گواہ بہ ہیئتِ مجموعی خدا کے رسول بھی ہوں گے۔ سورۃ المائدۃ میں ہے: يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَا أُجِبْتُمْ (۵/۱۰۹)۔ "جس دن اللہ رسولوں کو جمع کرے گا اور ان سے پوچھا جائے گا کہ ان لوگوں کی طرف سے تمہاری دعوت کا جواب کس قسم کا ملا تھا" ان رسولوں کا جواب، ان کی طرف سے گواہی (شہادت) ہوگا۔ رسولوں کے علاوہ "ملائکہ" کی شہادت بھی ہوگی۔ يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَٰئِكَةُ صَفًّا لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَقَالَ صَوَابًا (۷۸/۳۸)۔ "جس دن الروح اور ملائکہ[1] صف باندھے کھڑے ہوں گے اور کوئی بات نہ کر

[1] ملائکہ کی تشریح اس کتاب کے بابِ اول میں کی گئی ہے۔ الروح کی تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔

سکے گا۔ بجز اُس کے، جسے خدائے رحمٰن اجازت دے اور وہ صحیح اور درست بات کہے"۔ دوسری جگہ کہا: مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ (۱۰/۳)۔ "کوئی شخص خدا کے اذن کے بغیر گواہی کے لئے کسی کے ساتھ کھڑا نہیں ہو سکے گا۔ سورۃ مریم میں ہے: لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا (۱۹/۸۷)۔ "اُن کے سوا، جنہوں نے خدا سے عہد باندھ رکھا ہو (یعنی جو خدا کے مطیع و فرمانبردار رہے ہوں ان کے سوا) کوئی کسی کی تائید اور حمایت میں گواہی کا حق نہیں رکھے گا۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے: يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا (۲۰/۱۰۹)۔ "اس دن کسی کی شہادت کسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکے گی بجز اُس کے، جسے خدا کا اذن حاصل ہو اور وہ ایسی بات کہے جو خدا کی بات سے ہم آہنگ (قوانینِ خداوندی کے مطابق) ہو۔" (نیز ۳۴/۲۳ ؛ ۲۱/۲۸ ؛ ۵۳/۲۶)۔

ان مقامات سے شفاعت کا مفہوم سامنے آجاتا ہے۔ یعنی یہ مفہوم کہ اس کے معنی سفارش کے نہیں بلکہ صحیح اور سچی شہادت دیکر کسی کی تائید اور حمایت کرنے کے ہیں۔ چونکہ یہ تائید و حمایت اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب وہ خدا کے قوانین کے مطابق ہو، اس لئے خدا نے خود اپنے آپ کو شَفِيْعٌ کہا ہے۔ مثلاً سورۃ الانعام میں ہے: لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ (۶/۵۱ ؛ ۶/۷۰ ؛ ۳۲/۴)۔ "خدا کے سوا ان کا کوئی دوست اور شفیع نہیں ہوگا۔" اور سورۃ الزمر میں یہ کہکر ساری بات واضح کر دی کہ: قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا (۳۹/۴۴)۔ "ان سے کہو کہ شفاعت تمام تر، ساری کی ساری، صرف خدا کے لئے ہے۔" اگر ان آیات میں شفاعت کے معنے سفارش اور شفیع کے معنی سفارش کرنے والا کئے جائیں تو اس سے کوئی بات ہی نہیں بنتی۔ یعنی خدا تو حاکم یا فیصلہ کرنیوالا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی حاکم خود ہی سفارش کرنے والا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا شفاعت سے مراد خدا کی وہ تائید و حمایت ہے جو قوانین خداوندی کی اطاعت سے حاصل ہوتی ہے۔ اسے خدا کی نصرت بھی کہا جاتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ ہمارے ہاں جو رسول اللہ یا دیگر مقربینِ بارگاہِ خداوندی کی شفاعت بمعنی سفارش کا عقیدہ ہے، وہ صحیح نہیں۔ ویسے بھی، قرآنِ کریم نے، رسول اللہ کو کہیں شافع یا شفیع نہیں کہا۔ شہید یا شاہد — گواہی دینے والا یا نگران کہا ہے (دیکھئے ۲/۱۴۳ ؛ ۴/۴۱ ؛ ۳۳/۴۵ ؛ ۴۸/۸ ؛ ۷۳/۱۵)۔ علاوہ بریں جو رسول خود اپنے متعلق یہ کہے کہ اگر میں بھی خدا کی معصیت کروں تو اس کی سزا سے محفوظ نہیں رہ سکتا (۶/۱۵) کیا وہ معصیت کاروں کی، سفارش کر کے انہیں ان کے جرائم کی سزا سے بچانے کی کوشش کرے گا؟ قرآن کریم نے تو مجرمین کے پُشت پناہ بننے کی سخت ممانعت کی ہے اور واضح الفاظ میں کہا ہے کہ خدا کے نیک بندوں کا قطعاً یہ شیوہ نہیں

ہوتا (۲۸/۱۷ تا ۲۸/۸۶)۔ ویسے بھی سزا کا جو قرآنی مفہوم پہلے بیان کیا جا چکا ہے اس کی روشنی میں دیکھا جائے تو سفارش، رشوت وغیرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، آگ میں انگلی ڈالنے سے جو درد ہوتا ہے، کسی کی سفارش، یا رشوت اس کو نہ دور کر سکتی ہے نہ اس میں تخفیف۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو گناہوں (جرائم) کی "بخشش" کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس نکتہ کی وضاحت "مغفرت" کے عنوان میں اپنے مقام پر کی جائے گی۔ یہاں اتنے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے سفارش کا تصور قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔

ان تصریحات سے بات واضح ہو گئی ہو گی کہ قرآنِ کریم نے جب بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ یاد رکھو! خدا کے ہاں کسی کی سفارش قبول نہیں کی جائے گی تو وہاں شفاعت کے معنی سفارش کے ہیں جس کا عقیدہ یہودی رکھتے تھے۔ اور جس کی تردید قرآنِ کریم نے کی ہے۔ خواہ وہ عقیدہ کسی کے ہاں بھی ہو۔

آیتِ زیرِ نظر کا اگلا ٹکڑا ہے: وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ (۲/۴۸) اس میں عدل کے معانی غور طلب ہیں۔ لفظِ عدل کا مفہوم اس سے واضح ہو جائے گا کہ اونٹ کے دونوں طرف جو بوجھ لادا جاتا ہے اس کے لئے ضروری

عدل کا مفہوم

ہے کہ ہر دو اطراف کا وزن ایک دوسرے کے بالکل برابر ہو۔ ان میں سے ہر ایک کو "عِدْلٌ" کہا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں ایک چیز کا، کسی دوسری چیز کے برابر ہونا۔ بنا بریں، کسی چیز کے برابر اس کا معاوضہ عدل کہلاتا ہے۔ مثلاً سورۃ المائدہ میں ہے کہ اگر کوئی حالتِ احرام میں کسی جانور کا شکار کرے تو اس کے بدلے میں اسے اس کے برابر کوئی جانور دینا ہوگا: اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ (۵/۹۵)۔ "یا اس کی قیمت کے برابر مساکین کو کھانا کھلانا" اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا (۵/۹۵) "یا اس کے بدلے میں روزے رکھنا"۔ اس سے عدل کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے یعنی جرم کے معاوضے میں کوئی ایسی شے پیش یا قبول کرنا، جس سے مجرم اس کے مواخذہ سے بچ جائے۔ اس میں رشوت بھی آ جائے گی اور کفارہ بھی۔ کفارہ کا مفہوم بھی وضاحت طلب ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسانی بچہ پیدائش کے ساتھ اپنے اولیں ماں باپ کے گناہ کی آلائش لے کر آتا ہے۔ وہ کتنے ہی اچھے کام کیوں نہ کرے، اس آلائش سے اس کی نجات نہیں ہو سکتی۔ (ان کے عقیدہ کی رو سے) جب اللہ تعالیٰ نے اس صورتِ حالات پر نظر ڈالی تو اس سے اسے (معاذ اللہ) بڑی پریشانی ہوئی کہ اس سے تمام انسان جہنم رسید ہو جائیں گے! اس کا علاج یہ سوچا گیا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کو دنیا میں بھیج دے۔ مخالفین اسے صلیب دیدیں، اور اس طرح اس کا خونِ ناحق انسانوں کے گناہوں کا کفارہ بن

کفّارہ کا عقیدہ

بن جائے۔ چنانچہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص حضرت مسیح علیہ السلام کے کفارہ پر ایمان لے آئے اس کی نجات ہو جائے گی کیونکہ ان کا خونِ ناحق اس شخص کے گناہوں کا بدلہ بن جاتے گا۔ قرآنِ کریم نے جب کہا کہ: وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا (۶/۷۱) کوئی شخص اپنے گناہوں کا کسی قسم کا بھی بدلہ کیوں نہ دینا چاہے، وہ قبول نہیں کیا جائے گا" تو اس میں رشوت وغیرہ کے علاوہ عیسائیوں کے عقیدہ کی بھی تردید ہو گئی۔ (واضح رہے کہ قسم وغیرہ توڑنے کے جس کفارہ کا ذکر قرآنِ کریم میں آیا ہے اس کے متعلق گفتگو اپنے مقام پر کی جائے گی۔ اس وقت سمجھنے کے لئے اتنا کہدینا کافی ہوگا کہ وہ ایسی خفیف سی لغزشیں (لَمَم ۵۳/۳۲) ہیں جن کی، قانون کی رو سے، سزاء جرمانہ ہوتی ہے۔ اس کفارہ کے معنی جرمانہ کی ادائیگی ہوگی۔ لیکن یہ جرمانہ یہیں ادا کیا جاسکے گا۔ آخرت میں اس کی ادائیگی کا بھی سوال پیدا نہیں ہوگا)

یہ ہے وہ عدل، جس کے متعلق یہودیوں سے کہا گیا کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل میں اس کی قطعاً گنجائش نہیں[1]۔ اس قانون کی رو سے ہر عمل اپنا نتیجہ مرتب کر کے رہے گا اور کسی قسم کا کفارہ وغیرہ دیکر اس نتیجہ سے بچا نہیں جا سکے گا۔ جو الفاظ زیرِ نظر آیت (۲/۴۸) میں آئے ہیں، انہیں (۲/۱۲۳) میں بھی دہرایا گیا۔

نُصرت کا مفہوم

آیۂ زیرِ نظر کا اگلا ٹکڑا ہے: وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (۲/۴۸)۔ نُصرت کے عام معنی، مدد کرنا ہیں لیکن نصرت اور اعانت میں بالعموم یہ فرق کیا جاتا ہے کہ نصرت دفعِ مضرت کے لئے خاص ہوتی ہے۔ یعنی کسی مجرم کی مدد کر کے اسے جرم کی پاداش سے بچا لینا یا کسی مصیبت سے محفوظ رکھنا۔ مثلاً سورۃ الانبیاء میں ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے خدا کو پکارا کہ وہ انہیں آنیوالی مصیبت سے بچائے تو وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا (۲۱/۷۷) "ہم نے اسے اس قوم کی دراز دستیوں سے بچا لیا جو ہمارے قوانین کی تکذیب کرتی تھی" سورۃ الزمر میں ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرو، مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (۳۹/۵۴) "قبل اس کے کہ تم اس عذاب میں مبتلا ہو جاؤ جس سے تمہیں کوئی چھڑا نہیں سکے گا" دوسری جگہ اہلِ جہنم کے متعلق کہا کہ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے: وَلَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۳۳/۶۵) "اور وہ کوئی ایسا مددگار نہیں پائیں گے جو انہیں اس عذاب سے نجات دلادے" سورۃ المؤمن میں ہے کہ دربارِ فرعون کے مردِ مؤمن نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ: فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا (۴۰/۲۹) "ذرا سوچو! کہ جب خدا کا عذاب آ گیا تو اس سے ہمیں کون بچا سکے گا" سورۃ ہود میں ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ تم

---

[1] عدل بمعنی انصاف کے متعلق اس کے مقام پر گفتگو کی جائے گی۔

مجھے بتاؤ: فَمَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ اللّٰهِ إِنْ عَصَيْتُهُ (۱۱/۶۳) "اگر میں قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کی پاداش سے مجھے کون بچا سکے گا؟"

اِن آیات سے واضح ہے کہ نصرت کے معنی ہیں کسی کی مدد کرکے اُسے جرم کی پاداش سے بچا لینا خواہ اس مدد کی نوعیت اور کیفیت کچھ بھی ہو۔ یہ تصور خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے خلاف ہے۔ وہ ایسا عقیدہ رکھنے والوں سے کہتا ہے کہ جن معبودانِ باطل، یا اپنے بزرگوں کے متعلق تمہارا عقیدہ ہے کہ وہ تمہیں جرائم کی سزا سے بچالیں گے: وَلَا يَسْتَطِيعُونَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ أَنفُسَهُمْ يَنصُرُونَ (۷/۱۹۲) "تمہیں سزا سے بچالینا تو ایک طرف، وہ خود اپنے آپ کو بھی پاداشِ جرم سے بچا لینے کی استطاعت نہیں رکھتے" (نیز ۷/۱۹۷؛ ۲۱/۴۳)۔ (جہاں تک خدا کی نصرت کا تعلق ہے اس کی وضاحت اس کے مقام پر کی جائے گی۔ یہاں ہم نے نصرت کے اسی مفہوم پر اکتفا کیا ہے جس کا تعلق آیت زیرِ نظر سے ہے)۔

جو کچھ اس آیت میں کہا گیا ہے اس پر ایک دفعہ پھر نظر ڈالیے... اور دیکھیے کہ ان مختصر سے الفاظ میں، قانونِ مکافات کی کس طرح وضاحت، اور اس کے خلاف اہلِ مذاہب کے ہر باطل عقیدے کی کس طرح ضمنی طور پر تردید کی گئی ہے۔ آپ غور کیجیے کہ جس قوم کا قرآن کریم کی اس ایک آیت پر بھی ایمان ہو اس میں عدل کا کیا تصور ہوگا، اور وہ احکام و اقدارِ خداوندی کی کس طرح پابند ہوگی اور اس طرح وہ قوم اس زمین پر کس قسم کا جنتی معاشرہ قائم کرے گی!

واضح رہے کہ قرآنِ کریم کی اس قسم کی آیات کا مطلب یہی نہیں کہ ایسا کچھ قیامت (اُخروی زندگی) میں نہیں ہو سکے گا۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ ایسا کچھ اس دنیا کی زندگی میں نہیں ہونا چاہیئے۔ خدا کا قانونِ مکافات ہر دو جہان (دنیا اور آخرت دونوں) میں یکساں نافذالعمل ہے۔

قرآنِ کریم، بنی اسرائیل کو ان انعامات کی یاد دہانی کرا رہا ہے جن سے انہیں نوازا گیا تھا۔ اس ضمن میں اُس نے اگلی آیت میں کہا ہے:۔

۲/۴۹ وَإِذْ نَجَّيْنَٰكُم مِّنْ ءَالِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوٓءَ ٱلْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَآءَكُمْ ۚ وَفِى ذَٰلِكُم بَلَآءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ۔

اِس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "تم خدا کی اس نعمت کو بھی یاد کرو کہ اس نے تمہیں قومِ فرعون کے استبداد سے نجات دلائی جو تمہیں طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا رکھتی تھی۔ ان میں ایک عذاب یہ بھی تھا کہ وہ تمہارے ابنائے قوم کو ذبح کر دیتے

تھے اور نساء کو زندہ رکھتے تھے۔" ذبح ابناء" کی تفصیل آیت (۲/۴) کے تحت سابقہ باب میں گزر چکی ہے۔ اس میں نجات کا مفہوم بھی سامنے آچکا ہے اس لئے ان تفاصیل کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اس آیت کے آخر میں جو آیا ہے کہ وَفِي ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ (۲/۴۹) تو اس میں لفظِ بلآ وضاحت طلب ہے۔

ہمارے ہاں بلآ کے معنے بہت بڑی خوفناک چیز یا (مصیبت) کے ہوتے ہیں۔ یہیں سے لفظ ابتلا ہے جس کے معنے آزمائش کئے جاتے ہیں۔ جب کسی سے کہا جائے کہ خدا کے نیک بندے کیوں مصیبتوں میں گرفتار ہوتے ہیں تو اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ خدا انہیں آزمائش میں ڈالتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں بھی جہاں جہاں اس لفظ کو خدا کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس کا ترجمہ آزمائش ہی کیا جاتا ہے۔ یعنی خدا انہیں آزماتا ہے۔ ان کی آزمائش کرتا ہے۔ اور اس سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ خدا کا ان نیک بندوں کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ وہ اس کے مقرب بندے ہیں۔ لیکن ایسا کہتے وقت کوئی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ اس سے خدا کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے؟ آپ اپنے کسی محرم راز سے کہتے ہیں کہ فلاں شخص ہماری دوستی کا دعویٰ تو ہر وقت کرتا رہتا ہے لیکن معلوم نہیں وہ مخلص ہے بھی یا نہیں؟ اس کے جواب میں وہ کہتا ہے کہ اُسے آزما کر دیکھ لینا چاہیئے۔ یعنی اس سے کوئی بہت بڑی فرمائش کرنی چاہیئے اور پھر دیکھنا چاہیئے کہ وہ اسے پورا کرتا ہے یا نہیں۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ آپ کو اس شخص کی دوستی اور اخلاص کے متعلق یقینی طور

آزمائش کا غلط تصور

پر معلوم نہیں، اور اسے معلوم کرنے کے لئے آپ اُسے آزماتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ جب ہم یہ کہیں کہ خدا اپنے بندوں کو آزماتا ہے کہ اپنے دعویٰ عبدیت میں سچے اور مخلص ہیں یا نہیں، تو اس کے معنے یہ ہوتے کہ خدا کو اس کا علم نہیں۔ اس آزمائش سے وہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ وہ لوگ درحقیقت کیسے ہیں! خدا علام الغیوب ہے۔ وہ دلوں میں گزرنے والے خیالات تک سے بھی واقف ہے لہٰذا اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ فلاں شخص کیسا ہے، خدا کے متعلق بڑا غلط تصور پیدا کرتا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم میں یہ لفظ جہاں خدا کی طرف منسوب ہو اس کا ترجمہ آزمائش نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد دیکھئے کہ اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

بلآ یا ابتلا کا قرآنی مفہوم

بَلَآءٌ ۔۔۔ اِبْتَلَآءٌ (مادہ ب۔ل۔و۔یا۔ب۔ل۔ی) اس مادہ کے دو معانی ہوتے ہیں (۱) کسی کے متعلق جو باتیں معلوم نہ ہوں انہیں معلوم کرنا اور (۲) کسی چیز کی اصلی حالت کا ظاہر ہونا یا ظاہر کرنا خواہ وہ اچھی ہو یا بُری۔ پہلے مفہوم کی رُو سے اِسے آزمائش کہا جائے گا، اور جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، اس مفہوم کو خدا کی طرف کبھی منسوب نہیں

کرنا چاہیئے۔ دوسرے مفہوم (اصلیت یا حقیقت کے ظاہر ہو جانے) کے نظائر قرآن کریم میں بکثرت موجود ہیں۔ مثلاً سورۃ الطارق میں ہے: یَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ (۸۶/۹) "جس دن تمام چھپی ہوئی باتیں ظاہر ہو جائیں گی۔ ہر راز بے نقاب ہو جائے گا۔" سورۃ آلِ عمران میں منافقین کے سلسلے میں کہا گیا کہ جنگ کا حکم اس لئے بھی دیا جاتا ہے: وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِي صُدُوْرِكُمْ (۳/۱۵۳)۔ "تاکہ جو کچھ تمہارے دلوں میں پوشیدہ ہے وہ ظاہر ہو کر سامنے آ جائے۔" سورۃ المومنون میں قومِ نوحؑ کی داستان بیان کرنے کے بعد کہا: وَاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ (۲۳/۳۰) "ہم اقوامِ سابقہ کی سرگزشتوں کو اس طرح ظاہر کرتے رہتے ہیں۔"

دنیا میں حق و باطل کی کشمکش جاری ہے۔ کشمکش میں زندگی کے مختلف پہلو بدل بدل کر سامنے آتے رہتے ہیں۔ کہیں مشقتوں کے ہمت آزما پہلو اور کہیں خوشگواریوں کے سکون افزا گوشے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ ان تغیراتِ احوال میں انسان کس قسم کے کردار کا مظاہرہ کرتا ہے ـــــ وہ نامساعد حالات کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرتا ہے یا راہِ فرار اختیار کر لیتا ہے۔ مساعد حالات میں وہ خدا فراموش ہو جاتا ہے یا اس کے قوانین کی اور بھی شدت سے اطاعت کرتا ہے۔ ان تغیرِ حالات میں انسانی ردِّ عمل کو ابتلاء سے تعبیر کیا جاتا ہے ـــــ یعنی وہ مواقع جن میں انسانی کردار کی نمود ہو جائے۔ سورۃ الفجر میں ہے: فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ (۸۹/۱۵)۔ "جب انسان کے حالات مساعد ہوتے ہیں تو وہ یہ نہیں دیکھتا کہ یہ خوشگواریاں کن اسباب کا نتیجہ ہیں۔ وہ انہیں سرسری طور پر لیتا ہے اور تکلّفاً کہہ دیتا ہے کہ بس یہ تو خدا کا فضل ہے۔ وہ جسے چاہے اس سے نواز دے۔" وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ (۸۹/۱۶) "اور جب اس کی زندگی دوسرا پہلو بدلتی ہے اور اس پر رزق کی تنگی ہو جاتی ہے تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ یہ اس کی کس غلط روش کا نتیجہ ہے۔ وہ چیخنے چلّانے لگ جاتا ہے کہ خدا نے مجھے خواہ مخواہ ناحق، بلا سبب ذلیل و خوار کر دیا۔" اس کے بعد قرآن یہ بتاتا ہے کہ ایسے شخص کا یہ ردِّ عمل غلط ہوتا ہے: یہاں ہر بات کے لئے قاعدہ اور قانون مقرر ہے، اور یہ تغیراتِ احوال اُنہی قوانین کے مطابق رونما ہوتے ہیں۔

ان نظائر سے واضح ہے کہ ابتلاء کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنا محاسبہ کرے کہ اس کی صلاحیتوں کی کس حد تک نشو و نما ہو چکی ہے۔ زندگی کے اِس قسم کے (مساعد اور نامساعد) مواقع اس لئے پیش نہیں آتے کہ خدا انسان کو آزماتا ہے ـــــ یہ اس لئے پیش آتے ہیں کہ انسان خود اپنے آپ کو آزمائے۔ اپنی ذات کا ٹسٹ (TEST) کرے کہ وہ کس حد تک مستحکم ہو چکی ہے۔ ان معانی کی وضاحت کے لئے سورۃ الدھر

محاسبۂ خویش

میں انسانی تخلیق کے سلسلے میں کہا۔ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا (۲/۷۶)۔ "ہم نے انسان کی پیدائش کی ابتدا ایک ملے جلے نطفہ سے کی اور ایسا انتظام کیا کہ رحمِ مادر میں اس کے مضمر جوہروں کی نمود ہوتی جائے تا آنکہ وہ ایک سننے اور دیکھنے والا انسانی بچہ بن جائے"۔ یہ ہے.... اِبْتِلَآءٌ کا صحیح نقشہ، یعنی مضمر جوہروں کا محسوس شکل میں سامنے آجانا۔ ان کی نمود ہو جانا —— (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) اس کے لئے انسان کو کبھی نامساعد حالات میں سے گزرنا پڑتا ہے اور کبھی زندگی کی خوشگواریوں سے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۷/۱۶۸)۔ "انہیں زندگی کے مختلف حالات میں سے گزرنا پڑا —— یہ حالات کبھی خوشگوار تھے کبھی نامساعد —— مقصد اُن سے یہ تھا کہ وہ ہر حالت میں ہمارے قوانین کی طرف رجوع کریں"۔ دوسری جگہ زندگی کے خوشگوار پہلوؤں میں صحیح کردار کی نمود کو بَلَآءً حَسَنًا (۸/۱۷) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بَلَآءٌ کے اس مفہوم کی رو سے آیتِ زیرِ نظر میں جو کہا گیا ہے: وَفِىْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ (۲/۴۹) تو اس میں بلاء کے صحیح معانی واضح ہو جاتے ہیں۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ فرعون کا عذاب خدا کی طرف سے ایک آزمائش تھی۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، خدا کی طرف سے آزمائش کا تصور بنیادی طور پر غلط ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر اس کا یہ مفہوم لیا جائے کہ یہ عذاب خدا کی طرف سے آزمائش تھی تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ خدا ایک طرف تو اس عذاب کی شکل میں اُنہیں آزما رہا تھا اور دوسری طرف اس نے اپنے ایک جلیل القدر پیغمبر کو بھیجا کہ وہ انہیں اس عذاب سے نجات دلائے۔ یہ تو متضاد باتیں ہوں گی۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے تمہیں فرعون کے عذاب سے جو نجات دلائی تو یہ چیز تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لئے ایک عظیم نعمت تھی۔ زندگی کا بڑا خوشگوار پہلو تھا کیونکہ اس سے تمہیں اپنی بازآفرینی کے مواقع حاصل ہو گئے (نیز دیکھئے ۷/۱۴۱؛ ۱۴/۶)۔ اصل یہ ہے کہ محکوم قوم کو آزادی مل جانا بہت بڑی نعمت ہوتی ہے۔ اس سے اس قوم کو اپنی صلاحیتوں کو نشوونما دینے کے مواقع حاصل ہو جاتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم ان مواقع سے فائدہ کس طرح اٹھاتی ہے اور اس آزادی کے محاصل کو استعمال کس طرح کرتی ہے۔ یہ تھی بنی اسرائیل پر خدا کی پہلی نعمت۔

قومِ فرعون کے شکنجۂ استبداد سے نجات دلانے کے پروگرام کی پہلی کڑی یہ تھی کہ اس قوم کو مصر کی سرزمین سے نکال کر سینا کی آزاد فضا میں بسا دیا جائے۔ یہ ہے وہ واقعہ، جس کا ذکر اگلی آیت میں آتا ہے

جس میں کہا گیا ہے کہ:

۲/۵۰ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۔

بات یوں ہوئی کہ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ (۲۶/۵۲)۔ "اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ ہمارے بندوں کو راتوں رات مصر سے نکال کرلے جاؤ۔ لیکن یاد رکھو کہ یہ مرحلہ آسانی سے طے نہیں ہوجائے گا۔ فرعون تمہارا تعاقب کرے گا۔" حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں لے کر نکلے، اور جیسا کہ انہیں پہلے سے (WARN) کر دیا گیا تھا، فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ (۲۶/۶۰) "صبح ہوتے ہی فرعون نے ان کا تعاقب کیا۔" اب اس منظر کو سامنے لائیے کہ قومِ بنی اسرائیل جب آگے بڑھی تو اس نے دیکھا کہ سامنے سمندر ہے اور پیچھے فرعون کا لشکر۔ ظاہر ہے کہ یہ قوم جس کی ہمتوں کو صدیوں کی غلامی نے کچل کر رکھ دیا تھا، گھبرا اٹھی اور کہنے لگی کہ اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ (۲۶/۶۱) "ہم پکڑے گئے، ہم مارے گئے۔" اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے، اُس سکون اور اطمینان کے ساتھ، جو ان حضرات (علیہم السلام) کا خاصہ ہوتا ہے، ان سے کہا کہ كَلَّا ـــــ گھبراؤ نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہوگا: اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ (۲۶/۶۲)۔ "ہم تنہا نہیں، میرا رب میرے ساتھ ہے۔ وہ یقیناً ہماری راہنمائی ایسے راستے کی طرف کردے گا جس سے ہم صحیح وسلامت اپنے مستقر تک پہنچ جائیں۔"

آگے بڑھنے سے پہلے اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ (۲۶/۶۲) کے روح پرور اور اطمینان افزا ایمان کے اظہار پر غور فرمائیے۔ تاریخ کے اوراق کو، اس واقعہ کے بعد چند صدیاں آگے کی طرف اُلٹیے اور آجائیے اس غار کے دہانے پر، جس میں دو شخصیتیں دشمنوں سے اپنی حفاظت کے لئے چھپی بیٹھی ہیں۔ خدا نے ان دونوں کو ایک دوسرے کا دوست کہہ کر پکارا ہے۔ خطرہ کے احساس سے ایک دوست (حضرت ابوبکر صدیقؓ) کے چہرے پر، پریشانی کے کچھ آثار دیکھ کر ـــــ جو یقیناً اپنی حفاظت کے خیال سے نہیں بلکہ اس ساتھی کی حفاظت کے خیال سے لاحق ہوئی تھی۔ جو... اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا ـــــ اس دوسرے دوست (حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم) نے دل کے پورے سکون اور طمانیت کے ساتھ

غار کا ساتھی صدیقِ اکبرؓ

فرمایا کہ: لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (۹/۴۰) "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" یہاں غور کیجئے! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا: اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ (۲۶/۶۲) ـــــ "میرا رب میرے ساتھ ہے۔" انہوں نے اس میں اپنی قوم کو شامل نہیں کیا تھا کیونکہ اس قوم کا ہنوز خدا پر ایمان ایسا پختہ نہیں تھا۔ حضور نبی اکرمؐ

صلی اللہ علیہ وسلم نے مَعَنَا کہا۔ یعنی اس میں اپنے دوست کو بھی شامل کر لیا کیونکہ اللہ پر اس کے ایمان کی پختگی میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا۔

اس ضمنی نکتہ کے بعد آگے بڑھیے اور دیکھئے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے جو کہا تھا کہ میرا رب اس راستے کی نشاندہی کر دے گا جہاں سے ہم بخیر و عافیت اپنے مستقر تک جا پہنچیں گے، تو خدا کی وہ رہنمائی کیا تھی اور اس کی روشنی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کس طرح اپنی قوم کو لیکر بحفاظت آگے بڑھ گئے۔ اس سلسلے میں قرآنِ کریم میں چند الفاظ ایسے آتے ہیں، جن کا مفہوم پہلے سمجھ لینا ضروری ہے

(۱) بحر۔ ہمارے ہاں، بحر سمندر کو کہتے ہیں لیکن عربوں کے ہاں بحر، ہر اس مقام کو کہتے تھے جہاں بہت سا پانی جمع ہو، خواہ وہ نخلستانوں کے تالاب سے ہوں، خواہ دریا اور خواہ سمندر۔ وہ سب کے لئے یہی لفظ بولتے تھے۔ اسی ضمن میں دوسرا لفظ 'یم' بھی آیا ہے۔ (۲۹/۲۰)۔

(۲) فرق۔ اس کے معنی عام طور پر پھٹ جانا کئے جاتے ہیں لیکن دراصل اس کے معنی ہوتے ہیں الگ ہو جانا، جدا ہو جانا، فاصلے پر ہو جانا۔

(۳) ضرب۔ یہ لفظ بڑا وسیع المعانی ہے۔ عام طور پر اس کے معنے مارنا کئے جاتے ہیں لیکن یہ لفظ راستہ طے کرنے یا سفر کرنے کے معانی میں بھی آتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں ہے اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (۹۴/۴)۔ "جب تم اللہ کی راہ میں (جہاد کیلئے) نکلو"۔ سورۃ مائدہ میں ہے: اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ (۱۰۶/۵)۔ "جب تم حالتِ سفر میں ہو"۔

(۴) عصا۔ (مادہ ع ۔ ص ۔ و) اس مادہ کے اصلی معنی اجتماع اور ائتلاف کے ہیں۔ یعنی اکٹھا ہونا اور ایک دوسرے کے ساتھ مل جانا۔ لاٹھی کو اس لئے عصا کہتے ہیں کہ اسے پکڑنے لئے انگلیوں کو اکٹھا کرنا پڑتا ہے۔ العصا جماعت کو کہتے ہیں۔ شق العصا کے معنی ہیں جماعت میں افتراق پیدا کر دینا۔ نیز عصا کے معنی قوت اور ہر اس شئے کے ہوتے ہیں جس پر سہارا کیا جائے۔

(۵) آل۔ (مادہ ا ۔ و ۔ ل) یہ لفظ اولاد کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مثلاً آلِ یعقوب (۶/۱۹)۔ اور رفقا اور متبعین کے معانی میں بھی۔ جیسے آلِ فرعون (۴۹/۲)

سمندر کیسے پار کیا گیا تھا

ان مبادیات کے بعد آگے بڑھیے۔ ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جب حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لیکر سمندر کے کنارے

پہنچے تو آپ نے خدا کے حکم سے سمندر پر اپنی لاٹھی ماری۔ سمندر کا پانی پھٹ کر الگ الگ شیشے کی دیواروں کی طرح، منجمد ہوگیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ ان دونوں دیواروں کے درمیانی راستہ سے سمندر پار کر کے صحرائے سینا میں جا پہنچے۔ تورات میں ایسا ہی آیا ہے، اور ہمارے ہاں یہ تصور وہیں سے لیا گیا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی متعلقہ آیات پر غور کرنے سے حقیقت کچھ اور نظر آتی ہے۔ اسے پھر دہرا دیا جائے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ (۲۶/۶۲) "میرا رب میرے ساتھ ہے۔ وہ یقیناً میری راہنمائی اس راستہ کی طرف کر دے گا جہاں سے ہم بعافیت سمندر کو عبور کر لیں گے"۔ خدا کی وحی نے اس راستہ کی نشاندہی کی تھی جہاں سے یہ سمندر کو بآسانی پار کر سکتے تھے۔ تورات ہمیں بتاتی ہے —— اور جغرافیہ سے بھی یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ واقعہ بحیرہ قلزم (RED SEA) کا ہے۔ آپ ذرا نقشے پر نگاہ ڈالئے۔ بحیرۂ قلزم، بحرِ ہند سے الگ ہوکر، عرب اور مصر کو دو قطعوں میں تقسیم کرتا ہوا بحرِ روم کی طرف بڑھتا گیا ہے۔ حتّٰی کہ آخر میں یہ دو چھوٹی چھوٹی شاخوں میں بٹ جاتا ہے۔ ہم بحرِ روم کی طرف رُخ کئے ہوں تو بائیں طرف کی شاخ ذرا بڑی ہے۔ اب اُسے نہر سویز کے ذریعے بحرِ روم سے ملا دیا گیا ہے۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں نہر سویز موجود نہیں تھی۔ ان دونوں شاخوں کے درمیان مثلث قطعہ میں سینا کی وادیاں ہیں جہاں بنی اسرائیل کو پہنچنا تھا۔ بحیرہ قلزم کا یہ حصہ آج تو کافی گہرا ہے لیکن دنیا میں مرورِ زمانہ سے جو جغرافیائی تغیر و تبدل پیدا ہوتے رہتے ہیں وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ خشکیاں پانی میں اور پانی خشکیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بطلیموس کے جغرافیہ کے مطابق بحیرۂ قلزم، زمانہ قدیم میں متعدد جزیروں سے پٹا ہوا تھا اور قیاس ہے کہ اس کا آخری حصہ اس زمانے میں اتنا گہرا نہیں ہوگا جتنا آج کل ہے۔ اس لئے مد و جزر یا ہواؤں کے رُخ سے اس حصہ کا پانی پیچھے کی طرف ہٹ کر اسے پایاب بنا دیتا ہوگا۔ اس سلسلے میں دو مزید باتیں قابلِ غور ہیں۔ تورات میں سمندر پھٹ جانے کا بھی ذکر ہے لیکن، اس کے ساتھ ہی وہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ:-

> خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک بنا دیا اور پانی دو حصے ہوگیا۔ اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ سے خشک زمین پر چل نکلے۔ (خروج باب ۱۴۔ آیات ۲۲ - ۲۱)

—— دوسری بات یہ کہ ۱۹۶۲ء میں یہودیوں کی طرف سے تورات کا جو ترجمہ شائع ہوا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ دورِ حاضر کی تحقیق کی رو سے معلوم ہوا ہے کہ بنی اسرائیل نے سمندر کو عبور نہیں کیا تھا بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو اس مقام سے پار لے گئے تھے جو دلدل بن چکا تھا اور جہاں سرکنڈا اُگ رہا تھا۔ اسی نسبت

سے اسے (SEA OF REEDS) کہتے تھے۔ یہ مقام موجودہ نہر سویز سے قریب واقع تھا۔ یہ اعلان امریکہ کی (JEWISH PUBLICATION SOCIETY) کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر (LISSER ZUSSMAN) کی طرف سے کیا گیا تھا۔

ان تصریحات کے بعد قرآن مجید کی طرف آیئے۔ سورۃ الشعراء میں کہا گیا ہے: فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ (۲۶/۶۳)۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے کہ اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے "ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی اور کہا کہ تو اپنی لاٹھی سمندر پر مار"۔ لیکن، جیسا کہ ہم ان الفاظ کے معانی سے واضح کر چکے ہیں، ضَرَبَ کے معنی راستہ چلنے کے ہیں اور عصا کے معنی جماعت یا قوم کے۔ لہٰذا ان الفاظ کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تو اپنی قوم کو لے کر اس سمت سے سمندر کی طرف جا، جس کی بذریعہ وحی نشاندہی کی گئی ہے۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے: وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا (۲۰/۷۷)۔ "اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ ہمارے بندوں کو راتوں رات مصر سے نکال لو اور اس سمت سے سمندر کی طرف جاؤ جہاں سے پانی خشک ہو چکا ہے"۔ وہاں کا پانی خشک کس طرح ہوا تھا، اس کے متعلق دوسری جگہ کہا۔ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا (۴۴/۲۴)۔ "رَهْوًا" کے بنیادی معنی دو ہیں۔ (۱) سکون، جس میں جوش و خروش نہ ہو۔ اور (۲) وہ جگہ جو کبھی بلند ہو جاتی ہو اور کبھی پست۔ سمندر کے پرسکون ہونے کے معنے تو یہ ہیں کہ وہاں اس کا جوش و خروش نہیں ہوگا۔ باقی رہا پانی کے نیچے کی زمین کا کبھی ابھر آنا اور کبھی پست ہو جانا، تو اسے سمجھنے کے لئے آپ سمندر کے کنارے (BEACH) کو سامنے لایئے اور اس کے ساتھ مد و جزر کو۔ مد کے وقت سمندر کا پانی خشکی پر چڑھ آتا ہے۔ اسے اہل لغت نے زمین کے پست ہو جانے سے تعبیر کیا ہے۔ اور جب اس میں جزر آتا ہے تو پانی پیچھے ہٹ جاتا ہے اور وہی زمین ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اس لفظ (رَهْوًا) کے ان معانی کو سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ قرآن کریم نے دو الفاظ (رَهْوًا اور يَبَسًا) سے کس طرح ساری بات واضح کر دی ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی راہنمائی اس مقام کی طرف کی گئی تھی جہاں پانی کی گہرائی بہت کم تھی ـــــ اتنی کم کہ، سمندر کے جزر کے وقت وہ حصہ خشک ہو جاتا تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں پہنچے تو سمندر میں جزر تھا اس لئے وہ اپنی قوم کو لے کر بحیرۂ قلزم کی اس شاخ کو عبور کر کے سامنے خشکی پر پہنچ گئے۔ اس کے بعد آل فرعون وہاں آئے تو سمندر کو خشک دیکھ کر اس میں اتر گئے۔ لیکن اتنے میں سمندر میں مد شروع ہو گیا اور وہ غرق ہو گئے۔

ان مفاہیم کی روشنی میں اب پوری متعلقہ آیت دیکھئے۔ سورۃ البقرۃ کی زیر نظر آیت میں ہے: وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (۲/۵۰) "اور ہم نے

سمندر کے پانی کو فاصلے پر کر دیا اور تمہیں بعافیت پار لگا دیا۔ اس کے بعد فرعون اور اس کے ساتھی غرق ہو گئے اور تم اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔" آیات (۷/۱۳۸؛ ۱۰/۹۰) میں وَجَاوَزْنَا بِبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ الْبَحْرَ آیا ہے۔ یعنی "ہم نے اس طرح بنی اسرائیل کو سمندر عبور کرا دیا۔" یہ منظر، کہ (سمندر میں اترنے سے پہلے) اہل فرعون کا گروہ ایک طرف کھڑا تھا اور بنی اسرائیل کا گروہ دوسری طرف کی خشکی پر۔ اسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: فَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰ مُوسَىٰٓ أَنِ اضْرِب بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ فَانفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ (۲۶/۶۳)۔ "اور ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کو اس راستہ سے سمندر کی طرف لے چلو جس کی ہم نے نشاندہی کی ہے وہ سمندر کے دوسری طرف خشکی پر کھڑے ہو گئے۔ ادھر قوم فرعون کے لوگ آ گئے۔ دونوں کے درمیان سمندر کا وہ حصہ حائل تھا جہاں سے بنی اسرائیل گزرے تھے۔ اس طرح یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے یوں کھڑے تھے جیسے ریت کے تودے ہوں۔" سورۃ طٰہٰ میں ہے: وَلَقَدْ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ مُوسَىٰٓ أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَّا تَخَافُ دَرَكًا وَلَا تَخْشَىٰ (۲۰/۷۷)۔ "اور ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی بھیجی کہ میرے بندوں کو راتوں رات مصر سے نکال لے جا اور انہیں سمندر کے اس حصے سے پار لے جا جہاں پانی خشک ہو چکا ہے۔ اس طرح تمہیں نہ تو تعاقب کرنے والوں سے کوئی خدشہ ہو گا اور نہ ہی غرق ہو جانے کا ڈر۔" اور سلسلے کی آخری آیت ہے: وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا إِنَّهُمْ جُندٌ مُّغْرَقُونَ (۴۴/۲۴)۔ "اور ہم نے موسیٰؑ سے کہا تھا کہ) تم تو سمندر کو پُرسکون حالت میں چھوڑ دو۔ اس کے بعد فرعون کا لشکر اس میں غرق ہو جائے گا۔

یہ ہے بنی اسرائیل کے سمندر پار کرنے اور فرعون کے غرق ہو جانے کا واقعہ۔

اس واقعہ کا تذکرہ تو یہاں ختم ہو گیا لیکن اس میں دو امور اور وہ بھی قابل ذکر ہیں۔ سورۃ یونس میں ہے:۔

وَجَاوَزْنَا بِبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ الْبَحْرَ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُ بَغْيًا وَعَدْوًا ۖ حَتَّىٰٓ إِذَآ أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ آمَنتُ أَنَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا الَّذِيٓ آمَنَتْ بِهِ بَنُوٓا إِسْرَآءِيلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ (۱۰/۹۰)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار اتار دیا۔ فرعون اور اس کے لشکر نے ان کا پیچھا کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو جا دبوچیں اور انہیں پھر اپنے شکنجۂ استبداد میں جکڑ لیں لیکن اتنے میں پانی چڑھ آیا۔ جب فرعون نے دیکھا کہ وہ غرق ہونے لگا ہے تو پکار اٹھا کہ میں اس خدا پر ایمان لاتا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان رکھتے ہیں اور اعلان کرتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار

نہیں اور اس طرح میں بھی اس کے فرمانبردار بندوں میں شامل ہو جاتا ہوں۔[1]

فرعون کا ایمان

فرعون کے اس اعلان پر، عام انسانوں کے ذہن میں یہ خیال ابھرتا ہوگا کہ اس پر بارگاہِ خداوندی سے تحسین و تبریک کے ڈونگرے برسائے گئے ہوں گے اور ملائکہ نے جوشِ مسرت سے نعرے بلند کئے ہوں گے لیکن قرآن کچھ اور کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فرعون کے اس اعلان پر بارگاہِ خداوندی سے جواب ملا کہ:

آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ۔ (۱۰/۹۱)

ہاں! تو اب ایمان لایا۔ حالانکہ اس سے پہلے تو نے ساری عمر سرکشی اختیار کئے رکھی اور مسلسل فساد برپا کرتا رہا۔ اب تیرا یہ ایمان ہماری میزان میں پرکاہ جتنا وزن بھی نہیں رکھتا۔

آپ اس جواب پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ ذہنِ انسانی میں ابھرنے والے خیال اور قانونِ مکافاتِ عمل کے مالک خدا کے جواب میں کس قدر اصولی فرق ہے۔ ایمان، قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ صداقت کے اقرار اور اعلان کا نام ہوتا ہے جس کا محرک جذبہ دفعِ مضرت ہوتا ہے نہ جلبِ منفعت۔ وہ ہر قسم کے خطرات سے بے نیاز ہو کر کیا جاتا ہے۔ اس ایمان کا اعلان، استحکامِ خودی کی دلیل ہوتا ہے۔ لیکن جو ایمان، موت کے ڈر یا کسی اور خوف کی وجہ سے لایا جائے وہ نہ صرف یہ کہ، ایمان کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا بلکہ اس ایمان لانے والے کی بزدلی (ضعفِ خودی) کی دلیل ہوتا ہے۔ ایسا شخص درحقیقت، خطرہ یا موت سے بچنے کے لئے ایمان کو اپنی سپر بنانا چاہتا ہے۔ اس قسم کے ایمان کے اعلان کو اس شخص کے منہ پر یہ کہکر مارا جاتا ہے کہ:-

درکفر ہم پختہ نہ زنار را رسوا مکن

اس ایمان سے تو وہ کفر ہزار درجہ بہتر ہے، جس پر انسان مصائب و خطرات کے باوجود قائم رہے۔ اس سے اس

---

[1] اس واقعہ کے سلسلہ میں ہماری کتبِ روایات کا بیان بھی ملاحظہ کرتے جائیے۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے:-

حضورؐ فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کی خبر دیتے وقت جبرئیل علیہ السلام نے مجھ سے فرمایا کہ کاش کہ آپ اس وقت ہوتے اور دیکھتے کہ میں اس کے (فرعون کے) منہ میں کیچڑ ٹھونس رہا تھا اس خیال سے کہ کہیں اس کی بات پوری ہونے پر رحمتِ خدا اس کی دستگیری نہ کرے۔

(ابن کثیر۔ گیارھواں پارہ صفحہ ۵۲)

شخص کی پختگیٔ کردار کا پتہ چلتا ہے۔ اس کا کفر اس کی فکری غلطی یا تقلید کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو غالب نے اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ :-

وفاداری، بشرطِ استواری، اصل ایماں ہے ؛ مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

فرعون کے اس ایمان کے مقابلے میں، اسی کے دربار کے ساحرین کے ایمان کو سامنے لائیے، ضعف اور استحکامِ خودی کا تقابل اُبھر کر سامنے آجائے گا۔ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے کے لئے مملکت کے بڑے بڑے منتریوں اور پجاریوں کو بلایا تھا۔ اس کے لئے اس نے ایک بہت بڑے دنگل کا سا اہتمام کیا تھا۔ اس مقابلہ کی ہار جیت سے فرعون کا مستقبل وابستہ تھا۔ یہ اس کی "انا" کا بھی سوال تھا۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ یہ مقابلہ کس قدر اہمیت کا حامل تھا۔ مقابلہ ہوا تو ان منتریوں نے حضرت موسیٰؑ کی طرف سے پیش کردہ حقائق کو علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لیا اور اس کے بعد وہ بے اختیار

ساحرینِ دربارِ فرعون کا ایمان

پکار اُٹھے کہ: اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ (۷/۱۲۱-۱۲۲)۔ "ہم نے خدائے رب العالمین، رب موسیٰ و ہارون پر ایمان لے آئے"۔ آپ سوچئے کہ اس سے فرعون کے دل و دماغ کی حالت کیا ہوگی! شکست اور ایسی رسواکن شکست! ذلت اور ایسی کھلی ہوئی ذلت!! وہ ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرجا، کف بر دہاں سیلاب کی طرح اُمڈا اور کہا اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِى الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۷/۱۲۳)۔ "ہیں! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ تم مجھ سے اجازت لئے بغیر خدائے موسیٰؑ پر ایمان لے آئے۔ مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ یہ کوئی خفیہ سازش ہے جو تم نے مل کر دار السلطنت میں کی ہے تاکہ تم اس ملک کے باشندوں کو یہاں سے نکال باہر کرو اور اس سرزمین پر اپنی حکومت قائم کرلو۔ میں تمہیں ابھی اس کا مزہ چکھا دوں گا اور تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ فرعون کے خلاف سرکشی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے"۔ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۷/۱۲۴)۔ "میں پہلے تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے سیدھے کٹوا دوں گا اور پھر تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا"۔

جور و استبداد کی ان قہرمانی بجلیوں کو آپ نے دیکھ لیا۔ اب ساحرین کے کوہ تمثال عزم و ایمان کی تجلیات کا منظر بھی ملاحظہ فرمائیے۔ انہوں نے نہایت سکون و ثبات سے فرعون کی اس گرج کو سنا۔ ایک تبسم زیر لبی سے اس کی طرف نگہ حقارت سے دیکھا اور کہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ جس صداقت کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں کیا ہم تمہارے ڈر سے یا موت سے بچنے کے لئے اس کی تکذیب کر دیں؟ لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ

الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا (۲۰/۷۲) "جس خدا نے ہمیں پیدا کیا اور جو کچھ دلائل و بصیرت کی بنا پر ہمارے سامنے آگیا، ہم اس پر تجھے کبھی ترجیح نہیں دے سکتے۔ تیری دھمکیاں اور تخویف و ترہیب کی شعلہ باریاں ہم پر کچھ اثر نہیں کر سکتیں" فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ (۲۰/۷۲) "جو فیصلہ تو کرنا چاہتا ہے کر ڈال، جو تیرے جی میں آئے کر گزر، تیرے آہنی ہاتھ زیادہ سے زیادہ اسی طبیعی زندگی تک ہمارے گلوگیر ہو سکتے ہیں۔ اس سے آگے تو کر ہی کیا سکتا ہے؟ تیرے اقتدار کی حدود اسی دنیا تک ہیں اور خدا کی مملکت اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے" اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا........ (۲۰/۷۲) "تیرا فیصلہ اسی زندگی تک محدود ہے اور زندگی تو اس سے کہیں آگے جاتی ہے۔ وہاں تیرا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا"

یہ تھا وہ ایمان، جو... زمین و آسمان کو وجد میں لے آتا ہے اور اس پر خدا اور اس کے ملائکہ تبریک و تہنیت کے پھول برساتے ہیں۔ (۳۳/۴۳)۔ ایک طرف اس حق گوئی و بیباکی کو دیکھئے اور دوسری طرف فرعون کی پستی کردار کو، جس نے موت سے بچنے کے لئے ایمان کی آڑ لینا چاہی۔[1]

علاوہ بریں ایک اور بات بھی قابلِ توجہ ہے، مذہب پرست طبقہ کی طرف سے کہا جا سکتا ہے کہ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ اُسے بہر حال قبول کر لینا چاہیے خواہ اس کا اعلان کسی وقت بھی کیوں نہ ہو۔ ایسا کہنے والوں کو معلوم ہی نہیں کہ توبہ کسے کہتے ہیں اور اس کی قبولیت کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ توبہ کے دو اجزاء لاینفک یا باہمدگر پیوست ہیں۔ آپ سے کوئی غلطی ہو گئی۔ اس سے کچھ نقصان واقع ہوا۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

توبہ کا مفہوم

اس احساس کو توبہ کہتے ہیں۔ لیکن اتنے سے تو اس نقصان کا ازالہ نہیں ہو جاتا جو اُس غلطی کی وجہ سے لاحق ہوا تھا۔ اس کے لئے تو آپ کو ایسے کام کرنے ہوں گے جن سے اس نقصان کی تلافی ہو جائے۔ یہ اس پروگرام کا دوسرا حصہ ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ہر جگہ تَابَ کے ساتھ اَصْلَحَ کا اضافہ کیا ہے۔[2] اب اگر ایسا ہو کہ آپ کو اپنی خطا کا احساس اس وقت ہو جب آپ کے لئے کچھ کرنے کا وقت ہی نہ رہے تو یہ احساس کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں کر سکے گا۔ بالفاظِ دیگر، یہ کہا جائے گا کہ آپ کی توبہ کی قبولیت کا وقت گزر چکا۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے سورۃ النساء میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے وَلَيْسَتِ

---

[1] اس مقام پر ہم نے ساحرین کے اس واقعہ کو اختصاراً بیان کیا ہے۔ اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

[2] اس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد اول صفحات ۲۶ – ۲۷ پر گزر چکی ہے۔

التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰىٓ اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ (۴/۱۸) "ان لوگوں کی توبہ، توبہ ہی نہیں جو ساری عمر برائیاں کرتے رہے لیکن جب ان کے سامنے موت آکھڑی ہوئی تو کہنے لگے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں" قرآن کریم نے اسی لئے ایسے توبہ تسلیم نہیں کیا کہ اس کے بعد عمل کے لئے وقت ہی باقی نہیں رہا تھا جس سے تلافیٔ مافات ہوسکتی۔ یہی الٰئن فرعون کے قصے میں بھی کہا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھئے کہ یہ جواب خدا کی طرف سے ملا تھا جو دلوں کے ارادوں تک سے واقف ہے۔

اس قصہ میں دوسری قابلِ ذکر بات وہ ہے جس کا تذکرہ، قرآن کریم میں ان الفاظ میں آیا ہے:-

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً وَّاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (۱۰/۹۲)

(فرعون کی غرقابی کے وقت ہم نے اس سے کہا کہ) آج ہم ایسا کریں گے کہ تیری لاش کو سمندر کی موجوں سے بچالیں گے تاکہ، یہ ان لوگوں کے لئے، جو تیرے بعد آنے والے ہیں، حقیقت کی نشانی بن جائے ۔۔۔ اور اکثر انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں کی طرف سے یک قلم غافل رہتے ہیں۔

فرعون کی لاش

اس آیت کا صحیح مفہوم، ایک عرصہ تک مرکزِ بحث و نظر بنا رہا۔ اس لئے کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ فرعون کی لاش کو آنے والوں کے لئے کس طرح محفوظ رکھا گیا تھا۔ چونکہ حقیقت سمجھ میں نہیں آتی تھی اس لئے اس سلسلہ میں عجیب و غریب افسانے وجود میں آگئے (جو ہماری کتب تفاسیر میں موجود ہیں لیکن جن کا ذکر کرنا ہم ضروری نہیں سمجھتے)۔ تاآنکہ اٹھارویں صدی عیسوی میں، مصر کے تہہ خانوں سے ان کے قدیم بادشاہوں کی ممی شدہ لاشیں برآمد ہونا شروع ہوئیں جن میں سے ایک کے متعلق علمائے مصریات کی تحقیق ہے کہ وہ فرعون موسیٰ (ریمیسس ثانی) کی لاش ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اس تحقیق کی روشنی میں قرآن مجید کی اس آیت کا صحیح مفہوم سامنے آگیا۔ قرآن کریم کے حقائق و غوامض کا وہ حصہ، جس کا تعلق مختلف علوم سے ہے، علم و تحقیق کی روشنی میں ہی صحیح طور پر سامنے آسکتا ہے۔ زمانہ من حیث الکل علمی تحقیقات کی رو سے آگے بڑھتا جارہا ہے۔ جوں جوں ان تحقیقات میں اضافہ ہوتا جائے گا،

وہ قیاس سے آگے بڑھ کر یقین کے درجہ تک پہنچ جائیں گی، قرآن کریم کے معارف، رموزِ فطرت کی طرح بے نقاب ہوتے جائیں گے، قرآن کریم کے معارف، رموزِ فطرت کی طرح بے نقاب ہوتے جائیں گے اور اس طرح وہ آیات، جو پہلے متشابہات میں داخل تھیں — (یعنی انہیں تشبیہاً بیان کیا گیا تھا) — رفتہ رفتہ محکمات کے ذیل میں آتی جائیں گی (۳/۷)۔ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳)۔ "یہاں تک کہ یہ حقیقت مسلمہ طور سامنے آجائے گی کہ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ مبنی بر صداقت ہے"۔

اس طرح، بنی اسرائیل کو، حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں اہل مصر کے عذاب سے نجات ملی اور فرعون مع اپنے جنود وعساکر کے غرقِ دریا ہوگیا۔ بنی اسرائیل اس کے بعد سینا کی وادیوں میں سکونت پذیر ہوگئے۔ یہاں سے ان کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے اور اسی زندگی کا ایک واقعہ اس اگلی آیت میں مذکور ہے، جو یوں ہے:

۲/۵۱ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل، مصر میں قریب چار سو سال تک رہے۔ اگرچہ وہ رہے تو محکومیت کی حالت میں، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے جداگانہ قومی تشخص کو برقرار رکھا — یا یوں کہئے کہ حاکم قوم نے انہیں اپنے سے الگ رکھا اور اس طرح ان کا جداگانہ وجود برقرار رہا — ان کا جداگانہ وجود تو برقرار رہا لیکن، جیسا کہ خوئے غلامی کا تقاضہ ہوتا ہے، انہوں نے حاکم قوم کے اندازِ زیست ہی کو نہیں بلکہ ان کے عقائد ونظریات تک کو غیر شعوری طور پر اپنا لیا اور وہ ان کے قلب کی گہرائیوں تک میں اس طرح پیوست ہوگئے کہ خدا کے دو اولوالعزم پیغمبروں — حضرتِ موسیٰ وحضرت ہارون علیہما السلام کی تعلیم وتربیت کے باوجود ان کے نقوش نہ مٹ سکے۔

بُت سازی کی فرمائش

مصری بت پرست تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی انہوں نے بھی بت پرستی اپنا شعار بنا لیا تھا۔ قرآن کریم میں ہے کہ: وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْكُفُوْنَ عَلٰۤی اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَاۤ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (۷/۱۳۸)۔ "اور جب بنی اسرائیل سمندر پار اُتر گئے تو وہاں ان کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو اپنے بتوں کی مجاور بنی بیٹھی تھی۔ بنی اسرائیل نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہمارے لئے بھی ایک ایسا ہی معبود بنا دیجئے جیسا ان لوگوں کا معبود ہے"۔ اس فرمائش پر حضرت موسیٰؑ کے دل پر جو گزری ہوگی اس کا اندازہ لگایا

جاسکتا ہے لیکن ایسے لوگوں سے اس کے سوا اور کیا کہا جاتا کہ: قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ (۷/۱۳۸)" واقعہ یہ ہے کہ تم بڑی ہی جاہل قوم ہو" کم بختو! تمہیں ابھی تک یہ اندازہ بھی نہیں ہو سکا کہ جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے اور مآل کیا: اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۷/۱۳۹)" یہ لوگ جس طریق پر چل رہے ہیں وہ تباہ ہو کر رہے گا اور انہوں نے جو عمل اختیار کر رکھا ہے وہ یکسر باطل ہے" اللہ تعالیٰ تمہیں اقوامِ عالم پر فضیلت عطا فرمانا چاہتا ہے اور تم ہو کہ، انسان تو ایک طرف پتھر کی مورتیوں کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی آرزو دل میں لئے بیٹھے ہو۔ ذرا سوچو تو سہی: اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۷/۱۴۰)" کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے لئے خدا کے سوا، کوئی اور الٰہ تجویز کر دوں حالانکہ اس نے تمہیں اقوامِ عالم پر فضیلت عطا فرمائی ہے" تف ہے تم پر اور تمہاری ذہنیت پر ـــــ لیکن غلامی سے مسخ شدہ ذہنیت سے اس کے سوا اور توقع بھی کیا کی جاسکتی تھی؟

بہ خود کے می رسد ایں راہ پیمائے تن آسانے ہزاراں سال منزل در مقامِ آذری کردہ

بہرحال، حضرت موسیٰ علیہ السلام، انہیں لے کر آگے بڑھ گئے۔ طور کے دامن میں ڈیرے ڈال دیئے اور وہاں ان کی تعلیم و تربیت شروع کر دی۔ ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کچھ وقت کے لئے ان سے الگ ہونا پڑا۔ آیت (۲/۵۱) میں اسے چالیس راتوں کی مدت کہا گیا ہے اور آیت (۷/۱۴۲) میں، اس مدت کو "تیس جمع دس راتیں" کہہ کر پکارا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جاتے ہوئے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام سے کہا کہ میرے بعد، تم میری جانشینی کرنا اور معاملات کو بالکل ٹھیک ٹھاک رکھنا۔ ان میں کچھ مفسدین بھی ہیں اُن کا خاص خیال رکھنا (۷/۱۴۲) لیکن ان کی غیر حاضری میں، بنی اسرائیل نے ایک بت کی پرستش شروع کر دی جس کی شباہت گائے کے بچھڑے (عجل ـــــ گوسالہ) کی سی تھی۔ قرآن کریم نے اس واقعہ کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ لیکن اس کا ذکر کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان چند الفاظ کا تفصیلی مفہوم بیان کر دیا جائے جنہیں اس واقعہ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ سب سے پہلے اس لفظ "عِجْلٌ" (بچھڑے) کو لیجئے۔

سورۃ التوبہ میں ہے وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ (۹/۳۰)۔ "یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے"۔

عزیر کون تھا

ہمارے ہاں عام طور پر عزیر سے مراد، عزرا فقیہہ لئے جاتے ہیں جن کا ذکر تورات کی تدوین کے سلسلے میں تیسرے باب میں آچکا ہے۔ لیکن یہود کا کہنا ہے کہ ہم نہ تو عزرا فقیہہ کو عزیر کہتے ہیں اور نہ ہی ہم انہیں (یا کسی عزیر) کو ابن اللہ مانتے ہیں۔ ہماری بعض روایات میں ہے کہ

نزولِ قرآن کے زمانے میں، مدینہ میں کچھ یہودی تھے جو یہ عقیدہ رکھتے تھے۔ امام ابن حزم نے لکھا ہے کہ یہودیوں کا صُدوقی فرقہ جو یمن میں رہتا تھا اس کا یہ عقیدہ تھا۔؎ لیکن یہودیوں کا یہ کہنا ہے کہ یہ روایات ان کے لئے سند قرار ہی نہیں پا سکتیں۔

لیکن حال ہی میں بعض محققین کا خیال اس طرف گیا ہے کہ قرآن کریم نے جس عزیر کے متعلق کہا ہے کہ یہودی اسے ابن اللہ مانتے تھے اس سے مراد عذرا فقیہہ نہیں بلکہ مصر کا "عزیر دیوتا" ہے جس کی وہاں پرستش ہوتی تھی اور انہی کی دیکھا دیکھی یہودیوں نے بھی اس کی پرستش شروع کر دی تھی۔ ہیروڈوٹس نے، آج سے قریب اڑھائی ہزار سال قبل، اس دیوتا کا نام (OSIRIS) یعنی عزیرس لکھا ہے۔ یونان میں اسماء کے بعد "س" زائد ہوتی ہے۔ اس صورت میں، اس دیوتا کا اصل نام عزیر ہے جو قرآنی عزیر کے بالکل مشابہ ہے۔ مصر کے آثار قدیمہ میں اس کا نام "ایزاری" آیا ہے۔ اس کے نام پر جو سانڈ بیل پوجا جاتا تھا اس کا نام "ایزار ہاپی" — یعنی عجل عزیر تھا۔ اس بچھڑے کو عزیر کی روح کا مظہر اور "فتاح" یعنی خالق خدا کا اوتار اور بیٹا (ابن اللہ) مانا جاتا تھا۔ مصر سے یہ اعتقادات نکل کر شام اور فلسطین کے علاقوں میں پھیل چکے تھے اور یہی وہ عجل (بچھڑا) تھا جس کی پرستش یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری میں شروع کر دی تھی (اس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہود کو اس گوسالہ پرستی سے روک دیا لیکن آپ کے بعد اس کی پرستش دوبارہ شروع ہو گئی۔ چنانچہ یہودیوں کی سلطنت کی تقسیم کے بعد، شمالی سلطنت کے بادشاہ یربعام اول (۹۳۳ ق.م) نے عجل پرستی کو شاہی مذہب قرار دے دیا اور سونے کے دو بچھڑے بنا کر ان کی پرستش عام کر دی۔ یہی وہ عزیر دیوتا ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے۔ موجودہ زمانے میں بائبل کے عبرانی نسخوں کے تراجم کی جو تصحیح ہوئی ہے اس کے پیشِ نظر اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ بائبل میں بھی بنی اسرائیل کی عزیر پرستی کا ذکر موجود ہے لیکن (غلطی سے) لفظِ عزیر کو "اسیر" سمجھ کر اس کا ترجمہ "قیدی" کر دیا گیا۔ اب لیگارڈ نے اپنے یونانی ترجمہ میں اس کی تصحیح کی ہے۔

مصر کے آثارِ قدیمہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ دنیا میں غالباً سب سے پہلے، عزیر ہی کو ابن اللہ مانا گیا ہے۔ چنانچہ کم و بیش چار ہزار سال قبل مسیح، عزیر کے متعلق یہ اعتقاد ملتا ہے کہ یہ دیوتا خداوند اعلیٰ "آمن رع" کی نسل سے، اور خداوندِ ارض کا بیٹا تھا۔ مصر سے اب ایک صحیفہ بھی برآمد ہوا ہے جس میں عزیر کے حالات درج ہیں۔

؎ بحوالہ ارض القرآن از سید سلیمان ندوی۔

اِن تصریحات سے ذہن کا رخ اسی طرف جاتا ہے کہ عزیر سے مراد مصر کا دیوتا ہے نہ کہ عذرا نبی۔ بہر حال، یہ تاریخی قیاسات ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ بعد میں مزید انکشافات، حقیقت کو حتم ویقین کے ساتھ بے نقاب کردیں۔ [1]

قرآن کریم میں ہے کہ سامری نے اِس بت کو ڈھالا تھا اور اسی کی ترغیب وتلقین پر بنی اسرائیل نے اس کی پرستش شروع کردی تھی۔

سامری

اَلسَّامِرَةُ — اَلسَّمَرَةُ۔ یہودیوں کی ایک قوم، جو اسرائیلی قبائل میں سے ہے۔ یہ لوگ بعض مسائل میں یہودیوں سے اختلاف رکھتے ہیں۔ مثلاً ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ نیز یہ چھوت چھات کے بھی قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ نابلس کا شہر ہی (جس میں یہ رہتے ہیں) بیت المقدس ہے۔ ان کے دو فرقے ہیں۔ کوشان اور دوشان۔ انہی لوگوں کی طرف وہ سامری منسوب ہے جس نے بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی کی تعلیم دی تھی۔ صاحب محیط نے کہا ہے۔ کہ اَلسَّامِرَةُ فلسطین میں ایک مقام بھی ہے اور ایک قبیلہ بھی، جو نابلس میں رہتا ہے۔ ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ اِن کا عقیدہ ہے کہ دوسرے لوگوں سے چھو جانے سے یہ ناپاک ہو جاتے ہیں۔ آیت (۲۰/۹۵) میں اس سامری کے متعلق جس نے بنی اسرائیل کو بہکایا تھا، ایسا ہی کچھ آیا ہے۔

لیکن عصر حاضر کی اثری تحقیقات کی روشنی میں قیاس کا رُخ اس طرف جاتا ہے کہ یہ شخص سمیری قوم کا فرد تھا (بنی اسرائیل میں سے نہیں تھا) حضرت مسیح علیہ السلام سے قریب ساڑھے تین ہزار سال قبل عراق میں دو قومیں آباد تھیں۔ ایک قوم، جو جنوب سے آئی تھی عرب تھی اور دوسری جو غالباً شمال سے آئی تھی سمیری کہلاتی تھی۔ اس کا وطن اگرچہ عراق تھا لیکن یہ دور دور تک پھیل گئی تھی۔ مصر کے ساتھ ان کے تعلقات تاریخ کی روشنی میں واضح ہوچکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص (جسے قرآن کریم نے سامری کہکر پکارا ہے ۲۰/۸۵) مصر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معتقد ہوگیا تھا اور بنی اسرائیل کے ساتھ ہی وہاں سے نکل آیا تھا۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم اس کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اتری تھی۔ (۲۰/۹۶)۔

لیکن بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ مادہ (س۔ م۔ ر) سے ہے یا یوں کہیئے کہ عربوں نے سامری سے اس مادہ کے مختلف معانی وضع کئے۔ اَلسَّمَرُ کے معنی ہیں رات میں قصّے کہانیاں کہنا۔ اَلسَّامِرُ، شب میں قصّہ گوئی کی محفل، نیز قصہ گو۔ اَلسَّمِيْرُ، قصہ گو، داستان زن — کہانیاں کہنے والے۔ جس طرح قوموں کو گمراہ اور

---

[1] بحوالہ لغات القرآن۔ لفظِ عزیر۔

برباد کرتے ہیں اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ خود ہماری تاریخ اس کی زندہ شہادت ہے۔ جب ہم قرآن کریم کے حقائق کو چھوڑ کر قصّوں اور کہانیوں میں الجھ گئے تو دین سے دور ہٹتے گئے۔ رفتہ رفتہ اب ہماری حالت یہ ہو گئی ہے کہ ہمارے ہاں دین، نام ہی چند قصّوں اور کہانیوں کا رہ گیا ہے اور قرآنی حقائق ہمارے لئے بالکل اجنبی اور نامانوس نظریات قرار پا چکے ہیں۔ ہمارا واعظ داستان گو ہوتا ہے۔ دین کے اس طرح داستانوں میں تبدیل ہو جانے کے سلسلے میں اقبالؒ نے کہا ہے کہ:

داستان گو۔ واعظ

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے جسے بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستان کیلئے

بہرحال، السّامری، سمیری قوم کا فرد ہو یا خود بنی اسرائیل میں کا کوئی داستان گو، بات وہیں آجاتی ہے ——اس نے دینِ خداوندی کو افسانہ بنا دیا۔

سامری کے قصّے میں ایک لفظ اثر بھی آتا ہے۔ اس لفظ کے بنیادی معنے نقش یا نشان کے ہیں اور اسی نہج سے یہ لفظ نقشِ قدم یا کسی کی تعلیم یا مسلک کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت (۲۰/۸۴) میں اس کے یہ معنی واضح ہیں۔ "زیبِ داستان" کے لئے اسے کیا معنیٰ پہنائے گئے، اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

اب آیئے قرآن کریم میں بیان کردہ قصّہ "گوسالہ پرستی اور سامری کی طرف۔ اسے سورۃ طٰہٰ اور سورۃ الاعراف میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ طٰہٰ میں کہا گیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم سے الگ ہو کر گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ: وَمَآ اَعۡجَلَكَ عَنۡ قَوۡمِكَ يٰمُوۡسٰى (۲۰/۸۳) "اے موسیٰ! تمہیں کون سی ایسی جلدی پڑی تھی کہ قوم کو اس حالت میں چھوڑ کر چلا آیا؟"

گوسالہ پرستی کا واقعہ

حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا کہ اس میں حرج کی کوئی بات نہیں۔ هُمۡ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِىۡ (۲۰/۸۴) "وہ میرے پیچھے، میرے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ میری تعلیم پر عمل پیرا ہیں میرے مسلک کا اتباع کر رہے ہیں" اس لئے میری وقتی عدم موجودگی سے کیا نقصان واقع ہو سکتا ہے؟" اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قَالَ فَاِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَكَ مِنۡۢ بَعۡدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِىُّ (۲۰/۸۵)۔ "تو نے تو اپنی قوم کے متعلق یہ اندازہ کیا لیکن ہوا یہ ہے کہ تیری عدم موجودگی میں وہ ایک عجیب فتنے کا شکار ہو گئی ہے۔ سامری نے اُسے گمراہ کر دیا ہے" یہ سن کر فَرَجَعَ مُوۡسٰٓى اِلٰى قَوۡمِهٖ غَضۡبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوۡمِ اَلَمۡ يَعِدۡكُمۡ رَبُّكُمۡ وَعۡدًا حَسَنًا ۚ اَفَطَالَ عَلَيۡكُمُ الۡعَهۡدُ اَمۡ اَرَدۡتُّمۡ اَنۡ يَّحِلَّ عَلَيۡكُمۡ غَضَبٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ فَاَخۡلَفۡتُمۡ مَّوۡعِدِىۡ (۲۰/۸۶) " موسیٰؑ غصّہ اور تاسف سے ملے جلے جذبات کے ساتھ قوم کی طرف لوٹا اور اُن سے کہا کہ یہ تم نے کیا

گُل کھلایا؟ کیا تمہارے رب نے تم سے زندگی کی خوشگواریوں کے وعدے نہیں کئے تھے؟ یا کیا ان وعدوں کے پورا ہونے میں کوئی لمبا عرصہ لگ گیا تھا جو تم خدا سے نا امید ہوگئے اور اس کی جگہ اور معبود تراش لیا۔ یا کیا تم ادھار کھائے بیٹھے ہو کہ تم پر خدا کا غضب نازل ہو کر رہے، اس لئے تم نے یوں عہد شکنی کی ہے"۔ انہوں نے جواب دیا: قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا (۲۰/۸۷)۔ "ہم نے جان بوجھ کر، بطیبِ خاطر، اپنی مرضی سے عہد شکنی نہیں کی بلکہ معاملہ دوسرا پیش آگیا۔ مصری قوم کی دیکھا دیکھی ہم نے زینت و زیبائش کے لئے جو زیورات پہن رکھے تھے وہ اس صحرائی زندگی میں، ہم پر مفت کا بوجھ بن رہے تھے۔ چنانچہ ہم نے اس بارِ گوش اور وبالِ دوش کو اتار پھینکا۔ یہ خیال سامری نے ہمارے دل میں ڈالا تھا"۔ فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِيَ (۲۰/۸۷-۸۸)۔ "سامری نے ان زیورات کو لیا اور انہیں گلا کر ایک بچھڑا سا بنا دیا۔ وہ تھا تو محض ایک بے جان دھڑ، لیکن سامری نے اسے ایسا بنایا (یعنی اس میں کوئی کل رکھدی جس سے) اس میں سے بچھڑے کی سی آواز نکلتی تھی۔ یہ دیکھ کر لوگ پکار اُٹھے کہ یہ ہمارا بھی معبود ہے اور موسیٰ کا بھی۔ لیکن یہ کچھ کرتے وقت سامری اس بات کو بھول گیا کہ موسیٰ آکر کیا کہے گا"۔ وہ سامری بھولا تھا یا نہیں، لیکن اگر یہ قوم ذرا بھی عقل و شعور سے کام لیتی تو ان پر اس بچھڑے کی حقیقت بے نقاب ہو جاتی۔ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا (۲۰/۸۹)۔ "کیا انہیں نظر نہیں آتا تھا کہ بچھڑے میں سے ایک آواز تو نکلتی ہے لیکن وہ ان کی کسی بات کا جواب نہیں دے سکتا اور نہ ہی ان کے لئے کسی نفع یا نقصان کی قدرت رکھتا ہے"۔ علاوہ ازیں۔ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ (۲۰/۹۰)۔ "ہارون نے انہیں پہلے ہی سے کہہ دیا تھا کہ لوگو! یہ شخص تمہیں سخت گمراہی میں مبتلا کر رہا ہے۔ تمہارا رب یہ بچھڑا نہیں، خدائے رحمٰن ہے لہٰذا تم اس گمراہ کرنے والے کی بات مت سنو۔ میری پیروی کرو اور جو کچھ میں تم سے کہوں اس کی اطاعت کرو"۔ لیکن۔ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى (۲۰/۹۱)۔ "انہوں نے صاف جواب دیدیا کہ ہم اس کی پرستش سے باز نہیں آئیں گے۔ جب موسیٰ آئے گا تو اس وقت دیکھا جائے گا کہ وہ کیا کہتا ہے"۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے روئے سخن اپنے بھائی کی طرف پھیرا اور ان سے کہا۔ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا - اَلَّا تَتَّبِعَنِ - اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ (۲۰/۹۲-۹۳)۔ "اے میرے بھائی! جب تو نے دیکھا تھا کہ قوم یوں گمراہ ہو رہی ہے تو تو نے انہیں سختی سے روکا کیوں نہیں؟ تو نے وہی کچھ کیوں نہ کیا، جو ایسے وقت میں کیا کرتا ہوں۔ وہ کونسی بات تھی جو تجھے ایسا

کرنے میں مانع ہوئی۔ یا تو نے بھی دیدہ دانستہ مجھ سے سرکشی برتی"۔ اس کے جواب میں حضرت ہارون علیہ السلام نے جو کچھ فرمایا وہ ہمارے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ آپ نے کہا: قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ (۲۰/۹۴)۔ "اے میرے ماں جائے! تو مجھ پر اس طرح خفا نہ ہو اور مجھے ہدفِ ملامت نہ بنا (۷/۱۵۰)۔ میں نے انہیں سختی سے اس لئے نہیں روکا

شرک اور تفرقہ

کہ مجھے ڈر تھا کہ تو آکر یہ نہ کہے کہ تو نے قوم میں تفرقہ ڈال دیا اور میری بات کا کچھ پاس نہ کیا۔ میں نے قوم کی اس عارضی جہالت کو گوارا کر لیا لیکن اسے تفرقہ سے بچالیا"۔ اس جواب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام مطمئن ہو گئے۔ واضح رہے کہ یہ جواب دینے والا بھی خدا کا ایک رسول تھا اور اس سے مطمئن ہو جانے والا بھی رسول۔

ذرا اس جواب پر غور فرمائیے۔ قوم میں تشتت و افتراق اتنا بڑا جُرم ہے کہ اسے اس سے بچانے کے لئے عارضی شرک تک کو گوارا کر لیا گیا۔ واضح رہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے بت پرستی بھی شرک ہے اور تفرقہ بھی شرک۔ (۳۰/۳۱-۳۲)۔ بنی اسرائیل کی بت پرستی جہالت کا نتیجہ تھی جس کا ازالہ بآسانی ہو سکتا تھا۔ لیکن قوم میں تفرقہ مستقل فساد کا موجب بن جاتا ہے اور اس کی وجہ سے جو نقصان ہوتا ہے اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے حضرت ہارون علیہ السلام نے اس بڑے نقصان کے مقابلے میں، کم نقصان والے شرک کو گوارا کر لیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس سے مطمئن ہو گئے۔ لیکن ہمارے ہاں، حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں مسلمانوں میں مستقل فرقے موجود ہیں۔ اور مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ان فرقوں کے گروہوں کو مضبوط سے مضبوط تر کیا جاتا ہے اور کبھی نہیں سوچا جاتا کہ قرآنِ کریم بہ نصِ صریح، فرقہ بندی کو شرک قرار دیتا ہے۔ زمانے کے تقاضوں سے یہ امید بندھ چلی تھی کہ شاید یہ امت فرقہ بندی کے اس شرک سے تائب ہو کر پھر سے اُمتِ واحدہ بن جائے۔ لیکن ابلیس نے ان کے کان میں یہ سحر پھونک دیا کہ تمہارے فرقے، وہ فرقے نہیں، جنہیں قرآن شرک قرار دیتا ہے۔ یہ "مکاتبِ فکر" ہیں۔ اس نے الفاظ کے ذرا سے پھیر سے اس شرک کی گرہیں اور مضبوط کر دیں

فرقے نہیں مکاتبِ فکر

لیکن الفاظ کے بدل جانے سے حقیقت تو نہیں بدل جاتی۔ سنکھیا تو سنکھیا ہی رہتا ہے خواہ اس کا نام سم الفار کیوں نہ رکھ دیا جائے۔ ان سے پوچھئے کہ اگر یہ فرقے نہیں مکاتبِ فکر ہیں تو رسول اللہؐ نے جو فرمایا تھا کہ میری امت میں تہتر فرقے پیدا ہوں گے (اور اس حدیث کو آپ صحیح مانتے ہیں) تو وہ فرقے کہاں ہیں؟۔

بہرحال، اب پھر قصۂ سامری کی طرف لوٹئے۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا۔ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ (۲۰/۹۵)

"تم پر کیا بنی تھی جو تم نے یہ کچھ کر دیا۔" اس نے جواب دیا: بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ. فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ. فَنَبَذْتُهَا. وَكَذَٰلِكَ سَوَّلَتْ لِي نَفْسِي (۲۰/۹۶)۔" میں، جب اِدھر تمہاری قوم کی طرف آیا ہوں تو میں نے وہ کچھ بھانپ لیا تھا جو ان کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے آپ کے مسلک و مشرب کو پوری طرح اختیار نہیں کیا تھا۔ اس میں سے بس تھوڑا سا حصہ لیا تھا اور محض اپنے مقاصد کی خاطر تمہارے پیرووں میں شامل ہو گیا تھا۔ تمہاری عدم موجودگی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میرے دل نے یہ نقشہ میرے سامنے پیش کر دیا جو مجھے بڑا جاذب نظر آیا۔ چنانچہ میں نے تمہاری تعلیم کا وہ تھوڑا سا حصہ بھی، جسے میں نے اختیار کیا تھا۔ بیکار سمجھ کر اُٹھا کر پھینک دیا اور تمہاری قوم کو پھر بت پرستی کی طرف لے آیا۔ بت پرستی کا جذبہ ان کے دل کی گہرائیوں میں مچل رہا تھا۔ میں نے اسے بھانپ لیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ جب میں نے انہیں ذرا سی ترغیب دلائی تو وہ اپنے اس جذبہ کی تسکین کے لئے اس کی طرف لپک کر آ گئے۔" آپ نے غور فرمایا کہ عقائد، خواہ وہ کتنے ہی باطل اور مبنی بر جہالت کیوں نہ ہوں، کس طرح انسان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست اور اس کے خون کے ذرّوں میں حلول کئے ہوتے ہیں اور انہیں بدلنے کے لئے کس قدر صبر آزما ہمت اور استقامت کی ضرورت ہوتی ہے۔

سامری نے جو جواب دیا اُسے آپ نے قرآن کریم کے الفاظ میں سن لیا۔ بات کسقدر صاف اور واضح تھی۔ لیکن آپ دیکھئے کہ سامریت (زیب داستان) کے لئے ہمارے ہاں کے واعظوں نے اس میں کس کس قسم کے افسانوی اضافے کئے ہیں۔

افسانہ نگاری

تفسیر ابنِ کثیر (جس کا ذکر پہلے بھی کئی مرتبہ آ چکا ہے) میں کہا گیا ہے کہ جب فرعون اپنے لشکروں سمیت، سمندر کے کنارے آیا تو اس کا گھوڑا پانی میں اُترنا نہیں چاہتا تھا۔

> اُسی وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام گھوڑے پر سوار آ گئے۔ ان کے جانور کے پیچھے فرعون کا گھوڑا لگ گیا۔ آپ نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ فرعون کا گھوڑا اُسے کھلتا ہوا دریا میں اُتر گیا۔ حضرت میکائیل علیہ السلام اس گروہ کے پیچھے تھے تاکہ ان کے جانوروں کو ہنکائیں۔ [۵۱]

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے پوچھا کہ یہ تو نے کیا کیا اور اس بے جان جسد سے یہ آواز کیسے آنے لگ گئی تو اس نے کہا کہ:

> جب فرعون کی ہلاکت کے لئے حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے تو میں نے ان کے گھوڑے کے ٹاپ تلے کی تھوڑی سی مٹی اٹھالی تھی (بس یہ اس کا کرشمہ تھا)۔ [۵۲]

---

۵۱ تفسیر ابن کثیر اردو ترجمہ گیارہواں پارہ صـ ۵۲
۵۲ ایضاً 〃 〃 سولہواں پارہ صـ ۲۷

ہے نا یکسر قصّہ گوئی!

یہ ہے گوسالہ پرستی کا واقعہ۔ سورۃ طٰہٰ کے علاوہ، یہ سورۃ الاعراف آیات (۷/۱۴۸-۱۵۱) میں بھی آیا ہے۔ ضمناً یہ دیکھئے کہ، اسی واقعہ کو، جسے قرآنِ کریم نے اس طرح بیان کیا ہے، بائبل کس طرح بیان کرتی ہے۔ اس میں لکھا ہے:

تورات کا بیان

اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ پہاڑ سے اُترنے میں دیری کرتا ہے تو وہ ہارون کے پاس جمع ہوئے اور اُسے کہا کہ اُٹھ! ہمارے لئے معبود بنا کہ ہمارے آگے چلے۔ کیونکہ یہ مرد موسیٰ جو ہمیں مصر کے ملک سے نکال لایا، ہم اسے نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا۔ ہارون نے انہیں کہا کہ زیور سونے کے جو تمہاری جوروؤں اور تمہارے بیٹوں اور تمہاری بیٹیوں کے کانوں میں ہیں توڑ توڑ کے مجھ پاس لاؤ۔ چنانچہ سب لوگ سونے زیور جو اُن کے کانوں میں تھے، توڑ توڑ کے ہارون کے پاس لائے اور اس نے ان کے ہاتھوں سے لیا اور ایک بچھڑا ڈھال کر اس کی صورت حکّاک کے ہتھیار سے درست کی اور ان سے کہا کہ اے اسرائیل! یہ تمہارا معبود ہے جو تمہیں مصر کے ملک سے نکال لایا۔ اور جب ہارون نے دیکھا تو اس کے آگے ایک قربان گاہ بنائی۔ اور ہارون نے یہ کہہ کر منادی کی کہ کل خداوند کے لئے عید ہے۔ اور وہ صبح کو اٹھے اور سوختنی قربانیاں چڑھائیں اور سلامتی کی قربانیاں گزرانیں۔ اور لوگ کھانے پینے کو بیٹھے اور کھیلنے کو اُٹھے۔

(خروج ۳۲/۱-۶)

آپ نے دیکھا کہ غیر محرف کتابِ خداوندی (قرآنِ کریم) اور محرف کتابوں میں کیا فرق ہوتا ہے؟ یہاں کہا یہ گیا ہے کہ بُت حضرتِ ہارون علیہ السلام نے بنایا تھا اور انہوں نے بنی اسرائیل سے اس کی پرستش کرائی تھی۔ خدا کا ایک اولوالعزم پیغمبر اور بت سازی اور بت پرستی! یہ محرف کتابوں ہی کا کارنامہ ہوسکتا ہے۔

قرآنِ کریم نے بنی اسرائیل کے اس شرک کے سلسلے میں کہا ہے کہ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ (۲/۵۱) ذرا آگے چل کر کہا: اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ (۲/۵۴) یعنی "اس سے تم نے اپنے آپ پر ظلم کر لیا"۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ظلم کے معنی ہیں، جس مقام پر کسی چیز کو ہونا چاہیئے اس کا اس مقام پر نہ ہونا یا نہ رہنا۔ اسی اعتبار سے قرآنِ کریم نے شرک کو ظلمِ عظیم کہا ہے (۳۱/۱۳)۔

شرک کیوں ظلمِ عظیم ہے

شرک کے سلسلے میں اس جلد کے دوسرے باب (زیرِ آیت ۲/۳-۴) میں بتایا جا چکا ہے کہ شرک اس لئے ظلمِ عظیم ہے کہ اس سے انسان اپنے مقام سے نیچے گرجاتا

ہے۔شرک میں انسان یا تو خارجی قوتوں کو اپنا معبود تسلیم کر لیتا ہے یا اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کو۔ کائنات کی قوتیں یا چیزیں (ملائکہ) خود انسان کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے لئے بنائی گئی ہیں اور تسخیر فطرت انسانی ممکنات سے ہی نہیں بلکہ اس کا فریضہ بھی ہے۔ اس لئے جن اشیاء کو انسان مسخر کر سکتا ہے انہیں اپنا مسجود بنا لینا، مقام آدمیت سے نیچے گر جانا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم نے کہا ہے کہ تمام بنی آدم انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہیں (۷۰/۱۷)۔ اس لئے کسی انسان کو الوہیت کا درجہ دیدینا بھی شرف انسانیت کھو دینے کی دلیل ہے۔ انسان اپنے صحیح مقام پر اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ وہ صرف خالق کائنات کے قوانین کے سامنے جھکے۔ اسی کو توحید کہا جاتا ہے۔ کائناتی قوتوں، یا دوسرے انسانوں کو الٰہ تصور کر لینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ہر وقت ان سے ڈرتا اور کانپتا رہتا ہے۔ اس سے اسے زندگی میں استحکام نصیب ہی نہیں ہوتا۔ چنانچہ سورۃ الحج میں کہا گیا ہے کہ: وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (۲۲/۳۱)۔" یاد رکھو! جو شخص خدا کے سوا کسی اور کی اطاعت کرتا اور اس کے سامنے جھکتا ہے اس کی مثال یوں سمجھو گویا وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آگرا اور ایسا بے کس و بے بس بن کر رہ گیا جیسے چڑیا کا بچہ اپنے گھونسلے سے نیچے زمین پر گر جائے تو اسے چیل کوے جھپٹ کر لے جائیں۔ اور ایسا کمزور و ناتواں ہو گیا کہ ہوا کا ہر تیز جھونکا اسے پرِ کاہ کی طرح اڑائے اڑائے پھرے اور کسی دور دراز گوشے میں پھینک دے"۔ یہ ہوتا ہے شرک کا نتیجہ۔ اسی لئے بنی اسرائیل کے متعلق کہا کہ وہ جب اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بت کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے تو ذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۷/۱۵۲)۔" انہوں نے اپنے آپ کو اسی دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار کر لیا"۔

سوال یہ ہے کہ کیا وہ اس لغزش کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہو گئے؟ نہیں ایسا نہیں ہوا۔ انہیں اس نقصان کی تلافی کا موقعہ دیا گیا۔ جیسا کہ اگلی آیت میں ہے:

۲/۵۲ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔

عفو کے معنے مٹا دینا یا محو کر دینا ہوتے ہیں۔ یہ لفظ کسی نقصان کی تلافی کے لئے بھی آتا ہے۔ یعنی ایسا موقعہ بہم پہنچا دینا یا سامان فراہم کر دینا جس سے وہ شخص اپنے نقصان کی تلافی کر سکے۔ قانونی طور پر یہ لفظ سرزنش اور وارننگ کے بعد، سزا دیئے بغیر چھوڑ دینے کے لئے بھی آجاتا ہے اور معمولی سی سزا دینے کے بعد چھوڑ دینے کیلئے بھی

اسی نہج سے ہمارے ہاں اس کے معنے درگزر کر دینا بھی کئے جاتے ہیں۔ حقیقی مفہوم اس کا تلافیٔ مافات کے لئے موقعہ فراہم کر دینا ہو گا اور اسی مفہوم کے لئے یہ لفظ آیۂ زیرِ نظر میں آیا ہے (اس کے دیگر مفاہیم کا ذکر اپنے اپنے مقام پر آئے گا جہاں یہ بھی بتایا جائے گا کہ اس کے معنے آگے بڑھ جانے یا زائد از ضرورت کے بھی ہوتے ہیں۔)

یہاں کہا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کو اس معصیت کے بعد ایک موقعہ دیدیا گیا اور یہ اس لئے کہ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۲/۵۲) اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "تاکہ تم شکر کر سکو" لیکن اس سے بات سمجھ میں نہیں آتی۔ للہٰذا یہاں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ شکر کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

اس مادہ (ش۔ک۔ر) کے اصلی معنی بھر جانا، ظاہر کرنا یا نمودار ہو جانا ہیں۔ چنانچہ اَلشَّكِرَةُ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے تھن دودھ سے بھرے ہوں۔ شَكِرَتِ الشَّجَرَةُ کے معنی ہوتے ہیں درخت کے تنے پر ٹہنیاں نکل آئیں اور اس طرح وہ زندگی جو اس کے اندر پوشیدہ تھی، اس کی نمود ہو گئی۔

شکر کا مفہوم

شُكْرًا کے اِن معانی کو پیشِ نظر رکھنے سے "سعیٔ مشکور" کا مطلب سمجھ میں آ جائے گا۔ یعنی ایسی کوشش اور محنت، جس کے بھرپور نتائج سامنے آ جائیں۔ چونکہ انسان کی کوششیں اسی صورت میں بھرپور نتائج پیدا کر سکتی ہیں جب وہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق کی جائیں اس لئے خدا کو شاکر کہا گیا ہے۔ (۲/۱۵۸)۔ یعنی انسانی کوششوں میں بھرپور نتائج پیدا کرنے والا۔ نیز شَاكِرٌ کا لفظ اس شخص کے لئے بھی بولا جائے گا جس کی کوششیں اس طرح... بھرپور نتائج کی حامل ہو جائیں۔

شُكْرًا کے دوسرے معنی ظاہر کرنے یا ظاہر ہونے کے بھی ہیں۔ جیسا کہ متعدد مقامات پر بتایا جا چکا ہے، انسان کے اندر امکانی صلاحیتیں رکھی گئی ہیں۔ ان صلاحیتوں کا پورا پورا نشوونما پانا اور اس طرح ابھر کر سامنے آ جانا، ان کا شکر ہے۔ بنابریں، اعمالِ صالحہ خدا کی نعمتوں کے شکر کا موجب بنتے ہیں۔ خدا کی نعمتوں کو انسانی بہبود کے لئے بے نقاب رکھنا، یعنی انہیں چھپا کر نہ رکھنا، ان نعمتوں کا شکر ہے۔ اس کے مقابل میں کفر کا لفظ آیا ہے۔ (۱۴/۷)۔ جس کے معنی ڈھانپ کر رکھنا اور دبا دینا ہیں۔ اسی جہت سے کہا گیا: وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ (۲/۱۵۲)۔ "تم خدا کی عطا کردہ نعمتوں کو ہمیشہ بے نقاب رکھو تاکہ دوسرے انسان بھی ان سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ انہیں چھپا کر اور دبا کر نہ رکھو"۔

انسانی صلاحیتوں کے نشوونما پا جانے، اور ان کے صحیح استعمال سے نعمائے خداوندی حاصل ہو جانے سے انسان کے دل میں جذبۂ نشاط کی ایک عجیب کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ یہ سرور آفریں کیفیت، قوانینِ خداوندی

کے مطابق عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے اس لئے جو شخص ان حقائق کو پیش نظر رکھتا ہے اس کے دل میں اس سے اطاعتِ خداوندی کا جذبہ اور بھی شدت سے ابھرتا ہے۔ اسے اللہ کا شکر کرنا یا تشکر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ اگرچہ تم نے گوسالہ پرستی کے شرک سے اپنے آپ کو مقامِ آدمیت سے گرا لیا تھا اور اس طرح دنیا میں ذلت و خواری کے مستوجب بن گئے تھے لیکن چونکہ ابھی تمہاری تعلیم و تربیت خام تھی اس لئے تمہیں اس جرم کی پاداش میں ہلاک نہیں کر دیا گیا۔ تم سے رعایت برتی گئی اور تمہیں ایک اور موقعہ دیا گیا تاکہ تم اپنے مال و دولت، وقت اور توانائی، قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرو۔ اس تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کر دیں گی۔ گوسالہ پرستی میں تم نے اپنی دولت صرف کی، محنت اور مشقت کی، وقت بھی ضائع کیا لیکن اس کا نتیجہ نہ صرف حبطِ اعمال ہوا، بلکہ تمہیں سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ اگر یہی دولت، وقت اور توانائی قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرتے تو تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کرتیں۔ تمہیں ایک موقعہ دیا جاتا ہے تاکہ تم اس کے مطابق عمل کرو۔

اس مقصد کے لئے تمہیں ضابطۂ قوانینِ خداوندی دیا جاتا ہے۔ اس کا ذکر اگلی آیت میں یوں کیا گیا ہے:۔

۲/۵۳ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔

"تمہیں وہ ضابطۂ قوانین، وحی کی رُو سے، موسیٰ علیہ السلام کی معرفت دیا گیا تاکہ تم صحیح راستہ پر چلو۔"

یہاں کتاب کا ذکر آیا ہے۔ ہم، تورات کی تاریخ کے ضمن میں، پہلے بتا چکے ہیں کہ تورات، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کا نام نہیں بلکہ وہ اس مجموعۂ کتب کا نام ہے جو مختلف انبیائے بنی اسرائیل کو دی گئی تھیں۔ اور جسے بائبل کا عہد نامہ عتیق کہا جاتا ہے۔ اس مجموعہ میں کتابِ موسیٰ بھی شامل ہے۔ اس کتاب کی بنیادی صفت یا خصوصیت "فرقان" بتائی گئی ہے۔ اور یہ خصوصیت اسی کتاب کی نہیں، ہر وحیٔ خداوندی کی ہے۔ یہ لفظ بڑا جامع بھی ہے اور واضح بھی۔ اَلْفَرْقُ

فُرقان کے بنیادی معنی ہیں سر کی مانگ، جس سے دونوں طرف کے بال ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔ لہٰذا اَلْفُرْقَان وہ ضابطۂ ہدایت ہے جس سے حق اور باطل، جائز اور ناجائز، غلط اور صحیح اس طرح نکھر کر الگ الگ ہو جائیں کہ ان میں التباس یا ابہام کی بال بھر بھی گنجائش نہ رہے۔ نیز اَلْفَرَقُ ایک پیمانے کو بھی کہتے تھے جو مدینہ منورہ میں مستعمل تھا۔ پیمانے سے ہر شے کا تعین ہو جاتا ہے قرآن کریم کو بھی اسی جہت سے فرقان کہا گیا ہے۔ (۲/۳)

کتاب موسیٰؑ کے ضمن میں، ایک اور اہم نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ مرزا غلام احمد (قادیانی) نے دعویٰ نبوت کیا۔ اُن سے پوچھا گیا کہ آپ نبی ہیں تو خدا نے آپ کو کتاب کونسی دی ہے؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ میں نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے، رسول ہونے کا نہیں۔ نبی اور رسول میں فرق یہ ہے کہ رسول صاحبِ کتاب ہوتا ہے اور نبی بلا کتاب۔ ان کا یہ جواب نہ صرف یہ کہ نبوت کی حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے بلکہ خود قرآن کریم کی تعلیم سے لاعلمی کا ثبوت بھی۔

ہر نبی اور رسول کو کتاب

قرآن کریم میں ایک جگہ کہا گیا ہے: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (۵۷/۲۵)۔ "ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان سب کے ساتھ کتاب نازل کی۔" اور دوسری جگہ کہا کہ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۔ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (۲/۲۱۳)۔ "اللہ نے انبیاء کو مبشّر اور مُنذر بنا کر بھیجا اور ان سب کے ساتھ کتاب نازل کی۔" ان ہر دو آیات (نیز اسی قسم کے متعدد دیگر مقامات) سے واضح ہے کہ کتاب دیئے جانے کے اعتبار سے نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی اور رسول ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں نبوت سے مراد ہے خدا سے وحی یا کتاب کا ملنا اور رسالت کے معنی ہیں اس وحی یا کتاب کو دوسروں تک پہنچانا۔ اس لئے نہ کوئی رسول بلا نبوت ہو سکتا ہے اور نہ کوئی نبی بلا رسالت[1]۔ مرزا صاحب نے اپنے دعویٰ کی دلیل میں کہا کہ دیکھئے حضرت ہارون علیہ السلام نبی تھے لیکن انہیں کتاب نہیں ملی تھی۔ کتاب صرف موسیٰ علیہ السلام کو ملی تھی۔ ان کی یہ دلیل بھی ان کی قرآن کریم سے ناواقفیت کی غماز ہے۔ قرآن کریم نے جہاں کہا ہے کہ: وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ (۲/۵۳ و دیگر مقامات) وہاں یہ بھی کہا ہے: وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ (۲۱/۴۸)۔ "ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان (یعنی حق کو باطل سے الگ کرنے والی کتاب) دی جس میں وحی الٰہی کی روشنی تھی اور متقیوں کے لئے ضابطۂ ہدایت۔" اس سے بھی واضح تر الفاظ سورۃ الصّٰفّٰت میں آتے ہیں جہاں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کا نام لیکر کہا ہے: وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ (۳۷/۱۱۷)۔ "ہم نے ان دونوں کو واضح کتاب عطا فرمائی۔" ان مقامات سے واضح ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰؑ کو خدا کی طرف سے وحی ملی تھی اسی طرح ہارون علیہ السلام کو بھی وحی عطا ہوئی تھی ——— اور وحی ہی کو خدا کی کتاب کہا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ میری طرف وحی تو ہوئی ہے لیکن کتاب نہیں ملی۔ وحی اور کتاب کی حقیقت سے بے خبری کا بیّن ثبوت ہے۔

بنا بریں، بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ تمہیں مہلت کا وقفہ اس لئے دیا جاتا ہے کہ تم اس ضابطہ کی اطاعت کرو جو حضرت

[1] تفصیل ان امور کی میری کتاب ——— ختم نبوت اور تحریک احمدیت ——— میں ملے گی۔

موسیٰ علیہ السلام کی وساطت سے تمہیں دیا گیا ہے۔ اس کے پروگرام کی صراحت اگلی آیت میں کی گئی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ:۔

۲/۵۴ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ "تم نے گوسالہ پرستی سے جو اپنا نقصان کیا، یعنی تم مقامِ آدمیت سے گر گئے، تو اس کی تلافی کی یہ صورت ہے کہ تم پھر سے صحیح روش اختیار کر لو"۔ توبہ کے متعلق اس کتاب کی پہلی جلد میں، آیت (۲/۱) کے تحت (صفحہ ۲۲ پر) بتایا جا چکا ہے (اور چند صفحات پہلے اس کا اعادہ بھی کیا جا چکا ہے) کہ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جس مقام سے انسان کا قدم غلط راستے کی طرف اٹھ گیا تھا اسی مقام پر واپس آجانا۔ اس کے بعد صحیح راستے کو اختیار کرنے کے لئے لفظ اَصْلَحَ آتا ہے۔ اس طرح توبہ کے پروگرام کی تکمیل ہوتی ہے۔ ہم نے یہ بھی بتایا تھا کہ جب انسان اپنی غلطی کا احساس کر کے صحیح راستے کی طرف چلنے کے لئے واپس لوٹتا ہے تو قوانینِ خداوندی، نہایت آب و تاب کے ساتھ اس کے سامنے آجاتے ہیں اور وہ اس کی راہنمائی صحیح راستے کی طرف کر دیتے ہیں۔ اس نہج سے خدا کو توّاب کہا جاتا ہے ——— اور خدا کی یہ صفت اس کا بڑا ہی حسین اور پیارا تصوّر سامنے لاتی ہے یعنی اگر تم اپنی خطا کے احساس سے اپنی آنکھ میں اشکِ ندامت لئے، خدا کی طرف ایک قدم اٹھاؤ تو خدا دو قدم آگے بڑھ کر تمہیں اپنے آغوشِ رحمت میں لے لیگا۔ خدا کی اس صفت کو التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ سے تعبیر کیا جاتا ہے، بڑی تیزی سے لوٹ کر سامانِ رحمت عطا کرنے والا۔

توبہ اور توّاب

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ: فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ (۲/۵۴) ہم نے کسی مقام پر بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی متعدد صفات (الاسماء الحسنیٰ) قرآنِ کریم میں آئی ہیں لیکن مختلف آیات میں، ان صفات میں سے کسی ایک یا دو صفات کا ذکر خاص طور پر آتا ہے اور اس خاص صفت کے اس مقام پر لانے میں بڑی معنوی خصوصیت پنہاں ہوتی ہے۔ اس آیت میں خدا کی صفت اَلْبَارِئُ کو سامنے لایا گیا ہے۔ اس کی کیا خصوصیت ہے؟

البارئ

سورۃ الحشر میں خدا کی تین صفات ایک دوسرے سے ملحق بیان ہوئی ہیں۔ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (۵۹/۲۴) ——— یعنی الخالق ——— البارئ اور المصوّر ——— خدا کے عملِ تخلیق کے متعلق پہلی جلد میں بتایا جا چکا ہے کہ اس کے معنی ہیں خدا کے پیدا کردہ مختلف عناصرِ کائنات میں سے بعض کو ایک دوسرے کے ساتھ ایک خاص توازن یا تناسب (PROPORTION) کے ساتھ اس طرح ملانا کہ اس سے ایک نئی چیز وجود میں آجائے۔

اِس عملِ تخلیق کے پروگرام کو سامنے لائیے۔ کائنات میں مختلف عناصر (MATERIAL) ڈھیروں پڑے ہیں۔ عملِ تخلیق کی رو سے ہوتا یہ ہے کہ ان میں سے غیر ضروری عناصر کو الگ کرکے، ضروری عناصر کو، خاص تناسب کے ساتھ یکجا کیا جاتا ہے۔ غیر ضروری عناصر کو (یعنی وہ عناصر جو اس خاص شئے کی تخلیق کے لئے ضروری نہ ہوں) اس طرح الگ کر دینے کی صفت (یعنی الگ کر دینے والے) کو البارِی کہا جاتا ہے۔ جب ان عناصر سے حشو و زوائد کو الگ کر دیا جائے تو پھر وہ نئی شئے، خاص صورت (FORM) اختیار کر لیتی ہے۔ خدا کی اس صفت کو اَلْمُصَوِّرُ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سمجھنے کے لئے آپ ایک کمہار کو سامنے لائیے۔ وہ اپنے چاک پر گندھی ہوئی مٹی کا تودہ رکھکر چاک کو گردش دیتا ہے۔ اس تودے میں سے زائد مٹی کو الگ کرتا چلا جاتا ہے اور اس طرح وہی تودہ ایک خاص برتن کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اشیائے کائنات کے ارتقائی عمل کی یہی صورت ہے۔

اَلْبَارِی کے ان معانی کو سامنے رکھکر آیۂ زیر نظر کی طرف آیئے۔ بنی اسرائیل شرک کے مرتکب ہوئے۔ یعنی انہوں نے حق کے ساتھ باطل کو ملوّث کر دیا۔ دونوں مخلوط ہو گئے۔ توبہ کے لئے سب سے پہلے اس بات کی ضرورت تھی کہ باطل کو حق سے الگ کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے کہا گیا کہ تم اس خدا کی طرف رجوع کرو جو اَلْبَارِی ہے۔ اس رجوع کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے قلبی اور ذہنی تصورات (معتقدات) سے باطل الگ ہو جائے گا اور تم اس قابل ہو جاؤ گے کہ خالص خدائے واحد کے قوانین کی اطاعت کر سکو۔

فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ

لیکن اس آیت میں ابھی ایک ٹکڑہ باقی ہے۔ اور وہ ٹکڑہ ایسا ہے جس کے مروجہ (غلط) مفہوم سے بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ تم باری تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔ اور فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (۲/۵۴)۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "تم ایک دوسرے کو قتل کرو" چنانچہ تفسیر ابن کثیر میں ہے:-

> موسیٰ علیہ السلام نے انہیں حکمِ خداوندی سنایا اور جن جن لوگوں نے بچھڑا پوجا تھا انہیں بٹھا دیا اور دوسرے لوگ کھڑے ہوگئے اور قتل کرنا شروع کیا۔ قدرتی طور پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جب وہ ہٹا اور انہیں روک دیا گیا تو شمار کرنے پر معلوم ہوا کہ ستر ہزار آدمی قتل ہو چکے ہیں اور اس طرح ساری قوم کی توبہ قبول ہوئی۔ (پارہ اول صفحہ ۹۵)

ہم سمجھتے ہیں کہ اس تفسیر کی تغلیط کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ اس قوم میں شرک تک کو اس لئے گوارا کر لیا گیا تھا کہ ان میں تفرقہ نہ پیدا ہو جائے۔ تفرقہ باہمی فساد کا موجب ہوتا ہے اور فساد کا آخری نتیجہ قتال۔ ان

میں تفرقہ پیدا ہونے کے امکان کو تو رد کا گیا اور اس تفرقہ کا جو آخری نتیجہ ہو سکتا تھا اس کا حکم دیا گیا! کیا یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے؟ یہ بھی واضح رہے کہ قرآن کریم نے کسی ایک مومن کے ہاتھوں دوسرے مومن کے قتل بالعمد کو خدا کے غضب اور لعنت اور ابدی جہنم کا مستوجب بتایا ہے (۴/۹۳)۔ اس کے بعد آپ سوچ سکتے ہیں کہ خدا، بنی اسرائیل کی اس جماعت مؤمنین کو یہ حکم دے گا کہ تم ایک دوسرے کو قتل کر دو اور پھر اسے اپنی رحمت بھی قرار دیگا، کیونکہ آیت کے آخر میں اس نے اپنے آپ کو التواب الرحیم کہا ہے؟ اس کے برعکس قرآن کریم میں ہے: كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا (۵/۳۲)۔ "ہم نے بنی اسرائیل کی طرف یہ حکم بھیجا تھا کہ یاد رکھو! جس کسی نے کسی دوسرے شخص کو قتل کر دیا۔ بجز اس کے کہ ایسا کرنا جرم قتل یا بغاوت کی سزا کے طور پر ہو — یوں سمجھو گویا اس نے پوری کی پوری نوع انسان کو قتل کر دیا اور جس نے کسی ایک متنفس کی جان بچالی، یوں سمجھو، گویا اس نے پوری نوع انسان کی جان بچالی"۔

جس خدا نے انہیں یہ حکم دیا تھا کیا وہ انہیں اس کا حکم دیتا کہ باہمی قتال سے ہزاروں جانیں تلف کر دو!! علاوہ ازیں چند ہی آیات بعد ان سے کہا گیا ہے کہ تم سے عہد لیا گیا تھا کہ تم باہمی خون ریزی نہیں کرو گے، لیکن تم نے ایک دوسرے کو قتل کیا۔ یہ بڑا سنگین جرم تھا (۲/۸۴-۸۵)۔ اب ظاہر ہے کہ جس باہمی خونریزی اور قتال کو خدا نے ان کے خلاف "فرد جرم" میں سرِفہرست رکھا ہے، خود خدا نے تو اس کا حکم نہیں دیا ہوگا۔ لہٰذا اس آیت کی یہ تفسیر صحیح نہیں۔

بات صاف ہے۔ ہم "ذبح ابناء" کے سلسلہ میں بتا چکے ہیں کہ قرآن کریم میں ذَبْحٌ اور قَتْلٌ کے معنے گلا کاٹ دینا یا مار دینا ہی نہیں۔ اس کے معنے کسی کو پست کرنا بھی ہیں۔ بنی اسرائیل نے حکم خداوندی سے سرکشی اختیار کرکے گوسالہ پرستی کے شرک کا ارتکاب کیا تھا۔ ان سے کہا یہ گیا کہ تم اگر اپنے نقصان کی تلافی چاہتے ہو تو اس کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ تمرد و سرکشی کو چھوڑ کر تم اپنے قلوب کو اطاعت خداوندی کے لئے جھکاؤ — بہت زیادہ جھکاؤ۔ اس قدر جھکاؤ کہ ان میں معصیت اور سرکشی کا شائبہ تک باقی نہ رہے۔ ایسا کرنے کے بعد یہ ممکن ہوگا کہ تم صحیح راستہ اختیار کر لو۔ اس سے تمہارے نقصان کی تلافی بھی ہو جائے گی۔ اور تمہاری صلاحیتوں کی نشو و نما بھی۔

خلاصہ

خدا نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تمہیں تو یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے۔ تم اس کے نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو، جب تمہیں، ان کی بدولت، زندگی

کی ہر قسم کی آسائشیں نصیب ہو گئی تھیں اور تم اپنی ہم عصر اقوام میں، ایسی ممتاز حیثیت کے مالک ہو گئے تھے کہ کوئی اور قوم تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی (۲/۱۲۲)۔

اس نظام کو چھوڑنے کے بعد، تمہاری حالت یہ ہو گئی کہ آئین و قوانین کا احترام اور عدل و انصاف کی پاسداری تمہارے ہاں سے بالکل اٹھ گئی —— لیکن اب یہ دھاندلی زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکتی۔ اب (قرآنی نظام کے قیام سے) وہ دور جلد آنے والا ہے جس میں کوئی شخص کسی مجرم کا ذرا سا بوجھ بھی نہیں بٹا سکے گا۔ ہر ایک کو اپنے کئے کی سزا خود بھگتنی پڑے گی (۶/۱۶۵) نہ ہی کسی کی سفارش کسی کے کام آسکے گی۔ نہ ہی کسی سے، اس کے جرم کے معاوضہ میں کچھ (رشوت) لے کر اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ اور نہ ہی کوئی شخص کسی مجرم کی مدد کو پہنچ سکے گا۔

یہ اس دنیا میں بھی ہوگا جب (قرآن کا) نظامِ عدل قائم ہوگا، اور آخرت میں بھی، جب تمام فیصلے خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے ہوں گے۔

تمہیں یاد ہے کہ جب تم قومِ فرعون کی محکومی میں تھے تو وہ تم پر، ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر طرح طرح کے عذاب وارد کیا کرتے تھے۔ ان میں بدترین عذاب یہ تھا کہ وہ تمہارے اندر پارٹیاں پیدا کرتا رہتا تھا (۲۸/۴)، اور اس طرح کرتا یہ تھا کہ تمہاری قوم کے معزز افراد کو، جن میں اسے جوہرِ مردانگی کی جھلک دکھائی دیتی تھی اور جن سے اسے خطرہ کا امکان نظر آتا تھا، ذلیل و خوار کر کے غیر مؤثر بناتا رہتا تھا (بالخصوص انہیں جو موسیٰ پر ایمان لاتے تھے۔ ۴۰/۲۵)، اور جو طبقہ ان جوہروں سے عاری ہوتا، اسے اپنا معزز و مقرب بنا کر آگے بڑھاتا رہتا تھا۔ اس طرح مجموعی حیثیت سے تمہاری قوم کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جاتی تھی (۲۸/۵)۔ [سیاستِ ملوکیت کا انداز ہی یہی ہوتا ہے۔ ۲۷/۳۴]۔

تم نے قوانینِ خداوندی کا اتباع کیا تو اس نے تمہیں سب سے پہلے فرعون کے اس عذاب سے نجات دلائی۔ یہ چیز تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے تمہارے لئے ایک عظیم نعمت تھی، کیونکہ اس سے تمہیں اپنی بازآفرینی کے مواقع حاصل ہو گئے (۷/۱۴۱)۔

اور پھر (قومِ فرعون کے ساتھ کشمکش کے بعد) وہ وقت آگیا کہ تم مصر کو چھوڑ کر چل نکلے اور فرعون کا لشکر تمہارے تعاقب میں آیا، تاآنکہ تم اس مقام پر پہنچ گئے جہاں سامنے سمندر (یا دریا) کا حصہ تھا اور پیچھے فرعون اور اس کی فوج، تم اس طرح گھر چکے تھے کہ ہماری راہنمائی سے تمہیں سمندر (یا دریا) میں خشک راستہ مل گیا۔ اور اس طرح، ہم نے تمہیں فرعون کے لشکر کی دستبرد سے بچا لیا، اور وہ، اور اس کا لشکر، سب غرق ہو گئے۔ اور یہ کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوا (۷/۱۳۸؛ ۱۰/۹۰؛ ۲۰/۷۷؛ ۲۶/۶۳؛ ۴۴/۲۴)۔

اور سینا کی وادی میں پہنچ کر، (جہاں تمہاری تربیت ہو رہی تھی)، موسیٰؑ ہمارے حکم کے مطابق چالیس راتوں کے لئے تم سے الگ ہوا (۷/۱۴۲)، تو تم نے اتنے ہی عرصہ میں، (خدا کو چھوڑ کر مصریوں کے دیوتا) بچھڑے کی پرستش شروع کر دی، اور اس طرح، قوانینِ خداوندی سے سرکشی اختیار کر لی۔

لیکن ہم نے اس پر بھی تمہیں راندۂ درگاہ نہیں کر دیا، بلکہ (جیسا کہ آگے چل کر مذکور ہے۔ ۲/۵۶)، تمہاری اس غلط روش کے مضر اثرات کو مٹا دیا، اور تمہیں پھر موقع دیا کہ تم اپنی صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما کر لو۔

اس مقصد کے لئے، ہم نے موسیٰؑ کو ایک ایسا ضابطۂ قوانین دیا، جو حق و باطل کو نکھار کر الگ الگ کر دینے والا، اور مستقل اقدار کا پیمانہ تھا۔ یہ اس لئے دیا کہ تم، اس کی روشنی میں، اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکو۔

جب موسیٰؑ (چالیس راتوں کے بعد) اپنی قوم کی طرف واپس آیا، اور اس نے دیکھا کہ قوم گوسالہ پرستی میں مصروف ہے، تو اس نے ان سے کہا کہ تم نے اس بچھڑے کو اپنا معبود بنا کر، اپنا ہی نقصان کیا ہے، کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ تم اس سے انسانی سطح سے بہت نیچے گر گئے ہو (۷/۱۵۲)۔ اب پھر اس مقام کو حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تم اپنی غلطی کا اعتراف کرو، اور نہایت عجز و انکسار سے، قوانینِ خداوندی کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دو۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے تم قوانینِ خداوندی کے ان خوشگوار اور زندگی بخش نتائج سے پھر مستفید ہو سکتے ہو، جو اس وقت تم سے منہ موڑ چکے ہیں۔ ان قوانین میں یہ خصوصیت ہے کہ جب بھی کوئی ان کی طرف رجوع کرتا ہے، تو یہ، ربوبیت کے تمام سامان اپنے ساتھ لئے، اپنا رخ اس کی طرف پھیر دیتے ہیں۔

پانچواں باب

داستان بنی اسرائیل — خوئے غلامی کے مظاہرے

(آیات ۲/۵۵ تا ۲/۷۱)

۱ طرح طرح کے طفلانہ تقاضے۔

۲ ہم خدا کو بے نقاب دیکھیں گے۔

۳ نعمائے خداوندی — من و سلوٰی۔ رزقِ طیّب کا مفہوم۔

۴ ارضِ مقدس میں تمکن کا وعدہ — اور قوم کی دوں ہمتی۔

۵ وراثتِ ارضی کا ابدی قانون — صلاحیّت۔

۶ قتلِ انبیاء و رسل — خدا اور رسولوں کے غالب رہنے کا مفہوم۔

۷ عالمگیر دین صرف اسلام ہے۔

۸ سبت کا واقعہ۔

۹ بنی اسرائیل کے بندر بن جانے کا مفہوم۔

۱۰ ذبحِ بقر کا واقعہ — قوم کی کٹ حجتیاں

۱۱ اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم کا مفہوم۔

۱۲ ناتربیت یافتہ اقوام کا اسلام لے آنا۔

۱۳ ہمارا مروجہ اسلام، کس طرح غیر اسلامی عقائد و مسالک کا مجموعہ بن گیا۔

۱۴ حضرت موسٰےؑ کے کپڑے لیکر بھاگ جانے والی وضعی روایت۔

****

پانچواں باب

داستان بنی اسرائیل — خوئے غلامی کے مظاہرے

سابقہ باب میں ضمناً، بتایا گیا تھا کہ صدیوں کی غلامی کی وجہ سے بنی اسرائیل میں جوہر انسانیت مفقود ہو چکے تھے۔ نہ اُن کے سینے میں زندہ آرزؤں کی مقدس قندیل تھی، نہ ان کی نگاہوں میں تابندہ مقاصد کی عالمتاب درخشندگی۔ دنیا میں، غلامی، ہزار لعنتوں کی ایک لعنت اور لاکھ نحوستوں کی ایک نحوست ہوتی ہے۔ غلامی میں وہ تمام عیوب و ذمائم، جنہیں جسدِ انسانیت کے لئے جذام کہنا چاہیئے، اس انداز سے پیدا ہو جاتے ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کے تباہ کن جراثیم، کب اور کن راہوں سے خون کے اندر حلول کر گئے تھے۔ خوئے غلامی میں پختہ انسان، زندگی کے حقائق کے مقابلے سے جی چراتا ہے اور قفس کے خوگر پرندے کی طرح عافیت کوشی کی زندگی کو عین حیات سمجھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ، اس سے ذاتی سیرت کی رعنائیاں اور اجتماعی کیریکٹر کی دلربائیاں ایک ایک کر کے چھن جاتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:

از غلامی دل بمیرد در بدن ❊ از غلامی روح گردد بارِ تن

یہ تو ہوتی ہے غلامی میں انفرادی کیفیت۔ جہاں تک اجتماعی زندگی کا تعلق ہے، اس کی صورت یہ ہوتی ہے:

از غلامی بزمِ ملت فرد فرد ❊ این و آں از این و آں اندر نبرد

یہ لوگ بظاہر ایک قوم نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت وہ اجتماعی نہیں، انفرادی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس میں ہر فرد کا مفاد اپنا ہوتا ہے اور جب یہ مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں تو ان میں باہمی سر پھٹول شروع ہو جاتی ہے۔ اُن کی اس انفرادی زندگی کو اقبالؒ نے ایک مثال سے نہایت بلیغ انداز میں واضح کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ:

آں یکے اندر سجود ایں در قیام ❊ کاروبارش چوں صلوٰۃِ بے امام

آپ کسی مسجد میں، باجماعت نماز کو دیکھئے، اگرچہ اس جماعت میں بھی اب افراد ہیں... روحِ یگانگت نہیں ہوتی، بایں

خوئے غلامی

اس رسمی جماعت میں بھی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں افراد، سیدھی صفوں میں، کندھے سے کندھا ملاتے، کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک شخص (امام) کی آواز پر، سب کے سب، اُٹھتے ہیں، جھکتے ہیں، سجدے میں جاتے ہیں۔ اس کے بعد، جب یہی نمازی، سنتیں پڑھنے لگتے ہیں تو نماز بھی وہی ہوتی ہے اور نمازی بھی

وہی۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ اب ان میں امام نہیں ہوتا۔ اس امام کے نہ ہونے سے ان نمازیوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ کوئی کھڑا ہے، کوئی رکوع میں جھکا ہوا، کوئی سجدے میں پڑا۔ آپ کہیں دور کھڑے ہو کر اس صحن مسجد پر نگاہ ڈالئے جس میں یہ نمازی نماز ادا کر رہے ہوں۔ تشتت و افتراق کا بڑا عبرت انگیز منظر سامنے آجائے گا۔ یہی کیفیت ہوتی ہے قوموں کی غلامی کے زمانے میں۔ ان کی مرکزیت فنا ہو جاتی ہے اور وہ قوم ہزار قسم کے اختلافات کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ کیفیت ان کی یہ ہوتی ہے کہ ان میں نہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت باقی رہتی ہے نہ زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے نئے راستوں کی تلاش کا جذبہ:۔

کیشِ او تقلید کارش آذری است ندرت اندر مذہبِ او کافری است

جب ان میں فہم و بصیرت کی صلاحیت نہیں رہتی تو وہ بسیط حقائق (ABSTRACT REALITIES) کی صداقتوں کو پا ہی نہیں سکتے۔ اس لئے وہ اپنی پرستش کے لئے، محسوس خداؤں کو تراش لیتے ہیں —— خواہ یہ خدا مٹی اور پتھر کی مورتیں ہوں اور خواہ زندہ اور مردہ انسان۔ مسلکِ تقلید بذاتِ خویش بت پرستی ہوتا ہے۔ دورِ حاضر کا ایک بلند پایہ فلاسفر (WHITE=HEAD) کہتا ہے کہ:۔

مروجہ تصورات و نظریات پر بلا تحقیق مطمئن ہو کر بیٹھ جانا بُت پرستی ہے۔[1]

یہی وہ بت پرست ہیں، جن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:۔

تازگی ہا وہم و شک افزایدش ∴ کہنہ و فرسودہ خوش می آیدش

وہ اس طرح لکیر کے فقیر ہو جاتے ہیں کہ ہر نئی تحقیق میں انہیں کفر و الحاد کے جراثیم دکھائی دیتے ہیں۔ صدیوں کے اس جمود و تعطّل سے اُن کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ پتھر کی مورتیوں کی طرح ذہنی طور پر خود بھی پتھر بن جاتے ہیں اور ایک مقام پر ساکت و صامت بالکل کھڑے رہتے ہیں۔

کاروانِ شوق بے ذوق و رحیل ∴ بے یقین و بے سبیل و بے دلیل

اُن میں، سفرِ حیات میں، ایک قدم آگے بڑھانے کا بھی ولولہ نہیں رہتا۔ اس لئے نہ ان کے سامنے کوئی منزل ہوتی ہے، نہ منزل تک پہنچانے کے راستے۔ نہ کوئی راہنما نہ چراغِ راہ۔ مختصراً یہ کہ:

دین و دانش را غلام ارزاں دہد تا بدن را زندہ دارد جاں دہد

انسانی زندگی میں عقل و دانش، وحی کی عطا کردہ اقدار و اصول، اور ان کی رو سے نشو و نما پانے والی انسانی ذات متاعِ بے بہا ہیں۔ لیکن غلام اور محکوم محض طبیعی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اس متاعِ گرانمایہ کو جنس کاسد سمجھتا ہے۔ اور حیوانوں

[1] ADVENTURES OF IDEAS -

کی طرح جیتا اور انہی کی طرح مرجاتا ہے۔

ایسی ہوتی تھی وہ قوم، جسے انسانی سطح پر لانے کے لئے حضرات انبیائے کرام کو مبعوث کیا جاتا تھا۔ آپ غور کیجئے کہ یہ مرحلہ کسقدر ہمت طلب اور اس فریضے کی ادائیگی کس قدر صبر آزما ہوتی تھی۔ یہی تھا وہ مقام، جہاں حضرت

حضرت ابراہیمؑ کا سوال

ابراہیم علیہ السلام نے خدا سے کہا تھا: رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتَىٰ (۲/۲۶۰)۔ "اے میرے نشوونما دینے والے! مجھے یہ بتا کہ اِس قسم کی مردہ قوم میں زندگی کی روح کس طرح پھونکی جاتی ہے؟" اس سوال پر اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ اے ابراہیم! کیا تجھے اس پر یقین نہیں کہ ایسے مُردوں کو بھی زندہ کیا جا سکتا ہے؟ عرض کیا کہ جب آپ نے میرے ذمے یہ فریضہ عائد کر دیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایسا ہو جانا ممکن ہے لہٰذا اس میں تو مجھے کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ میں وہ طریقہ پوچھنا چاہتا ہوں جسے اختیار کرنے سے یہ مقصد حاصل ہو سکے۔ میں چاہتا یہ ہوں کہ مجھے کامل اطمینان ہو کہ میں جس راستے پر چل رہا ہوں وہ مجھے بالیقین منزل تک پہنچا دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس طریق کو ایک مثال کے ذریعے سمجھایا۔ کہا کہ جنگل کے وحشی پرندوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ انسانی سائے تک سے بھی ڈر کر اڑ جاتے ہیں لیکن پرندوں کو سدھانے والے جب انہیں سدھا کر اپنے سے مانوس کر لیتے ہیں تو ان کی اس طرح قلبِ ماہیت ہو جاتی ہے کہ فضا کی پہنائیوں میں کھلا چھوڑ دیا جائے۔ وہ دور دور پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھی کیوں نہ جا بیٹھیں۔ سدھانے والا، جب ایک آواز دیتا ہے تو وہ لبیک کر اس کی طرف آ جاتے ہیں۔ ابراہیمؑ! حقائق سے نامانوس، وحشی انسانوں کو اس طرح سدھا کر اپنے قریب لایا جاتا ہے۔ یہ ہے طریق مردہ قوموں میں زندگی کی روح پھونکنے کا۔ آپ نے غور کیا کہ یہ طریق کس قدر ہمت شکن، صبر آزما اور استقامت طلب ہوتا ہے؟۔

اس قسم کی تھی وہ قوم، جس کی تعلیم و تربیت، حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے سپرد کی گئی تھی۔ وہ مصر سے تو انہیں نکال لائے کہ یہ تبدیلی صرف سرزمین کی تبدیلی تھی۔ اب وہ مرحلہ آیا جس میں ان کے قلب و دماغ کی تبدیلی مقصود تھی۔ اس مرحلہ میں ان کی خوئے غلامی کے مظاہر قدم قدم پر سامنے آتے تھے۔ اس سلسلے میں دو تین واقعات اس سے پہلے ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب وہ مصر سے نکلے تو سامنے سمندر تھا اور پیچھے فرعون کا لشکر۔ اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کی راہنمائی کر رہے تھے اور انہیں یقین دلا رہے تھے کہ تم گھبراؤ نہیں، میں وحیِ خداوندی کی روشنی میں تمہیں ایسے مقام کی طرف لے چلوں گا جہاں سے تم بعافیت سمندر پار کر جاؤ گے۔ لیکن اس سے ان کی چیخ و پکار میں کمی نہ ہوئی بائبل میں ہے :-

اور جب فرعون نزدیک ہوا اور بنی اسرائیل نے آنکھیں اوپر کیں اور مصریوں کو اپنے پیچھے آتے دیکھا

تو وہ شدت سے ڈرے۔ تب بنی اسرائیل نے خداوند سے فریاد کی اور موسیٰ سے کہا، کہ کیا مصر میں قبروں کی جگہ نہ تھی کہ تو ہم کو بیابان میں مرنے کے لئے لایا۔ تو نے ہم سے یہ کیا معاملہ کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا۔ کیا یہ وہی بات نہیں جو ہم نے مصر میں تجھ سے کہی تھی کہ ہم سے ہاتھ اٹھا۔ تاکہ ہم مصریوں کی خدمت کریں کہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر تھا۔[1]

(خروج۔ باب ١٤۔ آیات ١٢-١٠)

آگے بڑھے تو ایک بت پرست قوم کو دیکھ کر، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دامن پکڑ کر بیٹھ گئے کہ ہمیں بھی ایسا ہی بت بنا دیجئے۔ انہوں نے وہاں اپنا دامن چھڑایا تو ان کی غیر حاضری میں، انہوں نے گوسالہ پرستی شروع کر دی۔ یہ سب

حضرت موسیٰؑ کو ستانے والی قوم

ان کی خوئے غلامی کے مظاہر تھے۔ یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو گیا۔ تربیت گاہِ سینا میں قدم قدم پر ان کی طرف سے اسی قسم کے تقاضے ہوتے تھے۔ وہ بات بات پر روٹھ کر بیٹھ جاتے اور سرکشی اختیار کر لیتے۔ اسی قسم کے وہ تقاضے تھے جن سے تنگ آ کر حضرت موسےٰ علیہ السلام کو یہ کہنا پڑا: يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَ قَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ (٦١/٥)۔ "اے لوگو! تم مجھے اس طرح کیوں تنگ کرتے ہو حالانکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کوئی اپنی بات تم سے نہیں منوانا چاہتا، میں تو خدا کے پیغامات تم تک پہنچاتا اور انہی کی اطاعت کا تم سے مطالبہ کرتا ہوں، پھر اس میں مجھ سے بگڑنے کی کیا بات ہے؟"

قوم بنی اسرائیل کی یہ ذہنیت، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک ہی محدود نہیں تھی۔ یہ ان کے بعد بھی مسلسل چلی آئی۔ چنانچہ جب نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے دینِ خداوندی پیش کیا تو وہ آپؐ سے بھی اسی قسم کے سوالات پوچھتے اور تقاضے کرتے تھے۔ سورۃ البقرۃ میں ہے: اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا

---

[1] ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قرآنِ کریم میں اقوامِ سابقہ کی داستانیں محض تاریخی حیثیت سے بیان نہیں ہوئیں۔ ان سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم ان سے عبرت اور موعظت حاصل کریں۔ آپ دیکھیں گے کہ بنی اسرائیل کی داستان، ہم اہلِ پاکستان پر کس طرح منطبق ہوتی ہے ہمیں بھی انگریز اور ہندو کی غلامی سے نجات دلا کر اس خطۂ ارض میں بسایا گیا تاکہ ہم آزادی کی فضا میں سانس لے کر اپنے تصورات کے مطابق، اپنی آزاد مملکت (اسلامی نظام) قائم کر سکیں۔ لیکن ہماری ناشکر گزاری کا عالم یہ ہے کہ ہمیں ذرا سی بھی کہیں مشکل پیش آتی ہے تو چلا اٹھتے ہیں کہ قائد اعظمؒ ہمیں یہاں کیوں لے آیا۔ اگر پاکستان نہ بنایا جاتا تو ہم ہندوستان میں، یہاں سے اچھے رہتے"۔ کیا ہماری ذہنیت بعینہٖ، بنی اسرائیل کی سی نہیں ؟۔

سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۔ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ (۲/۱۰۸) "کیا تم چاہتے ہو کہ اس رسولؐ سے بھی اسی قسم کی فرمائشیں کرو، جس قسم کی فرمائشیں تم اس سے پہلے موسیٰؑ سے کیا کرتے تھے۔ اس قسم کی فرمائشوں کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ تم ایمان کے بدلے کفر کی راہ اختیار کرنا چاہتے ہو اور ظاہر ہے کہ ایسی روش اختیار کرنے والا بڑے غلط راستے پر چلتا ہے۔"

بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جو تقاضے کئے تھے ان میں سے ایک تقاضہ وہ بھی تھا، جو زیرِ نظر آیت میں ہمارے سامنے آتا ہے، یعنی:

۲/۵۵ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۔

"جب تم نے موسیٰؑ سے کہا کہ ہم تمہاری کسی بات کے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں گے جب تک ہم خدا کو بے نقاب اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ ہم ایسے خدا پر ایمان ہی نہیں لا سکتے جسے ہم اپنے سامنے بے نقاب نہ دیکھ لیں" اس تقاضے کے بعد کیا ہوا اسے ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

خدا کو بے نقاب دیکھیں گے!

آپ نے دیکھا کہ ایک مدت تک مصر کی بت پرست قوم میں رہنے سے ان کی ذہنیت کیا ہو گئی تھی۔ یہ ان انبیاء کی اولاد میں سے تھے، اور بہرحال اپنے آپ کو انہی کے پیرو کہتے تھے، جو اَن دیکھے خدا پر ایمان لانے کی دعوت دیتے تھے۔ لیکن اب یہ ایسے خدا کو ماننے کے لئے تیار ہی نہیں تھے۔ خدا کی ذات ایک ایسی ورارالورا حقیقت ہے جو انسانی "قیاس و خیال و گمان و وہم" سے برتر اور ہمارے تصورات کی حدود سے بلند و بالا ہے۔ اس کا طبیعی آنکھوں سے دیکھنا تو ایک طرف، انسان تو مادہ تک کی ابتدائی شکل ـــ توانائی محض (PURE ENERGY) کو بھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔ اُسے اس کے مظاہر ہی سے پہچان سکتا ہے۔ ریڈیو سے نشر شدہ لہریں ہر وقت ہمارے اِرد گرد فضا میں محوِ حرکت ہوتی ہیں لیکن ہم انہیں اپنی آنکھوں سے کبھی نہیں دیکھ سکتے ـــ آنکھوں سے دیکھنا تو ایک طرف رہا، ہم انہیں اپنے حواس خمسہ میں سے کسی حس کے ذریعے محسوس نہیں کر سکتے۔ ان کے وجود کا علم ہمیں اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے آپ کو ہمارے ریڈیو سیٹ کی وساطت سے محسوس کرائیں۔ ذاتِ خداوندی کے متعلق قرآن کریم میں ہے: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۔ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (۶/۱۰۴) "کوئی آنکھ ذاتِ خداوندی

کا ادراک نہیں کر سکتی، حالانکہ خدا ہر مقام پر موجود ہوتا ہے اور وہ ہر آنکھ کا احاطہ کرتا ہے لیکن اس کا یہ احاطہ کرنا بھی کسی محسوس ذریعے سے نہیں ہوتا۔ وہ نہایت غیر مرئی اور غیر محسوس طور پر مخصوص اعمالِ انسانی تو ایک طرف، اس کے دل میں گزرنے والے خیالات تک سے بھی باخبر ہوتا ہے"۔ ایسے خدا کے متعلق یہ تقاضہ کہ جب تک ہم اسے اپنی آنکھوں سے بے نقاب نہ دیکھ لیں، اس پر ایمان نہیں لائیں گے، کتنی بڑی جہالت ہے! ان کی یہی جہالت تھی جس کے متعلق سورۃ النساء میں ہے: يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (۴/۱۵۳) "اے رسولؐ! تجھ سے یہ اہلِ کتاب (یہودی) کہتے ہیں کہ ہم تمہارے دعوئ نبوت کو تب سچا مانیں گے جب تم ایک بنی بنائی کتاب، آسمان سے اتری ہوئی دکھاؤ"۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ان کا یہ تقاضہ، اس تقاضے کے مقابلے میں جو انہوں نے اپنے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام سے کیا تھا، بہر حال ہلکے قسم کا ہے۔ انہوں نے موسیٰؑ سے کہا تھا کہ تم خود خدا کو ہمارے سامنے بے نقاب لا کر دکھاؤ"۔

ان کی اس فرمائش کے بعد کیا واقعہ پیش آیا، اس کی تفصیل تو قرآن کریم نے نہیں دی۔ بس اتنا ہی کہا ہے کہ: فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (۲/۵۵) "تمہیں بجلی کی کڑک نے پکڑ لیا۔ سورۃ الاعراف میں بھی (غالباً) اسی واقعہ کا تذکرہ ہے وہاں کہا گیا اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ (۷/۱۵۵) "انہیں زلزلہ نے پکڑ لیا"۔ ہمارے سمجھنے کی بات اتنی ہی ہے کہ مطالبہ تو خدا کو بے نقاب دیکھنے کا تھا اور ان کی دوں ہمتی اور بزدلی کا عالم یہ تھا کہ بجلی کی

بزدلی کا یہ عالم

کڑک اور زلزلے کے ارتعاش سے ان کے ہوش اڑ گئے، حالانکہ یہ دونوں چیزیں، محسوسات میں سے تھیں۔ محسوسات کو معبود بنا لینے والوں کی ہمت اور حوصلے کا یہی عالم ہو جاتا ہے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے شرک کرنے والوں کے خوف اور ڈر کو کس طرح واضح الفاظ میں بے نقاب کیا۔ اسی جلد کے شروع میں قصۂ آدم کے ضمن میں بتایا جا چکا ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کی صلاحیت آدمی کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہے۔ اس اعتبار سے ملائکہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ لیکن محسوسات کو معبود بنا لینے والوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ فطرت کی انہی قوتوں سے ڈرتے اور کانپتے رہتے ہیں اور یہی خوف انہیں، اُن کے سامنے سجدہ ریز ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جو قوم فطرت کی قوتوں سے اس طرح لرزہ براندام ہو جاتی وہ خدا کی عظمت اور اقتدار کا اندازہ کس طرح لگا سکتی ہے؟ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (۶/۹۲) "انہوں نے خدا کے متعلق صحیح اندازہ ہی نہیں لگایا"۔ ان اور انہی جیسوں کے متعلق کہا گیا تھا۔

یہودیوں کی یہی ذہنیت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جماعتِ مومنین سے کہا گیا تھا کہ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ

آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ آذَوْا مُوسَىٰ (۳۳/۶۹) "اے جماعت مومنین! دیکھنا تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا، جنہوں نے موسیٰ کو طرح طرح کی بیہودہ فرمائشوں اور تقاضوں سے تنگ کر مارا تھا"۔ ان میں سے ایک تقاضہ یہ بھی تھا کہ وہ خدا کو محسوس شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس جماعتِ مومنین نے حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے تو اس قسم کی کوئی فرمائش نہ کی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ خدا کو اس کی ان صفات کی رو سے ہی جو قرآن کریم میں مذکور ہیں، پہچانا جا سکتا ہے، ذاتِ خداوندی کو بے نقاب دیکھنا تو ایک طرف، اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان

مسلمانوں کو تنبیہ

کا اس حقیقت پر محکم یقین تھا اور کامل اطمینان۔ لیکن اس کے بعد، جب ہمارے ہاں تصوّف در آیا تو ہم بھی اسی سطح پر اتر آئے۔ قرآن کریم نے ذاتِ خداوندی پر ایمان کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن تصوف نے اس کی جگہ عرفان کا نظریہ وضع کیا۔ یعنی ذاتِ خداوندی کی معرفت۔ اس کی ذات کا پہچاننا۔ چونکہ (صاحب کے الفاظ میں)۔ تصوف برائے شعر گفتن خوب است ــــ اس لئے تصوف کے ان عقائد و نظریات نے زبانِ شعر میں گل کھلائے۔ قرآن کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہا ہے کہ انہوں نے خدا سے درخواست کی تھی کہ وہ انہیں اپنا جلوہ بے حجاب دکھائے تو اس کے جواب میں کہا گیا تھا لَنْ تَرَانِي (۷/۱۴۳) "تو مجھے نہیں دیکھ سکتا"۔ اس کے بعد ہے کہ موسیٰ علیہ السلام، جلوۂ خداوندی کی تاب نہ لا کر گر پڑے (ان اشارات کی تفصیل ہم آگے چل کر اپنے مقام پر بیان کریں گے جہاں یہ بھی بتائیں گے کہ بنی اسرائیل کے تقاضہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس درخواست میں بنیادی فرق کیا تھا۔ اس جگہ ہم اسی نکتہ تک محدود رہنا چاہتے ہیں جس کے لئے یہ بات ضمناً کہی گئی ہے)۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ خدا نے اپنے متعلق کہا ہے کہ کوئی انسانی آنکھ اس کا ادراک نہیں کر سکتی۔ ظاہر ہے کہ اس میں انبیاء اور غیر انبیاء

ہماری حالت

سب شامل ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں کی تصوف زدہ شاعری انتہائی غلو سے آگے بڑھتی ہے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں کہتی ہے کہ:۔

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات؛ تو عینِ ذات می نگری، در تبسمی!

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام صفاتِ خداوندی کے ایک جلوہ کی تاب نہ لا کر بیہوش ہو گئے لیکن حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ذاتِ خداوندی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں۔ نعت کی دنیا میں اس، اور اس قسم کے دیگر اشعار کو بڑے فخر سے پیش کیا اور بڑے ذوق و شوق سے سنا جاتا ہے لیکن کوئی نہیں سوچتا کہ یہ وہی غلو ہے جس سے قرآن کریم نے سختی سے منع کیا تھا جب کہا تھا کہ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ (۴/۱۷۱) "اے اہل الکتاب! تم دین میں مبالغہ مت کرو اور خدا کے متعلق وہی بات کہو جو الحق ہے"۔ اور الحق یہی ہے کہ

ذاتِ خداوندی کو آنکھوں سے دیکھنا تو ایک طرف، اس کی کنہ و ماہیت و کیفیت بھی انسانی ذہن میں نہیں آسکتی۔

لیکن یہ مثال تو ذرا پہلے زمانے کی تھی۔ اب معاملہ اور آگے بڑھ گیا ہے اور محراب و منبر تک سے اس قسم کی آوازیں بلند کی جاتی ہیں کہ:-

وہی جو مستویِ عرش ہے خدا ہو کر اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفٰےؐ ہو کر

ان کے نزدیک اَحَد اور اَحمَد میں، بس ایک میم کا پردہ حائل ہے جسے عاشق کی نگاہ نہایت آسانی سے، درمیان سے الگ کر کے، ان دونوں کی وحدت کا نظارہ کر لیتی ہے[۱] (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) اور یہ کہ:-

اگرچہ ظاہر میں وہ عرب ہے مگر حقیقت میں عین رب (ع+رب) ہے (معاذ اللہ)۔

یہ حضرات بزعمِ خویش، ہر رات خدا کی محفل میں شریک ہوتے اور عاشق و معشوق کی طرح محوِ ناز و نیاز رہتے ہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم نے ہم سے کہا تھا کہ تم بنی اسرائیل کی طرح نہ ہو جانا، ہم کس دھڑلے سے اس فرمانِ خداوندی سے سرتابی برت رہے ہیں اور طرفہ تماشہ یہ کہ اسے عینِ دین ہی نہیں، مغزِ دین قرار دیا جاتا ہے۔

بہرحال، اب آگے بڑھیے۔ بنی اسرائیل کی اس ذہنیت کے بعد، انہیں مرفوع القلم سمجھا جانا چاہیئے تھا۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، اللہ تعالیٰ نے تربیت گاہِ سینا کو ان کے لئے مہلت کا وقفہ قرار دیا۔ اس لئے کہا کہ ان کے اس قسم کے تقاضوں کے بعد، بجائے اس کے کہ انہیں ابدی طور پر راندۂ درگاہ قرار دے دیا جاتا:

۲/۵۶ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔

ہماری کتبِ تفاسیر میں، یہ کہا گیا ہے کہ اس تجلی کی کڑک یا زلزلہ سے وہ سب مر گئے، لیکن اللہ نے انہیں پھر زندہ کر دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو خدا اس عظیم کائنات کو عدم سے وجود میں لا سکتا ہے، جو بے جان مادہ میں سے زندگی کی نمود کر سکتا ہے، جو ایک جرثومہ کو انسان بنا سکتا ہے۔ اس کی قدرت سے یہ ناممکن نہیں کہ وہ کسی کو طبعی طور پر مار

---

[۱] نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر، وہ بزمِ یثرب میں آکے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر۔ اسے علامہ اقبالؒ کے دورِ اول کا شعر بتایا جا رہا ہے جسے انہوں نے اپنے مجموعہ کلام میں شامل نہیں کیا۔ لیکن اب اُسے فخریہ ان کی طرف منسوب کر کے دنیا بھر میں نشر کیا جا رہا ہے۔ اگر انہوں نے یہ شعر کہا تھا لیکن بعد میں اسے اپنے کلام سے خارج کر دیا تھا۔ تو پھر اسے ان کی طرف منسوب کئے جانا بڑی زیادتی ہے۔

کر پھر زندہ کرے۔ مرنے کے بعد کی زندگی پر تو ہمارا ایمان ہے۔ لیکن اس خدا نے یہ کہیں نہیں کہا وہ اس دنیا میں کسی کو طبعی موت مار کر، پھر یہیں زندہ کرے گا۔ اس لئے اس آیت میں، موت اور بعث کے الفاظ کچھ اور مفہوم رکھتے ہیں۔ موت اور حیات کے متعلق مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں آیت (۲/۲۸) کے تحت (صفحہ ۳۴۶ پر) گفتگو ہو چکی ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہاں موت اور بعثت کے قرآنی مفہوم کو ذرا اور واضح طور پر پیش کر دیا جائے تا کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ یہاں ان الفاظ سے مراد کیا ہے؟

بنیادی طور پر موت کا لفظ، حیات کے مقابلہ میں آتا ہے لیکن جس طرح حیات سے مراد محض سانس لینا نہیں، یہ لفظ مجازاً متعدد دیگر مفاہیم کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح موت سے مراد بھی صرف سانس کا بند ہو جانا

موت کا مجازی مفہوم

یا طبعی طور پر مر جانا نہیں، یہ مجازاً متعدد معانی کے لئے بولا جاتا ہے۔ مثلاً جس چیز کی حرکت بند ہو جائے اور اس طرح اس پر جمود طاری ہو جائے۔ عربوں کے ہاں اس کیلئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ کہتے تھے مَاتَتِ الرِّیْحُ۔ یعنی ہوا رُک گئی، ساکن ہو گئی۔ یا جس چیز میں قوت اور حرارت نہ رہے اس کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا تھا مَاتَتِ النَّارُ کے معنی تھے آگ بجھ گئی۔ یا جس چیز میں جوش اور ولولہ نہ رہے اس کے لئے بھی یہ لفظ آتا تھا مَاتَتِ الْخَمْرُ کے معنے تھے شراب میں تیزی اور تندی باقی نہ رہی۔ بنا بریں قرآنِ کریم میں بھی یہ لفظ ضعف و ناتوانی، ذلت و مسکنت، اضمحلال اور شکست خوردگی، قوت نمو کے باقی نہ رہنے یا عقل و شعور کے معطل یا مفقود ہو جانے کے لئے متعدد مقامات پر آیا ہے۔

مثلاً سورۃ البقرۃ میں، بنی اسرائیل ہی کے واقعہ کے ضمن میں لکھا ہے اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۔ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۔ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ (۲/۲۴۳) "تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جو دشمن کے مقابلہ کے لئے ہزاروں کی تعداد میں گھر سے نکلے لیکن جب وہ دشمن کے سامنے آئے تو ان پر موت کا خوف اس طرح طاری ہو گیا کہ وہ میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ نکلے تو اللہ نے ان سے کہا کہ جاؤ، مر جاؤ۔ لیکن اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں حیاتِ تازہ عطا کر دی"۔ ظاہر ہے کہ یہاں ان کی شکست خوردہ ذہنیت کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوبارہ ہمت اور حوصلہ عطا ہو جانے کو حیات کہکر پکارا گیا۔

قرآنِ کریم میں، زمین مردہ (بنجر زمین) میں حیاتِ تازہ (پیداوار کی صلاحیت) پیدا ہو جانے کے لئے یہ لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے مثلاً (۲/۱۶۴)۔ سورۃ النمل میں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ

الْمَوْتٰى - وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ (۲۷/۸۰) "اے رسولؐ! تو نہ مُردوں کو سنا سکتا ہے اور نہ ہی ان بہروں کو، جنہیں بلایا جائے تو وہ پیٹھ پھیر کر چل دیں"۔ اس سے اگلی آیت میں ہے کہ "تو اندھوں کو راستہ نہیں دکھا سکتا۔ تو انہی کو سنا سکتا ہے جو ہمارے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں اور ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں"۔ سورۃ یٰسین میں قرآن کریم کے متعلق کہا ہے کہ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (۳۶/۷۰)۔ "یہ انہی کے لئے تنذیر کا موجب بن سکتا ہے جو زندہ ہیں"۔ قرآنی رہنمائی کی روشنی کے متعلق سورہ الانعام میں ہے: اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا (۶/۱۲۳) "ذرا سوچو، کہ وہ شخص جو مردہ ہو، پھر اُسے زندگی عطا کر دی جائے اور اُسے ایک شمعِ ہدایت دیدی جائے جس کی روشنی میں وہ دنیا میں چلے پھرے۔ کیا یہ شخص اس کے برابر ہوگا جو ایسے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرے، جس سے نکلنے کی کوئی راہ نہ ہو"۔

میدانِ جنگ تو ہوتا ہی طبیعی موت کی آماجگاہ ہے۔ لیکن قرآن کریم میں جہاد (جنگ) کے لئے بلانے کو زندگی کی طرف دعوت، کہکر پکارا گیا ہے۔ فرمایا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (۸/۲۴) "اے جماعتِ مومنین! تم اللہ اور رسول کی اُس دعوت پر لبیک کہو جو تمہیں زندگی عطا کرنے کے لئے دی جاتی ہے"۔

بعث کا مفہوم

ان، اور انہی جیسے دیگر متعدد مقامات سے واضح ہے کہ موت کے معنے ہر جگہ طبیعی موت نہیں۔ اس کے بعد آیۂ زیرِ نظر (۲/۵۶) میں دوسرا لفظ بعث ہے۔ اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں جو چیز آزادانہ نقل و حرکت کی راہ میں حائل ہو اُسے راہ سے ہٹا دینا۔ مختلف رکاوٹوں کو دور کر کے کسی کی حرکت کو جاری کر دینا۔ اس اعتبار سے اس کے معنے کسی کو اُٹھا کھڑا کر دینے کے بھی ہوتے ہیں۔ بعثتِ انبیاء کا یہی مفہوم ہے۔ اور بَعَثَ بَعْدَ الْمَوْتِ کے معنے ہیں، موت کے بعد زندگی عطا کر دینا۔ قرآن کریم میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا کہ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (۱۷/۷۹)۔ "تمہارے راستے کی تمام رکاوٹوں کو دُور کر کے، تمہیں بہت جلد مقامِ محمود تک پہنچا دیا جائے گا"۔

ان مفاہیم کی رُو سے آیۂ زیرِ نظر کا مفہوم یہ ہوگا کہ بنی اسرائیل نے اپنی عقل و بصیرت کی صلاحیت بھی کھو دی تھی اور حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کو بھی پسِ پشت ڈال دیا تھا جس کی وجہ سے وہ اس قسم کے تقاضے کر دیا کرتے تھے کہ ہم خدا کو بے نقاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ان کی فکری اور اعتقادی موت تھی جس سے ان پر جمود طاری ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں پھر ایک موقعہ عطا کیا۔ ان کی اس ذہنی اور اخلاقی موت کے بعد، ان کے موانعات کو دور کر کے اُنہیں

پھر سے حیاتِ تازہ عطا کر دی تاکہ ان کی کوششیں ضائع نہ ہوں بلکہ بھرپور نتائج پیدا کر دیں۔ چنانچہ سورۃ الاعراف میں اس واقعہ کے ضمن میں کہا: اِنۡ هِیَ اِلَّا فِتۡنَتُكَ ۚ تُضِلُّ بِهَا مَنۡ تَشَآءُ وَتَهۡدِیۡ مَنۡ تَشَآءُ (۷/۱۵۵) "یہ ایک بھٹی تھی جس میں سے وہ گزرے۔ ہو سکتا تھا کہ وہ اس میں بھسم ہو کر راکھ ہو جاتے یعنی انہیں کبھی سیدھا راستہ دکھائی نہ دیتا لیکن خدا نے اپنے قانونِ مشیت کی رو سے ان کی پھر سے سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کر دی"۔ یہ تھی موت کے بعد ان کی دوبارہ زندگی۔

جہاں تک راستے کے موانعات کے دور کر دینے (بعث) کا تعلق ہے، ان کی طبیعی زندگی کی مشکلات اور پریشانیاں بھی دور کر دیں اور انسانی زندگی کی بھی۔ طبیعی زندگی کی سہولتوں کے متعلق فرمایا:۔

۲/۵۷ وَظَلَّلۡنَا عَلَیۡكُمُ الۡغَمَامَ وَاَنۡزَلۡنَا عَلَیۡكُمُ الۡمَنَّ وَالسَّلۡوٰی ؕ كُلُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ ؕ وَمَا ظَلَمُوۡنَا وَلٰكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ۔

"اے بنی اسرائیل! تم خدا کی ان نعمتوں کو بھی یاد کرو کہ اس نے ان صحراؤں میں، تمہارے سر پر بادلوں کے سائے کر دیئے۔ کھانے کے لئے من و سلویٰ جیسی غذا عطا کر دی جس کے لئے تمہیں کچھ محنت اور مشقت کرنی نہیں پڑتی تھی......"

ظِلّ کے معنی

یہاں بادلوں کے ساتھ ظَلَّلۡنَا کا لفظ آیا ہے۔ اس کے بنیادی معنے سایہ کے ہوتے ہیں چونکہ عربوں کا ملک نہایت گرم ہے اور وہاں درختوں کی بہت کمی، اس لئے ان کے ہاں سایہ، راحت و آسائش کے عظیم ترین اسباب میں سے سمجھا جاتا ہے۔ اس بنا پر وہ راحت و آسائش کی ہر شے کو "ظِلّ" سے تعبیر کرتے تھے۔ حتیٰ کہ جنت کو بھی ظِلّ کہہ کر پکارتے تھے۔ اسی نہج سے قرآن کریم نے جنت کے سلسلے میں ظِلٌّ کا لفظ متعدد مقامات پر استعمال کیا ہے (ملاحظہ ہوں ۵۶/۳۰؛ ۱۳/۳۵ وغیرہ)۔ لہٰذا آیۂ زیرِ نظر میں ظَلَّلۡنَا کے لفظ میں آسائش و راحت کا مفہوم بھی شامل ہے۔

لفظِ غمام جمع ہے غَمَامَةٌ کی۔ اس کے بنیادی معنے کسی چیز کو ڈھانپ لینے کے ہیں۔ اور چونکہ بادل، سورج کو ڈھانپ لیتا ہے اس لئے عرب اس لفظ کو بادلوں کے معانی میں بھی استعمال کرتے تھے۔

آیت میں، من و سلویٰ کے ساتھ، اَنۡزَلۡنَا آیا ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ سینکڑوں مقامات پر آیا ہے۔ اس کے بنیادی معنے بلندی سے نیچے کی طرف آنے کے ہیں لیکن اس کا مجازی استعمال متعدد انداز میں ہوتا ہے۔ جو چیز خدا کی طرف

نزول کے معنی

سے عطیہ کے طور پر ملے اس کے لئے یہ لفظ عام طور پر آتا ہے۔ اسی لئے بارش اور زمینی پیداوار کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً سورۃ الحدید میں ہے وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ (۵۷/۲۵)۔ "اور ہم نے لوہا نازل کیا"۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنے معدنیات کے بلا مزد و معاوضہ عطا ہونے کے ہیں۔ (یہاں ہم اس لفظ کے انہی معانی تک محدود رہتے ہیں۔ نزولِ قرآن کریم کے سلسلے میں تفصیلی گفتگو اپنے مقام پر کی جائے گی)۔

آیۂ زیرِ نظر میں کہا کہ خدا نے تمہیں منّ اور سلوٰی بلا مزد و معاوضہ عطا کر دیا۔ منّ، شیر خشت یا ترنجبین کی قسم کی ایک میٹھی اور بڑی لذیذ گوند ہوتی ہے جو صحرا کی جھاڑیوں پر جم جاتی ہے۔ لیکن منّ کے معنے احسان کے بھی ہیں۔ اس لئے اس لفظ میں کنایۃً یہ مفہوم بھی شامل ہو گا کہ یہ غذا تمہیں خدا کی طرف احساناً عطا ہوئی تھی۔ اسی طرح

منّ وسلوٰی

سلوٰی بٹیر کی قسم کا ایک پرندہ ہوتا ہے لیکن (مادہ کے اعتبار سے) اس سے مراد ہر وہ شے ہے جو کسی کے لئے وجہ تسلّی ہو۔ بنابریں من وسلوٰی کے الفاظ میں طبعی غذا کے ساتھ معنوی کنایات بھی شامل ہیں۔ (سایہ فگن بادلوں اور من وسلوٰی کا ذِکر ۷/۱۶۰؛ ۲۰/۸۰-۸۱ میں بھی آیا ہے)۔

رہنے کے لئے کھلی فضا، سایہ کے لئے بادل، کھانے کے لئے من وسلوٰی اور عقب کی طرف سے حفاظت کے لئے طور جیسا پہاڑ، جس کا ذکر (۲/۶۳؛ ۲/۹۳؛ ۴/۱۵۴) میں بھی آیا ہے۔

یہ ان کی طبیعی زندگی کے لئے سامان نشو ونما تھا۔ سیکولر نظام میں بات یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن قرآن کریم طبیعی سامانِ حیات سے متمتع ہونے کے لئے ایک شرط بھی عائد کرتا ہے اور وہ یہ کہ كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (۲/۵۷)۔ اس نے رزق کے ساتھ "طیّب" کی شرط التزاماً لگائی ہے اور یہی شرط قرآن کے معاشی نظام کو کمیونزم کے نظام سے

رزقِ طیّب کا مفہوم

متمیز اور ممتاز کرتی ہے۔ اس سلسلے میں طیّب کا مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے۔ لغت کی رُو سے اس کے بنیادی معنی ہر وہ چیز ہے جو طبیعی طور بھی انسان کے لئے پسندیدہ خوشگوار، خوش ذائقہ اور ممدِ صحت ہو اور وہ انسانی ذات کے لئے بھی نشو ونما اور بالیدگی کا موجب ہو۔ قرآن کریم نے کھانے کی بعض چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اور باقی چیزوں کے متعلق کہا ہے کہ وہ حلال ہیں۔ لیکن حلال کے ساتھ اس نے طیّب کا اضافہ بھی کیا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ کھانے پینے کی حلال اشیاء میں سے تمہیں جو پسند ہوں، جو تمہارے لئے خوشگوار ہوں، جو ممدِ صحت ہوں، انہیں کھاؤ پیو۔ یعنی یہ نہیں کہ ہر حلال چیز کے کھانے کا حکم دیدیا گیا۔

قرآن کریم نے انسان کے حسنِ ذوق کی رعایت بھی رکھی ہے۔ اسی لئے حلال چیزوں میں سے انتخاب انسان کی پسندیدگی پر چھوڑا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک انسانی ذات کا تعلق ہے اس کے لئے طیّب وہی رزق ہو گا جو قوانینِ خداوندی کے مطابق (جائز اور حلال طریق سے) حاصل کیا گیا ہو۔ اس اعتبار سے قرآن کریم میں ہے مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۶/۹۷)" جو مومن بھی ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ شامل کرے گا، خواہ وہ عورت ہو، خواہ مرد، ہم اسے نہایت طیب زندگی عطا کریں گے اور ان کے حسنِ عمل کا نہایت حسین نتیجہ مرتب کریں گے۔ یعنی ان کی حیاتِ طیبہ ان کے ایمان اور حسنِ عمل کا فطری نتیجہ ہوگی" ظاہر ہے کہ اس میں دنیاوی زندگی کی خوشگواریوں کے علاوہ، انسانی ذات کی نشو و نما بھی شامل ہے اور یہی وہ چیز ہے جو طبعی طور پر خوشگوار رزق کو رزقِ طیب بناتی ہے۔ حلال اور طیب رزق کے ضمن میں تفصیلی گفتگو پہلی جلد میں بھی ہو چکی ہے (ملاحظہ ہوں آیات ۲/۳؛ ۲/۱۱-۱۲؛ ۲/۲۲؛ ۲/۲۹) اور اس جلد میں بھی (زیر آیت ۲/۵۴)۔ لہٰذا اس نکتہ کی مزید وضاحت کی یہاں ضرورت نہیں بجز ایک نکتہ کے۔ اور وہ یہ کہ رزق کے طیب ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اسے کوئی شخص اپنے لئے مخصوص کر کے نہ دبا بیٹھے۔ وہ تمام ضرورتمندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا ہو۔ اس میں سب حاجتمند برابر کے شریک ہوں۔ چنانچہ یہ شرط بنی اسرائیل پر بھی عائد کی گئی تھی۔ بائبل میں ہے کہ جب بنی اسرائیل کو خدا کی طرف سے من و سلویٰ ملا تو حضرت موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ:۔

> یاد رکھو۔ یہ وہ روٹی ہے جو خداوند نے تمہیں کھانے کو دی ہے۔ خدا کا حکم یہ ہے کہ اس میں سے ہر ایک بقدر اپنے کھانے کے لے، اور جس کے خیمے میں جتنے لوگ ہوں، ایک اُدمری کس کے حساب سے جمع کرے۔ اس سے زیادہ کوئی شخص جمع نہ کرے جس نے ایسا کیا اس کے رزق میں کیڑے پڑ جائیں گے۔
>
> (خروج ۔ ۱۶/۱۶-۲۰)

اس انداز کو قرآن کریم رزق کے طیب ہونے کی ایک شرط بتاتا ہے۔

قرآن کریم نے یہ کچھ کہنے کے بعد ایک اور عجیب نکتہ کی بھی وضاحت کر دی ہے۔ نزولِ قرآن کے زمانے کے لوگوں اور ان کے بعد آنے والوں کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ تم جو یہودیوں کی اس قدر ذلت و نکبت کی زندگی دیکھ رہے ہو تو یہ نہ سمجھو کہ ہم نے ان پر خواہ مخواہ ظلم کر رکھا ہے۔ ہم نے تو انہیں اس قدر نعمتوں سے نوازا تھا لیکن انہوں نے ان نعمتوں کی ناقدر شناسی کی اور اس طرح اپنے آپ پر خود ظلم کیا جس کا نتیجہ ان کی ذلت و خواری کی شکل میں نمودار ہوا۔ ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا ——— ہم کسی پر ظلم کیا ہی نہیں کرتے۔

بنی اسرائیل کو، قومِ فرعون کی غلامی سے نجات دلائی گئی۔ اس کے بعد انہیں صحرائے سینا میں بسایا گیا۔ اگرچہ ان کی زندگی کی اس منزل میں بھی انہیں بہت سی نعمتوں سے نوازا گیا لیکن یہ ان کی زندگی کا منتہیٰ اور مستقل مستقر نہیں تھا۔ یہ تو محض راستے میں سستانے کا مقام تھا۔ ان کا آخری مقام کچھ اور تھا جس کا ذکر سورۃ القصص میں ان الفاظ میں آیا ہے کہ: وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ۔ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ (۲۸/۵-۶)۔ "ہمارا پروگرام یہ تھا کہ یہ قوم، جسے فرعون کے ظلم و استبداد نے اس قدر کمزور اور ناتواں بنا کر رکھ دیا تھا، ان پر اپنا احسان کریں۔ انہیں مملکتِ فرعون ہی کے ایک علاقہ کا وارث بنائیں۔ وہاں انہیں تمکن عطا کریں اور اس طرح دیگر اقوام کی امامت ان کے حصے میں آجائے۔" (نیز ۷/۱۳۷، ۲۶/۵۷-۵۹ و ۳۲/۲۴)۔ اس کی طرف اگلی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے جہاں کہا ہے:۔

۲/۵۸ وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ ۚ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ۔

اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے: "اور جب ہم نے کہا داخل ہو جاؤ اِس شہر میں اور کھاتے پھرو اس میں، جہاں چاہو فراغت سے اور داخل ہو دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے اور حِطَّۃٌ کہتے ہوئے۔ بخش دیں گے ہم تمہارے گناہ اور نیکی کرنے والوں کو زیادہ بھی دیں گے۔"

خلافتِ ارضی

اس آیت میں قریہ سے مراد کوئی خاص بستی نہیں بلکہ فلسطین کی سرزمین ہے جس کا انہیں وارث بنانا مقصود تھا۔ اُس سرزمین کے متعلق چار الفاظ میں یہ بتایا کہ وہاں تمہیں جنتِ ارضی کی زندگی نصیب ہو جائے گی۔ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا کے الفاظ جنتِ آدم کے سلسلے میں آیت (۲/۳۵) میں آچکے ہیں۔ وہاں سے معلوم ہو جائے گا کہ اس سے مقصود کیا تھا۔ بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ یہ سرزمین تمہارے نام لکھدی گئی ہے۔ اب تم آگے بڑھو اور اس کا قبضہ لے لو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں خاص تنبیہ بھی کردی اور یہ وہ تنبیہ ہے جو کسی ملک میں عام فاتحین اور مومنین کے لشکر کے داخل ہونے میں بیّن امتیاز پیدا کر دیتی ہے۔ عام فاتحین کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ مفتوحہ علاقے میں داخل ہوتے ہیں تو قوت کا نشہ انہیں بدمست کر دیتا ہے جسکی وجہ سے وہ مفتوح و مغلوب آبادی کو ایسے ظلم و ستم کا نشانہ بناتے ہیں جس سے انسانیت کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ سابقہ اقوام کے سلسلے میں تاریخ کے خونی اوراق، فاتح قوم کی اس وحشت و بربریت

کی داستانوں سے ملوث ہیں اور عصرِ حاضر کی اقوام، مفتوحہ علاقوں کے ساتھ کیا کچھ کرتی ہیں وہ ہمارے آنکھوں دیکھے مناظر ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو ملکۂ سبا کے ان عبرت آموز الفاظ میں تمام دنیا کے لئے باعثِ موعظت بنایا ہے کہ: قَالَتْ إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً ۖ وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ (۲۷/۳۴)" ملکہ سبا نے اپنے وزیروں اور مشیروں سے پوچھا کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی چٹھی کا کیا جواب دینا چاہئے اور اس کے ساتھ ہی ان سے کہا کہ اپنا مشورہ دیتے وقت اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا کہ جب بادشاہ، کسی ملک میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوتے ہیں تو وہاں کیا کچھ کرتے ہیں۔ وہ وہاں کی ہر شے کو تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں۔ وہ وہاں کے معزز اور سربرآوردہ ابنائے قوم کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں ـــــ اور اسے بھی فراموش نہ کرنا کہ کسی خاص بادشاہ کی روش نہیں، یہ ملوکیت کا خاصہ ہے۔ بادشاہ ہر جگہ اور ہر زمانے میں ایسا ہی کرتے ہیں۔ اور یہی تھی قوت کے نشہ میں مدہوش ملوکیت کی وہ ذہنیت، جسے بدلنے کے لئے بنی اسرائیل کو تنبیہ کی گئی کہ اس سرزمین میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہونا تو اس انداز سے کہ تمہاری گردنیں قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکی ہوئی ہوں (سُجَّدًا)۔ دیکھنا! تمہارے سر میں سرکشی کے جذبات نہ اُبھر آئیں

مسلم فاتحین کی خصوصیت

ان بستیوں میں متکبر اور جبار بن کر داخل نہ ہونا۔ اپنے سر کو جھکاتے ہوئے داخل ہونا۔ اس کے ساتھ دوسرا لفظ حِطَّةٌ ہے۔ اور یہ تنبیہ بھی بڑی عبرت آموز ہے۔ ظاہر ہے کہ جنگ و جدال میں سپاہیوں سے کوئی نہ کوئی لغزش سرزد ہو جاتی ہے۔ کہا کہ فاتحانہ طور پر داخل ہوتے وقت اپنی ان لغزشوں پر نظر رکھنا جو تم سے سرزد ہو چکی ہوں۔ جب تمہاری نگاہیں اپنی لغزشوں پر مرکوز ہوں گی تو تمہارے دل میں تمرّد اور سرکشی کے جذبات نہیں ابھریں گے۔ فروتنی اور انکسار کے جذبات بیدار ہوں گے۔ اور دوسری بات یہ یاد رکھنا کہ اس سرزمین کو اب تمہارا مستقر بننا ہے اس لئے اس کا بھی خیال رکھنا کہ اگر تم نے وہاں کسی چیز کو تباہ اور برباد کر دیا تو وہ تباہی اور بربادی خود تمہاری ہوگی کیونکہ وہ چیزیں تو اس کے بعد خود تمہاری اپنی زندگی کا سامانِ زیست بننے والی ہیں۔ انہیں دشمن کی چیزیں نہ سمجھنا، اپنی سمجھنا۔

لغت کی رو سے حِطَّةٌ کے یہ دونوں معانی ہیں ـــــ اپنی لغزشوں کی معافی مانگنا اور اس منزل پر سامانِ سفر کو اتار دینا۔ یہی تھی وہ تلقین، جو حضور نبیِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی لسانِ مبارک سے خود جماعتِ مومنین سے کی گئی جب کہا کہ إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۔ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا (۱۱۰/۱-۳)" جب خدا کی نصرت تمہارے شاملِ حال ہو جائے تمہارے سامنے فتوحات کے دروازے کھل جائیں اور تمہارے نظام کے ان خوشگوار نتائج کو دیکھ کر

لوگ فوج در فوج خدا کے دین میں داخل ہونے شروع ہو جائیں تو اس وقت یہ نہ سمجھ لینا کہ اب مقصد حاصل ہو گیا۔ اصل پروگرام تو اس وقت شروع ہو گا۔ اس لئے تم خدا کے نظامِ ربوبیت کی تکمیل کے لئے پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ سرگرمِ عمل رہنا اور خدا سے سامانِ حفاظت طلب کرنا۔ وہ تمہاری کوتاہیوں اور لغزشوں کے نقصان رساں نتائج سے محفوظ رکھے گا۔ یہی تھی وہ تنبیہ جو بنی اسرائیل کو کی گئی اور اس کا نتیجہ بھی انہی الفاظ میں بیان کیا گیا کہ نَغۡفِرۡ لَكُمۡ خَطٰيٰكُمۡ (۲/۵۸)۔ یہاں مغفرت کا لفظ پہلی بار آیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے صحیح مفہوم کا سامنے آنا نہایت ضروری ہے۔

مغفرت کے معنی

قرآنِ کریم کی رو سے قانونِ مکافاتِ عمل اور جزا اور سزا کا قرآنی مفہوم آیات (۲/۴۸ ؛ ۲/۵۲) میں سابقہ صفحات پر بیان کیا جا چکا ہے۔ اس سے عمومی طور پر مغفرت کا مفہوم بھی واضح ہو جائے گا اور یہ حقیقت بھی سامنے آ جائے گی کہ ہمارے ہاں جو کہا جاتا ہے کہ "گناہ بخشے جائیں گے" تو یہ تصور بھی قانونِ مکافات کے خلاف ہے۔ سفارش (شفاعت) کا عملی مقصد بھی تو یہی ہوتا ہے کہ مجرم کو بخش دیا جائے۔ اُسے اس کے جرائم کی سزا نہ دی جائے۔ جب قرآنِ کریم کی رو سے کسی مجرم کی سفارش نہیں ہو سکتی تو اس کے جرائم یا گناہوں کے بخشے جانے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ لغت کی رُو سے غَفۡرٌ کے معنے ہیں کسی کو ایسی چیز پہنا دینا جس سے وہ نقصان رساں چیزوں سے محفوظ رہے۔ چنانچہ اَلۡمِغۡفَرُ زرہ کی طرح آہنی حلقوں سے بنی ہوئی جالی کو کہتے تھے جو خَود کے نیچے پہنی جاتی تھی اور جو گردن اور مونڈھوں کو اس طرح ڈھانپ لیتی تھی کہ ان پر تلوار وغیرہ کا اثر نہیں ہوتا تھا اور اس طرح اس کا پہننے والا حملہ آور کے وار سے محفوظ رہتا تھا۔ اس مادہ کے اس بنیادی مفہوم کی روشنی میں مغفرت کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ جسمانی طور پر دیکھئے تو انسان پر ہر آن ایسے جراثیم کا حملہ ہوتا رہتا ہے جو اس کی صحت اور آخرالامر اس کی زندگی کو تباہ کر دیں۔ لیکن فطرت نے انسان کے اندر ایسی قوتِ مدافعت رکھی ہے جو اِن تخریبی عناصر کا مقابلہ کرتی ہے اور ان پر غالب آ کر انہیں ہلاک کر دیتی ہے۔ یوں انسان ہلاکت سے محفوظ رہتا ہے۔ اگر کبھی یہ تخریبی عناصر وبائی امراض کی شکل اختیار کر لیں تو لوگوں کو حفاظتی تدابیر (PREVENTIVE MEASURES) اختیار کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ لیکن اگر کسی کی قوتِ مدافعت کمزور ہو جائے اور یہ تخریبی عناصر غلبہ پا لیں تو معالج اس بیمار کی قوتِ مدافعت بڑھانے کی تدابیر اختیار کرتا ہے۔ اگر یہ قوت بڑھ جائے تو یہ ان تخریبی عناصر کو ہلاک کر دیتی ہے۔ ان تدابیر کو (CURATIVE MEASURES) کہا جاتا ہے۔ حفظِ ماتقدم کی تجاویز ہوں یا علاج کی تدابیر، انہیں بہر حال ہلاکت سے محفوظ رکھنے کی تدابیر کہا جائے گا۔ طبیعی زندگی میں یہ مغفرت ہے اور ایسی تدابیر طلب اور اختیار کرنے کو

استغفار کہکر پکارا جائے گا ـــ استغفار کے معنی ہیں مغفرت (حفاظت) طلب کرنا۔

طبیعی زندگی کی طرح انسانی ذات کی زندگی کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس کی نشوونما اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان عناصر کے حملوں سے بچنے کے لئے حفاظتی تدابیر اختیار کی جائیں جو اس کی تخریب کا موجب ہوں۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ وہ تخریبی عناصر انسانی ذات پر غالب آجائیں تو پھر ایسی تدابیر کی ضرورت اشد ہو جائے گی جو انسانی ذات کی تقویت کا موجب بنیں۔ یعنی اقدارِ خداوندی پر اور شدت سے عمل کیا جائے۔ اس پروگرام کے مطابق حفاظت مل جانے کو مغفرت کہا جائے گا۔ چنانچہ قرآن کریم نے اسے میزان کی تشبیہ سے محسوس طور پر سمجھایا ہے اس نے کہا ہے کہ انسانی زندگی کے دو پلڑے ہیں۔ ایک پلڑے میں تعمیری عناصر (نیکیاں) ہوتی ہیں اور دوسرے میں تخریبی عناصر (برائیاں یا گناہ)۔ مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ (۱۰۱/۶-۷)۔ "جس کا نیکیوں کا پلڑا جھکا رہے گا وہ خوشگوار زندگی بسر کرے گا"۔ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (۱۰۱/۸-۹)۔ لیکن جسکا یہ پلڑا ہلکا ہو جائے گا وہ تباہی کے جہنم میں جا گرے گا۔ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے تو اس وقت تباہی سے بچنے کی ایک ہی شکل ہو سکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان کے تعمیری اعمال کے پلڑے میں اور وزن ڈال دیا جائے یعنی زیادہ سے زیادہ تعمیری کام کئے جائیں۔ اس طرح تباہی سے حفاظت مل جانے کو مغفرت کہا جاتا ہے اور استغفار کے معنے ہوتے ہیں اس حفاظت کے لئے جدوجہد کرنا۔ قرآن کریم نے دو لفظوں میں بتا دیا ہے کہ تباہی سے یہ حفاظت ملتی کیسے ہے۔ اور یہ وہ بنیادی اصول ہے جو اس تمام مسئلہ کی نہایت عمدگی سے وضاحت کر دیتا ہے۔ اس نے کہا کہ:-

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴؛ نیز ۱۳/۲۲؛ ۲۳/۹۶؛ ۲۸/۵۴)۔

یاد رکھو! تباہی سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ تم زیادہ سے زیادہ تعمیری (نیک کام) کرو۔
سیئات کو حسنات ہی دور کر سکتی ہیں۔
تمہاری حسنات کا وزن تمہارے تعمیری پلڑے کو جھکا دے گا۔ اسے خدا کی مغفرت کہا جاتا ہے۔

بخشش کا غیر قرآنی تصوّر

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے مغفرت کا تصور۔ لیکن اس کے معنے "بخشش" کر دینے سے قوم پر جو تباہیاں آئیں اور آرہی ہیں ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ قوم تباہ کن جرائم پر جرائم کئے چلی جا رہی ہے، اخلاقی پستیوں کی آلائش میں ملوث ہوتی جا رہی ہے۔ اور اس کے باوجود مطمئن ہے کہ خدا یہ سب کچھ بخش دے گا۔ اس بخشش کے لئے کرنے کا کام اتنا

ہی ہے کہ خدا سے دعا مانگتے رہو کہ یا اللہ بخش دے۔ یا۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّی مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْهِ کی تسبیحیں پھیرتے رہو۔ یہ ہے وہ فریبِ نفس جس نے ہماری قوم کو جرائم اور بداخلاقیوں پر اسقدر جری کر دیا ہے۔ جب یقین یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ سب جرائم بخش دے گا تو پھر وہ کونسا احساس ہے جو انسان کو غلط کوشیوں سے باز رکھ سکے؟ قرآنِ کریم نے قدم قدم پر کہا کہ جنت صِرف تمہارے اعمال کے بدلے میں ملے گی۔ لیکن ہم ہیں کہ جنت بھی خدا سے بخشش کے طور پر مانگتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے کسقدر درد و سوز سے (بظاہر طنزیہ انداز میں) کہا ہے کہ :-

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم است ⁂ بہشتے بہرِ اربابِ ھمم ہست
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش ⁂ بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست

(ارمغانِ حجاز)

اور اس "فی سبیل اللہ" عطا شدہ بہشت کے متعلق وہ دوسری جگہ کہتے ہیں :-

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ ⁂ تا جزائے عملِ تست جناں چیزے ہست

اور یہ کہکر انہوں نے جزائے عمل کے قرآنی مفہوم کو ایک مصرعے میں سمو کر رکھ دیا، کہ :-

جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ اس سرزمین میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہو تو خدا کے حضور سر جھکاتے ہوئے اور اپنی لغزشوں کے تباہ کن نتائج سے سامانِ حفاظت طلب کرتے ہوئے داخل ہو۔ ایسا کروگے تو ہم تمہیں ان نقصانات سے بھی محفوظ رکھیں گے اور وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ (۲/۵۸) اس پر کچھ اضافہ بھی کریں گے۔ یہ "اضافہ" مزید حسنات کا متقاضی ہے۔

محسنین کا مادہ (ح-س-ن) ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت (قبل از اسلام) کے عرب بالعموم جاہل، گنوار اور وحشی تھے جنہیں نہ ذوقِ سلیم سے کوئی واسطہ تھا، نہ حسِ لطیف سے کوئی بہرہ۔ ایسا سمجھنا صحیح نہیں۔

حسن کا مفہوم

زیادہ تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں، لیکن ان کے ذوقِ لطیف کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ ان کے ہاں حسن کی تعریف تھی "صحیح صحیح توازن اور تناسب" (PROPORTION) ہم سمجھتے ہیں کہ حسن کی اس سے بہتر اور جامع تعریف ہو نہیں سکتی۔ اور یہ بات وہی قوم کہہ سکتی ہے جسے ذوقِ سلیم اور حسِ لطیف کا بہرہ وافر عطا ہوا ہو۔ حسن کا نام ہی صحیح تناسب کا ہے۔ کسی حسنِ مجسم، پری پیکر کی ایک آنکھ کی سیاہی بال برابر اپنے مقام سے ہٹی ہوئی ہو تو اس کی ساری رعنائیاں شرمندہ ہو کر رہ جاتی ہیں اور ذوقِ لطیف اس سے اِبا

کرنے لگ جاتا ہے۔ توازن کا ذرا سا بگاڑ بھی حسن کو ختم کر دیتا ہے۔

اور قرآنِ کریم کو دیکھئے کہ اس نے صحیح اعمال کو حسنِ عمل کہہ کر پکارا ہے۔ اور ان کی جزا یا نتیجہ کو بھی حسن سے تعبیر کیا ہے جیسا کہ ہم انسان اور نفس کے عنوانات میں بتا چکے ہیں، انسان کو مختلف قسم کی صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں جو ایک دوسرے سے متضاد بھی ہیں۔ ان متضاد صفات یا صلاحیتوں میں صحیح صحیح توازن برقرار رکھنا، حسنِ عمل کی معراج ہے۔ صفاتِ

الاسماء الحسنیٰ

خداوندی کے لئے قرآنِ کریم میں اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (۵۹/۲۴) کے الفاظ آتے ہیں۔ اس لئے کہ خدا کی ذات وہ ہے جس میں مختلف صفات اپنے پورے پورے تناسب و توازن کے ساتھ انتہائی حسن کارانہ انداز سے یکجا جمع ہیں یہی انداز جب (علیٰ حدِ بشریت) انسانی ذات میں پیدا ہو جائے تو اُسے "خدا کے رنگ میں رنگے جانے" سے تعبیر کیا جائے گا۔ (۲/۱۳۸)۔ تخلیقِ کائنات کے سلسلے میں قرآنِ کریم میں کہا گیا ہے: اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ (۳۲/۷)۔ "خدا نے کائنات کی ہر شے کو بہترین تناسب کے ساتھ پیدا کیا ہے۔" اس نہج سے خدا کو: اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ (۲۳/۱۴) کہا گیا ہے۔ خدا نے جو دین انسانوں کے لئے متعین کیا وہ بھی احسن ہے۔ چنانچہ سورۃ النسا میں ہے: وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ (۴/۱۲۵)۔ "اس نظامِ زندگی سے زیادہ حسین نظام اور کونسا ہو سکتا ہے جس میں ہر فرد اپنے جذبات، توجہات، بلکہ پوری کی پوری ذات کو قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکا دے اور اس طرح نہایت حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرے۔" ایسا دین عطا کرنے والے خدا کے متعلق کہا: وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا (۵/۵۰)۔ "خدا سے بڑھ کر احسن احکام دینے والا کون ہو سکتا ہے؟" اسی جہت سے خود قرآنِ کریم کو اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ (۳۹/۲۳) کہا گیا۔ سورۃ اللیل میں ہے وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى (۹۲/۸-۹)۔ "جو شخص سب کچھ سمیٹ کر اپنے لئے رکھ لیتا ہے اور پھر اس خیال میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے کہ مجھے کسی کی احتیاج نہیں اور معاشرے کے حسن کو بگاڑ دیتا ہے۔" آپ نے دیکھا کہ قرآنِ کریم نے نظامِ سرمایہ داری کے متعلق کہا ہے کہ اس سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے اس سرمایہ داری کے نمائندہ "قارون" کے بارے میں کہا کہ: وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ (۲۸/۷۷)۔ "جس طرح خدا نے تمہاری ہر کمی کو دور کر دیا ہے اسی طرح تمہیں بھی چاہیئے کہ تم معاشرے کی ناہمواریاں دور کرو اور ملک میں فساد مت برپا کرو۔ خدا فساد برپا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔" معاشرے میں حسن پیدا کرنے یعنی اس کی ناہمواریاں دور کرنے کے لئے بنی اسرائیل (اور خود جماعتِ مومنین) سے کہا گیا کہ: وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (۵/۱۲)۔ عام ترجمہ تو ان الفاظ کا یہ ہے کہ "تم اللہ کو قرضِ حسنہ دو۔" لیکن ظاہر ہے کہ اس سے مفہوم یہ ہے کہ جس کے پاس زائد از ضرورت دولت ہو وہ دوسروں کی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے دیدے تاکہ اس طرح معاشرے کا حسن (توازن) برقرار رہے۔ دوسری جگہ یہ کہا کہ: اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ (۱۷/۷)۔ "اگر تم اس طرح معاشرے کے بگڑے ہوئے توازن کو برقرار کر دو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ خود تمہاری ذات

کا توازن برقرار رہے گا"۔ یہاں سے ہمارے سامنے یہ حقیقت آ گئی کہ قرآنِ کریم کی رو سے اعمالِ حسنہ یا حسنات کے معنے کیا ہیں۔ اس سے مراد ہیں ایسے کام، جن سے معاشرے کا بگڑا ہوا توازن درست ہو جائے اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ ایسے کام کرنے والوں کی اپنی ذات کا بھی توازن برقرار رہے۔ عصرِ حاضر کی اصطلاح میں اسے متوازن شخصیت (BALANCED PERSONALITY) کہا جائے گا۔ اس قسم کے کام کرنے والوں کو قرآنِ کریم میں محسنین کہہ کر پکارا گیا ہے اور اس سلسلے میں کہا ہے کہ حضرات انبیائے کرام سب محسنین تھے (۲/۸۵)

عدل و احسان

قرآنِ کریم نے کہا ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (۱۶/۹۰) "تمہیں اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے"۔ عدل کے معنے تو یہ ہیں کہ جو کچھ کسی کا واجب ہے اسے دیدیا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر اس سے اس کی ضروریات پوری نہ ہو سکتی ہوں تو کیا اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے؟ یہ قرآنی نظامِ ربوبیت کے بنیادی تصور کے خلاف ہے۔ کہا کہ نہیں۔ اس کی کمی کو پورا کیا جائے تاکہ اس سے اس کا بگڑا ہوا توازن برقرار رہے۔ اسے احسان کہتے ہیں جو قرآنِ کریم کے معاشی نظام کا اصل الاصول ہے۔ قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر حکم دیا ہے: وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (۶/۱۵۲) اس کے معنے یہ ہیں کہ جب والدین ضعیف ہو جائیں تو ان میں مختلف نوعیتوں کی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اولاد کو چاہیئے کہ ان کی اس کمی کو پورا کرے۔ اسی کا نام احسان ہے۔

احسان کا بدلہ احسان

سورۃ الرحمٰن میں ایک عظیم آیت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (۵۵/۶۰)۔ اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ احسان کا بدلہ احسان ہے اور مفہوم اس سے یہ لیا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص تم پر احسان کرے تو تم بھی اس پر احسان کرو اور اس طرح اس کے احسان کا بدلہ چکا دو۔ چنانچہ احسان فراموش کو معاشرے میں بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کا یہ قرآنی مفہوم نہیں۔ قرآنِ کریم نے تو مومنین کی یہ خصوصیت بتائی ہے کہ وہ جب کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کرتے ہیں تو اس سے کہہ دیتے ہیں: لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (۷۶/۹)۔ "ہم نے تمہارے لئے جو کچھ کیا ہے۔ تم سے اس کے بدلے میں کچھ لینا تو درکنار، ہم تو اس کے لئے شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں۔ اس لئے کہ ہم نے یہ کچھ تمہارے لئے نہیں کیا۔ لِوَجْهِ اللّٰهِ کیا ہے۔ جس قرآن کی یہ تعلیم ہو، کیا وہ یہ کہے گا کہ اگر تم کسی پر احسان کرو تو اسے اپنا بے دام غلام بنالو اور جب تک وہ اس کا بدلہ نہ چکا دے اس کے سر پر سوار رہو؟ اس آیۂ جلیلہ کا مفہوم بڑا بلند ہے۔ قرآنِ کریم کہتا یہ ہے کہ معاشرے یا کسی فرد میں کسی قسم کی کمی آ جانے سے اس کا توازن بگڑ جائے، تو تمہارا فریضہ ہے

کہ اس بگڑے ہوئے توازن کو سنوار دو۔ لیکن اس کے لئے کسی معاوضہ یا صلہ کے متمنی مت ہو۔ تم نے بگڑے ہوئے توازن کو برقرار کرنا ہے۔ یہ تمہارا فریضہ ہے۔ وہ برقرار ہو گیا۔ بس یہی تمہاری محنت کا معاوضہ ہے ــــ

ع جلۂ شہید گیا ہے، تب و تاب جاودانہ

اب آیئے آیۂ پیشِ نظر کی طرف، جس میں کہا گیا ہے: نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۚ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ (۲/۵۸)۔ "اگر تم قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکے رہو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تمہاری حفاظت کر دی جائے گی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ تمہارے لئے اس سے بھی زیادہ کیا جائے گا۔ آپ مریض کی مثال کو، جو پہلے بیان کی گئی ہے، ایک بار پھر سامنے لایئے اس میں بتایا گیا ہے کہ جب کسی کی قوتِ مدافعت کم ہو جاتی ہے تو مہلک عناصر اس پر غالب آ جاتے ہیں۔ معالج اس مریض کی قوتِ مدافعت کو بڑھا دیتا ہے جس سے وہ ہلاکت سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ لیکن علاج کا مرحلہ، یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ معالج اسے مزید مقویات دیتا ہے تاکہ اس کی قوتِ مدافعت بڑھ جائے اور وہ اس طرح تخریبی عناصر کے حملوں سے محفوظ رہے۔ یہ ہے مراد وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ (۲/۵۸) سے۔ یعنی اگر تم حُسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرو گے تو تمہیں تمہاری لغزشوں کے نقصان رساں نتائج سے محفوظ ہی نہیں رکھا جائے گا۔ بلکہ تمہاری صلاحیتوں کو اس قدر مستحکم کر دیا جائے گا کہ تم زندگی کے بقیہ سفر کو بھی بخیر و عافیت طے کر سکو گے۔ اس سلسلے میں قرآنِ کریم میں (ایک اور مقام پر) ایسا عمیق نکتہ بیان کیا گیا ہے جس پر غور کرنے سے نگۂ بصیرت رقص کرنے لگ جاتی ہے۔ اس نے اہلِ جنت کے متعلق کہا ہے: لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ (۵۰/۳۵)۔ "اہلِ جنت جو کچھ چاہیں گے، انہیں ملے گا ــــ بلکہ ہماری طرف سے اس سے بھی زیادہ"۔

جو چاہو گے اس سے بھی زیادہ

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب جنت میں، اہلِ جنت کی ہر خواہش پوری ہو جائے گی تو پھر اس سے زیادہ کا کیا سوال پیدا ہو گا؟ قرآن یہ کہتا ہے کہ انسان کی خواہشیں اور آرزوئیں اس دائرے تک محدود ہوتی ہیں جس کے اندر وہ زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔ اس دائرے سے آگے اس کا تصور بھی نہیں جا سکتا لیکن خدا کے پروگرام کی رو سے، انسان نے نہ معلوم زندگی کے کتنے ارتقائی منازل طے کرنے ہیں۔ جنت بھی ان منازل میں سے راستے کا ایک مقام ہے۔ اس سفر کا منتہیٰ نہیں۔ لہٰذا اہلِ جنت کی خواہشات اُس دائرے تک محدود ہوں گی۔ اس سے آگے ان کی نگاہیں جا ہی نہیں سکیں گی۔ لیکن نگۂ خداوندی تو انتہا تک جاتی ہے۔ وہ ان کے حسنِ عمل کے بدلے میں وہ کچھ بھی دے گا جو اُن کی اس وقت کی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرے اور اس کے علاوہ وہ انہیں اس قابل بھی بنا دیگا کہ وہ اس سے اگلی منزل کو بھی بحسن و خوبی طے کر سکیں۔ یہ ہے خواہشات سے زیادہ ملنے

کا قرآنی مفہوم۔ یہ ہیں سَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ کے معنی۔

خدا نے تو بنی اسرائیل کے لئے یہ کچھ چاہا تھا لیکن۔

۲/۵۹ فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ. فَأَنزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ. (نیز ۱۶۲/۷)

ہمارے ہاں کے مفسرین نے بالعموم کہا ہے کہ بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ اس بستی میں داخل ہوتے وقت تم حِطَّةٌ کہنا۔ لیکن انہوں نے حِطَّةٌ کی بجائے حِنْطَةٌ کہا (جس کے معنی گندم ہیں) اور اس کی وجہ سے ان پر عذاب نازل ہو گیا۔ یعنی ایک لفظ کی بجائے دوسرا لفظ کہہ دینے سے ان پر تباہی آگئی۔ یہ مفہوم جس قدر بے معنی ہے اس کے لئے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کا جو عملی نتیجہ ہمارے ہاں مرتب ہوا وہ یقیناً ایسا ہے

الفاظ پر سارا زور

کہ اس پر کھڑے ہو کر غور کیا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم کی آیات کا تلفظ صحیح ہونا چاہیئے لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ آیات کا صرف تلفظ صحیح ہونا چاہیئے خواہ ان الفاظ کے معانی سمجھ میں آئیں یا نہ! اس نظریہ کی رو سے ہمارے ہاں صدیوں سے قرآنی الفاظ کے تلفظ کی صحت کو اس قدر اہمیت دی جا رہی ہے کہ بس اسی کو دین کا مقصود و مطلوب سمجھ لیا گیا ہے۔ اس نے ایک الگ فن کی حیثیت اختیار کر لی، جسے بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ مسلم ممالک کے بڑے بڑے جیّد قاری اس فن کے ماہر ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں کے حفاظ کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ان کے ہاں الفاظ کی صحت پر انتہائی زور دیا جاتا ہے لیکن ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو قرآنی الفاظ کے معانی بھی جانتا ہو۔ کچھ عرصہ سے ہمارے ہاں ایک جماعت پیدا ہو گئی

تبلیغی جماعت

ہے جس کا مشن یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کا "کلمہ درست" کراتی ہے۔ یعنی یہ لوگ ساری زندگی اس "جہاد" میں لگے رہتے ہیں کہ لوگ کلمے کے الفاظ صحیح طور پر ادا کریں۔ بالفاظِ دیگر ان کے نزدیک اس امت پر ساری تباہیاں اس لئے آئی ہیں کہ لوگ کلمے کے الفاظ صحیح طور پر ادا نہیں کرتے۔ اگر امت ان الفاظ کو صحیح طور پر ادا کرنے لگ جائے تو پھر ان کے سب بگڑے ہوئے کام سنور جائیں۔

قرآنی لفظ "قول"، کے معنی "بات" ہیں۔ لیکن خود ہمارے ہاں "بات" کا لفظ جن معانی میں بولا جاتا ہے اس سے "قول کے بدل دینے" کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ ہم ہر روز کہتے ہیں کہ "چلو بھئی! یہاں بات بنتے نظر نہیں آتی"۔ یا یہ کہ "بات بنتے بنتے بگڑ گئی"۔ ظاہر ہے ان فقروں میں بات سے مراد کوئی لفظ نہیں بلکہ معاملہ یا پروگرام

ہے۔ لہٰذا قرآن کریم نے کہا ہے کہ خدا نے جو پروگرام بنی اسرائیل کے سامنے رکھا تھا، انہوں نے اسے یکسر بدل دیا۔ انہوں نے ہماری بات کو بدل دیا۔ یہ ظلم تھا، فسق تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ غضبِ خداوندی کے مستوجب بن گئے۔ یعنی یہاں اللہ تعالیٰ نے خود کہدیا ہے کہ ان پر یہ تباہی اس لئے آئی کہ انہوں نے ظلم اور فسق کی روش اختیار کر لی۔ آئیے ہم دیکھیں کہ ان سے کہا کیا گیا تھا اور انہوں نے کیا کیا؟ سورۃ المائدۃ میں اس کی تفصیل دی گئی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا: یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَرْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ (۵/۲۱) "دیکھو! یہ ارضِ مقدس تمہارے نام لکھدی گئی ہے۔ اٹھو! اور اس کا قبضہ لے لو۔ دیکھنا دشمن کے مقابلے میں پیٹھ دکھا کر نہ بھاگ جانا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو بہت نقصان اٹھاؤ گے" یہ تھی بات جو ان سے کہی گئی تھی۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا: قَالُوْا یٰمُوْسٰۤى اِنَّ فِیْهَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ وَ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى یَخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ (۵/۲۲)۔ "اے موسیٰ! اس

ارضِ مقدس پر قبضہ

سرزمین میں تو بڑے بڑے جابر لوگ رہتے ہیں۔ جب تک وہ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس سرزمین میں قدم نہیں رکھیں گے۔ ہاں اگر وہ لوگ وہاں سے خود ہی نکل جائیں تو پھر ہم ضرور اس میں داخل ہو جائیں گے" ذرا غور کیجئے اس منطق پر کہ دشمن خود بخود اپنے ملک کو خالی کر جاتے، تو پھر ہم آگے بڑھ کر اس پر قبضہ کر لیں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کے ان دو بندوں (موسیٰ اور ہارون علیہما السلام) نے ان سے کہا کہ تم اس قدر بزدل اور دوں ہمت کیوں ہو رہے ہو؟ ذرا آگے بڑھ کر اس زمین پر قدم رکھو۔ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ وَ عَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۵/۲۳) "اگر ایک دفعہ تم نے وہاں قدم رکھ دیا تو پھر غلبہ تمہارا ہی ہوگا۔ یہ بات تم سے خود خدا نے کہی ہے۔ اگر تمہیں ایمان کا دعویٰ ہے تو اس کی بات پر اعتماد کرو" آپ کو معلوم ہے اس کے جواب میں انہوں نے کیا کہا: قَالُوْا یٰمُوْسٰۤى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِیْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (۵/۲۴)۔ وہ بولے، اے موسیٰ! ہم نے ایک دفعہ جو کہدیا کہ جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں، ہم ایک قدم آگے نہیں بڑھائیں گے۔ اگر تم وہاں جانے پر اس قدر ہی تلے بیٹھے ہو تو تم اور تمہارا بھائی دونوں جاؤ۔ ان لوگوں سے جا کر لڑو۔ ہم یہاں بیٹھے انتظار کریں گے۔ جب تم انہیں وہاں سے نکال دو گے تو ہم آجائیں گے" لیجئے جواب مل گیا!!

(ضمناً) اس آیت میں آیا ہے: فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ (۵/۲۴)۔ اس کے معنی یہ بھی کئے جاتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ "تو اور تیرا رب دونوں جاؤ اور ان لوگوں سے لڑو" لیکن عربی زبان میں "رب" بڑے بھائی کو بھی کہتے ہیں۔ میں نے

اسی مفہوم کو اختیار کیا ہے۔ بہر حال اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے تو مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہ سمجھی خدا سے یہ کہا: اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ (۵/۲۵)۔ بارِ خدایا! میں اپنے آپ یا اپنے بھائی کے سوا کسی پر بھی کچھ اختیار نہیں رکھتا۔ اس قسم کی فاسق قوم میں اور ہم ہیں، تو ہی کوئی فیصلہ کر دے۔" اور خدا کا فیصلہ یہ تھا کہ: فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِى الْاَرْضِ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ (۵/۲۶)۔" جب ان کی حالت یہ ہے تو وہ سرزمین، جو ان کے نام لکھدی گئی تھی، چالیس سال تک ان پر حرام کر دی گئی ہے۔ تم انہیں ان جنگلوں اور صحراؤں میں سرگرداں پھرنے دو۔ ہم جانتے ہیں کہ ان کی اس بدنصیبی پر تمہیں تاسف ضرور ہوگا۔ لیکن جس قوم کی روش یہ ہو اس پر افسوس کرنے سے کیا حاصل۔" خدا کا یہ فیصلہ اس کے قانونِ وراثتِ ارض کے مطابق تھا جس میں کہا گیا ہے: اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِىَ الصّٰلِحُوْنَ (۲۱/۱۰۵) زمین کے وارث تو وہی بندے ہو سکتے ہیں جن میں اس کی صلاحیت ہو۔ اس صلاحیت میں صالحیت بھی شامل ہے۔" چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام آب و گل کے ان پیکروں کو چالیس سال تک جنگلوں اور صحراؤں میں لئے لئے پھرتے رہے اور اس کے ساتھ ہی ان کی نوجوان نسل کی تربیت بھی کرتے رہے۔ جب یہ نئی نسل تربیت پا کر جوان ہوئی تو انہوں نے ایک جھپٹا مارا اور فلسطین کی موعودہ سرزمین پر قبضہ کر لیا۔ قوموں کی بازآفرینی کا طریقہ ہی یہ ہے کہ ان کے قدامت پرست، فرسودہ خیال اور رجعت پسند عنصر کو الگ کر کے نئی نسل کے افراد کی تعلیم و تربیت جدید ماحول میں نئے خطوط پر کی جائے تاکہ وہ تازہ ولولے اور زندہ عزائم لے کر ابھریں اور ہر مخالف قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا دیں۔ اسی لئے علامہ اقبالؒ نے اپنی اس آرزو کا اظہار کیا تھا کہ:

من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن　　دارم از روزے کہ می آید سخن
برجوانان سہل کن حرفِ مرا　　بہرِ شاں پایاب کن ژرفِ مرا

اسی لئے ان کی دعا یہ تھی کہ:

جوانوں کو مری آہِ سحر دے　　پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا! آرزو میری یہی ہے　　مرا نورِ بصیرت عام کر دے

بہر حال قرآنِ کریم میں ہے کہ ان کی اس روش کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان پر رِجز کی مار ماری گئی۔ یہاں رِجز کا لفظ بڑا غور طلب ہے۔ (اَلرِّجْزُ) اونٹ کی ایک بیماری کا نام ہے جس میں اس کی ٹانگیں یا جسم کا پچھلا حصہ اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ جب وہ کھڑا ہونے لگے تو اس کی ٹانگیں لڑکھڑانے اور کپکپانے لگ جاتی ہیں اور وہ دو تین جھٹکوں کے بعد کہیں اٹھنے

کے قابل ہوتا ہے (ہمارے ہاں بیلوں کو بھی یہ مرض عاید ہو جایا کرتا ہے)۔ لہٰذا اس کے معنی ہیں کسی قوم کا اس قدر کمزور ہو جانا کہ وہ بمشکل اُٹھنے کے قابل ہو سکے۔ اسے قرآنِ کریم نے رِجْز کہکر پکارا ہے۔ جنگِ بدر کے سلسلے میں قرآنِ کریم میں آیا ہے کہ وہاں خدا نے ایسے سامان پیدا کر دیئے: وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (۸/۱۱)۔ "جس سے تمہاری وہ کمزوری رفع ہو گئی جو دشمنوں کے پھیلائے ہوئے وساوس کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ تمہارے دل مربوط ہو گئے۔ تمہیں جمیعتِ خاطر نصیب ہو گئی۔ تمہارے قدم جم گئے۔ اس سے رِجز کے معنے واضح ہو جاتے ہیں۔

اس آیت (۲/۵۹) میں رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ کہا ہے۔ قومِ بنی اسرائیل میں ایک ضعف و ناتوانی اور اضمحلال اور کمزوری قومِ فرعون کے استبداد کی پیدا کردہ تھی لیکن یہاں پہنچنے کے بعد انہوں نے قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ ان کے حوصلوں کی یہ پستی اسی کا نتیجہ تھی۔ اسے قرآنِ کریم نے "آسمان سے نازل شدہ رِجز" کہا ہے۔ اس کی تائید (۳۴/۵) سے بھی ہوتی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ "جو ہمارے قوانین کو غیر مؤثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ الم انگیز رِجز کے عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔" جب حضور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہوا کہ آپ اس انقلابِ عظیم کو برپا کرنے کے لئے اٹھیئے۔ (قُمْ فَاَنْذِرْ (۷۴/۲) تو اس کے بعد کہا کہ اپنی جماعت کی اس طرح سے تربیت کیجئے: وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (۷۴/۵)۔" ان کا ضعف و ناتوانی مبدل بہ قوت ہو جائے اور ان میں ایک ہی جنبش سے اُٹھ کھڑے ہونے کی طاقت پیدا ہو جائے۔"

آیت زیرِ نظر (۲/۵۹) میں ہے کہ بنی اسرائیل میں یہ رِجز ان کے فسق کی وجہ سے پیدا ہوا تھا اور سورۃ الاعراف میں ہے کہ ایسا کچھ ان کے ظلم کی وجہ سے ہوا تھا۔ یعنی انہوں نے اپنا صحیح مقام چھوڑ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ فسق کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول میں آیت (۲/۲۶) کے تحت (صفحہ ۳۲۴ پر) تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں اس قالب سے نکل جانا جس میں کسی کی صلاحیتیں پختگی تک پہنچ سکیں۔

اس داستان میں اندازِ بیان یہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے کسی ایسی نعمت کا ذکر کیا گیا جس سے بنی اسرائیل کو بہرہ یاب کیا گیا تھا۔ اس کے بعد کہا گیا کہ جب انہوں نے کفرانِ نعمت کیا تو اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ پھر کسی اور نعمت کا تذکرہ کیا گیا۔ آیت (۲/۵۷) میں سایہ فگن بادلوں اور من و سلویٰ کا ذکر تھا۔ اگلی آیت میں کہا گیا ہے:۔

۲/۶۰ وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۔

اس کا عام ترجمہ یہ ہے "جب موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لئے ہم سے پینے کا پانی مانگا تو ہم نے اس سے کہا کہ تم اس صحرا سے آگے بڑھ کر اس علاقے کی طرف چلے جاؤ جہاں چٹانیں ہیں۔ وہاں تمہیں پتھروں میں پنہاں پانی کے چشمے مل جائیں گے۔" اس آیت میں "ضربِ عصا" کا ذکر آیا ہے۔ اس کے متعلق ہم تفصیل سے پہلے بیان کر چکے ہیں جہاں قومِ بنی اسرائیل کا سمندر پار کرنے کا ذکر آیا ہے (دیکھئے ۲/۵۰)۔

پانی کے چشمے

وہاں ہم بتا چکے ہیں کہ اس کے ایک معنے تو یہ ہوں گے کہ اپنی جماعت کو لے کر پتھریلے علاقے کی طرف نکل جاؤ۔ اور یہ بھی کہ وحیٔ خداوندی نے ان چٹانوں کی نشاندہی کر دی جن پر پڑی ہوئی مٹی ہٹانے سے نیچے سے چشموں کا پانی پھوٹ نکلے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ یہ قوم بات بات پر بگڑ بیٹھتی تھی اور واویلا مچانا شروع کر دیتی تھی کہ ہمیں مصر سے کیوں نکال کر لے آئے۔ چنانچہ اس سلسلے میں بھی بائبل میں ہے:۔

> تب سارے بنی اسرائیل کی جماعت نے اپنے ہم سفروں میں خداوند کے فرمان کے مطابق سین کے بیابان سے کوچ کیا اور رفیدیم میں پڑاؤ ڈالا۔ وہاں لوگوں کے لئے پینے کو پانی نہ تھا۔ سو لوگ موسیٰؑ سے جھگڑنے لگے اور کہا کہ ہم کو پانی دے کہ پئیں۔ موسیٰ نے ان سے کہا کہ تم مجھ سے کیوں جھگڑتے ہو اور خدا کا کیوں امتحان کرتے ہو۔ اور وہ لوگ پانی کے پیاسے تھے۔ سو لوگ موسیٰؑ پر جھنجھلائے اور کہا کہ تو ہمیں مصر سے کیوں نکال لایا کہ ہمیں اور ہمارے لڑکوں اور ہمارے مواشی کو پیاس سے ہلاک کر دے۔
>
> (خروج ۱۷/۱-۳)

آیتِ زیرِ نظر میں کہا گیا ہے کہ وہاں بارہ چشمے نکلے اور انہیں بنی اسرائیل کے بارہ اسباط (قبیلوں) میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ اقوامِ سابقہ میں حضراتِ انبیائے کرام اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی بعثت بھی قومِ بنی اسرائیل کی طرف ہوئی تھی۔ پھر یہ قوم بھی قبیلوں میں بٹی ہوئی تھی اور ہنوز ان کی تربیت ایسی نہیں ہوئی تھی کہ ان قبائلی تفریقات کو مٹا کر انہیں ایک امت بنا دیا جائے۔ انسانی تاریخ کے ابتدائی ادوار ایسے ہی تھے۔ لہٰذا حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے ہر قبیلے یا خاندان کو الگ الگ چشمہ تفویض کر دیا کہ کسی قسم کا جھگڑا نہ ہو۔ اس کے

بعد قرآنِ کریم نے اپنی اس بنیادی تعلیم کو دھرایا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ خدا کے عطا کردہ رزق کو باہمی فساد کا موجب نہ بنایا جائے۔ اس سلسلے میں مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں بڑی شرح و بسط سے لکھا جا چکا ہے۔ (دیکھئے آیات ۲/۳ ذ ۲/۱۱-۱۲ ذ ۲/۲۲ ذ ۲/۲۹ اور اس جلد میں آیت ۲/۳۰)۔ ان آیات میں فساد کا مفہوم بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ ان تشریحات کی یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

بنی اسرائیل کو مصر کے علاقے سے باہر نکال لینے کا مقصد تو یہ تھا کہ انہیں قومِ فرعون کی غلامی کے آہنی شکنجے سے نجات مل جائے اور دوسرا مقصد یہ کہ ان سے شہری زندگی کی سہل انگار عادات چھڑا کر ان کی تربیت صحرائی اور کوہستانی علاقوں میں اسطرح کی جائے کہ وہ محنت اور مشقت کے خوگر اور سختیاں برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں۔ علامہ اقبالؒ نے اسی نفسیاتی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ:-

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی ❖ یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

اسی مقصد کے پیشِ نظر یہاں بنی اسرائیل کو بالکل سیدھی سادی اور فطری غذا دی گئی تھی۔ یعنی من اور سلویٰ۔ لیکن انہیں رہ رہ کر مصری کھانوں کے چٹخارے یاد آتے تھے خواہ وہ حاکم قوم کی چچوڑی ہوئی ہڈیاں چوسنے ہی سے کیوں نہ حاصل ہوتے ہوں۔ چنانچہ بائبل میں ہے۔

> بنی اسرائیل کی ساری جماعت، زمینِ مصر سے خارج ہو کر دوسرے مہینے کے پندرھویں دن سین کے بیابان میں، جو ایلیم اور سینا کے درمیان ہے۔ پہنچے اور ساری جماعت بنی اسرائیل بولے کہ کاش ہم خداوند کے ہاتھ سے زمینِ مصر میں جس وقت کہ ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھتے تھے اور روٹی من بھر کر کھاتے تھے، مارے جاتے۔ تم ہم کو اس بیابان میں نکال لاتے ہو کہ سارے مجمع کو بھوک سے ہلاک کرو۔
> (خروج ۱۶/۳-۱)

قرآنِ کریم نے ان کے اسی تقاضے کو اگلی آیت میں یوں بیان کیا ہے:-

۲/۶۱ وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ۔ فَادْعُ لَنَا
رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا
وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا۔ قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنٰى بِالَّذِي هُوَ
خَيْرٌ۔ اِهْبِطُوا مِصْرًا۔ فَإِنَّ لَكُمْ مَّا سَأَلْتُمْ۔ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ

الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۔ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۔

اس آیت کا مفہوم حسب ذیل ہے " (جیساکہ پہلے کہا جا چکا ہے ۲/۵۹) تم نے سپاہیانہ زندگی پر، شہری زندگی کو ترجیح دی۔ اس کے لئے موسیٰؑ سے کہا کہ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم (اس صحرائی زندگی میں) صبح و شام ایک ہی قسم کا کھانا کھاتے رہیں۔ اس لئے، تم اپنے نشو و نما دینے والے سے ہمارے لئے زمینی پیداوار طلب کرو ـــــ سبزیاں ترکاریاں، ککڑیاں، لہسن (یا مختلف قسم کے اناج)، مسور، پیاز (وغیرہ) ـــــ حالانکہ صحرائی زندگی تمہاری عسکری تربیت گاہ تھی اور وہاں کی خوراک ایسی تھی جو تم میں زندگی کی حرارت پیدا کر دیتی۔

موسیٰؑ نے کہا کہ (کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ) تم اُس بہترین زندگی کی بجائے، جو تمہارے لئے تجویز کی جارہی تھی، اس قسم کی ادنیٰ زندگی اختیار کرنا چاہتے ہو۔ اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو جاؤ، شہر کی زندگی اختیار کر لو۔ وہاں تمہیں یہ سب کچھ مل جائے گا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں عسکریت اور کشورکشائی کی صلاحیتیں مفقود ہو گئیں اور محکومیت اور تساہل انگیزی کی خصلتیں پیدا ہو گئیں۔ اور، اس طرح، ان پر ذلّت و خواری کا عذاب خداوندی مستولی ہو گیا۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ انہوں نے قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے انبیاء کی عزت و توقیر کے بجائے، انہیں ناحق ذلیل کرنے کی تدبیریں کرنے لگے، نیز، بعض کی جان تک کے لاگو ہو گئے۔ یہ سب کچھ ان کی سرکشی اور حدود فراموشی کا نتیجہ تھا۔"

اس آیت میں جو کہا گیا ہے: اِهْبِطُوْا مِصْرًا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ تم ملک مصر کی طرف واپس چلے جاؤ۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ اس دشت و صحرا میں تمہیں اس لئے لایا گیا تھا کہ تم شہری تمدن کی تن آساں زندگی کی جگہ سپاہیانہ زندگی کے خوگر بن جاؤ۔ تاکہ تمہیں ایک قومِ غالب کی طرح سرفرازیاں اور کامرانیاں نصیب ہو جائیں۔ لیکن اگر تم ذلیل و خوار ہی رہنا چاہتے ہو تو جاؤ! اِدھر اُدھر کئی بستیاں موجود ہیں ان میں جا بسو۔ وہاں تمہیں وہ کچھ مل جائے گا جس کی تم خواہش کر رہے ہو۔ اس میں "اِهْبِطُوْا" کا لفظ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ جیسا کہ ہم آیات (۲/۳۶ و ۲/۳۸) میں بتا چکے ہیں، هبوط کے معنی کسی بلند سطح سے پست سطح کی طرف آجانے کے ہیں۔ لہٰذا انہیں بتا دیا گیا کہ تمہاری اس قسم کی خواہشات تمہیں پھر انہیں پستیوں کی طرف لے جائیں گی جن میں تم اس سے پہلے زندگی بسر

کرتے تھے۔ اس کے بعد کہا گیا ہے کہ ان پر ذلت و مسکنت کی مار ماری گئی۔ اور وہ غضبِ خداوندی کے مستوجب قرار پا گئے۔ ان الفاظ کا مفہوم آیات (۲/۱ و ۲/۷) پہلی جلد (صفحات ۵۳ - ۵۵) نیز آیات (۲/۲۵ و ۲/۴۴) زیرِ نظر جلد میں شرح و بسط سے بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اس مقام پر اتنی وضاحت ضروری ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ ان پر ذلت و مسکنت اور غضب و عذابِ خداوندی نازل ہو گیا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ایسا صرف ان کی اس خواہش کی پاداش میں ہوا تھا۔ بنی اسرائیل کی یہ تاریخ زمانہ نزولِ قرآن میں اُنکے سامنے پیش کی گئی تھی، اس لئے ان کی یہ حالت کسی ایک واقعہ کے نتیجے میں نہیں ہوئی تھی بلکہ یہ بہ ہیئتِ مجموعی نتیجہ تھی ان کی تمام سرکشیوں اور بدعنوانیوں کا، جو تاریخ کے مختلف ادوار میں ان سے سرزد ہوئی تھیں۔ چنانچہ خود زیرِ نظر آیت کے آخری حصے میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ نتیجہ تھا اس کا کہ انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی۔ حتیٰ کہ انبیاء تک کو قتل کر دیا۔ حدود فراموشی اور کھلی ہوئی بغاوت تک پر اُتر آئے ـــــ معصیت (ع۔ص۔ی) قانون شکنی اور نافرمانی کو کہا جاتا ہے اور عدوان کے معنے حد سے تجاوز کرنا ہیں۔ مقصد دونوں کا قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتنا اور خدا کی مقرر کردہ حدود سے آگے بڑھ جانا ہے۔

قتلِ انبیاء اس آیت میں "قتلِ انبیاء" کی حقیقت وضاحت طلب ہے۔ ہمارے زمانے کے ایک (جھوٹے) مدعیٔ نبوت (مرزا غلام احمد) نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں ایک دلیل یہ بھی پیش کی تھی کہ جھوٹا مدعیٔ نبوت قتل کر دیا جاتا ہے اور میں چونکہ قتل نہیں کیا گیا اس لئے میں جھوٹا مدعی نہیں ہو سکتا۔ ایسا کہنا، قرآنِ کریم کے حقائق سے بے خبری کی دلیل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ (جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں) عربی زبان میں قتل کے معنی کسی کو غیر مؤثر بنا دینا بھی ہیں لیکن اس کے معنی سچ مچ قتل کر دینا بھی ہیں اور قرآنِ کریم میں کہیں یہ نہیں آیا کہ جھوٹے مدعیٔ نبوت کو قتل کر دیا جائے گا[1] اس کے برعکس قتلِ انبیاء کا ذکر قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ (مثلاً دیکھئے ۲/۹۱ و ۳/۲۰ و ۳/۱۱۱ و ۳/۱۸۰ و ۴/۱۵۵) ان آیات میں قتلِ انبیاء کا ذکر ہے۔ اور آیات (۳/۱۸۲ و ۵/۷۰) میں قتلِ رسل کہا گیا ہے۔ انجیل میں حضرتِ مسیح علیہ السلام نے یہودیوں کی تباہی اور بربادی کا سب سے بڑا سبب ان کے اسی

---

[1] اس ضمن میں آیات (۶۹/۴۴-۴۶) کو تائید میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان آیات میں "قطع وتین" کے معنے یہ نہیں کہ افترا کرنے کی صورت میں رسول کی رگِ قلب کو (عملِ جراحی کی طرح) کاٹ کر رکھ دیا جاتا۔ مقصد یہ ہے کہ اس صورت میں ان ذرائع و اسباب کو منقطع کر دیا جاتا جن سے اس کے مشن کو استحکام و ثبات حاصل ہوتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی اپنے مقام پر آئے گی۔

جرم کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ متی کی انجیل میں ہے :-

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو۔ تم پر افسوس ہے! کہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راستبازوں کے مقبرے آراستہ کرتے ہو۔ اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادوں کے زمانہ میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے۔ اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ ہم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہیں۔ غرض اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھر دو۔ اے سانپو۔ اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے؟ اس لئے دیکھو میں نبیوں اور داناؤں اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں ان میں سے بعض کو قتل کرو گے اور صلیب پر چڑھاؤ گے اور بعض کو اپنے عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر بشہر ستاتے پھرو گے۔ تاکہ سب راستبازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا، تم پر آئے۔ راستباز ہابیل کے خون سے لیکر برکیاہ کے بیٹے زکریاہ کے خون تک، جسے تم نے مقدس اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ سب کچھ اس زمانہ کے لوگوں پر آئے گا۔

اے یروشلم! اے یروشلم! تو نبیوں کو قتل کرتی ہے اور جو تیرے پاس بھیجے گئے، انہیں سنگسار کرتی ہے۔ کتنی ہی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کر لیتی ہے اسی طرح میں بھی تیرے لڑکوں کو جمع کر لوں۔ مگر تم نے نہ چاہا۔ (متی ۲۳/۲۹-۳۷)

قتل انبیاء و رسل کی سب سے بڑی شہادت خود، رسول اللہؐ کے متعلق آیت (۳/۱۴۴) سے ملتی ہے جہاں کہا گیا کہ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ (۳/۱۴۴)۔ "محمدؐ بجز این نیست! کہ خدا کا ایک رسول ہے۔ اس سے پہلے کئی رسول اپنے اپنے فرائض سرانجام دیکر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اگر کل کو یہ بھی مرجائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے"؟ یہاں خود رسول اللہؐ کے متعلق قتل کئے جانے کے امکان کا ذکر ہے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ جھوٹا مدعیٔ نبوت قتل کر دیا جاتا ہے، سچے نبی کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا۔

قرآن کریم میں ایک جگہ کہا گیا ہے: يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭوَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ۭ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (۵/۶۷)۔ "اے رسولؐ! جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تجھ پر نازل کیا جاتا ہے اسے دوسروں تک پہنچاؤ۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ تم نے اپنے فریضۂ رسالت کو سرانجام نہیں دیا۔ تمہارا کام تبلیغ

رسالت ہے۔ خدا تمہارے مشن کو لوگوں کی دست برد سے محفوظ رکھیگا۔ یاد رکھو! جو قوم حق و صداقت سے سرکشی برتتی ہے وہ کبھی صحیح راستہ اختیار نہیں کرتی"۔ ظاہر ہے کہ یہاں وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (۵/۶۷) سے مراد حضورؐ کی جسمانی حفاظت نہیں، حضورؐ کے مشن اور ما انزل اللہ کی حفاظت مقصود ہے۔ جہاں تک حضور کی جسمانی حفاظت کا تعلق ہے جنگِ احد میں حضور کو کئی زخم آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیائے کرامؑ عندالضرورت خود میدانِ جنگ میں جایا کرتے تھے ـــ بلکہ اپنی فوج کی قیادت کیا کرتے تھے ـــ میدان جنگ میں قتل ہو جانا، ناممکنات میں سے نہیں۔ روایات میں ہے کہ حضور نے اپنے مرض الموت میں فرمایا تھا کہ اس مرض کا بنیادی سبب وہ زہر ہے جو ایک یہودیہ نے حضورؐ کو کھانے میں دیدیا تھا۔ اگرچہ آپ نے وہ لقمہ اُگل دیا تھا لیکن زہر غیر محسوس طور پر اثر انداز ہو گیا تھا اور اس نے رفتہ رفتہ یہ شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ بھی تو قتلِ انبیاء کی شق میں آتا ہے۔ قرآن کریم میں ایک اور آیت بھی ہے جس سے بعض اوقات ذہن اس طرف منتقل ہو سکتا ہے کہ خدا کے رسولوں کو قتل نہیں کیا جا سکتا تھا[1] وہ آیت یہ ہے: كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىْ (۵۸/۲۱)۔

رسولوں کا غلبہ

"خدا نے اسے واجب قرار دے رکھا ہے کہ وہ اور اس کے رسول غالب آکر رہیں گے"۔

اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ خدا کے رسول قتل نہیں کئے جا سکتے تھے کیونکہ اگر انہیں قتل کر دیا جاتا تو وہ غالب کس طرح آتے! لیکن جب اس آیت پر، اسے اس کے سیاق و سباق کے اندر رکھ کر، اور اسی قسم کی دیگر آیات کو ساتھ ملا کر، غور کیا جائے تو اس بات کی تائید ہوتی ہے جسے ہم نے ابھی ابھی (اوپر) بیان کیا ہے۔ اس آیت سے پہلے ان مخالفین کا ذکر چلا آرہا ہے جن کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ حضورؐ کا پیش فرمودہ نظامِ خداوندی کامیاب نہ ہونے پائے۔ ان کے متعلق کہا کہ: اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ۚ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ۚ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۵۸/۱۹) "ان لوگوں پر شیطان اس بری طرح مسلط ہو چکا ہے کہ انہوں نے قوانینِ خداوندی کو یکسر ترک کر دیا ہے۔ یہ درحقیقت شیطان کی پارٹی (حزب الشیطان) کے افراد ہیں۔ انہیں سن رکھنا چاہیئے کہ حزب الشیطان آخر الامر خاسر و ناکام رہتی ہے"۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اُولٰٓئِكَ فِى الْاَذَلِّيْنَ (۵۸/۲۰)۔ "یاد رکھو! جو لوگ بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کریں گے، وہ ذلیل و خوار ہوں گے"۔ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ قَوِىٌّ عَزِيْزٌ (۵۸/۲۱)۔ "اس لئے کہ خدا کا فیصلہ ہے ـــ اس نے اسے واجب اور لازم قرار دے رکھا ہے ـــ کہ خدا اور

[1] کبھی خود میرا ذہن بھی اس طرف منتقل ہوتا تھا۔

اس کے رسول آخرالامر مظفر و منصور ہوں گے۔ یہ اس خدا کا فیصلہ ہے جو تمام قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے اس لئے ہو نہیں سکتا کہ دنیا کی کوئی قوت اس کے فیصلے کو ناکام کر سکے۔" نظامِ خداوندی کی مخالفت کرنے والے "حزب الشیطان" (شیطان کی پارٹی کے افراد) ہیں۔ اِن کے برعکس ایک پارٹی خدا کی بھی ہے۔ یعنی حزب اللہ۔ اس پارٹی کے افراد کی کیفیت یہ ہے کہ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ۔ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ۔ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ۔ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ۔ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۸/۲۲)۔" یہ لوگ خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ ممکن ہی نہیں کہ جو لوگ خدا اور آخرت پر ایمان رکھیں وہ ان لوگوں سے دوستداری کے تعلقات استوار کریں جو اللہ اور اس کے رسول (دینِ خداوندی) کے دشمن ہوں، خواہ وہ ان کے ماں باپ، یا بیٹے بیٹیاں، یا بھائی بند، یا دیگر عزیز رشتے دار ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں راسخ ہو چکا ہے۔ اور مرضیٔ خداوندی ان کی تائید و نصرت کا موجب بن رہی ہے۔ یہ اس جنت میں داخل ہوں گے جس کی شادابیوں میں کبھی فرق نہیں آئے گا۔ رضی اللہ عنہم و رضوعنہ — یہ لوگ حزب الشیطان کے مقابلہ ہیں، حزب اللہ ہیں۔ اور ساری دنیا کو سن رکھنا چاہیئے کہ آخرالامر حزب اللہ (اللہ کی پارٹی) ہی کامیاب ہوتی ہے۔ حق غالب آکر رہتا ہے۔"

حزب اللہ

ان آیات سے ظاہر ہے کہ:۔

۱۔ حزب الشیطان، دینِ خداوندی کی مخالفت کرتی تھی۔ اس سے مراد وہ تمام قوتیں ہیں جو نہیں چاہتی تھیں کہ نظامِ خداوندی قائم ہو۔

۲۔ ان کے مقابلہ میں حزب اللہ (خدا کی پارٹی) تھی جو ان دشمنوں کی مخالفت کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی تھی۔

۳۔ خدا کا وعدہ یہ تھا کہ حزب الشیطان بالآخر ناکام رہے گی اور حزب اللہ کامیاب ہو گی۔

۴۔ اسے "خدا اور اس کے رسولوں" کے غالب آنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ رسولوں کے غالب آنے سے مراد اس نظامِ خداوندی کا غالب آنا ہے جسے وہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ مشن تنہا رسول کے ہاتھوں تکمیل تک نہیں پہنچتا تھا۔ اس میں اس کے رفقاء — جماعتِ مومنین — بھی شامل ہوتے

تھے۔ اسے "محمد رسول اللہ والذین معہٗ" (۴۸/۲۹) کے ہاتھوں قائم ہونا اور باطل کے ہر نظام پر غالب آنا تھا۔ اس کشمکش میں اس جماعت کے کسی فرد (خواہ وہ خود رسول ہی کیوں نہ ہو) کے وفات پا جانے یا قتل ہو جانے سے کسی قسم کا فرق نہیں پڑتا تھا۔ حتٰی کہ یہ بھی ممکن تھا کہ اس نظام کو پورا پورا غلبہ رسول کی وفات کے بعد حاصل ہو، جیسا کہ قرآن کریم کی کئی ایک آیات سے واضح ہے (مثلاً) سورۃ الرعد میں ہے: وَإِنْ مَا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳/۴۰) "جو کچھ ان مخالفین سے کہا جاتا ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا، اے رسول! ہو سکتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ تمہاری زندگی میں سامنے آ جائے اور کچھ حصہ تمہاری وفات کے بعد۔ تمہارا فریضہ اس پیغام کو عام کئے جانا ہے۔ یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے قانونِ مشیت کے مطابق اسکی تکمیل کب ہو گی" نظام خداوندی کا غلبہ بہر حال ہو کر رہے گا۔ یہ خدا کا فیصلہ ہے: هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (۹/۳۳) "خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطہ ہدایت یعنی حق پر مبنی نظام، دیکر بھیجا۔ یہ نظام باطل کے ہر نظام پر غالب آ کر رہے گا خواہ یہ بات مشرکین پر کیسی ہی گراں کیوں نہ گزرے؟ ظاہر ہے کہ یہ پروگرام (PROCESS) قیامت تک جاری رہے گا۔ کیونکہ ہر زمانے میں کوئی نیا نظام باطل ابھر کر سامنے آئے گا۔ جس پر نظامِ خداوندی نے غلبہ حاصل کرنا ہو گا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي (۵۸/۲۱) سے مراد یہ نہیں کہ یہ ناممکن تھا کہ حق و باطل کی آویزش میں رسول قتل ہو جاتا۔ مراد یہ ہے کہ اس کشمکش کا آخری نتیجہ یہ ہو گا کہ دینِ خداوندی غالب آئے گا اور باطل کا نظام ناکام رہے گا۔ (اس نکتہ کی مزید تشریح اپنے مقام پر کی جائے گی کہ قرآن کریم میں آمدہ "اللہ و رسول" کی اصطلاح سے مراد نظامِ خداوندی ہے)

آیتِ زیرِ نظر (۲/۶۱) میں قتل انبیاء بغیر الحق کہا گیا ہے۔ قرآن کریم نے "حق کے ساتھ" قتل کئے جانے کی تصریح خود کر دی ہے۔ سورۃ المائدہ میں ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل سے یہ کہا تھا کہ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا (۵/۳۲)۔ "جس نے کسی ایک شخص کو بھی ناحق قتل کر دیا —— یعنی بجز اس کے کہ اسے جرمِ قتل کی سزا کے طور پر یا جرمِ بغاوت کی پاداش میں قتل کیا جائے —— تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری کی پوری نوعِ انسانی کو قتل کر دیا"۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص کو قانونِ خداوندی کے مطابق کسی جرم کی پاداش میں قتل کیا جائے تو وہ قتل بغیر الحق نہیں ہو گا۔

اس کے بعد قرآنِ کریم یہودیوں کے اس بنیادی عقیدہ کی پھر تردید کرتا ہے جس کا ذکر متعدد بار پہلے بھی آچکا ہے۔ یعنی ان کا یہ عقیدہ کہ دین صرف بنی اسرائیل کی نسل تک محدود ہے اور جنت بھی انہی کے لئے مخصوص۔ ان کے اس عقیدے کی تشریح آیت (۲/۸۰) میں شرح و بسط سے کی جاچکی ہے۔

یہ عقیدہ کہ دین صرف بنی اسرائیل کی نسل تک محدود رہنا چاہئے، یہودیوں ہی کا نہیں۔ انجیل میں بھی یہ عقیدہ موجود ہے۔ مثلاً متی انجیل میں ہے کہ حضرتِ عیسٰی علیہ السلام نے جب اپنے حواریوں کو تبلیغ کے لئے بھیجا تو اُن سے کہا:۔

> پاک چیز کتوں کو نہ دو اور اپنے موتی سوّروں کے آگے نہ ڈالو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ انہیں پاؤں کے نیچے روندیں اور پلٹ کر تمہیں پھاڑیں (متی ۷/۶)

اس کی تشریح انہوں نے آگے چل کر ان الفاظ میں کر دی:۔

> ان بارہ کو یسوع نے بھیجا اور انہیں حکم دے کے کہا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔ بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔ (متی ۹/۵-۶)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ انجیل کی رو سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کا پیغام بھی بنی اسرائیل تک محدود تھا۔ عیسائیت کو جو عالمگیر مذہب قرار دیا گیا ہے تو یہ عیسائیوں کا بعد کا وضع کردہ عقیدہ ہے۔ انجیل اسے بنی اسرائیل تک ہی محدود رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ عقیدہ یہود اور نصاریٰ دونوں کے ہاں موجود تھا اور اس کی تردید قرآن کریم نے اگلی آیت میں کر دی۔

۲/۶۲ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ دینِ خداوندی کا پیدائش سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی شخص خواہ وہ مسلمانوں کے ہاں پیدا ہو یا یہودیوں کے گھر، عیسائیوں کے ہاں یا صابئین کے گھر، کسے باشد! جو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے گا اور عملِ صالحہ کرے گا تو ان لوگوں کا اجر ان کے رب کے ہاں سے ملے گا۔ انہیں کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہو گا۔ یہ آیت مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں آیت (۲/۱) کی تشریح کے سلسلہ میں (صفحات ۸۴-۸۳ پر) آچکی ہے۔ اور وہاں اس کا مفہوم واضح انداز میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اُسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں ہم اتنا کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں کہ قرآن کریم نے

یہود و نصاریٰ کے اس عقیدے کی تردید کر دی کہ دین کسی خاص نسل یا قوم کی اجارہ داری ہے۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے جو دین عطا کیا گیا ہے وہ تمام نوعِ انسان کے لئے ہے۔ وہ عالمگیر دین ہے۔

اس کے بعد قرآن کریم داستانِ بنی اسرائیل کی اگلی کڑی کی طرف آجاتا ہے اور کہتا ہے :-

۲/۶۳ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُم بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ -

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ بنی اسرائیل دامنِ کوہ میں اقامت پذیر ہوئے تھے اور اس طرح ان کی حفاظت کا فطری سامان کر دیا گیا تھا کہ ان پر عقب سے کوئی حملہ آور نہ ہو۔ اس پہاڑ کو الطور کہا گیا ہے۔ طور کے معنی سرسبز پہاڑ کے ہیں لیکن اس لفظ کے ساتھ (ال) لگنے سے اس سے مراد ایک خاص پہاڑ ہو گیا۔ یہ وہ پہاڑ تھا جہاں پہلے پہل حضرت موسیٰ علیہ السلام

الطّور کو وحی سے نوازا گیا تھا (دیکھئے آیات ۱۹/۵۲ و ۲۸/۲۹ و ۲۸/۴۶)۔ یہی وہ الطور تھا جس کے دامن میں اقامت پذیر بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا (۲/۹۳ و ۴/۱۵۴ و ۲۰/۸۰)۔ یہی وہ الطور ہے جسے دو ایک اور مقامات پر سلسلۂ رشد و ہدایت کی ایک کڑی کے طور پر شہادت میں... پیش کیا گیا ہے (دیکھئے ۵۲/۱ و ۹۵/۲) اس الطور کے دامن میں بنی اسرائیل سے جو عہد لیا گیا تھا وہ کیا تھا؟ یہ کہ جو قوانین انہیں وحی کی رو سے دیئے جاتے ہیں انہیں ہر وقت اپنے پیشِ نظر رکھیں۔ سفرِ حیات میں انہیں محکم طور پر تھامے رہیں تاکہ وہ زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے محفوظ رہیں۔ جسے خدا پر ایمان کہا جاتا ہے وہ درحقیقت خدا کے ساتھ ایک معاہدہ ہوتا ہے کہ ہم اس کے عطا کردہ قوانین کی اطاعت اور اس کی مقرر کردہ حدود کی پابندی کریں گے۔ ہمارے ہاں ایمان کا ترجمہ "مان لینا" کیا جاتا ہے جس کا کوئی عملی مفہوم نہیں ہوتا۔ ماننے کے معنے ہیں اس کی طرف سے بھیجی ہوئی راہنمائی کی پیروی کرنا۔ اسی کو خدا کے ساتھ عہد کہہ کر پکارا گیا ہے۔ جماعتِ مومنین اور اللہ تعالیٰ کے مابین، جو معاہدہ ہوتا ہے اس کے لئے آیت (۹/۱۱۱) ملاحظہ کیجئے۔

بنی اسرائیل نے خدا سے یہ عہد کیا۔ لیکن :-

۲/۶۴ ثُمَّ تَوَلَّيْتُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ ۖ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنتُم مِّنَ الْخَاسِرِينَ -

وہ اپنے عہد سے پھر گئے۔ اس کا نتیجہ ان کی تباہی ہونا چاہیئے تھا لیکن چونکہ خدا کے پروگرام میں یہ تھا کہ انہیں

باز آفرینی کے مواقع دیئے جائیں۔ اس لئے انہیں ہلاک نہیں کیا گیا بلکہ ان کی مہلت کے وقفے کو بڑھا دیا گیا۔ یہ خدا کا فضل تھا اور اس کی رحمت۔ کسی قوم کو مہلت کا وقفہ مل جانا، واقعی عنایاتِ خداوندی میں سے ہوتا ہے۔ یہ ہوتا تو ہے اس کے قانون کے مطابق ہی، لیکن ضابطۂ قوانین میں اس قسم کی گنجائش کا رکھا جانا، بہرحال عنایتِ خداوندی ہی ہے۔

لیکن اس قوم نے مہلت کے اِس وقفے سے بھی فائدہ نہ اٹھایا اور اپنی خوئے سرکشی سے باز نہ آئے۔ اس کی شہادت میں واقعۂ سبت کو پیش کیا گیا ہے:-

۲/۶۵ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ۔

اَلسَّبْتُ کے مادہ (س۔ ب۔ ت) کے بنیادی معنے ہوتے ہیں راحت اور سکون۔ اور اس سے مراد ہوتا ہے ترکِ عمل اور قطعِ کاروبار۔ چونکہ یہاں اَلسَّبْت آیا ہے اس لئے اس سے مراد وہ دن ہے جس میں یہودی کاروبار نہیں کرتے۔ یعنی سنیچر کا دِن۔

سبت کا مفہوم ہفتے میں ایک دن کی چھٹی (یا کاروبار کا ناغہ) آج کل معمول میں داخل ہے۔ یہ پابندی یہودیوں کے ہاں بھی معمول میں داخل تھی۔ (HASTINGS) نے اپنے انسائیکلوپیڈیا میں عہد نامہ عتیق، مشنا اور تالمود کے حوالوں سے لکھا ہے کہ سبت جمعہ کی شام سے شروع ہو جاتا اور سنیچر کا پورا دن رہتا تھا۔ اس میں کاروبار کے علاوہ قریب اڑتیس دیگر امور بھی تھے جن کا کرنا منع تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں ناغہ کا دن قانونی طور پر متعین نہیں کیا گیا تھا اس لئے وہ لوگ اس میں اختلاف کرتے تھے اور اس کی وجہ سے گریز کی راہیں تراش لیا کرتے تھے۔ اس اختلاف کو مٹانے کے لئے، اس کے لئے ایک خاص دن متعین کر دیا گیا۔ سورۃ النحل میں ہے: اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (۱۶/۱۲۴) "السبت کا دن ان کے اختلافات کی وجہ سے مقرر کیا گیا"۔

ہفتے میں ایک دن کا ناغہ کوئی بڑی بات نہیں، لیکن جب زندگی کسی نظام کے تحت بسر کی جائے تو اس نظام کی طرف سے عاید کردہ چھوٹی سے چھوٹی پابندی پر قائم رہنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس قسم کے ڈسپلن سے قوم کی سیرت و کردار کا امتحان ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اتنی سی طمع (TEMPTATION) کا مقابلہ بھی نہ کر سکیں اور چور دروازوں سے اس پابندی کی خلاف ورزی کرنے لگ جائیں، وہ زندگی کی بڑی بڑی آزمائشوں میں کیا پورے اتریں گے؟ قرآن کریم

نے اس واقعہ کا ذکر یہی بتانے کے لئے کیا ہے کہ یہودیوں میں اتنا سا کیریکٹر بھی باقی نہیں رہا تھا۔ محکوم قوم کی کیفیت یہی ہو جاتی ہے۔ سورۃ الاعراف میں ہے کہ یہودیوں پر پابندی عاید کی گئی تھی کہ وہ ایک دن (منجملہ دیگر امور) مچھلیاں نہ پکڑیں۔ جانوروں میں یہ جبلّی حس (INSTINCT) ہوتی ہے کہ جب انہیں یقین ہو جائے کہ فلاں مقام پر، یا فلاں وقت میں کسی قسم کا خطرہ نہیں تو وہ وہاں آنے جانے میں بیباک ہو جاتے ہیں۔ [اسی مقصد کے لئے جنگلوں میں مقاماتِ امن (SANCTUARIES) کا تعین کر دیا جاتا ہے]۔ وہاں مچھلیوں کی بھی یہی کیفیت ہو گئی تھی۔ کچھ عرصہ کی مداومت کے بعد ان کی حس نے انہیں بتا دیا کہ اس دن ہمیں کوئی نہیں پکڑے گا، اس لئے وہ تیرتی ہوئی سطح آب پر آ جاتی تھیں۔ اور یہ، کردار کے خام، اتنی سی ترغیب کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ انہیں چوری چھپے پکڑ لیتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کا بہت بڑا ٹسٹ (TEST) تھا (۷/۱۶۳ نیز ۷/۱۶۴)۔ لیکن جب انہوں نے اس پابندی کو توڑا تو عذاب خداوندی میں گرفتار ہو گئے۔ اس کے لئے الفاظ ہیں فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ (۲/۶۵ نیز ۷/۱۶۶) اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "تم ذلیل بندر بن جاؤ"۔ اور اس کی تفسیر میں کہا جاتا ہے کہ وہ سچ مچ کے بندر بن گئے تھے۔ اگرچہ ہمارے متقدمین

بندر بن جانے کا مفہوم

میں سے بھی بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد مسخ سیرت ہے، مسخ صورت نہیں، یعنی ان کی شکلیں بندروں کی سی نہیں ہو گئی تھیں بلکہ ان کی سیرت بندروں کی سی ہو گئی تھی۔

لفظ قِرَدَةً کا مادہ (ق۔ ر۔ د) ہے۔ اَلْقَرَدُ اس اون کو کہتے تھے جو خودبخود جھڑ جائے اور کاتی نہ جا سکے۔ اس لئے اسے بیکار ہونے کی وجہ سے یونہی پھینک دیا جاتا تھا۔ اس سے یہ لفظ حقارت اور ذلت کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ چنانچہ اَقْرَدَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں افسردگی اور درماندگی کی وجہ سے اس شخص پر جمود طاری ہو گیا۔ وہ ذلیل و خوار ہو گیا اور یوں سمجھو کہ وہ جھوٹ موٹ کا مردہ بن گیا۔ اس اعتبار سے وہ، ہر قابلِ نفرت اور حقارت انگیز شے کو قِرَادَةٌ کہتے تھے۔ چنانچہ یہ لفظ چیچڑی کے لئے بھی آتا ہے۔ اس سے اَلْقِرْدُ بندر کو کہتے تھے جو ان کے نزدیک بڑا قابلِ نفرت جانور تھا۔ یہی معنی لفظ خاسئین کے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم میں بار بار کہا گیا ہے کہ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ (۲/۶۱)۔ اُن پر جمود طاری ہو گیا۔ وہ ذلیل و خوار ہو گئے۔ اسے خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۲/۸۵) بھی کہا گیا ہے۔ یعنی اسی دنیا کی زندگی میں ذلت و رسوائی۔

یہودیوں کی اس ذلت و خواری کی زندگی کے متعلق خود بائبل میں ہے کہ:-

اور خداوند تجھ کو سب قوموں کے درمیان زمین کے اس سرے سے اس سرے تک تتر بتر کرے گا اور

وہاں تو غیر معبودوں کی جو لکڑیاں اور پتھر ہیں جن سے نہ تو تیرے باپ دادے واقف تھے، اُن کی پرستش کرے گا اور ان قوموں میں تجھ کو آرام نہ ملے گا۔ بلکہ تیرے پاؤں کے تلوے کو قرار نہ ہو گا۔ کیونکہ خداوند وہاں تجھ کو دل کا دھڑکا اور آنکھوں کی دھندلاہٹ اور جی کی غمناکی دے گا۔ اور تیری زندگی تیری نظر میں بے ٹھکانا ہو جائے گی اور تو رات اور دن ڈرتا رہے گا اور تجھ کو اپنی زندگی کا کچھ بھروسہ نہ ہوگا۔ اپنے دل کے خوف سے، جسے تو کھائے گا اور ان چیزوں سے، جنہیں تیری آنکھیں دیکھیں گی، صبح کو تو کہیگا اے کاش کہ شام ہوتی! اور شام کو کہیگا اے کاش صبح ہوتی۔ اور خداوند تجھ کو اس راہ سے، جس کی بابت میں نے تجھے کہا کہ تو پھر اسے نہ دیکھے گا کشتیوں پر مصر کو پھر سے جائے گا اور تم وہاں غلام اور لونڈی ہونے کے لئے اپنے دشمنوں کے ہاتھ بیچے جاؤ گے اور تمہیں کوئی مول نہ لے گا۔　　　(استثناء (۲/۶۴-۶)

خود زمانہ نزولِ قرآن میں یہودیوں سے کہا گیا تھا کہ اب پھر تمہارے سامنے ایک موقعہ آیا ہے کہ تم اپنی ذلت کی زندگی کو عزت اور سرفرازی کی زندگی میں تبدیل کر لو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو نَلۡعَنَهُمۡ كَمَا لَعَنَّآ أَصۡحَٰبَ ٱلسَّبۡتِ (۴/۴۷)۔ "تمہیں زندگی کی خوشگواریوں سے اسی طرح محروم کر دیا جائے گا جس طرح تمہارے اسلاف میں اصحاب سبت کو محروم کر دیا گیا تھا۔"

ان تصریحات سے واضح ہے کہ ان لوگوں کو سچ مچ کا بندر نہیں بنا دیا گیا تھا بلکہ ان کی سیرت بندروں کی سی ہو گئی تھی۔ ان کی (APISH MENTALITY) کی شہادات قرآن کریم میں متعدد مقامات پر ملتی ہیں۔ قرآن کریم نے مسخ شدہ سیرت کو محسوس انداز میں سمجھانے کے لئے اسی قسم کی تشبیہات سے کام لیا ہے۔ مثلاً وہ منافقین کے متعلق کہتا ہے: قُلۡ هَلۡ أُنَبِّئُكُم بِشَرّٖ مِّن ذَٰلِكَ مَثُوبَةً عِندَ ٱللَّهِۚ مَن لَّعَنَهُ ٱللَّهُ وَغَضِبَ عَلَيۡهِ وَجَعَلَ مِنۡهُمُ ٱلۡقِرَدَةَ وَٱلۡخَنَازِيرَ وَعَبَدَ ٱلطَّٰغُوتَۚ أُوْلَٰٓئِكَ شَرّٞ مَّكَانٗا وَأَضَلُّ عَن سَوَآءِ ٱلسَّبِيلِ (۵/۶۰)۔ "اے رسولؐ! تم ان سے کہو کہ کیا میں تمہیں بتلاؤں کہ معیارِ خداوندی کی رُو سے کس کی حالت بدترین ہے؟ ان کی حالت جو زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہو گئے۔ ان کی متاعِ حیات جھلس گئی۔ ان کی سیرت بدترین حیوانات — بندروں اور خنزیروں — جیسی ہو گئی۔ بڑی بڑی مستبد سرکش قوموں نے انہیں اپنی غلامی کے شکنجے میں جکڑ لیا۔ یہی لوگ ہیں جو زندگی کے بدترین درجہ میں ہیں اور سب سے زیادہ راہ بھٹکے ہوئے۔" ان مقامات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کے ان الفاظ سے، جو اصحاب سبت کے متعلق آئے ہیں

یہ مراد نہیں کہ وہ سچ مچ کے بندر بن گئے تھے۔ اس قسم کی تفسیریں ان روایات پر مبنی ہیں جو یہودیوں نے وضع کر کے ہماری کتب روایات میں داخل کر دیں [1]۔ لیکن قرآن کریم نے اپنے مفہوم کو اگلی آیت میں خود ہی واضح کر دیا ہے، جہاں کہا ہے:۔

۲/۶۶ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ۔

ہمارے لئے عبرت

"ہم نے ان کی اس حالت کو ان لوگوں کے لئے بھی موجبِ عبرت بنایا جو اس دور میں موجود تھے اور ان کیلئے بھی، جو ان کے بعد آنے والے تھے۔ اور یہ چیز ان لوگوں کے لئے باعثِ صد موعظت ہے جو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں"۔ اگر وہ لوگ سچ مچ بندر بنا دیئے گئے تھے تو ان کی یہ تبدیلی ان لوگوں کے لئے تو وجۂ عبرت ہو سکتی تھی جنہوں نے انہیں ایسا بنتے دیکھا، لیکن بعد میں آنے والوں کے لئے یہ کس طرح وجۂ موعظت ہو سکتی تھی۔ آج ہم سینکڑوں بندروں کو دیکھتے ہیں کیا ہم میں سے کسی کا ذہن بھی اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ یہ انہی بنی اسرائیل کی نسل سے ہیں؟ یا یہ کہ اگر ہم نے بھی احکام خداوندی سے سرکشی برتی تو ہم بھی انہی جیسے بندر بن جائیں گے؟ سچ مچ کے بندر ہمارے لئے باعثِ عبرت نہیں۔ البتہ قرآنِ کریم نے قدم قدم پر صحرا نورد خانماں خراب، ذلیل و خوار یہودیوں کی مثال دیکر ہمیں سمجھایا ہے کہ جو لوگ احکامِ خداوندی سے سرتابی برتتے ہیں ان کی یہ حالت ہو جایا کرتی ہے۔

اس کے بعد قرآنِ کریم ان کی خوئے غلامی کے مظہر ایک اور واقعہ کو سامنے لاتا ہے، جب کہتا ہے کہ:۔

---

[1] یہ چیز ہمارے روایت پرست متقدمین تک ہی محدود نہیں۔ خود ہمارے دور کے ایک مفسر ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں:۔

بعض یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی جسمانی ہیئت بگاڑ کر بندروں کی سی کر دی گئی تھی اور بعض اس کے یہ معنے لیتے ہیں کہ ان میں بندروں کی سی صفات پیدا ہو گئی تھیں۔ لیکن قرآن کے الفاظ اور انداز بیان سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسخ اخلاقی نہیں بلکہ جسمانی تھا۔ میرے نزدیک قرینِ قیاس یہ ہے کہ ان کے دماغ بعینہٖ اسی حال پر رہنے دیئے گئے ہوں گے جس میں وہ پہلے تھے اور جسم مسخ ہو کر بندروں کے سے ہو گئے ہوں گے۔ (تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ ۸۴۔ طبع ۱۹۵۱ء)۔

۲/۶۷ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہٖٓ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا ھُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ ۔

عام ترجمہ اس آیت کا یہ ہے " اور پھر وہ معاملہ یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے یہ سیدھی سادی سی بات کہی تھی کہ خدا کا حکم ہے کہ ایک گائے ذبح کردو (بجائے اس کے کہ وہ اس صاف اور سیدھے حکم کی تعمیل کر دیتے، لگے طرح طرح کی کٹ حجتیاں کرنے۔ پہلے) کہا: بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ خدا نے ایسی بات کا حکم دیا ہو۔ تم ہمارے ساتھ مذاق کر رہے ہو۔ موسیٰؑ نے کہا میں اس سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں احکامِ الٰہی کی تبلیغ میں تمسخر کروں اور جاہلوں کا شیوہ اختیار کردوں"۔

ذبح بقر کا واقعہ

بَقَرٌ گائے اور بیل دونوں کو کہتے ہیں۔ یہ جمع ہے۔ اس کا واحد، بَقَرَۃٌ ہے[1] قصۂ سامری کے ضمن میں بتایا جا چکا ہے کہ بنی اسرائیل نے بھی مصریوں کی تقلید میں گوسالہ پرستی اختیار کر رکھی تھی۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے ان کے خود ساختہ سانڈ (بقرۃ) کے بت کو جلا کر دریا برد کر دیا تھا لیکن قرآنِ کریم میں ہے وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْعِجْلَ بِکُفْرِھِمْ (۲/۹۳) "گوسالہ کی محبت ان کے دل کی گہرائیوں تک میں پیوست ہو چکی تھی۔ وہ ان کے خون کے ذروں تک میں حلول کر گئی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خدا پر خلوصِ قلب سے ایمان نہیں لائے تھے"۔ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی گوسالہ پرستی کے مستور جذبات کا مظاہرہ کسی نہ کسی شکل میں ہوتا رہا ہوگا، اس لئے ضرورت سمجھی گئی کہ کوئی ایسا اقدام کیا جائے جس سے یہ عقیدت ان کے دِل سے نکل جائے۔ اس کا آسان طریق یہ تھا کہ کسی گائے یا سانڈ کو خود اُن کے ہاتھوں سے ذبح کرا دیا جائے۔

اس تجویز یا حکم کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ ہندوؤں کے ہاں گائے کی پرستش ہوتی ہے۔ اگر کوئی ہندو، مسلمان ہو جائے تو وہ اور تو سب کچھ برداشت کر لیتا ہے لیکن اگر گائے کا گوشت اس کے سامنے آجائے تو اُسے جھرجھری آجاتی ہے۔ وہ اسے کھانے کی اپنے اندر ہمت نہیں پاتا۔ اسے اپنے آپ کو اس پر مائل کرنے کے لئے ایک عرصہ لگ جاتا ہے۔ صدیوں سے متواتر چلے آنے والے معتقدات ایسے ہی گہرے ہوتے ہیں۔ یہی کیفیت بنی اسرائیل کی تھی۔ ان کے دل سے اس دیوتا کی عقیدت اور محبت کو زائل کرنے کے لئے مؤثر ترین طریق یہی ہو سکتا تھا کہ ان کے دیوتا کو خود ان کے ہاتھوں ذبح کرایا جائے۔ وہ اس حکم کی تعمیل سے اعلانیہ انکار تو نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس

---

[1] اسی کی نسبت سے قرآنِ کریم کی اس سورۃ کا نام سورۃ بقرۃ رکھا گیا۔

سے ان کا کفر ثابت ہو جاتا تھا۔ انہوں نے اس سے بچنے کے لئے بہانہ سازیاں شروع کیں۔ سب سے پہلے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہا کہ تم ہم سے مذاق کرتے ہو۔ خدا اس قسم کا حکم کیوں دے گا۔

انہوں نے اس سلسلہ میں کیا کیا باتیں بنائیں۔ ان کا ذکر کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں جو "اعوذ باللہ" آیا ہے، اس کے قرآنی مفہوم کی وضاحت کر دی جائے کیونکہ۔۔۔ اسے ہمارے ہاں بڑی

اعوذ باللہ کا مفہوم

اہمیت حاصل ہے۔ اس لفظ کا مادہ (ع۔ و۔ ذ) ہے۔ عَاذَتْ بِوَلَدِهَا کے معنے ہیں مادہ کا اپنے نوزائیدہ بچے کے پاس کھڑے رہنا۔ اور اس کی حفاظت کرتے رہنا۔ عَاذَ بِالشَّیْءِ کے معنے ہیں کسی چیز کے ساتھ چمٹے رہنا۔ یعنی اُسے مستقل طور پر اختیار کر لینا۔ جو جماعت، قرآنی نظام کے قیام کے لئے اٹھے گی اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ ہر مخالف قوت سے محفوظ رہنے کی تدبیر کرے۔ یہ تدبیر اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ جماعت، قوانینِ خداوندی کی زیادہ سے زیادہ تعمیل اور پابندی کرے۔ اسے "خدا کی پناہ میں آنے سے" تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کی اس آرزو اور روش کو اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳/۱) یا اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱۱۴/۱) جیسے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۃ المومن میں ہے کہ جب فرعون اور اس کی کابینہ کے زیرِ غور یہ سکیم آئی کہ حضرت موسیٰؑ کو قتل کر دیا جائے تو آپ نے کہا: اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ (۴۰/۲۷)۔ "میں انکی سازشوں کے خلاف، خدا کی پناہ میں آنا چاہتا ہوں" (نیز ۴۴/۲۰) حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نے بچی کی پیدائش کے وقت کہا تھا: وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ (۳/۳۵)۔ "بارِ الٰہا! میں اس بچی اور اس کی اولاد کو شیطانی سازشوں سے محفوظ رکھنے کی استدعا کرتی ہوں"۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے کہلوایا گیا: وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ (۲۳/۹۷-۹۸)۔ "اے رسولؐ! تم کہو کہ شیطان کی سازشوں سے محفوظ رہنے کے لئے تیری پناہ طلب کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ مجھ پر حملہ آور نہ ہوں"۔ سورۃ الاعراف میں ہے: وَاِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ۔ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (۷/۲۰۰)۔ "اگر کسی قسم کا کوئی وسوسہ یا ان مخالفین کا کوئی سرغنہ تم میں باہمی فساد ڈالنا چاہے (۵۳/۱۴) تو تم ضابطۂ خداوندی کے ساتھ اور شدت سے متمسک ہو کر اس کی پناہ میں آجاؤ۔ یاد رکھو! تمہارا خدا سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔ ان تخریبی عناصر یا وساوس سے محفوظ رہنے کے لئے خدا کی حفاظت میں کس طرح آیا جاتا ہے اس کی وضاحت اس سے اگلی آیت میں یہ کہکر کر دی کہ: اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا۔

فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (۷/۲۰۱) "متقیوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی غلط (شیطانی) خیال، یونہی گھومتے پھرتے بھی ان کے پاس سے گزر جائے تو وہ فوراً قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے لے آتے ہیں۔ اس سے یوں ہوتا ہے جیسے تاریکی میں یکایک روشنی سامنے آجائے اور صاف طور پر دکھائی دینے لگ جائے کہ انہیں اس حالت میں کیا کرنا چاہیئے"۔ اس مفہوم کی تائید قصۂ حضرت یوسف علیہ السلام سے بھی ہوتی ہے۔ جب عزیزِ مصر کی بیوی نے کمرے کے دروازے بند کرکے اپنی خواہشِ نفس کی تسکین کے لئے حضرت یوسفؑ کو آمادہ کرنا چاہا تو آپ نے کہا: مَعَاذَ اللّٰهِ (۱۲/۲۳) "میں تمہارے اس ارادے اور اقدام سے محفوظ رہنے کے لئے خدا کی پناہ طلب کرتا ہوں"۔ اور انہیں یہ پناہ اس طرح سے مل گئی کہ: وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ۔ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ۔ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (۱۲/۲۴) "وہ عورت اس کا تہیہ کر چکی تھی اور اس نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ اگر یوسفؑ کی جگہ کوئی اور ہوتا جس کے سامنے اپنے پروردگار کی درخشندہ و تابناک اخلاقی قدر نہ ہوتی تو وہ بھی اس پر آمادہ ہو جاتا۔ اس اخلاقی قدر کے پیشِ نظر رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس بے حیائی کے کام سے مجتنب رہا اور یوں اس نے اپنے حسنِ سیرت سے ثابت کر دیا کہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے"۔ اس سے واضح ہے کہ ایسے مقامات پر خدا کی پناہ میں آنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان فوراً اس امر کو سامنے لے آئے کہ اس باب میں خدا کی راہنمائی کیا ہے اور پھر شدت سے اس پر کاربند ہو جائے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے سلسلے میں یہی حقیقت (۱۲/۲۴) میں بھی سامنے لائی گئی ہے۔

سورۃ النحل میں ہے کہ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (۱۶/۹۸-۹۹)۔ ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ "جب تم قرآنی پروگرام پر عمل درآمد شروع کرو گے تو مفاد پرست اور سرکش قوتیں اس کی مخالفت کریں گی۔ اس وقت ضرورت ہوگی کہ تم اور زیادہ شدت کے ساتھ قوانینِ خداوندی سے وابستہ رہ کر تخریبی عناصر کی مضرت رسانیوں سے، سامانِ حفاظت طلب کرو۔ یاد رکھو! یہ تخریبی قوتیں ان لوگوں پر کبھی غلبہ نہیں پا سکتیں جو قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین اور ان کی محکمیت پر پورا پورا بھروسہ رکھیں"۔ (نیز دیکھئے ۴۰/۵۹)۔

یہ تھا قرآنی مفہوم فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ کا۔ لیکن اب اس کی تعمیل کا طریق صرف یہ رہ گیا ہے کہ قرآنِ مجید کی تلاوت کے آغاز میں اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ کے الفاظ دہرا لئے جاتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں، اس سے ایک قدم اور بھی آگے بڑھایا جاتا ہے۔ لفظِ تعویذ کا مادہ بھی یہی ہے۔ اب قرآنی آیات کا

مصرف یہ رہ گیا ہے کہ ان کے تعویذ بنا کر گلے میں ڈال دیئے جائیں یا دروازوں کے ساتھ لٹکا دیئے جائیں، اور اس سے یہ اطمینان حاصل کر لیا جائے کہ اس سے ہر آفت سے حفاظت مل جائے گی۔ کیونکہ ہم خدا کی پناہ میں آگئے ہیں۔ جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس میں حصول مقاصد کی عملی تدابیر کے بجائے الفاظ کی پرستش شروع ہو جاتی ہے۔

بہرحال، آپ پھر واقعہ ذبح گاؤ کی طرف آیئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں تم سے مذاق نہیں کر رہا۔ میں بالکل (SERIOUS) ہوں اور خدا کا حکم تم تک پہنچا رہا ہوں کہ تم ایک گائے ذبح کر دو۔ ظاہر ہے کہ گائے یا بیل کے لفظ سے ایک بچہ بھی سمجھ لے گا کہ اس سے کیا مراد ہے لیکن چونکہ ان کے دل میں چور تھا اس لئے انہوں نے خواہ مخواہ موشگافیاں شروع کر دیں اور کہنے لگے:-

۲/۶۸ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ۔

"خدا سے کہیئے کہ وہ ذرا واضح طور پر بتائے کہ وہ گائے یا بیل کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ جب انہوں نے اس قسم کی جزئیات کا تقاضہ شروع کر دیا تو ان سے کہا گیا کہ وہ سانڈ نہ بوڑھا ہونا چاہیئے نہ بچہ، بلکہ اس کے بین بین، ادھیڑ عمر کا ہونا چاہیئے۔ لہٰذا جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے۔ اس کی تعمیل کرو۔"

اس پر انہوں نے کہا کہ بات اب بھی کچھ مشتبہ سی ہے:-

۲/۶۹ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۔ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا ۔ تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ۔

"انہوں نے کہا کہ اپنے رب سے پوچھ کر یہ بھی بتاؤ کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔ کہا گیا کہ گہرے زرد رنگ کا سانڈ (بیل) جو دیکھنے والوں کی نگاہوں میں اچھا جچے۔"

وہ اس پر بھی آمادہ بہ عمل نہ ہوئے اور مزید حجت بازی کے لئے کہا:-

۲/۷۰ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ۔

"اپنے رب سے کہو کہ ذرا کھول کھول کر بتائے کہ وہ بیل کیسا ہونا چاہیئے۔ ہم پر بات واضح نہیں ہوئی۔ اس کی

مزید وضاحت کر دی جائے تو ہم یقیناً حکم کی تعمیل کریں گے"۔

اس پر ان سے کہا گیا:-

۲/۷۱ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ - فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ -

"وہ بیل ایسا ہونا چاہیئے جسے نہ ہل میں جوتا گیا ہو اور نہ کنوئیں پر چلایا گیا۔ ہر طرح سے صحیح وسالم اور بے داغ۔ کہا کہ ہاں! اب تم نے ٹھیک ٹھیک بتایا"۔ اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے اس کی وضاحت کر دی کہ انہوں نے ایک معمولی سی بات میں بھی اس قدر موشگافیاں شروع کر دیں۔ انہوں نے یہ کچھ اس لئے نہیں کیا تھا کہ پہلے بات واضح نہیں تھی۔ انہیں شروع ہی سے معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھوں سے ایک بیل ذبح کرانا چاہتے ہیں تاکہ ان کے دل سے ان کے معبود کی عظمت اور عقیدت نکل جائے۔ لیکن ان کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ اُسے ذبح کریں۔ مشکل یہ تھی کہ وہ اس کا کھلے بندوں اقرار بھی نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے حیلہ سازیاں اور عذر تراشیاں شروع کر دیں اور اس قدر لمبی چوڑی باتوں کے بعد اس حکم کی تعمیل کی۔

ناپختہ ذہنیت کے مسلمان

اس واقعہ سے دو اہم نکات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو قوم دین کے حقائق اور نظام کو اچھی طرح سمجھے اور اس طرح ان کی صداقت پر مطمئن ہوئے بغیر کسی وجہ سے ایمان لے آتی ہے وہ اپنے سابقہ عقائد (خواہ وہ اوہام اور خرافات ہی کیوں نہ ہوں) اپنے دل کی گہرائیوں میں ساتھ لے کر آتی ہے۔ اس کے لئے بڑی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کی تعلیم وتربیت مسلسل اور التزاماً اس انداز سے کی جائے کہ یہ تمام عقائد ان کے دل سے نکل جائیں اور ان کی جگہ قرآنی عقائد نہایت پختگی سے ان کے قلب و ذہن میں جاگزیں ہو جائیں۔ صدرِ اسلام میں اسی قسم کے تھے وہ نئے نئے ایمان لانے والے (بدوی قبائل) جن کے متعلق قرآن کریم میں ہے: قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا - قُل لَّمْ تُؤْمِنُوا وَلَٰكِن قُولُوا أَسْلَمْنَا - وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ - وَإِن تُطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلِتْكُم مِّنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا - إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۴۹/۱۴)۔ "یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ ان سے کہو کہ وہ ایسا نہ کہیں بلکہ یہ کہیں کہ ہم نے اس مملکت یا نظام کے سامنے اپنے آپ کو (SURRENDER) کر دیا۔ یہ اس لئے کہ ابھی تک ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا"۔ اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ سے کہا کہ ان سے کہو کہ وہ اس سے دل برداشتہ نہ ہو جائیں۔ اگر وہ خدا اور رسول کی اطاعت کرتے رہے تو ان کے اعمال کے معاوضہ میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائے گی۔ اللہ غفور اور رحیم واقع ہوا

ہے" میں نے اپنی کتاب ـــــ شاہکارِ رسالت ـــــ میں اس حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ جب وہ قومیں، جن کے علاقے مسلمانوں نے فتح کئے تھے، شبا شب، بغیر کسی سابقہ تعلیم و تربیت کے حلقۂ اسلام میں داخل ہوگئیں تو وہ اپنے تمام قدیم عقائد کو ساتھ لیے ہوئے آئیں اور چونکہ اس کے بعد بھی ان کے مناسب تعلیم و تربیت کا انتظام نہ ہوسکا اس لئے ان کے وہی عقائد اسلامی عقائد کی شکل اختیار کر کے ساری دنیا میں پھیل گئے اور وہی عقائد و نظریات اس وقت تک مسلسل آگے چلے آ رہے ہیں۔

یہ پرانے وقتوں کی بات ہے۔ خود (ہندوستان اور) پاکستان میں کثیر التعداد مسلمان ان اسلاف کی اولاد ہیں جو اسلامی تعلیم و تربیت کے بغیر (خارجی محرکات کی بنا پر) مسلمان ہوگئے تھے، وہ ہندوانہ عقائد اور رسوم اپنے ساتھ لائے اور چونکہ ان کے مسلمان ہونے کے بعد ان کی صحیح اسلامی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ ہوسکا، اس لئے وہ عقائد و رسوم بدستور ہم میں چلے آ رہے ہیں۔ لہٰذا ہمارا مروجہ اسلام، (خواہ وہ کہیں ہو) انہی عقائد و نظریات اور رسوم و مسالک کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے جنہیں ہمارے (غیر مسلم) اپنے ساتھ لئے حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تھے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ (اور طریقِ عمل) يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۲/۱۲۹) بتایا گیا ہے۔ یعنی حضورؐ کتاب و حکمت کی تعلیم سے افرادِ امت کی صحیح تربیت (يُزَكِّيهِمْ) کیا کرتے تھے۔ اگر ارشادِ خداوندی اور سنتِ نبوی کے اتباع میں تعلیم و تربیت کا یہ سلسلہ جاری رکھا جاتا تو (نئے نئے مسلمانوں کے اپنے ساتھ لائے ہوئے) عقائد و مسالک، جزوِ اسلام نہ بن سکتے۔ لیکن ہم نے اس طریقِ نبوی کا اتباع چھوڑ دیا جس سے اسلام کچھ کا کچھ بن کر رہ گیا۔ اب جو تعلیم، مذہب کے نام سے دی جاتی ہے وہ انہی عقائد و مسالک کی تعلیم ہوتی ہے کیونکہ کتاب (قرآن) کا مقصد، ہمارے ہاں، اس کی تلاوت سے ثواب حاصل کرنے سے زیادہ کچھ نہیں رہ گیا۔ اور دین کی غایت اور مقصد کے نگاہوں سے گم ہو جانے کی وجہ سے حکمت کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ یہی وہ "غارت گری" ہے جس کا ماتم کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی ٭ یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

ذبح بقر کے واقعہ کا یہ پہلا نکتہ ہے جو سامانِ عبرت فراہم کرتا ہے۔ اس کا دوسرا نکتہ بھی ایسا ہی اہم ہے۔ اور وہ یہ کہ قرآن کریم نے جو احکام اور قوانین اصولی طور پر دیئے ہیں اور ان کی جزئیات خود متعین نہیں کیں تو ایسا کچھ دانستہ اور خدا کے پروگرام کے مطابق کیا گیا ہے۔ دین کے اصول تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہتے تھے لیکن ان کی جزئیات

قرآنی احکام کی جزئیات

کو زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہنا تھا۔ اگر وہ (جزئیات) بھی قرآن کریم کے اندر دیدی جاتیں تو وہ بھی غیر متبدل قرار پاجاتیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ جب زمانے کے احوال وکوائف کے بدل جانے سے ان جزئیات پر عملدرآمد مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا تو لوگ خود نفس اسلام ہی سے بدظن ہو جاتے اور یہ خیال قائم کر لیتے کہ یہ ضابطۂ قوانین کسی گزرے ہوئے زمانے میں تو ممکن العمل تھا، اب یہ اس زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں نے اس اہم گوشے کی وضاحت مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں آیت (۲/۴) کے تحت صفحات (۱۳۰-۱۲۵ پر) شرح وبسط سے کر دی ہے۔ اس کا دہرانا ضروری نہیں۔ البتہ ان دو آیات کا پھر سے درج کر دینا ضروری نظر آتا ہے جنہیں قرآنِ کریم نے ہماری ہدایت کے لئے سورۃ المآئدۃ میں محفوظ کر رکھا ہے۔ وہ آیات یہ ہیں:-

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ۔ وَ اِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ۔ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ۔ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ۔ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ۔ (۵/۱۰۱-۱۰۲)۔

اے جماعتِ مومنین! جن امور کی تصریحات ہم نے خود نہیں کیں انہیں کرید کرید کر مت پوچھا کرو۔ اس وقت جبکہ وحی کا سلسلہ جاری ہے اگر (بالفرضِ محال) ان امور کو بھی قرآن میں دیدیا جائے تو تم مشکل میں پڑ جاؤ۔ قرآن میں دیدینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ان میں کبھی تبدیلی نہ ہو سکے گی اور جب تغیرِ حالات کی بنا پر وہ ناقابلِ عمل ہو جائیں گی تو تمہارے لئے ان کا نباہنا مشکل ہو جائے گا۔ تم سے پہلے بھی ایک قوم نے ایسا ہی کیا تھا۔ پھر ان کی کیفیت یہ ہو گئی کہ انہوں نے ان ناقابلِ عمل جزئیات سے پیچھا چھڑانے کے لئے خود دین کے لبادے ہی کو اتار پھینکا۔ لہٰذا جن جزئیات کا تعین ہم نے خود نہیں کیا، تم سمجھ لو کہ انہیں دانستہ ایسا رکھا گیا ہے۔

اس کی وضاحت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بھی موجود ہے۔

حضورؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے چند باتیں فرض قرار دی ہیں۔ پس تم ان کو ضائع نہ کرو۔ چند چیزیں خدا نے حرام ٹھہرائی ہیں، تم ان کے قریب تک بھی نہ پھٹکو۔ اس نے چند حدود مقرر کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور کچھ چیزوں کے بیان کرنے میں خاموشی اختیار کی ہے، تم ان کے متعلق کرید مت کرو۔ کیونکہ خدا

نے ایسا بھول کر نہیں کیا، دانستہ ایسا کیا ہے۔

(مشکوٰۃ اردو ترجمہ۔ جلد اول صفحہ ۹۲۔ باب اعتصام بہ کتاب و سنت)

ہم نے جلد اول میں، صراحت سے بتایا ہے کہ جزئیات کا تعین اور ان میں تغیر و تبدل صرف اسلامی مملکت کر سکے گی جسے خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کہا جاتا ہے۔ کسی فرد یا افراد کے گروہ کو ایسا کرنے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔

یہ قوم حضرت موسیٰؑ کو تنگ کرتی تھی

آپ چند صفحات پیچھے اُلٹیے اور اس مقام پر پہنچیے جہاں قرآن کریم کی یہ آیت درج کی گئی ہے کہ: وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ (۶۱/۵)" جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ میری قوم کے لوگو! تم مجھے اس طرح کیوں ستاتے ہو۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں خدا کا رسول ہوں اور تم سے جو کچھ کہتا ہوں وہ خدا ہی کے ارشادات ہوتے ہیں۔ اس لئے تم مجھے ان کی وجہ سے قدم قدم پر ستانے کیوں بیٹھ جاتے ہو۔ گذشتہ صفحات میں آپ کے سامنے وہ واقعات آگئے جن سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لوگ کس طرح ایک ایک قدم پر روٹھ کر بیٹھ جاتے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو، کوسنے لگ جاتے تھے۔ اس ضمن میں چند ایک مقامات اور بھی ملاحظہ فرمائیے جو بائبل میں مذکور ہیں۔ مثلاً:

> تب ساری جماعت چلا کر رو ئی اور لوگ اس رات بھر رویا کیے۔ پھر سارے بنی اسرائیل موسیٰ اور ہارون پر کڑکڑائے اور ساری جماعت نے انہیں کہا کہ اے کاش کہ ہم مصر میں مر جاتے! اور.... کاش کہ ہم مصر میں مر جاتے! اور کاش کہ ہم اسی بیابان میں فنا ہوتے۔ (گنتی ۱۴/۱-۲)

اس سے آگے ہے:-

> بعد اس کے بنی اسرائیل کی ساری جماعت پہلے مہینہ میں دشتِ صین کو آئی اور قادس میں رہنے لگی۔ مریم وہاں مری اور وہیں گاڑی گئی۔ وہاں جماعت کے لئے پانی نہ تھا۔ سو وہ جمع ہو کے موسیٰ اور ہارون کے برخلاف ہوئے۔ اور ان لوگوں نے موسیٰ سے جھگڑا کیا اور کہا اے کاش کہ جب ہمارے بھائی خداوند کے آگے مرگئے، ہم بھی مر جاتے۔ تم خداوند کی جماعت کو اس دشت میں کیوں لائے کہ ہم اور ہمارے جانور یہاں مر جائیں؟ اور تم ہمیں مصر سے اس بُرے مقام پر پہنچانے کے واسطے کیوں نکال لائے؟ یہاں تو بونے کی جگہ نہیں اور نہ انجیروں کی اور نہ انگوروں کی اور نہ اناروں کی۔ یہاں تو پینے کو پانی بھی نہیں۔ (گنتی ۲۰/۱-۵)

اور تیسرے مقام پر:

اور لوگوں نے خدا اور موسیٰ سے بگڑ کر یوں کہا کہ تم ہم کو مصر سے نکال لائے کہ ہم بیابان میں مریں؟ یہاں تو نہ روٹی ہے نہ پانی۔ ہمارے جی کو اس ہلکی روٹی سے کراہیت آتی ہے۔ (گنتی ۲۱/۵)

یہ ٹھوس واقعات تھے۔ لیکن انسانی ذہن کو جو لذت افسانوں سے ملتی ہے وہ حقیقت میں کہاں؟ اس لئے بائبل میں (جس میں انسانی خیالات کی آمیزش ہو چکی ہے) اس کھلی ہوئی حقیقت کو چھوڑ کر افسانہ طرازی کی طرف رخ کر لیا گیا۔ انہوں نے ایسا کیا تو یہ بات کچھ تعجب انگیز نہیں کیونکہ خدا کی کتاب اس کی اصلی شکل میں اُن کے پاس موجود نہیں رہی تھی اور ذہن انسانی نے اسے افسانوں کا مجموعہ بنا دیا تھا۔ لیکن افسوس اس بات پر ہے کہ خود ہمارا لٹریچر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، حالانکہ ہمارے پاس خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود تھی۔ اور اس میں یہ تمام واقعات نہایت وضاحت سے مذکور تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اِس "اذیت رسانی" کے سلسلے میں بخاری میں حسب ذیل روایت درج ہے:-

ایک وضعی روایت

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ موسیٰؑ نہایت باحیا اور ستر کو چھپانے والے تھے۔ چونکہ ان کے مزاج میں شرم تھی اس لئے کوئی ان کے حصہ بدن کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ لیکن بعض موذی بنی اسرائیل نے ان کو ایذا پہنچائی اور کہنے لگے یہ اس قدر پردہ صرف اس وجہ سے کرتے ہیں کہ ان کے بدن میں کوئی عیب ہے۔ برص ہے یا باد خایہ ہے یا کوئی اور مرض ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ کا ارادہ ہوا کہ موسیٰؑ کو بنی اسرائیل کی افترا بندی سے بری کرے۔ چنانچہ ایک روز (حضرت) موسیٰؑ تنہائی میں غسل کرنے کھڑے ہوئے۔ کپڑے اتار کر پتھر پر رکھے اور خود غسل کرنے لگے۔ غسل سے فارغ ہو کر جب کپڑے پہننے کے لئے بڑھے تو پتھر کپڑے لے کر بھاگا۔ موسیٰؑ لاٹھی لیکر (برہنہ) پتھر کے پیچھے یہ کہتے ہوئے چلے۔ او پتھر! میرے کپڑے۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت تک پہنچ گئے۔ لوگوں نے ان کو برہنہ دیکھ لیا اور معائنہ کر لیا کہ وہ بہت عمدہ ساخت کے آدمی ہیں خدائے تعالیٰ نے (اس ذریعہ سے) بنی اسرائیل کی افترا بندی سے ان کو بری کر دیا۔ بالآخر پتھر بھی رُک گیا۔ موسیٰؑ نے اپنے کپڑے لے لئے اور لاٹھی سے پتھر کو مارنے لگے۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم موسیٰؑ کے مارنے کی وجہ سے پتھر پر تین یا چار یا پانچ نشان پڑ گئے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا خدا تعالیٰ کے مذکورہ ذیل قول کا یہی مطلب ہے يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ...... (۳۳/۶۹)۔

(بخاری عربی مطبوعہ مصر، جلد دوم صفحہ ۱۵۳۔ اُردو ترجمہ جلد اول صفحہ ۷۶)

آپ خود سوچ لیجئے کہ جو قرآن ان روایات و تفاصیل کی رو سے سمجھا جائے گا اس سے اسلام کا کس قسم کا تصور ذہن میں پیدا ہو گا۔ اسی قسم کا اسلام ہے جس سے ہماری نئی نسل، جس نے سوچنا شروع کیا ہے، مذہب سے برگشتہ ہو رہی ہے۔ اگر اس کے سامنے قرآنِ کریم اس کی حقیقی شکل میں پیش کیا جائے تو ہو نہیں سکتا کہ وہ اسے حرزِ جاں نہ بنا لے۔ میں یہ کچھ اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ میں ان نوجوانوں کے سامنے قرآن کریم کو بلا آمیزش پیش کرتا ہوں جس سے بڑے حوصلہ افزا، خوشگوار نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

نوٹ: ترتیب کے اعتبار سے اس جگہ پانچویں باب کا خلاصہ آنا چاہیئے تھا۔ لیکن پانچویں اور چھٹے باب میں اس قدر معنوی تسلسل ہے کہ ان دونوں کا خلاصہ یکجا دیا جانا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ بنا بریں آیات ۵۵ تا ۱۱۲ کا خلاصہ چھٹے باب کے آخر میں دیا جائے گا۔

چھٹا باب

داستانِ بنی اسرائیل ـــــ مسلسل

(آیات ۷۲ تا ۱۱۲)

۱ـــ واقعۂ قتل اور طریقِ تفتیش

۲ـــ یہودیوں کی قساوتِ قلبی۔

۳ـــ قانونِ مکافاتِ عمل

۴ـــ والدین اور اولاد کا تعلق

۵ـــ کتاب کے ایک حصہ پر ایمان دوسرے سے کفر۔ یہ ثنویت باعثِ تذلیل ہے۔

۶ـــ ہمارے علماء کی حالت۔

۷ـــ "آنے والے" کا عقیدہ

۸ـــ سیکولرازم۔ سوشلزم۔ کمیونزم۔ سب خلافِ اسلام ہیں۔

۹ـــ حضرت سلیمانؑ کے خلاف بہتان تراشی۔ ہاروت و ماروت کا افسانہ

۱۰ـــ جادو کی حقیقت۔ باطنیت کا عقیدہ۔ تعویذ۔ درد، وظائف

۱۱ـــ علامہ اقبالؒ اور تصوف

۱۲ـــ قریش کی طرف سے اسلامی نظام کی مخالفت۔

۱۳ـــ مخالفین سے اعراض اور علیحدگی کا حسن کارانہ طریق۔

۱۴ـــ قانونِ مکافاتِ عمل

چھٹا باب

(آیات ۷۲ تا ۱۱۲)

داستانِ بنی اسرائیل — مسلسل

۲/۷۳-۷۲ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ـ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ـ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ـ

ان آیات کی تفسیر میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اس سے ان کا مفہوم واضح ہونے کے بجائے الجھ کر رہ گیا ہے۔ اس سلسلے میں تمہیداً ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم میں جو کچھ آیا ہے، اصولی طور پر اُسے مختلف گوشوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ایک، اور بنیادی گوشے کا تعلق انسانی راہنمائی (ہدایت) سے ہے۔ اس میں جو احکام دیئے گئے ہیں ان کے معانی متعین ہیں جنہیں ہر ذہنی سطح کا انسان (بشرطیکہ وہ قرآنِ کریم کی زبان اور اسلوبِ بیان سے واقف ہو) بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ دوسرے گوشے کا

قرآنی حقائق کے تین گوشے

تعلق خارجی کائنات میں نافذ قوانین اور نظام سے ہے۔ ان حقائق کے کماحقہٗ سمجھنے کے لئے اشیائے کائنات سے متعلق علوم (قوانینِ فطرت) سے واقفیت ضروری ہے۔ اِن قوانین میں اکثر و بیشتر ایسے ہیں جن کا انکشاف علومِ سائنس کی رو سے کر لیا گیا ہے اور کچھ ایسے ہیں جن کے متعلق تحقیق جاری ہے۔ ان (آخرالذکر) کے متعلق جو کچھ سر دست کہا جائے گا وہ قیاس ہوگا۔ لیکن قرآنِ کریم میں جو کچھ آیا ہے وہ بہرحال قطعی اور یقینی ہے۔ اس لئے ان امور کے متعلق ہم یہی کہیں گے کہ جب انسانی علم مزید ترقی کر جائے گا تو ان آیاتِ قرآنیہ کا قطعی مفہوم ہمارے سامنے آجائے گا۔ ان کے یقینی ہونے پر بہرحال ہمارا ایمان ہے۔ یہی کیفیت اُن تاریخی واقعات کی ہے جنہیں قرآنِ کریم نے اپنے دعاوی کی تائید میں بطورِ شہادت پیش کیا ہے۔ ان میں سے اکثر واقعات کی تصدیق و توثیق تاریخی انکشافات سے ہو چکی ہے اور کچھ ایسے ہیں جن سے یہ تحقیق ہنوز پردہ نہیں اٹھا سکی۔ ان کے متعلق بھی سر دست یہی کہا جائے گا کہ

ان کے سچا ہونے پر ہمارا ایمان ہے اور جب تاریخی تحقیقات آگے بڑھیں گی تو وہ ان کی تصدیق کر دیں گی۔ جس طرح (مثلاً) فرعون کی لاش کے محفوظ رکھے جانے کا جو واقعہ قرآنِ کریم میں مذکور ہے، صدیوں تک تاریخی تحقیق کے اعتبار سے وہ پردۂ اخفا میں رہا تآنکہ اہرامِ مصر کے نیچے ممی شدہ لاشوں کے انکشاف کے بعد قرآنِ کریم کا بیان حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آگیا۔ اس سے اگلا گوشہ ان حقائق پر مشتمل ہے جن کا تعلق مابعد الطبیعیات سے ہے۔ (مثلاً) مرنے کے بعد کی زندگی اور اس کی کیفیات۔ ان حقائق کی کنہ و ماہیت کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ نہیں سکتے، البتہ دلائل و شواہد کی رو سے ان کے متعلق ذہن میں ایک تصور قائم کر سکتے ہیں۔ بایں ہمہ، ان کے حقیقتِ ثابتہ ہونے پر بھی ہمارا ایمان ہے۔

جس واقعہ کا ذکر آیاتِ زیرِ نظر (۲/۷۳-۷۲) میں آیا ہے، تاریخی تحقیق ابھی تک اس پر سے پردہ نہیں اٹھا سکی۔ اس لئے اس کے متعلق سرِدست جو کچھ کہا جائے گا، بہرحال قیاسی ہوگا۔ لیکن قیاس کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ قرآنی اصول و قوانین یا اس کی مجموعی تعلیم کے خلاف نہ جائے۔

ان تصریحات کی روشنی میں، ان آیات کے مفہوم کی طرف آیئے۔ ان سے پہلی آیات میں گائے یا بیل (سانڈ) کے ذبح کرنے کا واقعہ مذکور ہے۔ عام طور پر مفسرین کا خیال اس طرف گیا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق بھی ذبحِ بقرہ سے ہے یعنی ان

واقعۂ قتل کی عام تفسیر

آیات میں واقعاتی تسلسل ہے۔ اس اعتبار سے عام طور پر کہا یہ گیا ہے کہ بنی اسرائیل کے ہاں ایک قتل ہو گیا اور قاتل کا پتہ نہ چل سکا۔ چنانچہ وہ باہم گر جھگڑنے اور ایک دوسرے کے خلاف الزام دھرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جس بات کو یہ لوگ پوشیدہ رکھتے تھے (یعنی یہ کہ قاتل کون ہے) اُسے ہم ظاہر کئے دیتے ہیں۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اُن سے کہا کہ اس ذبح شدہ گائے کی لاش کا ایک ٹکڑہ اس مقتول (مردہ) کی لاش کے ساتھ لگا دو۔ انہوں نے ایسا کیا تو مردہ جی اٹھا اور اس نے بتا دیا کہ اس کا قاتل کون ہے۔ اس راز کے افشا کرنے کے بعد وہ پھر مر گیا۔ جن لوگوں کو اس مفہوم سے اختلاف ہے ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ وہ شخص درحقیقت مرا نہیں تھا بلکہ بیہوش ہو گیا تھا۔ یا اس میں عملِ تنفس بند ہو گیا تھا اور اس کے جسم کے بعض اعضاء کو حرکت دینے سے اس میں عملِ تنفس پھر سے جاری ہو گیا یا وہ ہوش میں آگیا تھا۔ وہ ان آیات کے بعض الفاظ کے مجازی معانی کی تائید

سے اس نتیجہ تک پہنچنے کے مدعی ہیں۔ لیکن (ہمارے نزدیک) کسی شخص کا بیہوش ہو جانا یا اس پر سکتہ طاری ہو جانا تو کوئی ایسا اہم یا غیر معمولی واقعہ نہیں جسے قرآن کریم اتنی اہمیت دیتا۔ ہمارے خیال میں وہ مقتول تھا اور مر چکا تھا۔ اہمیت اس واقعہ کو یوں بھی ہے کہ قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ اُسے ان میں سے کسی ایک شخص نے قتل کیا تھا۔ قَتَلْتُمْ جمع کا صیغہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی اجتماعی سازش کا نتیجہ تھا، اور مقتول بھی کوئی اہم شخصیت تھی۔ جہاں تک اس مفہوم کا تعلق ہے کہ خدا نے یہ کہا کہ اُس مذبوحہ گائے یا بیل کی لاش کے کسی ایک ٹکڑے کو مقتول کی لاش کے ساتھ مس کر دو تو اس سے مقتول زندہ ہو جائے گا — اور وہ زندہ ہو گیا — تو اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک معجزہ تھا جسے قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ معجزہ کس کا تھا؟ معجزہ کے متعلق تو عقیدہ یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نبی کے ہاتھوں سرزد ہوتا تھا، اور اس طرح وہ اس نبی کے دعوائے نبوت کی دلیل یا شہادت بن جاتا تھا۔ لیکن یہ معجزہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں سرزد نہیں ہوا۔ لہٰذا یہ معجزہ اُس گائے کا ہو گیا جسے ذبح کیا گیا تھا۔ اور یہ بات تسلیم کئے جانے کے قابل ہی نہیں۔ اُس گائے کو بنی اسرائیل کے ہاتھوں اس لئے ذبح کرایا گیا تھا کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ گائے عام مویشیوں کی طرح ایک مویشی ہے جو خود اپنی بھی حفاظت نہیں کر سکتی۔ وہ انسان کے قابو اور قبضہ میں ہوتی ہے جسے وہ جس وقت چاہے ذبح کر سکتا ہے۔ لہٰذا اسے معبود سمجھنا انتہائی حماقت ہے۔ لیکن اگر کیفیت یہ ہو کہ اُس ذبح شدہ گائے میں بھی یہ قدرت ہو کہ اُس کے چھونے سے ایک مردہ زندہ ہو جائے تو اس کے معبود ہونے میں شبہ کیا رہ جاتا ہے؟ یہ تو عجیب سی بات ہوئی کہ بنی اسرائیل کے دل سے گائے کی عظمت و عقیدت زائل کرنے کے لئے اُسے اُن کے ہاتھوں ذبح کرایا گیا، اور پھر اس ذبح شدہ گائے کو ایسی قدرت کا حامل ثابت کر کے دکھا دیا جو خدا ہی کے شایانِ شان ہو سکتی ہے۔ اس سے تو اس کے معبود ہونے میں کوئی شبہ ہی باقی نہیں رہتا۔

اب آگے بڑھیے۔ اس تفسیر کی رو سے کہا یہ جاتا ہے کہ خدا کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ وہ مردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اس تصور کو سامنے لائیے کہ مردہ گائے کے ایک ٹکڑے کو لاش کے ساتھ مس کیا گیا تو وہ مردہ زندہ ہو گیا۔ اور اس کے بعد خدا نے کہا کہ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى (۲/۷۳) "اس طرح خدا مردوں کو زندہ کیا کرتا ہے — اور زندہ کرے گا"۔ اس میں كَذٰلِكَ (یعنی اس طرح) کا لفظ

قابلِ غور ہے۔ یعنی خدا نے کہا یہ ہے کہ ہم مردہ انسانوں کے جسموں کے ساتھ مردہ حیوانات کے بعض ٹکڑوں کو مس کریں گے اور اس طرح مردے جی اٹھیں گے! اس تفسیر کے بے معنی (بلکہ قرآنی تصور کے خلاف) ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ اگر خدا کو یہی مقصود تھا کہ وہ مقتول زندہ ہو کر اپنے قاتل کا پتہ نشان بتا دے تو اس کے لئے اس ذبح شدہ گائے کو درمیان میں لانے کی ضرورت کیا تھی؟ کیا اللہ تعالیٰ اس کے بغیر اپنے حکم سے براہِ راست ایسا نہیں کر سکتے تھے؟

اس کی تفسیر میں قیاس کا رُخ کس سمت کی طرف ہونا چاہیئے، اس کا تعین آیت (۲/۷۳) کے آخری الفاظ نے خود ہی کر دیا ہے جہاں کہا ہے کہ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (۲/۷۳)، "اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی باتیں بتاتا ہے تاکہ تم عقل و فکر سے کام لو"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس واقعہ میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے اُسے عقل و فکر کی رو سے سمجھا جانا چاہیئے۔ اگر یہ خارقِ فطرت معجزہ ہوتا تو اسے سمجھنے کے لئے عقل کو اپیل کیا ہی نہیں جا سکتا۔ معجزہ تو کہتے ہی اُسے ہیں جس کے سمجھنے سے عقل عاجز آجائے۔ بنابریں، اس کے متعلق جو قیاس بھی کیا جائے اس کی بُنیاد عقل و فکر پر ہونی چاہیئے۔ یعنی اُسے عقل و بصیرت کے خلاف نہیں ہونا چاہیئے۔

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اس واقعہ کا تعلق ذبحِ بقر کے واقعہ سے نہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، قرآنِ کریم کی ان اور اسی نہج کی دیگر آیات میں بنی اسرائیل کی تاریخ

ہمارا قیاس

کو سامنے لایا گیا ہے جو حضرتِ موسےٰ علیہ السلام سے لے کر نزولِ قرآنِ کریم کے زمانے تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ لہٰذا زیرِ نظر واقعہ بنی اسرائیل کی تاریخ کے کسی اور دور سے متعلق ہے۔ اس کا تعلق ذبحِ بقر کے زمانے یا واقعہ سے نہیں۔ یہ ایک الگ واقعہ ہے۔ ہمارے قیاس کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ اُس قوم کے کسی گروہ نے خفیہ سازش سے کسی نامور ہستی کو قتل کر دیا اور کوشش کی کہ یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے۔ ظاہر ہے کہ اس سے قوم میں کھلبلی مچ گئی ہوگی اور قاتل کے تعین میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہوئے ہوں گے جس سے وہ ایک دوسرے پر الزام دھرتے ہوں گے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے قاتل کے پہچاننے کا ایک نفسیاتی طریقہ بتایا جو اس زمانے میں وحی کے ذریعے ہی بتایا جا سکتا تھا۔ آپ پہلے کسی لاش کا تصور ذہن میں لائیے۔ وہ مرنے والا اپنے آخری سانس تک تمام گھر والوں کے لئے عزیز ترین ہستی اور محبت و پیار کا پیکر تھا۔ لیکن سانس بند ہو جانے کے بعد جب وہ زندہ انسان کے بجائے مردہ ہو گیا تو اس کی لاش سے گھر پر ہیبت طاری ہو گئی۔ جس کمرے میں اُس لاش کو رات بھر کے لئے رکھا گیا، کوئی

شخص اس میں تنہا جانے کی جرأت نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ رات بھر مُردے کی چارپائی کے گرد بہت سے لوگ (بالعموم عورتیں) جمع رہتی اور کچھ پڑھتی پڑھاتی رہتی ہیں تاکہ خیال لاش کی طرف نہ جانے پائے۔ یہ کیفیت ہوجاتی ہے لاش کی۔ اور وہ لاش اگر کسی مقتول کی ہو تو اسکی ہیبت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ قتل کا جرم ایسا سنگین ہوتا ہے کہ قاتل کسی فوری جذبے کے ماتحت اس کا خفیہ ارتکاب تو کر لیتا ہے لیکن جب جذبات کی شدت ماند پڑ جاتی ہے تو اس جرم کا احساس اس کے دل میں کرب و اضطراب کی ہیجانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ خون چھپا نہیں رہتا۔ وہ مجرم کے سر پہ چڑھ جاتا ہے۔ آجکل سنگین خفیہ جرائم کی تفتیش کے سلسلے میں خاص نفسیاتی طریق عمل میں لائے جا رہے ہیں۔ ان طریقوں کے ماہرین ملزم سے مختلف سوالات کے دوران اُس کے چہرے کی علامات اور آثار سے اکثر اوقات صحیح نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ اب ایسے آلات بھی ایجاد ہو گئے ہیں جو ملزم کے دورانِ خون، دل کی

تفتیش کا نفسیاتی طریق

دھڑکن، نبض کی رفتار کو اس طرح ریکارڈ کرتے جاتے ہیں کہ اُن سے اس کی قلبی کیفیت کا اندازہ کر لینا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ تو پھر بھی ماہرینِ علم النفس کے وضع کردہ طریق ہیں، ہمارے ہاں بالکل نچلی سطح پر چور کا پتہ لگانے کا ایک طریقہ تھا، (اور دیہات وغیرہ میں اب بھی ہے) جسے "لوٹا گھمانا" کہتے ہیں۔ ایک "سیانا" لوٹا لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ کچھ پڑھتا ہے اور جن لوگوں پر چوری کا شبہ ہوتا ہے اُن سے کہا جاتا ہے کہ ایک ایک شخص آکر لوٹے پر ہاتھ رکھے۔ عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ جو چور ہوگا اُس کے ہاتھ رکھنے سے لوٹا گھوم جائے گا۔ لوٹا گھومتا گھماتا تو کچھ نہیں لیکن جب چور لوٹے پر ہاتھ رکھتا ہے تو اس کا رنگ ضرور فق ہو جاتا ہے اور ہاتھ کانپنے لگتے ہیں (غالباً یہیں سے ہمارے ہاں "چور کی داڑھی میں تنکا" کا محاورہ رائج ہو گیا۔ اگرچہ اب عادی مجرم اپنی داڑھیاں منڈائے رکھتے ہیں تاکہ ان میں تنکا نہ اٹکے)، ہم سمجھتے ہیں کہ قصہ زیرِ نظر میں اسی قسم کا نفسیاتی طریق تھا۔ جو بذریعہ وحی بتایا گیا تھا ___ اس پر کچھ تعجب نہیں ہونا چاہیئے کہ وحی اس قسم کی باتیں بھی بتایا کرتی تھی۔ انسان کے ابتدائی ادوار میں تو کیفیت یہ تھی کہ حضرت نوح علیہ السلام کو سیلاب سے محفوظ رکھنے کے لئے کشتی بنانے کا طریق بھی وحی کے ذریعے بتایا گیا تھا۔ (۱۱/۳۷ ؛ ۲۳/۲۷)۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کہا یہ گیا ہوگا کہ جن لوگوں پر قتل کا شبہ ہے اُن میں سے ایک ایک شخص لاش کے قریب آئے اور لاش کا ہاتھ اٹھا کر اس کے جسم سے لگا دیا جائے۔ تفتیش کنندہ اس کا گہری نظر سے جائزہ لیتا جائے کہ کس پر کس قسم کی کیفیت

طاری ہوتی ہے۔ یا ان سے پہلے ہی کہہ دیا جائے کہ قاتل تنہائی میں سچی سچی بات بتا دے ورنہ اس لاش کے چھونے سے سارا راز کھل کر سامنے آجائے گا۔ تفتیش کے اِسی طریق پر غور و فکر کی دعوت قرآنِ کریم نے دی ہے اور اسی غور و فکر کا نتیجہ ہے کہ اب تفتیشِ جرائم کا نفسیاتی طریق عام ہوتا چلا جا رہا ہے۔

اِس مفہوم کے سلسلے میں، البتہ ایک بات وضاحت طلب رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى (۲/۷۳)۔ لغوی اعتبار سے تو اس کا ترجمہ یہی ہوگا کہ "اس طرح خدا مردوں کو زندہ کرتا ہے" لیکن، جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، اس سے لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۲/۷۳) (تاکہ تم عقل و فکر سے کام لے سکو) کا ربط قائم نہیں رہتا، اس لئے ان الفاظ کے لغوی نہیں بلکہ مجازی معانی لینے ہوں گے۔ امام راغب نے "حیات" کے معنی قوتِ عقل و عمل بھی بتائے ہیں اور کسی بات کے ظاہر یا واضح ہو جانے کے بھی۔ چنانچہ حَيِيَ الطَّرِيْقُ کے معنی ہیں، راستہ ظاہر یا واضح ہوگیا۔ اور طَرِيْقٌ حَيٌّ کے معنے ہیں واضح راستہ۔ اور جب موت کا لفظ اس کے مقابل آئے گا تو اس سے مفہوم کسی بات کا پوشیدہ ہو جانا ہوگا۔ چنانچہ عقل و ہوش یا حواس کے گم ہو جانے پر بھی موت کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ آیت (۲/۷۲) میں مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ (۲/۷۲)۔ (جسے تم چھپاتے ہو) کو آیت (۲/۷۳) میں الْمَوْتٰى (مخفی یا پوشیدہ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ (خدا ظاہر کر دے گا) کی يُحْيِ اللّٰهُ سے وضاحت کر دی گئی ہے۔ آیاتِ زیرِ نظر میں نقطۂ ماسکہ "پوشیدہ راز کا ظاہر کرنا تھا" نہ کہ مردہ کو زندہ کر کے دکھانا۔ وہ راز اس طرح سے ظاہر ہوگیا۔ یوں بھی قرآنِ کریم نے مجرموں کو اُن کے جرائم کی سزا دینے کو "حیات" سے تعبیر کیا ہے۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۲/۱۷۹) "اے اربابِ عقل و بصیرت! اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ مجرموں کو اُن کے جرائم کی سزا ملنے سے قوم کو زندگی (حیات) عطا ہو جاتی ہے۔

بہرحال، جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، یہ ہمارا قیاس ہے۔ حقیقت اُس وقت سامنے آئے گی جب تاریخی تحقیق اس واقعہ سے پردہ اٹھائے گی۔ اُس وقت تک ہمیں یہی کہنا چاہیئے کہ بحالاتِ موجودہ ہماری فکر کی حد یہی ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ امام ابنِ کثیرؒ جیسے مفسرؒ، جو قدامت پرستی اور اعجوبہ پسندی میں عام طور پر بہت شدت اختیار کر جاتے ہیں، اس واقعہ کے ضمن میں، انہوں نے بھی کچھ ایسا ہی موقف اختیار کیا ہے۔ وہ گائے کے ٹکڑے کو لاش کے ساتھ چھونے کے ضمن میں

لکھتے ہیں کہ :۔

اس کا بیان نہ تو قرآن میں ہے نہ کسی صحیح حدیث میں، اور نہ ہمیں اس کے معلوم ہونے سے کوئی فائدہ ہے، نہ ، نہ معلوم ہونے سے کوئی نقصان ہے۔ سلامت روی اسی میں ہے کہ جس چیز کا بیان نہیں، ہم بھی اس کی تلاش و تفتیش میں نہ پڑیں۔

(تفسیر ابن کثیر۔ پارہ اول۔ صفحہ ۱۰۰)

اس کے برعکس ہمارے دور کے مفسر، ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے،

مودودی صاحب کا قرآن پر اعتراض

اس سے ہمیں افسوس ہی نہیں، سخت صدمہ ہوا۔ ہمیں ان کے خیالات سے اتفاق بھی ہو سکتا ہے اور اختلاف بھی۔ اختلاف کی صورت میں ہمیں کسی قسم کا صدمہ تو ایک طرف، تاسف بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن جب کوئی ایسی بات سامنے آجائے جس سے (معاذ اللہ) خدا کی اس کتاب عظیم پر حرف آتا ہو تو اُس سے ہمیں واقعی دلی افسوس اور صدمہ ہوتا ہے۔ وہ ان آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں :۔

اس مقام پر بات تو بالکل صریح معلوم ہوتی ہے کہ مقتول کے اندر دوبارہ اتنی دیر کے لئے جان ڈالی گئی کہ وہ قاتل کا پتہ بتادے۔ لیکن اس غرض کے لئے جو تدبیر بتائی گئی تھی یعنی "لاش کو اسکے ایک حصے سے ضرب لگاؤ" اس کے الفاظ میں کچھ ابہام محسوس ہوتا ہے تاہم اس کا قریب ترین مفہوم وہی ہے جو قدیم مفسرین نے بیان کیا ہے۔ یعنی یہ کہ اوپر جس گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا، اُسی کے گوشت سے مقتول کی لاش پر ضرب لگانے کا حکم ہوا۔ اس طرح گویا بیک کرشمہ دو کار ہوئے۔ ایک یہ کہ اللہ کی قدرت کا ایک نشان انہیں دکھایا گیا۔ دوسرے یہ کہ گائے کی عظمت و تقدیس اور اس کی معبودیت پر بھی ایک کاری ضرب لگی کہ اس نام نہاد معبود کے پاس اگر کچھ بھی طاقت ہوتی تو اُسے ذبح کرنے سے ایک آفت برپا ہو جانی چاہیئے تھی نہ کہ اُس کا ذبح ہونا اُلٹا اس طرح مفید ثابت ہو۔

(تفہیم القرآن۔ جلد اول۔ مطبوعہ ۱۹۵۱ء۔ صفحہ ۸۶)

اِس "بیک کرشمہ دو کار" کے متعلق ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ جو کچھ ہم نے اِس کے معجزہ ہونے اور اس گائے کی عظمت و تقدیس کے مسلّم ہو جانے کے سلسلے میں پہلے لکھا ہے وہ اس کی تردید کے لئے کافی ہے۔ لیکن

جس بات سے ہمیں صدمہ ہوا وہ مودودی صاحب کے یہ الفاظ ہیں کہ "اس غرض کے لئے جو تدبیر بتائی گئی تھی"

اس کے الفاظ میں کچھ ابہام محسوس ہوتا ہے۔

قرآن کے الفاظ میں "ابہام" ــ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ ــ غیر مسلم تو اس قسم کے اعتراض کیا کرتے ہیں لیکن کسی مسلمان سے قرآن کریم کے متعلق اس قسم کی جسارت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ۔ (۵/۱۵) کہا ہے یعنی روشن اور نہایت واضح کتاب؛ ایسی واضح کہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (۱۶/۸۹) "ہر شے کو نہایت وضاحت سے بیان کرنے والی"؛ جس کتاب کے متعلق خود اللہ تعالیٰ یہ کہتے ہوں، اس کے متعلق یہ کہنا کہ اُس کے الفاظ میں کچھ ابہام محسوس ہوتا ہے، بہت بڑی جسارت ہے۔ یعنی بجائے اس کے کہ اس کا اعتراف کیا جائے کہ ہماری فکر ہنوز اتنی بلند نہیں ہوئی کہ ان الفاظ کے حقیقی مفہوم کو سمجھ سکے، کیونکہ تاریخی تحقیق ابھی وہاں تک نہیں پہنچ سکی، یہ کہنا کہ اِس کے الفاظ میں ابہام ہے، ہم تو سمجھ نہیں سکے کہ اسے کیا کہا جائے؛ یعنی اپنی فکر کی نارسائی کا اعتراف کرنے کے بجائے خدا کی کتاب کو مبہم قرار دینا۔ استغفر اللہ۔ اقبالؒ نے شاید ایسے ہی لوگوں کے متعلق کہا تھا کہ:۔

نری نگاہ فرومایہ ہاتھ ہے کوتاہ ترا گناہ کہ نخیلِ بلند کا ہے گناہ

اِن صاحب کا کہنا یہ ہے کہ "یہ میرا گناہ نہیں، نخیلِ بلند کا گناہ ہے۔ کیونکہ میرا ہاتھ کوتاہ نہیں اور میری نگاہ فرومایہ نہیں ہو سکتی"؛ ہم عاجز بندوں کا تو بہر حال ایمان یہ ہے کہ

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے درد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے!

(-)

خدا کی کتابِ مبین کو مبہم کہنے والوں کی یہی قساوتِ قلبی ہے جس کی طرف (بالواسطہ) اگلی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے جہاں کہا ہے:۔

۲/۷۴ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۔ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۔ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۔ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ۔ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۔

(بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ) تمہارے ساتھ یہ کچھ ہوتا رہا، تم بگڑتے اور بنتے رہے، لیکن مسلسل تکبر اور رعونت سے تمہارے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے، بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ اس لئے کہ بعض پتھر بھی ایسے ہوتے ہیں کہ اُن سے پانی کے قطرے ٹپک پڑتے ہیں اور بعض ایسے کہ وہ پھٹ جاتے ہیں تو ان کے اندر سے پانی کے چشمے اور ندیاں بہہ نکلتی ہیں اور ایسے پتھر بھی ہوتے ہیں کہ وہ قوانینِ خداوندی کی رو سے اپنی سختی کو چھوڑ کر نرم پڑ جاتے ہیں لیکن تمہارے دل ہیں کہ نہ وہ انسانیت کی غمخواری میں نرم ہوتے ہیں اور نہ اپنی رعونت کو چھوڑ کر صداقت کے سامنے جھکتے ہیں۔

مسلسل سرکشی اور تمرّد، نخوت اور تکبر سے انسان کے دل کی جو حالت ہو جاتی ہے اُسے قرآنِ کریم نے بہ ہیئتِ مجموعی پتھر سے تشبیہ دی ہے۔ (کالحجارۃ ـ پتھر نہیں بلکہ پتھر کی مانند) یہ وہی تمثیلی انداز ہے جو سورۃ الحشر کی آیت (۵۹/۲۱) میں اختیار کیا گیا ہے، جہاں کہا ہے کہ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ۔ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (۵۹/۲۱) "اس قرآن کی اثر انگیزیوں کا عالم یہ ہے کہ اگر، مثال کے طور پر، ہم اسے قلبِ کوہ کے اندر رکھ دیتے (اور اسے احساس عطا کر دیتے) تو تُو دیکھتا کہ اس کی خلاف ورزی کے احساس سے اُس پر لرزہ طاری ہو جاتا اور ذمہ داریوں کے خیال سے اس کا جگر شق ہو جاتا ہے۔ اِس قسم کی مثالیں ہم اس لئے بیان کرتے ہیں کہ لوگ عقل و فکر سے کام لیں اور سوچیں کہ یہ قرآن کن عظمتوں کا مالک ہے اور اس کی خلاف ورزی کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔"

آیۂ زیرِ نظر میں ہے ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ (۲/۷۴)۔ قساوت کے معنی سخت ہو جانا ہیں۔ حَجَرٌ قَاسٍ، ٹھوس اور سخت پتھر کو کہتے ہیں۔ اَرْضٌ قَاسِيَةٌ سخت چٹیل زمین، جس میں کچھ پیدا نہ ہو۔

قساوتِ قلبی

اس سے قساوتِ قلبی یا سنگدلی کا تصور سامنے آجاتا ہے۔ دلوں کی یہ حالت کیسے ہو جاتی ہے اس کے متعلق جماعتِ مومنین سے کہا وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ۔ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ۔ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ۔ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۵۷/۱۶)۔ "دیکھنا! تم کہیں سابقہ اہلِ کتاب کی طرح نہ ہو جانا۔ انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی۔ (ضد)، تعصب اور تقلید کی

روش اختیار کی، اور پھر جب اس روش پر چلتے ایک عرصہ گزر گیا تو ان کے دل سخت ہو گئے اور وہ راہِ راست سے پھر کر ایک طرف کو ہو گئے۔" اس کے بعد خود ان اہلِ کتاب (یہودیوں) سے کہا کہ اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا۔ (۵۷/۱۷)۔" اب بھی مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ مردہ زمین کو کس طرح حیاتِ تازہ عطا کر دیتا ہے۔ تم بھی اگر اس کے قوانین سے ہم آہنگی اختیار کر لو تو تمہارے دلوں کی سختی نرمی سے بدل سکتی ہے۔" دوسری جگہ ہے۔ فَبِمَا نَقۡضِہِمۡ مِّیۡثَاقَہُمۡ لَعَنّٰہُمۡ وَ جَعَلۡنَا قُلُوۡبَہُمۡ قٰسِیَۃً ۚ یُحَرِّفُوۡنَ الۡکَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِہٖ ۙ وَ نَسُوۡا حَظًّا مِّمَّا ذُکِّرُوۡا بِہٖ (۵/۱۳)۔" انہوں نے خدا سے جو عہد باندھے تھے انہیں ایک ایک کر کے توڑ دیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ نعمائے خداوندی سے محروم ہو گئے اور رفتہ رفتہ ان کے دل ایسے سخت ہو گئے کہ وہ خدا کی وحی میں تحریف کرنے لگ گئے اور اس کے ایک حصے کو یکسر فراموش کر دیا؟

دل کس طرح سخت ہوجاتے ہیں

وحیِ خداوندی میں تحریف اور آمیزش کس طرح سے ہوتی ہے اس کے متعلق (۲۲/۵۲) میں کہا کہ رسول اللہ سے پہلے ہر رسول کے ساتھ یہی ہوتا رہا کہ اس کے دنیا سے چلے جانے کے بعد شیطانی عناصر اس کی وحی میں آمیزش کر دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہوتا یا ان کے دل سخت ہو چکے ہوتے، وہ تحریف اور آمیزش ان کے لئے باعثِ فتنہ بن جاتی (۲۲/۵۳) اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وَ لٰکِنۡ قَسَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ وَ زَیَّنَ لَہُمُ الشَّیۡطٰنُ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (۶/۴۳)۔" شیطان ان کے غلط اعمال کو نہایت خوشنما بنا کر دکھاتا۔" سورۃ الزمر میں کہا کہ اَفَمَنۡ شَرَحَ اللّٰہُ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ فَہُوَ عَلٰی نُوۡرٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ ؕ فَوَیۡلٌ لِّلۡقٰسِیَۃِ قُلُوۡبُہُمۡ مِّنۡ ذِکۡرِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ (۳۹/۲۲)۔" کیا وہ شخص جس کے سینے میں کشادگی پیدا ہو چکی ہے، اور وہ سفرِ حیات خدا کی عطا کردہ روشنی کی راہنمائی میں طے کر رہا ہو، اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جس کا دل قوانینِ خداوندی کی طرف سے سخت ہو چکا ہو۔ ایسے لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں ہوتے ہیں۔" اس سے واضح ہو گیا کہ قساوتِ قلبی شرحِ صدر کی ضد ہے۔ اور شرحِ صدر اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور وہ انسان بڑا خوش بخت ہے جسے یہ حاصل ہو جائے۔ کشادِ قلب، وسعتِ ظرف، بینائی نگاہ، حق و صداقت قبول کرنے کے لئے ہر وقت آمادگی، اور بخل اور خود غرضی کے مقابلے میں دوسروں کی ہمدردی کے لئے اپنے سینے کا کھلا رکھنا۔ یہ ہیں شرافتِ انسانیہ کے خصائص کبریٰ۔ اور یہود انہی خصائص سے محروم ہو چکے تھے۔ جہاں تک بخل اور خود غرضی کا تعلق ہے، یہودیوں کی دناءت دنیا

میں ضرب المثل بن کر رہ گئی ہے۔ یہودی ذہنیت (JEWISH MENTALITY) کا مفہوم کسے معلوم نہیں؛ شیکسپیر نے اپنے ڈرامہ (THE MERCHANT OF VENICE) میں (SHYLOCK) کے کردار میں، یہودیوں کی جس ذہنیت کا نقشہ کھینچا ہے وہ ان کی قساوت بلکہ شقاوت قلبی کی زندہ شہادت ہے۔

یہودیوں کی خود غرضی

کارل مارکس نے جس کا خاندان نسلاً یہودی تھا (اگرچہ اس کے باپ نے یہودیت کو ترک کرکے عیسائیت کا مذہب اختیار کر لیا تھا) زر پرستی کو "یہودیت" سے تعبیر کیا ہے۔ — واضح رہے کہ جرمن زبان میں یہودیت اور کاروبار دونوں کے لئے (JUDENTUM) کی اصطلاح مستعمل ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہودیت، یعنی کاروبار (تجارت) ایک ایسا مذہب ہے جس میں زر (دولت) کی حیثیت خدا کی ہے۔

> یہودی کا دنیاوی مسلک کیا ہے، کاروبار — اس کا دنیاوی خدا کون ہے، روپیہ[1]۔ یہ زر، اسرائیل کا وہ حاسد خدا ہے جو کسی دوسرے کو خدا برداشت نہیں کرسکتا۔ زر، انسان کے تمام خداؤں کو تخت سے اتار دیتا ہے اور ان کو اشیائے بازاری میں بدل دیتا ہے۔ زر تمام چیزوں کی آفاقی قدر ہے۔ لہٰذا اس نے ساری دنیا کو — دنیائے انسانیت اور دنیائے فطرت دونوں کو — ان کی اپنی قدروں سے محروم کر دیا ہے۔ اور انسان، اس کی پرستش کرتا ہے۔ لہٰذا یہودیوں اور غیر یہودیوں کی آزادی اور تجارت کا انحصار، بنی نوع انسان کے یہودیت، یعنی تجارتی کاروبار سے نجات حاصل کرنے پر ہے۔
>
> (بحوالہ "موسیٰؑ سے مارکس تک"۔ از سبطِ حسن صفحہ ۸۶-۲۸۵)

یہ تھے یہودی، جن کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا کہ اُن کے دل پتھروں جیسے ہو گئے بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ کیونکہ پتھروں میں ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اُن کی دراڑوں میں سے ندیاں بہہ نکلتی ہیں۔ ایسے بھی کہ جب وہ کہیں سے شق ہو جاتے ہیں تو ان میں سے صاف شفاف قطراتِ آب موتیوں کی طرح ٹپکنے

---

[1] خود پاکستان کے ہمسایہ "یہودی" (ہندوؤں) کے ہاں بھی دولت کی پرستش ہوتی ہے۔ لکشمی، دولت ہی کی دیوی کا نام ہے اور دھن (مال) کا لفظ ان کے ہاں انتہائی خوش نصیبی اور مبارک بادی کے لئے بولا جاتا ہے۔

لگ جاتے ہیں۔ ایسے بھی کہ وہ قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکتے ہیں تو ان کی سختی اور صلابت میں نرمی (لچک) پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ شقی القلب ایسے ہیں کہ نہ کسی مظلوم کی مظلومیت پر ان کا دل پگھلتا ہے، نہ کسی ستم رسیدہ انسان سے ہمدردی میں ان کی آنکھوں سے آنسو تک ٹپکتا ہے ۔ اقبالؒ نے جو کہا تھا کہ "نم بہ چشمِ منعماں کم دیدہ ام" تو اس میں انہی جیسے سرمایہ داروں کی طرف اشارہ ہے۔ آج بھی دنیا میں یہودیوں کی سرمایہ داری نے جس طرح جسدِ انسانیت سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا ہے۔۔ اس کا کسے علم نہیں۔ غریبوں اور محنت کشوں کا استحصال ان کا شیوہ اور سلب و نہب ان کا شعار ہے۔ یہ سب انکی قساوتِ قلبی کی وجہ سے ہے۔ آیت زیرِ نظر کے آخری الفاظ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۲/۷۴) نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ اُن کی اس قساوتِ قلبی کا مظاہرہ اُن کی سیرت و کردار کی شکل میں نمودار ہوتا رہتا ہے۔

ضمناً، اس آیت میں ایک لفظ خشیت بھی آیا ہے۔ آیت (۲/۴۰) میں "فارھبون" کی تشریح کرتے

خشیت کا مفہوم

ہوئے وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے کہ خوفِ خدا کا مفہوم کیا ہے۔ اس مادہ (خشیت) کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی کام کا انجام معلوم ہونے کی وجہ سے اُس سے اندیشہ کرنا اور احتراز برتنا۔ سورۃ طٰهٰ میں قرآنِ کریم کے متعلق ہے اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى (۲۰/۳)۔ "یہ قرآن اس شخص کے لئے آیۂ عبرت ہے جو جانتا ہے کہ ان قوانین کی خلاف ورزی کا نتیجہ کیا ہوگا۔" اسی کا نام خشیتِ خداوندی ہے۔

(۰)

یہودیوں کی اس ذہنیت کو سامنے لانے کے بعد جماعتِ مومنین سے کہا کہ :-

۲/۷۵ أَفَتَطْمَعُوْنَ أَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۔

رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضورؐ کی وساطت سے جماعتِ مومنین سے کہا کہ "کیا تم اس کی توقع رکھتے ہو کہ یہ قوم، تمہاری بات مان کر قرآنِ کریم پر ایمان لے آئے گی؟ ایسا سمجھنا تمہاری خوش فہمی ہوگا۔ ان کی حالت یہ ہے کہ عوام تو ایک طرف، ان کے مذہبی پیشوا، خود اپنی کتابوں میں تحریف کرتے رہے، اور اب

بھی ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ تمہاری محفلوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اللہ کا کلام (قرآن مجید) سنتے ہیں۔ اُسے اچھی طرح سے سمجھتے اور جانتے ہیں کہ وہ واقعی خدا کا کلام ہے۔ لیکن یہاں سے اٹھتے ہیں تو خدا کی ان آیات کو نہایت مسخ شدہ صورت میں دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جن لوگوں کی بد دیانتی اور جراُتِ دزدیدگی کا یہ عالم ہو اور وہ دیدہ دانستہ، جانتے بوجھتے ایسا کرتے ہوں[1]، اُن سے اس کی توقع رکھنا کہ وہ قرآن کی صداقت کو مخلصانہ طور پر قبول کرلیں گے ۔۔ ایں خیال است ومحال است وجنوں؟

ضمناً ہم نے "(فتطمعون" کا ترجمہ توقع کرنا کیا ہے۔ لیکن توقع اور طمع میں بڑا باریک فرق ہے۔ توقع کا تعلق ذہن اور خیال سے ہوتا ہے اور طمع کے معنی ہوتے ہیں وہ خواہش اور آرزو جو دل میں پیدا ہو۔ اس سے واضح ہے کہ نبیٔ اکرمؐ اور جماعتِ مومنین دل سے چاہتے تھے کہ یہ راہ گم کردہ قوم کسی طرح صحیح راستے پر آجائے تاکہ ان کی ذلت وخواری کی زندگی، خوشگواریوں اور سرفرازیوں میں بدل جائے ۔ ایک طبیبِ مشفق

حضورؐ کی شفقتِ قلبی

کی طرح جو دل سے چاہتا ہے کہ کسی طرح مریض کا دکھ دور ہوجائے۔ حضور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق خصوصیت سے کہا گیا ہے کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۔ (۲۶/۳)" تو تو اس غم سے اپنی جان گھلائے گا کہ لوگ صداقت کو کیوں نہیں مانتے "۔

قرآنِ کریم نے جو یہ کہا ہے کہ یہ لوگ تمہاری محفلوں میں آکر کلام اللہ سنتے ہیں اور باہر جاکر اُسے توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں تو یہ چیز نہ کسی خاص قوم تک محدود ہے، نہ کسی خاص زمانے میں مقید۔ پروپیگنڈے میں ہوتا ہی یہ ہے کہ کسی شخص کی بات کو صحیح شکل میں پیش نہیں کیا جاتا، اسے توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے اور یہ ابلیس کا خاص حربہ ہے۔

(۰)

اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے ان کے مذہبی پیشواؤں کی ایک اور ذہنیت کو بھی واشگاف کیا ہے جہاں کہا ہے:۔

۲/۷۶ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۔ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى

---

[1] چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد!

بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔

"جب یہ لوگ تمہاری محفلوں میں آتے ہیں یا تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لے آئے ہیں"۔ منافقین کی اس روش کا ذکر آیت (۲/۱۴) (پہلی جلد صفحہ ۲۰۹ تا ۲۴۶) میں آچکا ہے جہاں ان کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ اور جماعتِ مومنین کو دھوکا دینے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ جب یہ لوگ تمہاری محفل سے اٹھ کر اپنے مذہبی پیشواؤں کے پاس جاتے ہیں تو وہ ان سے کہتے ہیں کہ تم نے کہیں مسلمانوں کو اپنی کتابوں کی وہ باتیں تو نہیں بتا دیں جن سے ثابت ہو کہ اُن کا رسول برحق ہے اور اس طرح وہ ان حوالوں کو تمہارے خلاف پیش کر کے تمہیں شکست دے دیں؟ وہ (ان کے سرغنے) ان سے کہتے کہ تم وہاں جاتے ہو تو اپنے حواس برقرار رکھا کرو اور اس کی احتیاط برتا کرو کہ تمہاری زبان پر بھولے سے بھی کوئی ایسی بات نہ آنے پائے۔

ان کی منافقت

زمانۂ نزولِ قرآن میں، یہودیوں کی مبیّنہ آسمانی کتابوں کی یہ کیفیت تھی کہ ایک تو وہ عبرانی زبان میں تھیں، جس سے غیر یہودی بالعموم ناواقف تھے۔ اس لئے انہیں معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اُن کتابوں میں کیا لکھا ہے۔ پھر، ان کے مذہبی پیشوا ان کتابوں کو بالعموم دوسروں سے چھپا کر بھی رکھتے تھے۔ ان کتابوں میں بڑی حد تک تغیر و تبدل ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اُن میں ایسی چیزیں موجود تھیں جو ایک آنے والے رسول کا ذکر کرتی تھیں اور اس کی جو علامات بتاتی تھیں اُن پر حضور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پورے اُترتے تھے۔ احبار و رہبان، اپنے اُن لوگوں سے، جو مسلمانوں کی محفلوں میں جاتے، تاکیداً کہتے تھے کہ اُن سے کہیں تم یہ نہ کہہ دینا کہ ہماری کتابوں میں ایک آنے والے رسول کا ذکر ہے اور اس کی یہ علامات بتائی گئی ہیں۔ ایسا کرو گے تو وہ خود تمہاری شہادات کو تمہارے خلاف پیش کر کے ثابت کر دیں گے کہ وہ آنے والے رسولِ آخرالزماں صلے اللہ علیہ وسلم یہی ہیں۔ اس کا تمہارے پاس کوئی جواب نہیں ہو گا۔ اس لئے اس کی بڑی احتیاط برتنا۔

دنیا کے مذاہب میں ہوتا یہی ہے۔ مذہبی پیشوا اپنی تعلیم کو "گپت ودیا" بنا کر رکھتے ہیں تاکہ اس پر ان کی اجارہ داری قائم رہے اور کسی دوسرے کی اس تک رسائی نہ ہو۔ اور تو اور، وہ خود اپنے عوام سے بھی حقیقی تعلیم کو چھپا کر رکھتے ہیں۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ خود ہمارے ہاں اس کی کتنی احتیاط برتی جاتی ہے

کہ مسلمانوں کے سامنے قرآنِ خالص نہ آنے پائے۔ کیونکہ اس سے مذہبی پیشوائیت کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے!

(o)

ان اہلِ کتاب کے علماء اور مشائخ ایسی احتیاط برتتے تھے۔ لیکن ان کی ان چالوں کی یہ کہہ کر تردید کر دی کہ:-

۲/۷۷ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ۔

ان کی حماقت ملاحظہ فرماؤ کہ یہ اپنی کتابوں کی صحیح تعلیم کو اُس خدا سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں جس نے وہ کتابیں نازل کی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اسی ازلی علم کی بنا پر سابقہ کتابوں کی حقیقی تعلیم کو قرآنِ کریم کے اندر شامل کر دیا۔ جہاں تک ان کی اس کوشش کا تعلق تھا کہ مسلمان اُن کی کتابوں کو سمجھنے نہ پائیں تو وہ بھی ناکام نہ رہ گئیں (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) ان کی کتابیں عبرانی زبان میں تھیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ سے فرمایا کہ وہ عبرانی زبان سیکھ لیں، تو انہوں نے ہفتہ عشرہ کے اندر اس میں اتنی مہارت پیدا کر لی جس سے وہ یہودیوں کی کتابوں کو سمجھنے کے قابل ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل و بنیاد کی رُو سے عربی اور عبرانی زبان ایک ہی ہیں۔ بلکہ عبرانی زبان کی اُم (ماں) بھی عربی زبان ہے۔ اس لئے جس شخص کو عربی زبان پر عبور ہو، اُسے عبرانی زبان کے سمجھنے اور سیکھنے میں زیادہ دشواری لاحق نہیں ہو سکتی۔ غالباً یہی وجہ تھی جو (تاریخ میں ہے کہ) حضرتِ عمرؓ اسلام قبول کرنے سے پہلے، دوسرے ملکوں میں جاتے تو وقت نکال کر یہودیوں کے اہلِ علم لوگوں کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ان کی زبان سمجھتے تھے۔ بہرحال، یہودی علماء کی کوششوں کے باوجود اُن کی کتابوں کی کوئی بات مسلمانوں سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

ضمناً آیت (۲/۷۶) میں اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ کا لفظ آیا ہے۔ لفظِ حدیث کے عام معنی بات کے ہیں۔ اس اعتبار سے خود قرآنِ کریم کو بھی حدیث کہا گیا ہے، یعنی خدا کی بات۔ سورۃ النساء میں ہے وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا (۴/۸۷) "اللہ سے زیادہ سچی بات کہنے والا کون ہے؟" اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کی "یہ سچی باتیں" قرآنِ مجید ہی کے اندر ہیں۔

لفظ حدیث کے معنی

اسی بنا پر مخالفین کو جو چیلنج دیا گیا تھا تو ان سے کہا گیا تھا فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا

صٰدِقِیْنَ۔ (۵۲/۲۳)۔" اگر یہ اپنے اس دعویٰ میں سچے ہیں کہ قرآن، خدا کا کلام نہیں، انسان کا وضع کردہ ہے تو یہ اس کی مثل کوئی حدیث (بات) لاکر بتائیں"۔

اسی مادہ سے حَدَّثَ کے معنی ہوتے ہیں کسی بات کا چرچا کرنا یا اُسے عام کرنا۔ سورۃ الضّحیٰ میں ہے۔ وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ (۹۳/۱۱)۔"اے رسولؐ! تم خدا کی نعمتوں کا عام چرچا کرو"۔ اس لفظ کے یہی معنے آیت (۲/۷۶) میں ہیں۔

واضح رہے کہ یہاں ہم نے لفظ حدیث کے عام معانی سے متعلق گفتگو کی ہے۔ اس کے اصطلاحی مفہوم (احادیثِ رسولؐ اللہ) سے متعلق اپنے مقام پر گفتگو کی جائے گی۔

(٠)

اوپر سلسلۂ کلام یوں چلا آرہا تھا کہ اہلِ کتاب کے مذہبی پیشوا، اپنی کتابوں کی تعلیم کو، خود اپنے عوام کی نگاہوں سے بھی پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے اور اُن کے لئے ایسا کرنا چنداں مشکل نہیں تھا۔ کیونکہ ان عوام کی حالت یہ تھی کہ

۲/۷۸ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ

اس کے عام معنی یہ ہیں کہ یہ عوام اُمّی تھے اور کتاب کے متعلق امانی سے زیادہ کچھ علم نہیں رکھتے تھے۔ یہاں اُمّی اور امانی کے الفاظ تشریح طلب ہیں۔

اُمّی کے معنی لفظِ اُمّی کا مادہ (ا-م-م) ہے اور اس کے بنیادی معنے "ماں" کے ہیں۔ اس اعتبار سے کسی شے کی اصل و بنیاد کو اُم کہا جاتا ہے۔ اسی سے لفظ امت ہے جس کے معنی قوم یا جماعت کے ہیں (اس کا تشریحی مفہوم آگے چل کر اپنے مقام پر آئے گا)

لفظ اُمّی کے معنی ایسے شخص کے ہیں جو اپنی پیدائشی حالت پر ہو۔ یعنی جس حالت میں اُسے اس کی ماں نے جنا تھا وہ اُسی حالت میں ہو۔ اس سے اس لفظ کے معنی غیر تعلیم یافتہ یا اَن پڑھ ہو گئے۔ اہلِ کتاب اپنے سے غیر عربوں کو اُمّی کہتے تھے اور اس سے مراد تھی ایسی قوم جس کے پاس کوئی آسمانی کتاب موجود نہ ہو۔ چنانچہ وہ عربی اور اُمّی کو مرادف معانی میں استعمال کیا کرتے تھے۔ سورۃ آلِ عمران میں ہے کہ یہ اہلِ کتاب کہتے ہیں۔ لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ۔ (۳/۷۴)۔ ان عربوں (غیر اہلِ کتاب)

کے ساتھ ہم جو جی میں آئے کریں، ہم سے اس کا مواخذہ نہیں ہوگا" یہاں امّی کا لفظ اہل کتاب کے مقابلے میں آیا ہے اور انہی معانی میں دوسری جگہ ہے۔ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ (۳/۲۰) "اے رسولؐ! تم اہل کتاب سے بھی کہو اور امیین سے بھی کہ کیا تم اسلام لاتے ہو یا نہیں؟ یہاں قرآن کریم نے امیین کا لفظ اہل کتاب کے مقابلے میں استعمال کیا ہے۔ اور چونکہ نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت انہی غیر اہل کتاب عربوں میں ہوئی تھی اس لئے سورۃ الجمعۃ میں ہے۔ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ۔ (۶۲/۲) "اللہ وہ ہے جس نے ان امیوں میں، خود انہی سے ایک رسول مبعوث کیا"۔

عرب، مکہ کو امّ القریٰ (۶/۹۳) کہتے تھے۔ اس شہر کی نسبت سے اہل مکہ کو بھی امّی کہا جاتا تھا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ اصطلاحی اعتبار سے لفظ امّی کے معنی ہیں (۱) ان پڑھ۔ (۲) اس قوم کا فرد جس کی طرف قرآن سے پہلے کوئی کتاب نہیں آئی تھی یعنی غیر اہل کتاب۔ اور (۳) مکہ کا رہنے والا۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو قرآن کریم نے کہا ہے۔ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ (۷/۱۵۷) "یہ لوگ (مومنین، نبیؐ امّی کا اتباع کرتے ہیں"؛ تو اس میں لفظِ امّی کے تینوں معانی لئے جا سکتے ہیں یعنی مکہ کا باشندہ یا اس قوم کا فرد جس کی طرف پہلے کتاب نہیں آئی تھی۔ اور ان پڑھ۔

حضورؐ ان پڑھ نہیں رہے تھے

جہاں تک حضورؐ کے ان پڑھ ہونے کا تعلق ہے۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ حضورؐ کی یہ کیفیت نبوت سے پہلے کی تھی۔ نبوت ملنے کے بعد حضورؐ کی یہ حالت نہیں رہی تھی۔ چنانچہ سورۃ عنکبوت میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی؛ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ (۲۹/۴۸) اے رسولؐ! تو نبوت ملنے سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھ سکتا تھا، نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکتا تھا۔ اس آیت میں مِنْ قَبْلِهٖ نے واضح طور پر بتا دیا کہ حضورؐ نبوت سے پہلے بے شک لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، لیکن نبوت کے بعد یہ کیفیت نہیں رہی تھی۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم تمام عمر ان پڑھ رہے تھے، قرآن کریم کی صراحت کے خلاف ہے۔

اب لفظ امانی کی طرف آیئے۔ اس کا مادہ (م۔ ن۔ ی) ہے۔ بنیادی طور پر اس کے دو معنے ہوتے ہیں۔ (۱) خواہشات۔ آرزوئیں، تمنائیں، جذبات۔ اور (۲) کسی کتاب کی تلاوت، یعنی مفہوم سمجھے بغیر اس کا

لفظ امانی کے معنی

محض پڑھ لینا۔ رسول کی کتاب کے مندرجات کے لئے یہ لفظ (۲۲/۵۲) میں آیا ہے۔ اس کی تشریح پہلے بھی گذر چکی ہے۔ اور اس کے بعد اپنے مقام پر بھی آئے گی۔ یہاں اتنی تنبیہہ کافی ہے کہ عام تراجم میں جو اس کے معنی تمنائیں یا آرزوئیں کیا جاتا ہے وہ صحیح نہیں۔ جہاں تک اس کے دوسرے مفہوم (تمنا، آرزو) کا تعلق ہے، سورۃ البقرہ میں ہے۔ وَ قَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی۔ تِلْكَ اَمَانِیُّهُمْ۔ (۲/۱۱۱) "یہ لوگ کہتے ہیں کہ جنت میں یہود اور نصاریٰ کے سوا کوئی نہیں جا سکے گا۔ یہ محض ان کی خوش فہمیاں ہیں۔ باطل آرزوئیں ہیں۔ خود پیدا کردہ تمنائیں ہیں"۔ دوسری جگہ، ان کے ساتھ مسلمانوں کو بھی شامل کر کے بہ ہیئت مجموعی کہا کہ یاد رکھو! لَیْسَ بِاَمَانِیِّكُمْ وَ لَاۤ اَمَانِیِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ۔ (۴/۱۲۳)۔ "جنت میں داخلہ نہ تمہاری آرزوؤں اور تمناؤں کے مطابق ہوگا نہ اہل کتاب کی۔ یہ محض تمہاری خوش فہمیاں ہیں"۔ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ وَ لَا یَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا (۴/۱۲۳) جو بھی غلط کام کرے گا اس کی سزا پائے گا۔ اور خدا کے سوا اس کا کوئی ایسا حامی اور مددگار نہیں ہوگا، جو اسے اس کی سزا سے بچا سکے۔ اس کے برعکس وَ مَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَ لَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا (۴/۱۲۴)۔ "جو قرآنی معیار کے مطابق اچھے کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ قرآن کی صداقت پر یقین رکھتا ہو تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہو سکیں گے اور ان پر ذرہ برابر بھی ظلم و زیادتی نہیں ہوگی"۔

اِن دو الفاظ (اُمّی اور امانی) کے معانی متعین ہونے کے بعد آیت (۲/۷۸) کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی ان مذہبی پیشواؤں کی جو سازش ہے کہ کتاب کی تعلیم کو عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا جائے وہ اس میں اس لئے کامیاب ہو جاتے ہیں کہ عوام اَن پڑھ ہوتے ہیں اور کتاب کے ساتھ محض ان کی

کتاب اللہ کا رسمی احترام

عقیدت وابستہ ہوتی ہے۔ وہ اسے ریشمی غلافوں میں لپیٹ کر گھر میں کسی اونچی جگہ رکھتے ہیں۔ کھولتے ہیں تو اسے چومتے ہیں، آنکھوں سے لگاتے ہیں، اس کی طرف پیٹھ نہیں کرتے۔ اس کی سطروں اور لفظوں پر انگلی پھیر کر سمجھتے ہیں کہ ہمیں ثواب حاصل ہو گیا ہے۔ اس طرح کتاب اللہ، ان کی اس قسم کی فریب انگیز خوش فہمیوں اور مزین آرزوؤں کا مرجع بننے سے زیادہ کچھ معنی نہیں رکھتی۔ یا ان میں ایسے ہوتے ہیں جو محض کتاب

کے الفاظ دہراتے رہتے ہیں، یہ جانے بغیر کہ ان الفاظ کے معانی اور مفہوم کیا ہے ، یہ کتاب کو ناظرہ پڑھتے ہیں۔ اس کی محض تلاوت کرتے ہیں، اسے حفظ کر لیتے ہیں، اس سے زیادہ انہیں کتاب کا کچھ علم نہیں ہوتا ظاہر ہے کہ جب عوام کی یہ حالت ہو تو ان کے مذہبی پیشوا، انہیں جو کچھ بتا دیں وہ اسی کو کتاب کی تعلیم سمجھ لیں گے۔

(٠)

مذہبی پیشوا، اُن کی اس جہالت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور

۲/۷۹ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ۔

" یہ مذہبی پیشوا، خود اپنی طرف سے، جو جی میں آئے لکھتے رہتے ہیں اور عوام کے سامنے اسے شریعتِ خداوندی کہہ کر پیش کر دیتے ہیں۔ اس سے مقصد محض روٹی کمانا ہوتا ہے" ارشادِ خداوندی ہے کہ انکے یہ خود وضع کردہ فتاویٰ بھی ان کی تباہی کا موجب ہوتے ہیں۔ اور جو کچھ یہ ان کے ذریعے کماتے ہیں وہ بھی ان کی بربادی کا باعث۔ شریعت سازی اور دین فروشی تباہی اور بربادی کا سب سے بڑا سبب ہوتا ہے۔ (ان امور کی تشریح جلد اول میں زیرِ آیت (۲/۱۶، صفحہ ۲۵) اور زیرِ نظر جلد میں آیات (۲/۴۲-۴۱) کے تحت کی جا چکی ہے)

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی تکذیب کرنے والوں کے متعلق کہا (جس سے ظاہر ہے کہ اس سے

دین فروشی

خود ہمارے ہاں کے دین فروش علماء مراد ہیں) کہ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ۔ وَ تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ۔ (۵۶/۸۲-۸۱) "کیا تم قرآن جیسی عظیم کتاب سے خود بھی پھسلتے ہو اور دوسروں کو بھی پھسلاتے ہو، اور اس کی تکذیب کرتے ہو، تاکہ اس طرح تم روٹی کما سکو۔ تم نے تکذیبِ دین کو ذریعۂ معاش بنا رکھا ہے" حقیقت یہ ہے کہ جب بھی دین، ذریعۂ معاش بن جائے تو انسان کو یہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اس میں کسی مذہب کی پیشوائیت کی بھی تخصیص نہیں۔

(٠)

پھر ان مذہبی پیشواؤں کی کیفیت یہ ہے کہ یہ خود بھی اس قسم کی خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں، اور دوسرے لوگوں سے بھی کہتے ہیں کہ

۲/۸۰ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔

"اول تو ہم لوگ جہنم میں جائیں گے ہی نہیں اور جائیں گے بھی تو صرف چند دنوں کے لئے۔ اس کے بعد ہمارے بزرگ ہمیں وہاں سے نکال کر جنت میں لے جائیں گے"۔ ان کی اس خوش فہمی کی تردید میں کہا کہ "ان سے پوچھو کہ کیا تم نے خدا سے اس قسم کا کوئی وعدہ لے رکھا ہے؟ اگر ایسا وعدہ لے رکھا ہے، تو پھر تو تمہارا کہنا بالکل بجا اور درست ہے کیونکہ خدا اپنے عہد اور وعدہ کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرتا"۔

(٭)

لیکن ایسا ہرگز نہیں۔ تم خدا کے متعلق اس قسم کی باتیں کرتے ہو جن کے لئے تمہارے پاس کوئی سند اور دلیل نہیں۔ جیسا کہ تمہیں بار بار بتایا جا چکا ہے (اور یہ تفصیل آیت (۲/۴۸) کے تحت سابقہ صفحات میں سامنے آچکی ہے)، خدا کا غیر متبدل قانون یہ ہے کہ:-

۲/۸۱-۸۲ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ۔ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔

"جس قوم نے بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کی اور اس روش کو ایسا عام کیا کہ سارا معاشرہ خطاکاریوں میں گھر گیا اور ہر طرف فساد ہی فساد رونما ہو گیا۔ تو اس قوم کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں گی اور وہ لوگ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ ان کا مقام جہنم ہوگا۔ اِن کے برعکس، جو قوم خدا کے قانون کی صداقت پر یقین رکھتے ہوئے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوگی تو اِن لوگوں کو اس دنیا اور آخرت دونوں میں، جنتی زندگی نصیب ہوگی اور ان کی کھیتیاں ہمیشہ لہلہاتی رہیں گی"۔ یہ ہے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل۔

قانونِ مکافات

آیت (۲/۸۲) میں ایمان اور جنت کے الفاظ آئے ہیں۔ ان کا مفہوم جلد اول میں زیرِ آیت (۲/۲۵)

عمل اور فعل میں فرق

صفحہ ۳۳۳۔ اور آیت (۲/۳۶) صفحہ ۸۷ پر بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اصل یہ ہے کہ آیت (۲/۸۲) میں آیت (۲/۲۵) کو سمٹا کر بیان کیا گیا ہے۔ البتہ لفظِ اعمال (واحد۔ عمل) کے مفہوم میں ایک دو نکات وضاحت طلب ہیں۔ عمل اور فعل دونوں کے معنے "کام" کے ہیں۔ لیکن (امام راغب نے کہا ہے کہ) عَمَلٌ ہر وہ کام ہے جو کسی جاندار سے ارادۃً سرزد ہو۔ اس کے برعکس فِعلٌ کا لفظ حیوانات کی طرف اس وقت بھی منسوب ہو سکتا ہے جب اُن سے کوئی کام بلا قصد سرزد ہو۔ حتیٰ کہ جمادات کی طرف بھی۔ عَمَلٌ کا لفظ ان کی طرف بہت کم منسوب ہوتا ہے۔ صاحبِ محیط نے تو بعض اہلِ لغت کا یہ قول بھی نقل ہے کہ عَمَلٌ درحقیقت عِلمٌ کی مقلوب شکل ہے۔ لہٰذا عمل کے لئے علم لاینفک ہے۔ علاوہ ازیں، علمارِ لغت کے نزدیک عمل کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کام محض ہنگامی طور پر سرانجام نہ دیا گیا ہو بلکہ وہ عام طور پر (التزاماً) کیا جاتا ہو۔

ان تصریحات کی رو سے عمل اس کام کو کہا جائے گا جو بالارادہ کیا جائے اور التزاماً کیا جائے۔ جو کام محض عادتاً کئے جائیں یا میکانیکی طور پر، ان پر عمل کے لفظ کا اطلاق نہیں ہو سکے گا، نہ ہی ان کاموں پر جو کبھی کبھار کر دیئے جائیں۔ اس بنا پر آپ خود ہی سمجھ لیجئے کہ قرآنِ کریم نے جن کاموں کو اعمال کہہ کر پکارا ہے ان سے کس قسم کے کام مراد ہیں۔ یہی ہیں وہ کام جن سے مثبت اور تعمیری نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اور جنت انہی کاموں کا نتیجہ ہے اور اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ "مذہبی اعمال" سے جنت کی عمارت استوار نہیں ہو سکتی۔ یہ کام رسماً، عادتاً یا تقلیداً سرانجام دیئے جاتے ہیں۔ اس لئے خود لغت کی رُو سے بھی "اعمال" کی شق میں نہیں آتے۔ اور ظاہر ہے کہ جس کام پر "عمل" کے لفظ تک کا اطلاق نہ ہو سکے اس کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے؟

---(۰)---

دین کے ان اصولوں کی طرف توجہ منعطف کرانے کے بعد داستانِ بنی اسرائیل کی اگلی کڑیاں سامنے لائی گئی ہیں۔

۲/۸۳ وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ ‌ۖ وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا وَّذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا۔ وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ۔ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ۔ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کو پھر یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ تم سے خدا نے ایک عہد لیا تھا۔ (اس عہد کا اجمالی ذکر (۲/۴۰) میں آچکا ہے) وہاں یہ کہا گیا ہے کہ تم وحیٔ خداوندی کو نہایت محکم طور پر تھامے رہو۔ اب اس اصولی حکم کی جزئیات کا ذکر آتا ہے۔ اصولی حکم تو یہ کہہ کر دہرایا گیا کہ خدا کے سوا کسی کی محکومیت اور عبدیت اختیار مت کرو۔ فرمانبرداری اور اطاعت شعاری اسی کے احکام کی کرو۔ کسی اور کے احکام کی نہیں۔

اِن احکام میں سب سے پہلے کہا کہ والدین، رشتہ داروں، یتامیٰ اور مساکین سے احسان کرو۔ ان میں سب سے پہلے لفظ والدین آتا ہے۔ مادہ (و۔ل۔د) کے معنی ہیں طریقِ تولید کی رو سے افزائشِ نسل۔ خواہ وہ ابتدائی جرثومہ کی سطح پر ہو یا انتہائی حیوانات کی سطح پر، جن میں خود انسان بھی شامل ہے۔

تولید و تخلیق میں فرق

اللہ تعالےٰ کا طریقِ پیدائش تخلیقی (CREATION) ہے۔ تولیدی (PRO CREATION) نہیں۔ اسی لئے اس نے خود اپنے متعلق کہا۔ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ (۱۱۲/۳)۔ "نہ خدا طریقِ تولید کی رو سے وجود میں آیا ہے اور نہ ہی وہ اس طریق سے کسی کو وجود میں لاتا ہے"۔ عیسائیوں نے، جو حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق یہ عقیدہ وضع اور اختیار کیا کہ وہ ابن اللہ۔ خدا کے بیٹے ہیں، تو اللہ تعالےٰ نے اس کی تردید چار الفاظ میں کر دی کہ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ۔ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ۔ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ۔ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۶/۱۰۱)۔ اس آیۂ جلیلہ میں ایک عظیم حقیقت کی پردہ کشائی کی گئی ہے۔ پہلے تین الفاظ میں تو یہ کہا کہ خدا کی قدرتِ کاملہ کی کیفیت تو یہ ہے کہ وہ اس محیر العقول کارگہ کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ یعنی کسی ساز و سامان، مسالہ یا اسباب کے بغیر۔ جو خدا یہ کچھ کر سکتا ہے اس کے لئے یہ کون سی مشکل بات ہے کہ اپنا ایک بیٹا بھی پیدا کر لے۔ لیکن (اس نے کہا کہ) ہم نے تخلیقِ کائنات کے بعد کچھ قوانین وضع اور نافذ کئے ہیں جن کے مطابق یہاں کا جملہ کاروبار سر انجام پاتا ہے۔ ان میں

خدا کا بیٹا!

سے ایک قانون یہ بھی ہے کہ سلسلۂ افزائش نر و مادہ کے اختلاط کے بغیر وجود میں نہیں آئے گا۔ (مثلاً) انسانی بچے کی تولید کے لئے بیوی اور شوہر کے اختلاط کی ضرورت ہے۔

اور اس بات کو تو یہ لوگ (عیسائی بھی) تسلیم کرتے ہیں کہ خدا کی کوئی بیوی نہیں۔ لہٰذا جب اس کی کوئی بیوی نہیں تو اس کے مقرر کردہ قانونِ تولید کی رو سے اس کے ہاں بیٹا کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے نافذ کردہ توانین میں خود اپنے لئے بھی استثنا نہیں کرنا چاہتا حالانکہ اگر وہ چاہے تو ایسا کر سکتا ہے۔ لہٰذا خدا کا عملِ افزائش تخلیقی ہے۔ جہاں تک انسان کا تعلق ہے، حیوانی سطح پر اس کا طریقِ افزائش بھی تولیدی ہے لیکن انسانی سطح پر اس کے عمل میں عملِ تخلیق کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے اور چونکہ صرف حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنا، ایمان نہیں، کفر ہے (۱۲/۴۷) اسی لئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ

ہر کہ اُو را قوتِ تخلیق نیست ۔۔۔ نزدِ ما جز کافر و زندیق نیست

(۰)

اب آگے بڑھئے۔ ہمارے ہاں تو والدین سے مراد صرف ماں باپ، اور اولاد سے مراد بیٹے اور بیٹیاں ہوتی ہیں لیکن عربی زبان میں والدین کا سلسلہ ماں باپ سے اوپر تک چلا جاتا ہے یعنی دادا نانی وغیرہ اور اولاد کا سلسلہ بیٹے اور بیٹیوں سے نیچے یعنی پوتا، پوتی، نواسہ، نواسی وغیرہ۔ اس کی اہمیت ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی۔ جہاں قرآنی قانونِ وراثت کے سلسلے میں بتایا جائے گا یتیم پوتا اپنے دادا کی وراثت سے حصہ پانے کا حقدار ہوتا ہے۔ یہاں ہم قرآنِ کریم کے انہی احکام تک محدود رہنا چاہتے ہیں جن کا ذکر اس آیت میں آیا ہے۔ واضح رہے کہ اس آیت میں کہا تو یہ گیا ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل سے یہ عہد لیا تھا۔ لیکن انہی الفاظ میں یہی احکام، متعدد مقامات پر، خود مسلمانوں کو بھی دیئے گئے ہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہو (۴/۳۶)

پہلا حکم یہ ہے کہ والدین سے احسان کرو۔ لفظ احسان کے معنی آیت (۲/۸۳) کی تشریح کے سلسلے میں چند صفحات پہلے بیان کئے جا چکے ہیں۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کسی میں جو کمی واقع ہو گئی ہو، اس کی اس کمی کو دور کر کے اس کے توازن کو برقرار کر دینا۔ بڑھاپے کی عمر میں انسان میں کئی لحاظ سے کمی آجاتی ہے۔ اس کی جسمانی قوتوں میں اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے اور کئی اور طبعی صلاحیتوں میں بھی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس طرح اس کا طبعی توازن بگڑ جاتا ہے۔ غالبؔ کے الفاظ میں ؎

ہو گئے مضمحل قویٰ غالبؔ ۔۔۔ اب عناصر میں اعتدال کہاں

اسی حقیقت کو قرآنِ کریم نے ایک مقام پر ان الفاظ میں واضح کیا ہے کہ وَ مَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۚ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ۔ (۳۶/۶۸) "کیا تم اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ کبرسنی کی وجہ سے انسان کے جسمانی"

ڈھانچے اور اس کی طبیعی قوتوں اور صلاحیتوں میں کس قدر کمی واقع ہو جاتی ہے، وہ کس قدر نگوں سار ہو جاتا ہے"۔ دوسری جگہ کہا۔ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۔ (۲۲) "تم میں بعض لوگوں میں جن

والدین سے حسن سلوک

کی عمر لمبی ہوتی ہے، بچپنے کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ علم میں اضافہ تو ایک طرف، ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ جو کچھ پہلے یاد تھا وہ بھی بھول جاتا ہے"۔ ان مقامات سے واضح ہے کہ بڑھاپے میں عام طور پر انسان میں اپنی ضروریات آپ پوری کرنے کی قوت بھی نہیں رہتی اور اس کی بعض صلاحیتوں میں بھی بڑی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے اولاد کو یہ حکم دیا کہ تم ان کی اس کمی کو پورا کرو۔ ان کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے علاوہ ان کی دل جوئی بھی کرتے رہو۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، بڑھاپے میں انسان بچوں کی سی باتیں کرنے لگ جاتا ہے۔ بچوں کی باتوں میں نہ منطقی ربط ہوتا ہے، نہ ترتیب و تسلسل۔ اس کے باوجود، تم ان کی باتوں سے زچ نہیں پڑ جاتے بلکہ ان سے لطف اندوز ہوتے ہو۔ لیکن جب یہی کیفیت بوڑھے والدین کی ہو جاتی ہے تو اس سے تم زچ پڑ جاتے اور انہیں ڈانٹنے لگ جاتے ہو۔ دیکھئے قرآن کریم میں کیسے بلیغ انداز میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے جہاں کہا ہے:۔

وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۔ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ ۔ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۔ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ ۔ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۔ (۲۴-۲۳/۱۷)

"تیرے رب نے یہ حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی اطاعت نہ کرو اور والدین کے ساتھ احسان سے پیش آؤ۔ اگر ان میں سے کوئی ایک یا دونوں عمر رسیدہ ہو جائیں تو انہیں ڈانٹ ڈپٹ مت کرو۔ ان سے نہایت نرمی سے اس انداز سے بات کرو جس سے ان کی عزت نفس مجروح نہ ہونے پائے۔ اپنا شفقت کا ہاتھ ان کے سر پر رکھو اور خدا سے یہ دعا مانگو کہ وہ تمہیں اس کی توفیق عطا فرمائے کہ جس حسن لطافت سے انہوں نے تمہاری بچپن میں نشو و نما کی تھی، تم بھی اسی طرح ان کی نشو و نما اور رفاقت کا سامان بہم پہنچاؤ"۔

اس حکم میں دو ایک اور اہم نکات بھی پوشیدہ ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ انسان اپنے طبعی تقاضوں کو

حیوانات کی طرح جبلی طور پر پورا کرتا ہے ۔ مثلاً بھوک لگنے پر کھانا کھانا، پیاس کے لئے پانی پینا، افزائشِ نسل کے لئے جنسی اختلاط ۔ ان امور کے لئے انسان کو وحی کی رو سے تاکید کرنے کی ضرورت نہیں تھی ۔ یہ ہدایت تو اس کی جبلت میں رکھ دی گئی تھی ۔ البتہ انہی امور میں اس کی انسانی سطح پر جن پابندیوں کی ضرورت تھی ان کی راہ نمائی وحی کی رو سے کر دی گئی ۔ مثلاً کھانے پینے میں حلال و حرام کی تمیز، جنسی اختلاط کے لئے ازدواجی زندگی سے متعلق حدود و قیود ۔ حیوانی سطح پر ان حدود و قیود کی ضرورت نہیں تھی ۔ انکا ملحوظ رکھنا خاصۂ انسانیت ہے ۔ اس اصول کی روشنی میں اس حقیقت پر نگاہ ڈالئے کہ اپنے بچوں کی پرورش ہر حیوان جبلی تقاضے کی رُو سے کرتا ہے ۔ اس لئے قرآنِ کریم نے بھی انسان کو کہیں یہ تاکید نہیں کی کہ تم اپنے بچوں کی پرورش کیا کرو ۔ لیکن ماں باپ سے حسنِ سلوک حیوانی جبلت کا تقاضا نہیں تھا ۔ اس کے لئے وحی کی رو سے انسان کو تاکید کی گئی ۔ اور یہ تاکید والدین تک ہی محدود نہ رکھی گئی بلکہ اس کا سلسلہ آگے بھی بڑھایا گیا ۔

اگرچہ بعض بلند سطح کے حیوانات میں نر اور مادہ کی رفاقتی زندگی کا نقشہ سامنے آتا ہے ۔ لیکن عائلی زندگی (فیملی لائف) کا تصور ان کے ہاں نہیں ملتا ۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ جس عمر تک بچے کو ماں باپ کی طرف سے پرورش اور حفاظت کی ضرورت ہوتی ہے اس حد تک تو ان میں "عائلی زندگی" کا نقشہ نظر آتا ہے ۔ لیکن جب بچہ اس عمر سے آگے بڑھ جاتا ہے تو عائلی زندگی کے روابط تو ایک طرف، نہ بچہ ماں باپ

فیملی لائف

کو پہچانتا ہے نہ ماں باپ بچے کو جانتے ہیں ۔ ان میں یکسر بیگانگی اور علیحدگی ہوتی ہے ۔ اگر یہی کیفیت انسان کی تمدنی زندگی میں بھی پیدا ہو جائے تو یہ حیوانی سطح کی زندگی ہوگی انسانی سطح کی نہیں ۔ یورپ نے عائلی زندگی کو بالعموم حیوانی سطح تک برقرار رکھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ذرا بڑا ہونے پر نہ ماں باپ کو اولاد سے کوئی تعلق رہتا ہے، نہ اولاد کو ماں باپ سے کوئی واسطہ ۔ اور ان کے ہاں بوڑھے ماں باپ، جس تنہائی اور بے کسی کی زندگی بسر کرتے ہیں، وہ عبرت و موعظت کی زندہ شہادت ہوتی ہے ۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہاں کی بعض حکومتیں ان درماندہ، واماندہ اور دھتکارے ہوئے انسانوں کے لئے روٹی، کپڑے اور رہائش کا انتظام کر دیتی ہیں، لیکن صرف روٹی، کپڑا تو انسانی زندگی کا سہارا نہیں ہوتے، انسانی جذبات، رفاقت، شفقت، عطوفت اور محبت کے بھی متقاضی ہوتے ہیں ۔ ان کے پورا کرنے کا وہاں کوئی انتظام نہیں ہوتا ۔ یہ

تو صرف (FAMILY UNIT) ہی میں پورے ہو سکتے ہیں ۔ بچوں کی صحیح تربیت بھی گھر کے ماحول میں ہو سکتی ہے اور بڑھاپے کی یاس انگیز تنہائیوں کا مداوا بھی یہیں ممکن ہے ۔ گھر میں بچے ہوتے ہیں تو وہ بوڑھے دادا، دادی کے دوست اور ہمجولی بن جاتے ہیں کیونکہ ان میں بھی تو بچپنا آچکا ہوتا ہے۔ یہ، اور اس قسم کے دیگر مصالح ہیں، جن کی بنا پر اسلامی معاشرے میں خاندانی وحدت برقرار رکھنے کی تلقین و تاکید ہے۔

ماں باپ کی اطاعت

اب ایک قدم آگے بڑھیئے اور قرآنِ کریم کی ایک اور حقیقت نگی پر غور کیجئے۔ دنیا کے ہر مذہب میں، بلکہ ان کے ہاں بھی جو کسی متعین مذہب کے پابند نہیں، اس بات کو ایک مسلّمہ کی سی پوزیشن حاصل ہو چکی ہے کہ "ماں باپ کی اطاعت فرض ہے"۔ اسے ایک ایسی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے جس پر کسی قسم کے غور و فکر کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔ بعض مذاہب میں تو اس کے متعلق ایسی شدت اختیار کی جاتی ہے کہ ماں باپ کی پوجا تک کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جو اس فریضہ کی جس حد تک ادائیگی کرتا ہے اس کا مقام اسی قدر بلند سمجھا جاتا ہے۔ اس کی مثال ہندو دھرم اور ان کی تاریخ میں ملتی ہے۔ مہاراجہ رام چندر نے اپنے باپ (مہاراجہ دسرتھ) کے حکم کے سامنے سر جھکاتے ہوئے راج پاٹ تیاگ کر بن باس اختیار کر لیا حالانکہ وہ حکم علم و دلیل پر مبنی نہیں تھا بلکہ خالصتہً جذباتی تھا۔ بایں ہمہ، نوجوان رام چندر کی اس فرمانبرداری سے اس کا مقام اتنا بلند تصور کیا گیا کہ اسے ایشور کا اوتار قرار دے کر اس کی پرستش شروع ہوگئی۔ ہندو دھرم اور معاشرت میں ان کا آج تک یہی مقام چلا آرہا ہے۔ اُن کے ہاں، بیوی کا خاوند کی پوجا کرنا اور اولاد کا ماں باپ کی پرستش کرنا، عظیم ترین نیکی کے کام ہیں۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، اس چیز کو دنیا کے ہر مذہب اور ہر قوم میں ایک مسلّمہ کے طور پر مانا جاتا تھا۔ قرآنِ کریم نے اس مسلّمہ کو توڑا اور اس کی بجائے ایسی راہ اختیار کی جو مبنی بر حقیقت و صداقت ہے۔ اس نے ماں باپ کی اطاعت کو کہیں فرض قرار نہیں دیا بلکہ کہا یہ کہ ان کے ساتھ احسان کرو۔ بات بڑی واضح ہے۔ جہاں تک بچپن کی عمر کا تعلق ہے، بچے کو یقیناً ماں باپ کی ہدایات پر چلنا چاہیئے کیونکہ اس میں ابھی نہ خود اپنے نفع و نقصان میں تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی ہوتی ہے نہ ہی اس کا تجربہ ہوتا ہے۔ لیکن جب بچہ جوان ہو جائے (سنِ رشد تک پہنچ جائے)، تو اُسے ان انسانوں کی اطاعت کا حکم

دینا، جن کے متعلق خود قرآن یہ کہتا ہے (اور ہماری روزمرہ کی زندگی اس کی شہادت دیتی ہے) کہ وہ ارذل العمر کے درجے میں پہنچ چکے ہوتے ہیں، اس کی زندگی کی گاڑی کو بہت پیچھے دھکیل دینے کے مرادف ہوگا۔ زمانے کے تقاضے بڑی تیزی سے بدلتے رہتے ہیں اور بڑھاپے میں انسان، ان نئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ لہٰذا وہ معاملاتِ حاضرہ کے فیصلے اپنے سابقہ دور کے تقاضوں کے مطابق ہی کر سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ فیصلے ان نئے تقاضوں میں (FIT-IN) نہیں ہو سکتے۔ ایک نوجوان کو اس قسم کے فیصلوں کی اطاعت پر مجبور کرنا — اور وہ بھی یہ کہہ کر یہ خدا کا حکم ہے — اُس کے دل میں جس قسم کی نفسیاتی کشمکش پیدا کر دیگا، اور اُس کے جو پریشان کن، اور بعض حالات میں، فساد انگیز نتائج پیدا ہوں گے، ان کا مشاہدہ ہم آئے دن کرتے رہتے ہیں۔ اس قسم کے حالات اُن نوجوانوں کی زندگی میں زیادہ رونما ہوتے ہیں جو ماں باپ کے ہر حکم کو ارشادِ خداوندی کی طرح واجب التعمیل تصور کرتے ہیں۔ اس سے بالخصوص، ان کی ازدواجی زندگی جس قدر تلخ ہو جاتی ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ قرآن کریم نے جس "مسلّمہ" کو محض جذباتی قرار دے کر اس کی جگہ ایک حقیقت پسندانہ حکم دیا تھا، ہم نے اُسی "مسلّمہ" کو اپنے ہاں مذہبی فریضہ قرار دیدیا — اور اس کے نتائج بھگت رہے ہیں۔

اسوۂ ابراہیمی

ہندو دھرم نے "رام" کی زندگی کو قابلِ تقلید نمونہ قرار دیا تھا۔ لیکن قرآنِ کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کو اسوۂ حسنہ قرار دیا (۶۰/۴) اور ان کی اس زندگی کا ابتدائی تعارف ہی یہ کہہ کر کرایا کہ يَٰٓأَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنكَ شَيْـًٔا (۱۹/۴۲) "اے میرے باپ! تم اُن بتوں کی پرستش کیوں کرتے ہو جن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ نہ کچھ سُن سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے۔ نہ کسی معاملے میں تمہاری کوئی مدد کر سکتے ہیں"۔ يَٰٓأَبَتِ إِنِّي قَدْ جَآءَنِي مِنَ ٱلْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَٱتَّبِعْنِيٓ أَهْدِكَ صِرَٰطًا سَوِيًّا (۱۹/۴۳) "اے میرے باپ! مجھے حقائق کا وہ علم دیا گیا ہے جس سے تم محروم ہو۔ لہٰذا تم میرا اتباع کرو۔ میں تمہیں سیدھے راستے کی طرف لے جاؤں گا"۔ ساری دنیا میں مسلّمہ یہ تھا کہ بیٹے کو ماں باپ کا اتباع کرنا چاہیئے۔ یہاں بیٹا باپ سے کہہ رہا ہے کہ تم میرا اتباع کرو۔ سوال باپ اور بیٹے کے رشتے کا نہیں، فیصلہ کن امر تو یہ ہے کہ علم و حقیقت کے راستے پر کون ہے۔ اسوۂ ابراہیمیؑ کا یہی اتباع تھا جس کے لئے خصوصیت سے کہا کہ ماں باپ سے حسنِ سلوک ضرور کرو لیکن اگر وہ تمہیں خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنے کے لئے کہیں، تو ان

کا کہنا قطعاً نہ مانو۔ (۹/۲ : ۳۱/۱۵)۔ دینِ خداوندی میں اتباع نہ باپ کا ہے نہ بیٹے کا۔ اتباع حق و صداقت کا ہے۔ یہ تو غنیمت ہے کہ انسانی تاریخ میں یہ روش نہیں رہی کہ آنے والی نسل نے ہر حال میں جانے والی نسل کا اتباع کیا ہو۔ اگر یہ صورت رہتی تو انسان آج بھی، ابتدائی زمانے کے انسانوں کی طرح غاروں میں زندگی بسر کرتا کیونکہ اسلاف کے اتباعِ مسلسل کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟ اس قسم کا اتباع حیوانات میں ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کی بکری بھی ویسی ہے جیسی سب سے پہلے زمانے کی بکری تھی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

چہ خوش بودے اگر مردِ نکوئے ۔۔۔ زبندِ پاستاں آزاد رفتے
اگر تقلید بودے شیوۂ خوب ۔۔۔ پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے (پیامِ مشرق)

والدین کے بعد قرآنِ کریم نے ذی القربیٰ کے ساتھ احسان کا حکم دیا ہے۔ قربیٰ کا مادہ (ق۔ر۔ب) ہے جس کے معنے قریب ہونے کے ہیں۔ عام طور پر اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ والدین کے بعد جو بھی زیادہ قریبی ہوں، ان سے بھی حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ لیکن ذی القربیٰ کی اصطلاح عام طور پر رشتہ داروں کے لئے آتی ہے۔ واضح رہے کہ قربیٰ کے معنی رشتہ دار نہیں، رشتہ داری ہیں۔ جب اس کے ساتھ (ذو یا ذی) آئیں گے تو اس کے معنے رشتہ داروں کے ہوں گے۔ اس فرق کی اہمیت آگے چل کر سامنے آئے گی جہاں مودّت فی القربیٰ (۲۳/۴۲) کی تشریح کی جائے گی۔ بہرحال، ذی القربیٰ کے ساتھ حسنِ سلوک کے حکم نے خوش معاملگی اور تعاون کے لئے، تمدنی زندگی میں اور وسعت پیدا کر دی۔

ذی القربیٰ

اس کے بعد کہا کہ یتامیٰ سے بھی حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ یتیم کے بنیادی معنی ایسے شخص کے ہیں جو تنہا رہ جائے۔ اصطلاحی طور پر یہ لفظ ان لوگوں کیلئے بولا جاتا ہے جن کے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں۔ اور وہ اس طرح تنہا رہ جائیں۔ لیکن عربوں کے ہاں اس کا یہ محدود مفہوم نہیں تھا۔ وہ ان جوان لڑکیوں کو جنہیں خاوند نہ ملیں یا بیوہ عورتوں کو بھی اس میں شامل کرتے تھے۔ (اس مفہوم کی اہمیت آگے چل کر سامنے آئے گی جہاں تعددِ ازدواج کا ذکر آئے گا)۔ یتیم کے معانی کی وسعت کے اعتبار سے اس کے اندر ہر وہ شخص آجائے گا جو معاشرے میں تنہا رہ جائے یا اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے۔ غور سے دیکھئے کہ غیر قرآنی معاشرے میں ہر شخص

یتامیٰ سے حسنِ سلوک

اپنے آپ کو یتیم (تنہا) محسوس کرتا ہے۔ ہم تو ایک طرف رہے، ہمارے ذہن میں یورپ اور امریکہ کی معاشرتی زندگی کا کچھ ایسا تصور ہے کہ وہاں کوئی شخص بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کرتا ہوگا۔ لیکن وہاں کی "یتیمی" کا اندازہ اس سے لگتا ہے کہ کچھ عرصہ ہوا امریکہ سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس نے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ اس میں اہلِ امریکہ کی معاشرتی زندگی کا نقشہ کھینچا گیا تھا۔ اس کتاب کا نام تھا (THE LONELY CROWD) یہ عنوان خود وہاں کے "یتیم" معاشرے کا غماز ہے۔ افراد کی یہ یتیمی صرف نصب العین کی وحدت اور قلب و نگاہ کی ہم آہنگی سے دور ہو سکتی ہے۔ ایسے معاشرہ میں قرآن کے الفاظ میں "افراد کے دل ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں" (۳/۱۰۲)۔ اور جب معاشرہ کی یہ کیفیت ہو جائے تو پھر اس میں کوئی فرد اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کرتا۔ بہرحال، قرآن کریم نے جو یہ حکم دیا تھا کہ یتامیٰ کے ساتھ بھی حسنِ سلوک سے پیش آؤ تو اس سے اس کا یہی مطلب نہیں تھا کہ ان کی طبیعی ضروریات ہی کو پورا کرو۔ بلکہ یہ مطلب بھی تھا کہ ان کے ساتھ ایسا رابطہ رکھو کہ انہیں محسوس ہی نہ ہونے پائے کہ وہ تنہا ہیں۔ (یتامیٰ کے متعلق دیگر احکام اپنے مقام پر آئینگے)

اس سے آگے ہے کہ مساکین کے ساتھ بھی احسان کرو۔ اور ان کی کمی کو پورا کرو۔ اس لفظ کا مادہ ——— (س۔ک۔ن) ہے۔ جس کے معنی ہیں حرکت کا بند ہو جانا۔ کسی کا ایک مقام پر رک کر رہ جانا۔ چلنے کی سکت نہ رہنا۔ عام طور پر اس سے یہ مفہوم لیا جائے گا کہ جن لوگوں کا کسی وجہ سے چلتا ہوا کاروبار رک جائے ان کی اس کمی کو پورا کر دو تاکہ ان کی کاروباری مشینری پھر سے حرکت میں آجائے۔ یہ مساکین کے مفہوم کا ایک گوشہ ہے۔ اس اصول کو مدِنظر رکھنے سے اسی قسم کے کئی اور گوشے بھی سامنے آسکتے ہیں۔ آپ دیکھئے کہ ان مقامات پر قرآنِ کریم رشتہ داری کے تعلق سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ ان شقوں میں ہر ضرورت مند انسان شامل ہے۔ حتیٰ کہ بعض آیات میں، ان میں "ابن السبیل" کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ یعنی کوئی اجنبی مسافر جو تمہارے ملک میں سے گزر رہا ہو، اگر اس کو بھی کوئی ضرورت پیش آگئی ہے تو تم، اُسے بھی پورا کرو۔ ان احکام میں اپنے اور بیگانے کی کوئی تمیز و تخصیص نہیں۔ یہ بات آیت کے اگلے الفاظ سے واضح ہو جاتی ہے جہاں کہا ہے کہ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (۲/۸۳)۔ اس کا عام ترجمہ تو یہ ہوگا کہ لوگوں سے اچھی باتیں کیا کرو۔ لیکن حُسن کا جو مفہوم پہلے بیان کیا جا چکا ہے اور لفظ "قول" کی جو تشریح پہلے ہو چکی ہے (ملاحظہ ہو ۲/۵۹)، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے

کہ اس سے مراد اچھی اچھی باتیں کرنا ہی نہیں بلکہ دوسرے انسانوں کے ساتھ معاملات اور روابط میں توازن برقرار رکھنے کی اہمیت بھی شامل ہے۔ ایک حسین اور متوازن معاشرہ میں ہر بات، ہر عمل، ہر حرکت، ہر اقدام حسن کارانہ انداز لئے ہوتا ہے!

اس کے بعد اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا حکم ہے جس کی جامعیت کے متعلق اس سے پہلے (جلد اول اور اسی جلد کے سابقہ ابواب میں) وضاحت سے گفتگو کی جا چکی ہے۔ یہاں اتنا اضافہ ضروری ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا حکم امتِ محمدیہ ہی کو نہیں دیا گیا۔ یہ تو دین کی اساس ہے۔ اور چونکہ دین، شروع سے آخر تک اصولی طور پر ایک ہی چلا آرہا تھا اس لئے ہر رسول کی امت کو یہ حکم دیا گیا تھا۔ یہاں بنی اسرائیل مخاطب ہیں۔ آگے چل کر دیگر اقوام کا ذکر بھی آئیگا۔

بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ تم نے عہد کیا تھا کہ ان احکام کی تعمیل کرو گے۔ تم نے اس کا اقرار کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد تم (باستثنائے چند) اس قول و قرار سے پھر گئے۔ اتنی بات "ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ" کے الفاظ سے پوری ہو جاتی تھی لیکن اس کے بعد وَأَنْتُمْ مُعْرِضُونَ (۲/۸۳) سے ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا تھا کہ یہ کسی عہدِ گزشتہ کے ہنگامی واقعہ کا ذکر ہے۔ کسی زمانے میں، یہودیوں کی اُس وقت کی نسل کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہوگا۔ لیکن "وَأَنْتُمْ مُعْرِضُونَ" سے اس امر کی وضاحت کر دی کہ تم ہو ہی ایسے۔ تمہاری ہمیشہ یہ روش رہی کہ ایک بات کا عہد کر کے اُس سے پھر گئے۔ تمہاری یہ روش عارضی یا ہنگامی نہیں تھی۔ تمہاری ساری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ تم کرتے ہی یہی کچھ رہے ہو۔ تمہاری ذہنیت ہی ایسی ہو چکی ہے۔ قول و قرار کے بعد اس سے پھر جانا، تمہاری عادتِ مستمرہ اور فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ تم نے پہلے بھی یہی کچھ کیا تھا اور آج بھی یہی کچھ کر رہے ہو۔ اس سے عہدِ نزولِ قرآن کی اولین جماعتِ مومنین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ یہودیوں کے قول و قرار اور معاہدات پر یونہی اعتماد نہ کر لینا۔ یہ اُن سے پھر جایا کرتے ہیں — اور جیسا کہ قرآن کریم کے دیگر مقامات سے واضح ہے، انہوں نے ایسا ہی کیا۔

(۰)

اس کے بعد بنی اسرائیل کے اِسی عہد و میثاق کی ایک اور شق سامنے آتی ہے اور وہ ایک عظیم حقیقت در کنار ہے:-

۲/۸۴ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا
تُخْرِجُونَ أَنفُسَكُم مِّن دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَ
أَنتُمْ تَشْهَدُونَ.

سابقہ آیات میں کئی ایک مقامات پر بنی اسرائیل سے کہا گیا ہے کہ خدا نے تم سے یہ عہد بھی لیا تھا۔ وہ عہد بھی۔ تم نے اِس بات کا اقرار و پیمان بھی کیا تھا، اُس بات کا بھی۔ لیکن تم اپنے ہر عہد سے پھر گئے۔ ہر پیمان و اقرار سے روگردانی کی۔ اسی سلسلے میں زیرِ نظر آیت میں کہا گیا ہے کہ تم سے دو اور باتوں کے عہد بھی لیے گئے تھے۔ ایک یہ کہ تم باہمی خونریزی نہ کرو گے۔ اور دوسرے یہ کہ اپنے لوگوں کو اُن کے گھروں سے نہیں نکالو گے۔ تم نے اس کا اقرار بھی کیا تھا اور تمہارے مذہبی صحیفوں میں، ایسا کچھ لکھا بھی ملے گا، اس لئے تم آج بھی اس کے گواہ ہو کہ تم سے یہ عہد لیا گیا تھا اور تم نے اس کا اقرار بھی کیا تھا۔

(۰)

لیکن

۲/۸۵ ثُمَّ أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنكُم
مِّن دِيَارِهِمْ تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِم بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. وَإِن
يَأْتُوكُمْ أُسَارَىٰ تُفَادُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ.
أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ. فَمَا جَزَاءُ
مَن يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ
يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ. وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُونَ.

تم نے ان ہر دو احکام کی خلاف ورزی کی۔ تم نے باہمی خونریزی بھی کی اور اپنے لوگوں کو ان کے گھروں سے بھی نکالا۔ یہاں باہمی خون ریزی کی بجائے قتل کا لفظ آیا ہے۔ جیسا کہ آیت (۲/۵۴) کی تشریح میں بتایا جا چکا ہے، قتل کے معنے سچ مچ قتل کر دینا بھی ہیں اور کسی کو پست و ذلیل کر دینا اور غیر مؤثر بنا دینا بھی۔ آیت (۲/۸۴) میں چونکہ خوں ریزی کا ذکر ہے اس لئے یہاں قتل کے لئے خوں ریزی بھی ہو سکتے ہیں لیکن جو کچھ اگلی آیت میں کہا گیا ہے اس کی رو سے غور کیا جائے تو اس کے معنی پست اور ذلیل کر دینا، کمزور

اور ناتوان بنادینا بھی ہو سکتے ہیں۔

جیسا کہ ہم کئی مقامات پر لکھ چکے ہیں، قرآنِ کریم میں امم سابقہ کی یہ داستانیں اس لئے بیان کی گئی ہیں کہ ان میں جو اصول پوشیدہ ہیں وہ آنے والوں کے لئے بھی راہ نمائی کا موجب بنیں۔ اس آیت میں ایک ایسا اہم اصول بیان کیا گیا ہے جو باطل کے نظام کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا ہے؛ اس لئے یہ انتہائی غور و تفکر کا متقاضی ہے۔ قرآنِ کریم نے یہودیوں سے کہا یہ ہے کہ تم کرتے یہ تھے کہ خود اپنی قوم کے ایک طبقے کو مفلس

ایک عجیب فریبِ نفس

اور غریب، کمزور اور ناتواں بنا کر انہیں ان کے گھروں تک سے نکال باہر کرتے تھے۔ اِن بے گھر، بے در، خانماں خراب، ضعیف و ناتواں لوگوں کو اِدھر اُدھر کے طاقتور قبائل قید کر لیتے تھے۔ اُس کے بعد تمہارے مذہبی پیشوا اس قسم کا وعظ کہتے تھے کہ قیدیوں کو قید سے چھڑانا بڑے ثواب کا کام ہے۔ چنانچہ تم یہ ثواب کمانے کے لئے باہمی چندے اکٹھے کرتے اور ان قیدیوں کا فدیہ ادا کر کے انہیں قید سے چھڑا لیتے۔ ان سے کہا گیا کہ ایسا کرنے سے تم اپنے آپ کو کتنے بڑے فریب میں مبتلا رکھتے ہو۔ قیدیوں کو قید سے آزاد کرانے کا ثواب تو کماتے پھرتے ہو لیکن اتنا کبھی نہیں سوچتے کہ اِن لوگوں کو اس حالت تک پہنچا دینا جس میں دوسرے لوگ انہیں اچک کر لیجائیں، کتنا بڑا سنگین جرم ہے۔ تم ایسے سنگین جرم کا ارتکاب کرتے وقت تو ذرا متأمل نہیں ہوتے۔ اس سے تمہارے دل میں خفیف سی کھٹک بھی پیدا نہیں ہوتی۔ تم ان لوگوں کو بے دھڑک اِس حالت تک پہنچا دیتے ہو اور اس کے بعد انہیں قید سے چھڑانے کی "نیکیاں" کماتے پھرتے ہو۔

اس سے یہ اہم اصول ہمارے سامنے آتا ہے کہ کسی کو ایسی حالت تک پہنچا دینا جس میں وہ خود تمہاری یا دوسروں کی مدد کا محتاج ہو جائے، نظامِ خداوندی میں جرمِ عظیم ہے۔ اور پھر اس کی مدد کر کے اپنے آپ کو اطمینان دلا لینا اور خوش ہو جانا کہ ہم نے اتنا بڑا ثواب کا کام کیا ہے، فریبِ نفس سے زیادہ کچھ نہیں۔ آیئے ہم دیکھیں کہ اس قرآنی صداقت میں ہمارے لئے ہی نہیں، ساری دنیا کے لئے کتنا بڑا اصول پوشیدہ ہے۔

آج ساری دنیا کی آبادی بنیادی طور پر، دو طبقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک طبقہ دولت مندوں کا، دوسرا طبقہ مفلسوں اور غریبوں کا۔ اس کے بعد ساری دنیا اس غم میں گھلی جا رہی اور اس

باطل کا اقتصادی نظام اور مذہب

"جہادِ عظیم" میں مصروف نظر آتی ہے کہ ان غریبوں اور مفلسوں کی مدد کس طرح کی جائے۔

لیکن اس بنیادی سوال پر کوئی غور نہیں کرتا کہ امیروں اور غریبوں کے یہ دو متضاد طبقات وجود میں کس طرح آتے ہیں؟ پیدائش کی رو سے کوئی انسانی بچہ نہ غریب ہوتا ہے نہ امیر۔ آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ کوئی بچہ پیدائش کے وقت ہیرے اور جواہرات کے ہار اپنے گلے میں، اور جاگیروں، ملوں و فیکٹریوں کی ملکیت کی دستاویزات ہاتھ میں لے کر پیدا ہوتا ہو۔ اور دوسرا بچہ خالی ہاتھ دنیا میں آتا ہو۔ سب بچے دنیا میں یکساں طور پر خالی ہاتھ آتے ہیں، اور اس کے بعد ہم خود ان میں سے بعض بچوں کو دولتمند بنا دیتے ہیں اور بعض کو غریب۔ طبقۂ امراء کے بچوں کو دولت، جائیدادیں اور جاگیریں میراث میں مل جاتی ہیں اور غریب ماں باپ کے گھر پیدا ہونے والے بچے ان کے خدمت گزار اور محنت کش بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہزاروں ایکڑ زمین کے رقبہ کا مالک (بچہ یعنی زمیندار) کچھ کام نہیں کرتا۔ اس کے برعکس اس کے مزارعے سال بھر خون پسینہ ایک کر کے اناج پیدا کرتے ہیں اور اس میں سے انہیں اتنا بھی نہیں ملتا کہ ان کی اور ان کے بچوں کی طبیعی ضروریاتِ زندگی بھی پوری ہوسکیں۔ جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں وہ امیر، امیر تر بنتا چلا جاتا ہے اور یہ غریب، غریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ دیہات سے نکل کر شہروں کی طرف آجائیے۔ یہاں ملوں اور فیکٹریوں میں محنت کش اور ملازم کام پر لگائے جاتے ہیں۔ ان فیکٹریوں کے مالک ان مزدوروں کی اُجرت (WAGES) مقرر کرتے ہیں۔ (WAGES) کس طرح سے مقرر ہوتی ہیں، یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ (غالباً) حکمائے یونان میں سے کسی کا قول ہے کہ تاریخِ انسانیت میں سے وہ دن سیاہ ترین تھا جب کسی غلام نے اپنے آقا کو اتنا کما کر دیا جو اس سے زیادہ تھا جتنا وہ آقا اس غلام پر خرچ کرتا تھا۔ اس دور کی بے نقاب غلامی ہو یا عصرِ حاضر کی نقاب پوش غلامی (جسے مزدوری یا محنت کشی کہا جاتا ہے) ہر آقا، اپنے مزدور کو اس سے کم دیگا جتنا وہ مزدور کما کر دیتا ہے۔ (مثلاً) کسی مزدور سے یہ طے پاتا ہے کہ وہ آٹھ گھنٹے روزانہ کام کرے گا۔ اور اسے دس روپیہ یومیہ اجرت ملے گی۔ وہ مزدور چار گھنٹے میں اتنا کام کر دیتا ہے جس سے مالک کو دس روپے مل جائیں۔ اس کے بعد وہ بقایا چار گھنٹوں میں جس قدر محنت کرتا ہے اسے اس کا کچھ معاوضہ نہیں ملتا۔ وہ سارے کا سارا کارخانے کے مالک کے پاس چلا جاتا ہے۔ کارخانہ دار اس پر تو

رکھتا ہے کہ وہ مزدور ایک منٹ کے لئے بھی بیکار نہ بیٹھے لیکن اس سے اسے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ جو اُجرت اس مزدور کو دی جاتی ہے اس سے اس کی اور اس کے اہل و عیال کی ضروریاتِ زندگی بھی پوری ہوتی ہیں یا نہیں۔ اس سے محنت کشوں کے طبقہ کو آہستہ آہستہ ایسے مقام پر پہنچا دیا جاتا ہے جہاں ان پر فاقوں تک کی نوبت آجاتی ہے۔ ایسے میں مذہب آگے بڑھتا ہے اور ان دولت مندوں سے کہتا ہے کہ ان غریبوں کی مدد کرنا تم پر فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صدقات، خیرات، زکوٰۃ اور دیگر بہبود کے کاموں کے لئے سخت تاکیدی احکام نازل کئے ہیں۔ ایسا کرنا بڑے ثواب کا کام ہے۔ چنانچہ دولت مندوں کا یہ طبقہ بڑے فخر سے خیرات کے کاموں میں حصہ لیتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ اس سے خوشنودیٔ باری تعالیٰ حاصل ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم ان سے کہتا ہے کہ اے صدقہ و خیرات اور زکوٰۃ سے، ان مفلس اور محتاجوں کی مدد کر کے ثواب کمانے والو! ذرا یہ بتاؤ کہ انہیں مفلس اور محتاج بنایا کس نے ہے؟ تم پہلے انہیں مفلس اور محتاج بنا دیتے ہو اور پھر ان کی مدد کر کے خوش ہو جاتے ہو کہ ہم بڑا ثواب کا کام کر رہے ہیں حالانکہ انہیں اس حالت تک پہنچانا سنگین ترین جرم تھا۔ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ (۲/۸۵) دولت مند طبقہ، اور ان کی حمایت کرنے والے مذہبی پیشواؤں کی طرف سے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ زمیندار نے اپنی ملکیت کی زمین، ان مزارعوں کو دی لہٰذا بٹائی لینا ان کا "شرعی حق" ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ انہیں زمین پر اپنی ملکیت جتانے کا حق کیسے حاصل ہو گیا؟ کرۂ ارض کی ساری زمین خدا کی پیدا کردہ ہے۔ اور اس نے اسے تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں ذریعۂ رزق بنایا ہے۔ خدا کی ملکیت کو اپنی ملکیت سمجھ لینا، خود خدا بن جانا ہے۔ (اس نکتہ کی وضاحت اس کتاب کی پہلی جلد میں آیت (۲/۳۰)، صفحہ ۲۹۶) کی تشریح میں کی جا چکی ہے) اسی طرح کارخانے کے مالک کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنا سرمایہ لگا رکھا ہے اس لئے اسے اس سرمایہ کا نفع لینے کا حق حاصل ہے۔ ان سے کوئی نہیں پوچھتا کہ کارخانے کے موجودہ مالک (یا اس کے باپ دادا) کے پاس یہ سرمایہ آیا کہاں سے ہے؟ یہ انہی مزدوروں کی اُس چار گھنٹے کی محنت کا ماحصل ہے جس کا انہیں کچھ معاوضہ نہیں دیا گیا تھا۔

انفرادی سرمایہ داروں سے آگے بڑھ کر، آجکل فلاحی مملکت (WELFAR STATE) کا نظام سامنے آتا ہے۔ اس میں خود مملکت سرمایہ کار ہوتی ہے اور مزدوروں، مفلسوں کے لئے

فلاح وبہبود کی اسکیمیں، وہی "صدقہ" خیرات" کے ثواب کمانے کے کام! حتیٰ کہ عصرِ حاضر میں جس انقلاب (سوشلزم) کا اس قدر ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے، اس میں بھی محنت کشوں کو اجرتیں (WAGES) ہی دی جاتی ہیں اور اجرتیں مقرر کرنے کا اصول دمعیار، وہی سرمایہ دارانہ ہے۔

قرآن، نظامِ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت، دونوں کے خلاف چیلنج لے کر سامنے آتا ہے اور اعلانیہ کہتا ہے کہ اِن انسانوں کو مفلسی اور محتاجی، غریبی اور ناداری کی اس حالت پر پہنچانے کا ذمہ دار یہ باطل نظام ہے جو سرمایہ دار طبقے کا وضع کردہ اور مذہبی پیشواؤں کی باطل تاویلات کے سہارے قائم ہے۔ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کو اُس حالت تک پہنچا دے جس میں وہ، ان کا دست نگر بننے پر مجبور ہو جائے۔ دین کے قائم کردہ نظام میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس نظام کی تفصیلات پہلی جلد میں زیرِ آیت (۱/۲ ; ۲/۳ ; ۲/۴۲، صفحات ۵۸ ; ۱۰۱ ; ۲۹۶) میں اور زیرِ نظر جلد میں آیات (۲/۴۳ ; ۲/۴۴) میں گزر چکی ہیں۔ انہیں ایک نظر پھر دیکھئے۔ یہاں اتنا اضافہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں مزارعت (بٹائی) یا اجرت کا کوئی ذکر نہیں۔ یہ تصور ہی قرآن کے معاشی نظام کے خلاف ہے۔ اس نظام میں ہر ایک کی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور زاید از ضرورت کسی کے پاس نہیں رہتا۔ باقی رہا یہ کہ خود قرآنِ کریم میں بھی صدقہ اور خیرات وغیرہ کا ذکر آیا ہے تو اس کے متعلق ہم قرآن کے معاشی نظام سے متعلق اُن آیات میں ذکر کر چکے ہیں جن کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے۔ (مزید تشریح ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی)

آیۂ زیرِ نظر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بالادست طبقہ درحقیقت ایک برادری ہوتا ہے جو زیردست طبقہ کے مقابل متحدہ محاذ قائم کر لیتا ہے۔ بالادست طبقہ کے لوگ، زیردست طبقہ پر غالب رہنے کے لئے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ اس مدد کے لئے قرآن نے اثم اور عدوان کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اثم سے مراد ہوتی ہے ایسے کام جو اضمحلال پیدا کر دیں اور عدوان ان اُن کاموں کو کہتے ہیں جن سے انسان حد سے بڑھ جاتا ہے۔ یہ طبقہ ایسی اسکیمیں بناتا رہتا ہے جن سے محنت کشوں اور مزدوروں کی قوتیں مضمحل ہو جائیں اور سرمایہ دار طبقہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس طرح یہ لوگ اپنے اس نظام کو مستحکم کرتے رہتے ہیں۔ ان کی ہر اسکیم محنت کشوں کے اثم اور سرمایہ داروں کے عدوان کا موجب ہوتی ہے، اور اسے شرعی سند، مذہبی پیشوائیت بہم پہنچاتی

ہے۔ کوئی فرعون، ہامان کے بغیر فرعون نہیں بن سکتا۔ نہ ہی ان میں کوئی قارون جنم لے سکتا ہے۔

(۰)

زیرِ نظر آیت میں قرآنِ کریم نے بنی اسرائیل سے کہا ہے کہ پہلے تم لوگوں کو اس حالت میں پہنچا دیتے ہو کہ انہیں دوسرے لوگ اپنا قیدی یا غلام بنائیں اور پھر ان قیدیوں یا غلاموں کو رہائی دلانے کے لئے فدیہ دیتے ہو۔ ایک حدیث میں ہے کہ:۔

> رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت پر ایک ایسا ہی زمانہ آئے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پر آیا تھا۔ بالکل درست اور ٹھیک، جیسی کہ دونوں جوتیاں برابر اور ٹھیک ٹھیک ایک جیسی ہوتی ہیں۔
>
> (ترمذی۔ بحوالہ مشکوٰۃ۔ باب اعتصام بکتاب وسنت)

جس مقصد کے لئے ہم نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اُس تک پہنچنے سے پہلے ایک تمہیدی وضاحت ضروری ہے۔ یہ، اور اس قسم کی دیگر روایات کو عام طور پر پیش گوئیاں کہا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ پیش گوئیاں نہیں بلکہ حقائق سے اخذِ نتائج ہے۔ (پیش گوئی علمِ غیب کا دوسرا نام ہے اور علمِ غیب خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ قرآنِ کریم میں "آنے والے حالات" سے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ خدا کی طرف سے ہے کسی انسان کی طرف سے نہیں) احادیث کے

روایات میں پیش گوئیاں

معاملے میں ہمارے ہاں دشواری یہ ہے کہ کسی حدیث کا پورا پس منظر بیان نہیں کیا گیا صرف "قولِ رسولؐ" درج کر دیا گیا ہے۔ اس سے بات اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتی۔ مندرجہ بالا حدیث کے ضمن میں ہم سمجھتے ہیں کہ نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہوگا کہ اگر مسلمانوں نے قرآن کو چھوڑ دیا تو ان کی حالت بھی بعینہٖ بنی اسرائیل کی سی ہو جائے گی کیونکہ انہوں نے بھی خدا کی کتاب کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ وہ جو قرآنِ کریم میں آیا ہے کہ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا۔ (۲۵/۳۰)۔ "رسول اللہ، بحضور رب العزت عرض کریں گے کہ اے میرے رب! حقیقت یہ ہے کہ میری قوم نے اس قرآن کو ترک کر دیا تھا۔ (مہجور بنا دیا تھا)"۔۔۔ اس سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

اب ہم پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ زمانہ نزولِ قرآن میں غلامی کا رواج عام تھا۔ تو میں

بالعموم جنگ میں گرفتار شدہ قیدیوں کے مردوں کو غلام اور عورتوں کو لونڈیاں بنا لیتے تھے۔ اس کے بعد ان کی خرید و فروخت کے بازار بھی گرم رہتے تھے۔ قرآن کریم نوعِ انسان کو ہر طرح کی غلامی سے نجات دلانے

غلامی اور قرآن کریم

کے لئے آیا تھا اس لئے ظاہر ہے کہ وہ غلامی جیسی لعنت کو کیسے باقی رہنے دیتا۔ جنگ کے قیدیوں کے متعلق اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۴۷/۴) "ان قیدیوں کو بہر حال رہا کرنا ہوگا۔ اگر ان کی قوم ان کا فدیہ دیدے۔ قیدیوں کے بدلے میں قیدی یا مقرر کردہ فدیہ۔ تو انہیں اس طرح چھوڑ دو۔ اور اگر حالات ایسے ہوں جن میں فدیہ کی شکل پیدا نہ ہو سکے تو انہیں بطور احسان چھوڑ دو۔ یعنی انہیں ہر حال چھوڑنا ہوگا" جنگ کے قیدیوں کے متعلق قرآن کریم میں یہی ایک آیت ہے۔ اور یہ اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے۔ قرآن کریم نے غلام اور لونڈیاں بنانے کے دروازے کو اس طرح ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ باقی رہے وہ غلام اور لونڈیاں جو اس وقت عرب معاشرے میں موجود تھے۔ ان کے متعلق ایسے احکام دیدیئے جن سے وہ یا تو رفتہ رفتہ آزاد خاندانوں کے جزو بن جائیں اور یا آزاد انسانوں کی طرح اپنی الگ زندگی بسر کریں۔ قرآن کریم میں غلاموں اور لونڈیوں (ماملکت ایمانکم) کے متعلق جتنے احکام ہیں، وہ سب اسی سلسلے میں ہیں۔ اس میں آپ شروع سے آخر تک دیکھ جایئے" غلاموں کو آزاد کرو، آزاد کرو" کی تاکید جا بجا ملے گی اور کسی ایک جگہ بھی یہ لکھا نہیں ملے گا کہ دوسروں کو غلام بناؤ۔

یہ تو تھے قرآن کریم کے احکام۔ لیکن جب ہم نے قرآن کو چھوڑ دیا تو ہم نے غلامی کو اسلام کا جزو بنا لیا۔ چنانچہ آپ ایک طرف یہ دیکھیں گے کہ ہمارے سلاطین، وزراء، امراء، حتیٰ کہ علماء کے طبقہ کے محلات میں سینکڑوں، ہزاروں کی تعداد میں لونڈیاں چلتی پھرتی نظر آئیں گی اور دوسری طرف ان لونڈیوں کی خرید و فروخت کے متعلق "احکام شریعت" کی تصریحات دکھائی دیں گی۔ یہ چیز ہمارے متقدمین تک ہی

مودودی صاحب اور غلامی

محدود نہیں، عصر حاضر کے مفسرین اور اسلام کے نام نہاد مفکرین کا بھی یہی مسلک ہے۔ ہمارے دور میں (LATEST) تفسیر ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی۔ تفہیم القرآن۔ ہے۔ وہ اس باب میں لکھتے ہیں:-

> حکومت کو اختیار ہے کہ چاہے (جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو) رہا کر دے چاہے ان سے فدیہ لے لے۔ چاہے ان کا تبادلہ اُن مسلمان قیدیوں سے کر لے جو دشمن کے ہاتھ میں

ہوں۔ اور چاہے انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے اور سپاہی انہیں اپنے استعمال میں لائیں۔

(تفہیم القرآن ۔ جلد اول صفحہ ۳۴۰ ۔ اشاعت ۱۹۵۱ء)

انہوں نے اس اجمال کی تفصیل اپنی کتاب — تفہیمات ۔ حصہ دوم — میں بڑی شرح و بسط سے بیان کی ہے۔ وہ اس میں کہتے ہیں کہ ان لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنے کی بھی ضرورت نہیں (صفحہ ۳۱۵) نیز

اسلامی شریعت میں نکاح کے لئے تو چار کی حد مقرر ہے ...... لیکن لونڈیوں کے لئے سرے سے کوئی حد رکھی ہی نہیں گئی۔ (ایضاً صفحہ ۳۱۹)

جہاں تک لونڈیوں کی خرید و فروخت کا تعلق ہے، وہ لکھتے ہیں :-

اِس قسم کے لونڈی غلاموں کو بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے فدیہ وصول کرنے اور فدیہ وصول نہ ہونے تک ان سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے اُس کو وہ معاوضہ لے کر دوسرے شخص کو منتقل کر دیتا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۳۲۳)

طرفہ تماشہ یہ کہ اس کے ساتھ ہی ہماری تفاسیر میں غلاموں کو آزاد کرنے کو اتنے بڑے ثواب کا کام بتایا گیا ہے جس کا مقابلہ شاید ہی کوئی دوسرا عمل کر سکے۔ یعنی ایک طرف یہ کہا گیا ہے کہ خدا کا یہ حکم ہے کہ تم ان قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بناؤ اور دوسری طرف یہ کہ خدا نے غلاموں اور لونڈیوں کو رہا کرنا بڑا ثواب کا کام قرار دیا ہے۔ غور کیجئے کہ کیا یہ بعینہٖ وہی شکل نہیں جسے بنی اسرائیل نے اختیار کر رکھا تھا۔ یعنی ایک طرف اپنے لوگوں کو گھروں سے نکالنا اور دوسری طرف انہیں چھڑا کر لانے کا ثواب کمانا۔ کس قدر صحیح فرمایا تھا حضورؐ نے کہ میری امت نے اگر قرآن کو چھوڑ دیا تو یہ نعل بہ نعل بنی اسرائیل کی پیروی کرنے لگ جائے گی !

———— (۰) ————

قرآن کریم نے بنی اسرائیل کے خلاف یہ الزام عاید کرنے کے بعد کہا کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ[1] وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۔ (۸۵/۲) تمہاری حالت یہ ہے کہ تم کتابِ خداوندی کے ایک حصہ پر تو ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے سے کفر برتتے ہو! یہ نکتہ بھی بڑا غور طلب ہے۔ آیتِ زیرِ نظر کی رو سے ان سے یہ کہا گیا ہے کہ تمہاری کتاب میں یہ حکم بھی دیا گیا تھا کہ اپنے لوگوں کو گھروں سے نہ نکالنا اور یہ حکم بھی کہ قیدیوں کو چھڑانا بڑا نیکی کا کام ہے۔ تمہاری حالت یہ ہے کہ اس دوسرے حکم خداوندی پر تو ایمان رکھتے

ہو لیکن پہلے حکم سے کفر برتتے ہو۔ یہ کتاب کے ایک حصے پر ایمان لانے اور اس کے دوسرے حصے سے انکار کرنے کے مرادف ہے۔" اور اس کے بعد کہا کہ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۔ (۸۵:۲)۔ "یاد رکھو! تم میں سے جو لوگ بھی ایسی روش اختیار کریں گے اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ اس دنیا میں بھی ذلت و خواری کی زندگی بسر کریں گے اور اگلی دنیا میں اس سے بھی زیادہ شدید، الم انگیز، اور رسوا کن عذاب میں ماخوذ کئے جائیں گے۔ اور یہ سب ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوگا۔"

دین کے حصے بخرے کر دینا

دین، ایک نظامِ حیات عطا کرتا ہے۔ اور حیات (زندگی) کی صورت یہ ہے کہ وہ ناقابلِ تقسیم وحدت (INDIVISIBLE UNIT) ہے جس کے حصے بخرے نہیں کئے جا سکتے۔ اور جب دین، نظامِ حیات عطا کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ اسے بھی مختلف حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اسے قبول کیا جائے گا تو پورے کا پورا اور مسترد کیا جائے گا تو پورے کا پورا۔ اسی لئے کہا گیا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ۔ (۲۰۸:۲)۔ "اے جماعتِ مومنین! تم اس نظام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی مت کرو۔ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔" اس کے معنے یہ ہیں کہ دین کے حصے بخرے کر دینا شیطان کا اتباع ہے۔ کتاب اللہ کے بعض حصوں کو قبول کر لینا اور بعض سے انکار کر دینا، کفر ہے، کھلا ہوا کفر۔ اور اس کا نتیجہ اِس دنیا میں ذلت و خواری اور اُخروی زندگی میں عذابِ الیم۔

غلط فہمی میں مبتلا ذہن یہ کہے گا کہ یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ جس نے دین کے جس حصے سے انکار کیا اُسے اُس حد تک تو مبتلائے عذاب ہونا چاہیئے۔ لیکن اس نے اس کے جس حصے کو قبول کیا تھا، اُسے اس کا صلہ تو ملنا چاہیئے۔ اس مغالطہ آفریں دلیل کے ابطال کے لئے طبیعی زندگی کی ایک مثال کو سامنے لائیے۔ طبیب آپ کے مرض کی تشخیص کر کے ایک نسخہ مرتب کرتا ہے جو مختلف اجزاء (ادویات) پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر آپ اس نسخے کو پورے کا پورا استعمال کریں گے تو وہ اپنا صحت بخش نتیجہ مرتب کریگا۔ لیکن اگر آپ ایسا کریں کہ اس نسخے کے دس اجزاء میں سے پانچ کو تو لے لیں اور بقایا پانچ کو چھوڑ دیں تو کیا آپ کو اس سے "پچاس فیصد" شفا حاصل ہو جائے گی؟ پچاس فیصد شفا حاصل ہونا تو

ایک طرف، نہ معلوم اس سے آپ میں اور کتنے عوارض پیدا ہوجائیں۔ نسخہ کے بعض اجزاء کو چھوڑ دینا تو ایک طرف، اگر آپ طبیب کے متعین کردہ اوزان میں بھی کسی قسم کی کمی بیشی کر دیں گے تو اس کا نتیجہ بھی نہ معلوم کیسا ہلاکت انگیز برآمد ہوجائے! یہی کیفیت دین کے نظام کی ہے۔ یہ نظام اسی صورت میں اپنے خوشگوار نتائج پیدا کریگا جب اسے بالکلیہ اختیار کیا جائے۔ اگر اس کے بعض حصوں کو اختیار کیا جائے اور بعض کو چھوڑ دیا جائے تو اس کا نتیجہ ذلت و خواری کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اور اس کی زندہ شہادت ہماری اپنی حالت ہے۔ ہم نے دین کو پرسنل لاز اور پبلک لاز (مذہب اور سیاست) میں تقسیم کرکے اسے "مذہب" میں تبدیل کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے! ہم صدیوں سے (باوجود سب کچھ ہونے کے) جس ذلت و خواری کی زندگی بسر کر رہے ہیں اُس کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ ہمارے "مذہب" میں کتاب اللہ کے بعض احکام پر تو بہر حال عمل ہو رہا ہے۔ کیا ان اعمال کا کوئی خوشگوار نتیجہ مرتب ہوتا ہے؟ کیا ان کے باوجود ہماری ذلت و خواری بڑھتی نہیں جارہی؟ اور یہ پہلے بالوضاحت بیان کیا جاچکا ہے کہ قرآنِ کریم کا واضح فیصلہ ہے کہ جس قوم کی اس دنیا کی زندگی ذلت و خواری کی ہوگی اس کی آخرت کی زندگی بھی ذلت و خواری ہی کی ہوگی۔ (۱۲/۷۲ و دیگر آیات)

سیکولرازم

عصرِ حاضر کی سیاسی اصطلاح میں اس نظام کو، جس میں انسانی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، سیکولرازم کہا جاتا ہے۔ اس میں ہر شخص کو اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق پوجاپاٹھ، بھگتی، پرستش، نماز، روزہ اور دیگر مذہبی رسوم کی ادائیگی کی اجازت ہوتی ہے۔ لیکن "دنیاوی امور" انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی رو سے طے پاتے ہیں۔ یہ "کتاب کے ایک حصے پر ایمان اور دوسرے حصے سے کفر" کی بیّن مثال ہے۔ کتاب اللہ (قرآنِ کریم) نے ان امور کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران 'نیشنلسٹ علماء' اور علامہ اقبالؒ (اور ان کے ہمنواؤں) کے درمیان یہی نکتہ مابہ النزاع تھا۔ نیشنلسٹ علماء کا موقف یہ تھا کہ ہندو ہمیں اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو "مذہبی آزادی" حاصل ہوگی اور مطالبۂ پاکستان کے مدعیوں کا کہنا یہ تھا کہ قرآن کی رو سے اس آزادی کو آزادی کہا ہی نہیں جاسکتا۔ اس میں آزادی سے مراد "دین کی آزادی" ہے۔ نیشنلسٹ علماء کے اسی موقف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت　　نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

ہم نے بہر حال "دین کی آزادی" کیلئے مملکتِ پاکستان کو حاصل کر لیا لیکن وائے برحالِ ما، کہ ہم نے یہاں نہ ہی سیکولر نظام جاری کر رکھا ہے۔ آئین کی رو سے تو ہماری مملکت "اسلامی جمہوریہ" ہے۔ لیکن عملاً یہاں یہ حالت ہے کہ مرکزی حکومت کی مختلف وزارتوں میں ایک وزارت "امورِ مذہبیہ" کی بھی ہے۔ گویا "مذہبی امور" اِن امور سے الگ ہیں جو دیگر وزارتوں سے متعلق ہیں — "امورِ مذہبیہ" میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اوقاف، حتےٰ کہ مزارات پر عرسوں کی تقریبات وغیرہ شامل ہیں۔ کیا یہ وہی سیکولرازم نہیں جسے تحریکِ پاکستان کے دوران، نیشنلسٹ علماء پیش کرتے تھے۔ اور جسے غیر اسلامی قرار دے کر ہم نے پھٹکار دیا تھا۔ اگر اسلامی نظام اسی کا نام ہے کہ مملکت میں ایک وزارت "امورِ مذہبیہ" سے متعلق بھی ہو تو اس کی ضمانت تو ہندو بھی دیتا تھا۔

اب ہم اس سلسلہ کی آخری کڑی پر پہنچتے ہیں۔ جب پہلی بار دین کا نظام قائم کیا جائے گا، (یعنی مذہب کے نظام کو چھوڑ کر دین کے نظام کی طرف آیا جائے گا، تو دین کا نظام ایک دن میں قائم نہیں ہوگا، یہ بتدریج قائم ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اِن تدریجی مراحل میں بعض اجزا دین کے ہوں گے اور بعض چیزیں غیر اسلامی بھی ساتھ چلیں گی۔ یہ صورتِ حال، افتؤمنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض کے ذیل میں نہیں

دین کے نظام کی تدریجی تکمیل

آئے گی۔ قرآنِ کریم کی حکمتِ بالغہ دیکھئے کہ اس نے یہاں تؤمنون — ایمان لانے کا ذکر کیا ہے، دین کی عملی اقامت کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو قوم دین کا نظام قائم کرنے کے لئے اٹھے اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اس نظام کی صداقت (کتاب اللہ) پر بالکلیہ ایمان رکھے۔ اس ایمان کے بعد وہ، غلط نظام کی جگہ تدریجاً صحیح نظام کی طرف بڑھتی جائے لیکن ہر مرحلہ میں اِس حقیقت کو پیشِ نظر رکھے کہ یہ زندگی ہنوز اسلامی زندگی نہیں کہلا سکتی۔ ہم اسلامی زندگی کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔ وہ اسلامی اس وقت کہلائے گی جب دین کا نظام بالکلیہ قائم ہو جائے گا اور اس میں کسی غیر دینی عنصر کی رمق تک بھی باقی نہیں رہے گی۔ یہ قرآنِ کریم کا اعجاز ہے کہ اس نے جہاں دین کی آخری شکل کے لئے احکام دیئے ہیں وہاں ان تدریجی مراحل سے گزرنے کے لئے بھی ہدایات اور قوانین عطا کئے ہیں۔ دین کی آخری شکل وہ ہوگی جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

کس دریں جا سائل و محروم نیست　　　عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اُس میں غریب اور امیر کے طبقات باقی نہیں رہیں گے۔ اس لئے امیروں کی طرف سے غریبوں کو صدقہ اور خیرات دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن ان تدریجی مراحل میں تو یہ تفریق موجود ہوگی اگرچہ اس کی شدت رفتہ رفتہ کم ہوتی چلی جائے گی قرآنِ کریم میں صدقہ اور خیرات کے ذریعے غریبوں اور مسکینوں کی مدد کرنے یا ترکہ اور وراثت وغیرہ کے سلسلے میں جو احکام آئے ہیں، اُن کا تعلق انہی عبوری ادوار سے ہے۔ مکمل دین میں تو صورت یہ ہوگی کہ نہ کسی کے پاس ضرورت سے زاید (فاضلہ دولت) ہوگی اور نہ کوئی فرد اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم، لہٰذا دوسروں کی امداد کا محتاج ہوگا۔ اسی دور کے متعلق کہا گیا ہے کہ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔ قُلِ الْعَفْوَ۔ (۲/۲۱۹) "اے رسولؐ! تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کی ضروریات کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زاید ہو سب کا سب"۔ اس وقت (مذہب میں) ہماری حالت یہ ہے کہ ہم صدقہ اور خیرات کے متعلق آیات پر تو ایمان رکھتے ہیں، لیکن "قُلِ الْعَفْوَ" کے حکم سے کفر برتتے اور فریبِ نفس کے لئے اس کی طرح طرح کی تاویلیں کرتے رہتے ہیں جن کے لئے ہمارے ہاں بکثرت وضعی روایات موجود ہیں۔ لیکن اِس فریبِ نفس سے ہم، خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل سے تو نہیں بچ سکتے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ جو لوگ کتاب اللہ کے ایک حصے پر ایمان رکھیں گے اور دوسرے سے انکار کریں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اِس دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کریں گے اور آخرت میں شدید ترین عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ یہ ہے "تؤمنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض" کی زندہ مثال، جس پر ہم کاربند ہیں اور ذلت و خواری کے اُس عذاب میں ماخوذ جسے قرآنِ کریم نے اس کا فطری نتیجہ بتایا ہے۔

———— (۰) ————

یہ اِس لئے کہ

۲/۸۶ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۖ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ۔

ان لوگوں نے اُخروی زندگی کو دنیاوی مفاد کے بدلے میں بیچ دیا۔ اس لئے ان کا اس عذاب سے بچ جانا تو ایک طرف، اس میں ذرا سی تخفیف بھی نہیں کی جائے گی اور نہ ہی دنیا کی کوئی طاقت انہیں اس عذاب سے نجات دلائے گی۔ (تفصیل اس کی جلد اول میں، زیرِ آیت (۲/۴۸) گذر چکی ہے)

———— (۰) ————

اس کے بعد کہا۔

۲/۸۷ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ ۔ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ
وَاٰتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوحِ
الْقُدُسِ ۔ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ
اسْتَكْبَرْتُمْ ۔ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۔

آسمانی رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام تک ہی محدود نہیں رہا تھا، ان کے بعد بھی، تمہاری طرف خدا کے رسول یکے بعد دیگرے آتے رہے اور اس سلسلے کی آخری کڑی حضرتِ عیسےٰ علیہ السلام تھے۔

یہاں لفظ قَفَّيْنَا آیا ہے جس کے معنی یکے بعد دیگرے، علی التواتر آنے کے ہیں۔ (نیز دیکھئے ۵/۴۶ ؛ ۵۷/۲۷)۔ دوسری جگہ کہا گیا ہے۔ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا۔ (۲۳/۴۴) علمائے لغت نے کہا ہے کہ تترہ میں، وقفوں کے ساتھ، یکے بعد دیگرے آنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ دنیا کی ہر قوم کی طرف رسول بھیجے گئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب کسی ایک قوم یا ایک ملک میں رسولوں کی آمد کا ذکر ہوگا تو اس میں یکے بعد دیگرے کا سلسلہ سامنے آئے گا۔ ایک رسول، اور دوسرے رسول کی آمد کے درمیانی وقفہ کے سلسلہ میں نبیٔ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا۔ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ ۔ (۵/۱۹)۔ "اے اہلِ کتاب! تمہاری طرف ہمارا یہ رسولؐ، رسولوں کی درمیانی مدت میں آیا ہے"۔ دراصل فترہ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کی گرم جوشی یا اثر کا ماند پڑ جانا۔ ایک رسول جو دینِ خداوندی دے کر جاتا تھا، اُس کے بعد اُس کے متبعین اس میں آمیزش کر دیتے تھے جس کی وجہ سے اُس دین کی گرم جوشی پہلے کی سی نہیں رہتی تھی۔ اس لئے اُس کے بعد ایک دوسرا رسول بھیجا جاتا تھا جو دین کو پھر سے اس کی اصلی شکل میں پیش کرتا تھا۔ اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے سورۃ الحج کی آیت (۲۲/۵۲) میں وضاحت سے بیان کیا ہے۔ چونکہ جس دینِ خداوندی کو حضور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ کیا تھا اسے قرآنِ کریم میں محفوظ کر دیا گیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا اُس لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی رسول کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آیت (۲۲/۵۲) میں مِنْ قَبْلِكَ کے الفاظ آتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ سے پہلے تو رسولوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن

ختمِ نبوّت

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہی، کیونکہ وحیٔ خداوندی، قرآن کریم میں محفوظ کر دی گئی۔ یہ ٹھیک ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی امت نے دین میں آمیزش کر دی جس کی وجہ سے اُس کی حرارت ماند پڑ گئی۔ یعنی دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن اس میں پھر وہی پہلی سی حرارت پیدا کرنے کے لئے کسی رسول کے آنے کی ضرورت نہیں۔ یہ فریضہ اس امت کا ہوگا کہ یہ قرآنِ خالص کی رو سے پھر اُسی نظام کو قائم کر دے۔

رُوح القدس

بہرحال آیۂ زیرِ نظر میں کہا یہ گیا ہے کہ بنی اسرائیل کی طرف انبیائے کرامؑ کا سلسلہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی ذاتِ گرامی تک جاری رہا۔ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے متعلق تفصیلی گفتگو متعلقہ مقام پر کی جائے گی۔ یہاں اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ انہیں روح القدس کے ذریعے تقویت پہنچائی تو لفظِ روح کے بنیادی معنی توانائی کے ہیں، لیکن قرآن کریم نے اسے وحی کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ لفظ قدس کی تشریح آیت (۳۰/۲) میں گزر چکی ہے۔ وحی کے ... قدس ہونے میں دو نکات مضمر ہیں۔ ایک تو یہ کہ رسول کی طرف نازل کردہ وحی اس کی ذات تک محدود نہیں رہتی تھی۔ اُس کا فریضہ تھا کہ اُسے اپنی وسعت کے مطابق، دور دور تک پھیلائے۔ اور دوسرے یہ کہ ہر رسول کی طرف بھیجی ہوئی وحی ان آمیزشوں اور آلائشوں سے پاک اور صاف ہوتی تھی جو سابقہ رسولوں کی وحی میں ملا دی جاتی تھیں۔ ہم ذرا آگے چل کر بتائیں گے کہ "روح القدس" کی اصطلاح وحی لانے والے (حضرت جبرئیل) کے لئے بھی استعمال کی گئی ہے۔

قرآنِ کریم نے بنی اسرائیل پر ایک اور الزام عاید کیا ہے اور وہ یہ کہ جب کوئی رسول تمہاری طرف آتا تھا اور وہ دینِ خداوندی پیش کرتا تھا تو تمہاری کیفیت یہ ہوتی تھی کہ اس میں جتنا حصہ تمہیں پسند آتا، (یعنی جس سے تمہارے مفادات پر زد نہ پڑتی)، تم اُسے تو قبول کر لیتے اور جو تمہارے مفاد اور جذبات کے خلاف جاتا اُس سے سرکشی برت کر انکار کر دیتے۔ اِس سرکشی میں تم دو طریقے اختیار کرتے۔ یا تو تم اُس رسول کی تکذیب کرتے یا اُسے غیر مؤثر بنا دیتے اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ تم اُسے جان ہی سے مار دیتے۔ (قتلِ انبیاء کی تفصیل آیت (۶۱/۲) کے تابع گذر چکی ہے)۔

قرآنِ کریم نے جو کہا ہے کہ وحیٔ خداوندی میں تم اِس کا انتخاب کرتے کہ اس کا کون سا حصہ ماننا چاہیئے۔ اور کون سے حصے سے انکار کر دینا چاہیئے (تفصیل آیت (۸۵/۲) میں گذر چکی ہے) تو یہی روش تم نے نبی اکرم

صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی اختیار کر رکھی ہے۔ چنانچہ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے: وَ اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا۔ (۱۷/۴۶)۔ "اے رسولؐ! جب تو قرآن میں خدائے واحد کا ذکر کرتا ہے تو ان لوگوں کے دل میں نفرت کے جذبات ابھرتے ہیں۔ اور یہ منہ پھیر کر چل دیتے ہیں"۔ چنانچہ ان کی طرف سے اس قسم کے تقاضے آتے تھے کہ؛ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَاۤ اَوْ بَدِّلْهُ۔ (۱۰/۱۵)۔ "خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کو ناپسند کرنے والے لوگ تجھ سے کہتے ہیں کہ تو اس قرآن کی جگہ کوئی دوسرا قرآن پیش کر دے یا اس میں اُن کے حسبِ منشا تبدیلی کر دے"۔ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۰/۱۵)۔ "اے رسولؐ! تو ان سے کہہ دے کہ یہ میرے بس کی بات نہیں کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کر دوں۔ ....

..................میرا فریضہ تو اتنا ہی ہے کہ مجھے جو کچھ خدا کی طرف سے ملے، میں اُسے تم تک پہنچا دوں۔ اتنا ہی نہیں، میں خود اسی قرآن کا اتباع کرتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ اگر میں نے اس کی ذرا سی بھی خلاف ورزی کی تو میں بھی خدا کے عذاب سے بچ نہیں سکوں گا۔ لہٰذا، میں اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا"۔

قرآنِ خالص سے نفرت

یہ بات بنی اسرائیل کے متعلق ہو رہی تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خود ہم نے بھی وحیٔ خداوندی (قرآنِ کریم) کے ساتھ یہی کچھ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ: اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ (۲۹/۵۱) "کیا ان لوگوں کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تیری طرف ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جسے تو ان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ کتاب جس میں ان لوگوں کے لئے جو صداقت پر ایمان لائیں، رحمت بھی ہے اور موعظت بھی"۔ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ مومنین کے لئے قرآن کافی ہے۔ لیکن ہم دھڑلے سے کہتے ہیں کہ نہیں، ہمارے لئے قرآن تنہا کافی نہیں۔ اس کے ساتھ اس کی مثل (مثلہٗ معہٗ)[1] کچھ اور چیزوں کی بھی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف آنے والی وحی کی دو قسمیں تھیں — ایک وحیٔ متلو، جو قرآن کے اندر محفوظ ہے اور دوسری وحیٔ غیر متلو، جو احادیث کی شکل میں، بعد میں جمع کی

[1] فٹ نوٹ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

گئی۔ یہ احادیث، قرآن کے ساتھ، قرآن کی مثل ہیں۔ (اس عقیدے کے متعلق آیات (۲/۲۳) جلد اول صفحہ ۲۸ (۱) میں گفتگو کی جاچکی ہے۔ یہ عقیدہ ہمارے دل کی گہرائیوں میں اس قدر پیوست ہو چکا ہے کہ اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ انسانی ہدایت کے لئے قرآن کریم کافی ہے تو اُسے کافر اور ملحد قرار دے دیا جاتا ہے قرآن کریم نے جو کہا تھا وَ اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا۔ (۱۷/۴۶)۔ "جب تو قرآن میں خدائے واحد کا ذکر کرتا ہے تو یہ لوگ نہایت نفرت کے ساتھ منہ پھیر کر چل دیتے ہیں۔" تو یہ منظر ہر روز ہمارے سامنے آتا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ منظر بھی کہ وَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَ اِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ۔ (۳۹/۴۵)۔ "جب اکیلے خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دلوں میں عجیب قسم کی کدورت اور کبیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جب اُس کے سوا اوروں کا بھی ذکر آجاتا ہے تو ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔" غور کیجئے کہ قرآنِ کریم نے کس قدر عبرت آموز انداز میں ہمارا نقشہ کھینچا ہے۔ یاد رکھئے! روایات، تاریخ، تفسیر وغیرہ قرآنِ کریم کے سمجھنے میں ممد و معاون ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی قرآن کی مثل نہیں ہو سکتی۔ قرآن بے مثل و بے نظیر، خدا کی کتاب واحد ہے۔ قرآن کی مثل تو خود قرآن کا ترجمہ بھی نہیں ہو سکتا۔

(۰)

اس کے بعد قرآنِ کریم نے یہودیوں کے مذہبی پیشواؤں (علماء) کی ایک اور ذہنیت کا ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ:-

۲/۸۸ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۚ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ۔

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ذرا ٹھہرو اور دیکھو کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ واقعی حق و صداقت پر مبنی ہے؟ اگر

---

(۱) (فٹ نوٹ صفحہ سابقہ) ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے قرآن دیا گیا ہے اور مثلہٗ معہٗ۔ قرآن کے ساتھ قرآن ہی جیسا کچھ اور بھی۔ اس روایت کا وضعی ہونا بالکل بدیہی ہے کیونکہ قرآن کریم تو ساری دنیا کو چیلنج کرتا ہے کہ تم سارا قرآن تو ایک طرف، اس کی کسی ایک سورۃ کی مثل ہی لا کر بتا دو۔ (تفصیل آیات ۲/۲۳-۲۴۔ جلد اول صفحہ ۲۸) میں گزر چکی ہے

ایسا نہیں تو جو کچھ ہم تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں اُسے بھی اچھی طرح پرکھ کر دیکھ لو۔ اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم نے جو کچھ سمجھنا تھا سمجھ لیا۔ تم یوں سمجھ لو کہ ہمارے دلوں پر خول چڑھے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے باہر کی کوئی بات بھی ان تک نہیں پہنچ سکتی۔ یا یہ ایسے برتن ہیں جو پہلے ہی لبالب بھرے ہوتے ہیں۔ اس لئے ان میں ایک قطرے تک کی مزید گنجائش نہیں۔ ہم نے جس قدر علم حاصل کرنا تھا، کرلیا۔ اب اس میں کسی اضافے کی گنجائش نہیں۔ اس ذہنیت کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اُسے اس آیت کے آخری الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت ہم ذرا آگے چل کر کریں گے۔ اس مقام پر اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ

حصولِ علم کی ضرورت

فرد ہو یا قوم، جو یہ سمجھ لے کہ ہمیں مزید علم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں وہ جیتے جاگتے انسان نہیں رہتے، جانوروں کے متحجرا (FOSSIBLIZED) ڈھانچے بن کر رہ جاتے ہیں۔ انسانی زندگی ارتقائی منازل طے کر رہی ہے۔ وہ زمانے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان علم کے ارتقاء کا ساتھ دے۔ بلکہ مومن کا تو یہ مقام ہے کہ وہ اپنے زمانے کی امامت کرے۔ شاہراہِ حیات پر کسی ایک مقام پر یہ سمجھ کر کھڑے ہو جانا کہ ہم علم کی انتہا تک پہنچ گئے ہیں، مصافِ زندگی میں شکست خوردگی کی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مکمل راہ نمائی قرآنِ کریم میں دے دی۔ اس میں نہ کسی تبدیلی کی ضرورت ہے نہ اضافے کی گنجائش۔ لیکن اس اصولی راہنمائی کی روشنی میں سفرِ زندگی طے کرنے کے لئے تو حصولِ علم کی ضرورت ہوگی اور یہ ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ اس ضرورت کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ وہ ذاتِ اقدس داعظمﷺ جو علم کی بلندیوں پر فائز تھی، اسے بھی یہ دعا سکھائی گئی: وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا۔ (۲۰/۱۱۴) "اے میرے نشو و نما دینے والے! میرے علم میں اضافہ کرتا جا۔" ظاہر ہے کہ اس دعا میں وہ علم بھی شامل تھا جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی مل رہا تھا اور جو ہنوز آخر تک نہیں پہنچا تھا۔ یعنی قرآن کی تنزیل کا سلسلہ جاری تھا۔ اور اس کے ساتھ وہ علمِ انسانی بھی جس کی روشنی میں حضورؐ نے اس آسمانی ہدایت کو ایک محسوس نظام کی شکل میں قائم کرکے دکھانا تھا۔ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کو ہمارے لئے اسوۂ حسنہ (حسین ترین نمونہ) قرار دیا گیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اُس اسوہ کے اتباع میں یہ دعا ایسی ہے جو ہر قلبِ مومن میں زندہ آرزو کی طرح مچلتی رہنی چاہیئے۔۔ اے میرے نشو و نما دینے والے! میرے علم میں اضافہ کر۔

لیکن وہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر میری امت نے قرآن کو چھوڑ دیا تو اس کی حالت

یعنی بنی) اسرائیل کی سی ہو جائیگی تو اس کی زندہ شہادت، ہمارے مذہبی پیشوا ہیں جو اپنے آپ کو علما کہہ کر پکارتے ہیں ان کے علم کی کیفیت تو یہ ہوتی ہے کہ وہ نہ دین کے کام کا ہوتا ہے نہ دنیا کے۔ لیکن ان کی نخوت، و تکبر کا یہ عالم ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے آپ کو ہر قسم کے علم سے مستغنی سمجھتے ہیں اور کسی کی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ ان حضرات

ہمارے علماء کی حالت

کی کیفیت کیا ہے اس کے متعلق — ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی — اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ان کے متعلق، خود انہی میں کچھ نامور شخصیات کی آراء پیش کر دیں جن کے دلوں کے قفل اللہ تعالیٰ نے کھول دیتے تھے اور اسی لئے ان میں حقیقت شناسی کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔ اس سلسلے میں ہم متقدین اور متاخرین کی آراء اس قدر کثرت سے پیش کر سکتے تھے کہ اُن سے ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جائے۔ لیکن ہم صرف چند ایک پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ ہمارے حلقہ۔ علماء میں امام غزالیؒ کا مقام بہت بلند سمجھا جاتا اور ان کی کتاب "احیائے علوم الدین" کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی اس مشہور تصنیف کی جلد اول کا ایک پورا باب (یعنی چھٹا باب)، علماء کے خلاف تنقید کے لئے وقف کر دیا ہے۔ وہ اس باب میں پہلے یہ بتاتے ہیں کہ اعتراف حقیقت یا علمی انکسار کے بارے میں، حضور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کبارؓ کی کیفیت کیا تھی وہ لکھتے ہیں کہ:۔

> ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ عزیر نبی ہیں یا نہیں۔ اور میں نہیں جانتا کہ تبّع (یمن کا قدیم بادشاہ) ملعون تھا یا نہیں۔ اور میں نہیں جانتا کہ ذوالقرنین نبی ہیں یا نہیں۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ

> حضرت ابن عمرؓ سے اگر کوئی دس مسئلے پوچھتا تو آپ ایک کا جواب دیتے اور نو کے جواب میں خاموش رہتے..... فقہا سلف میں سے کئی ایسے بزرگ ہیں جو "ادری" (میں جانتا ہوں) کے بجائے "لا ادری" (میں نہیں جانتا)، زیادہ کہتے تھے۔

ان حضرات کا یہ مسلک بیان کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ:۔

> حضرت عبداللہؓ ابن عمر فرماتے ہیں کہ ہم اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو قرآن سے پیشتر ایمان نصیب ہوا تھا۔ لیکن عنقریب تمہارے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو کہیں گے کہ ہم نے

قرآن مجید پڑھ لیا ہے۔ ہم سے زیادہ پڑھنے والا کون ہے۔ ہم نے اس کا علم حاصل کر لیا ہے ہم سے زیادہ علم حاصل کرنے والا کون ہے..... یہ امت کے بڑے لوگ ہوں گے۔

جامعۂ ازہر (مصر) مذہبی علوم کی قدیم ترین درس گاہ ہے اور ساری دنیا میں مستند سمجھی جاتی ہے۔ دوسری طرف مفتی محمد عبدہٗ (مرحوم) کا نام اور مقام بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ خود بھی جامعۂ ازہر کے استاد رہے ہیں۔ علمائے ازہر کے متعلق ان کا کیا خیال تھا اس کی بابت ان کے نامور شاگرد علامہ رشید رضا (مرحوم) لکھتے ہیں کہ:۔

ان کا خیال تھا کہ علمائے ازہر اور ان کی قسم کے اور بڑے بڑے شیوخ و علماء وہ لوگ ہیں جن کی اصلاح کی امید باقی نہیں رہی..... جو شخص ازہر یا اس کی قبیل کے مدارس میں جتنی زیادہ مدت تک تحصیلِ علم کرتا ہے اتنی ہی اُس میں تحصیلِ علم کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے

(تفسیر المنار۔ جلد اوّل صفحہ ۱۸۱)

(مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) کو امام الہند کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ سنیئے کہ وہ علماء کے متعلق کیا کہہ گئے ہیں۔ وہ اپنی مشہور تصنیف "تذکرہ" میں لکھتے ہیں:۔

مدتوں غور کرنے کے بعد یہ حقیقت کھلی کہ امتِ اسلامیہ کے تمام مفاسد کی اصلی جڑ دوہی چیزیں ہیں جن کو یونانیت اور عجمیت سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ سارے برگ و بار و ثمراتِ فساد کو انہی سے ظہور و نمو ہوا۔ آج ہمارے مدارس میں جو علوم، باسمِ اصل و اساسِ علومِ شرعیہ پڑھے پڑھائے جاتے ہیں، اگر کسی صاحبِ حکمت کی نظر کیمیاوی ان کی تحلیل و تفرید کرے تو کھل جائے کہ کس قدر حصہ ان کا شریعتِ اصلیہ اور دینِ خالص سے مرکب ہے اور کس قدر اِس فتنۂ عالم آشوب، یونانیت و عجمیت سے ؟ کوئی شئے اِس سے نہ بچی۔ حتیٰ کہ علومِ الٰہیہ و بلاغت و بیان اور عملاً جزئیاتِ اعمال و رسوم و ہیئاتِ معاشرت وغیر ذالک۔ جب یہ حال علومِ شرعیہ بلکہ نام نہاد اصولیہ کا ہے تو پھر ان اساطیر و اوہام کا کیا پوچھنا، جن کو بہ لقبِ شریف "معقولات" پکارا جاتا ہے۔ و ان من العلم جھلاً۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔

ان کا سرمایۂ ناز علمِ حق نہیں ہے جو تفرقہ مٹاتا اور اتباعِ سبلِ متفرقہ کی جگہ ایک ہی

صراطِ مستقیم پر چلاتا ہے بلکہ یکسر جدل و خلاف ہے. نفس پرستی اس کی کثافت کو خمیر کر دیتی ہے اور دنیا طلبی کی آگ اس کی ناپاکی کے بخارات کو اور تیز کرتی رہتی ہے۔

اِن کے علم کے علاوہ، وہ ان کے کردار کے متعلق لکھتے ہیں:۔

سانپ اور بچھو ایک سوراخ میں جمع ہو جائیں گے لیکن علمائے دنیا پرست کبھی یکجا اکٹھے نہ ہوں گے. کتوں کا مجمع ویسے تو خاموش رہتا ہے. لیکن اِدھر قصائی نے ہڈی پھینکی اور اُدھر ان کے پنجے تیز اور دانت زہر آلود ہو گئے. یہی حال اِن سگانِ دنیا کا ہے. ساری باتوں میں متفق ہو سکتے ہیں لیکن دنیا کی ہڈی جہاں سڑ رہی ہو وہاں پہنچ کر اپنے پنجوں اور دانتوں پر قابو نہیں رکھ سکتے ...... فساق و فجار خرابات میں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کا جامِ تندرستی پیتے ہیں اور چور اور ڈاکو مل جل کر راہ زنی کرتے ہیں. مگر یہ گروہ خدا کی مسجد اور زہد و عبادت کے صومعہ و خانقاہ میں بیٹھ کر بھی متحد و یک دِل نہیں ہو سکتا اور ہمیشہ ایک دوسرے کو درندوں کی طرح چیرتا پھاڑتا اور پنجے مارتا ہے. میکدوں میں محبت کے ترانے اور پیار و الفت کی باتیں سننے میں آجاتی ہیں، مگر عین محراب کے نیچے پیشوائی امامت کے لئے ان میں سے ہر ایک کا ہاتھ دوسرے کی گردن پر بڑھتا اور خونخواری کی ہر آنکھ دوسرے بھائی کے خون پر لگی ہوتی ہے. حضرت مسیحؑ نے احبارِ یہود سے فرمایا تھا "تم نے داؤد کے گھر کو ڈاکوؤں کا بھٹ بنا دیا ہے" ڈاکوؤں کے بھٹ کا حال تو معلوم نہیں لیکن ہم نے مسجد کے صحن میں بھیڑیوں کو ایک دوسرے پر غراتے اور خون آشام دانت مارتے دیکھا ہے۔ (تذکرہ۔ صفحہ ۸۴-۸۳)

دار المصنفین (اعظم گڑھ) سے شائع ہونے والا مجلہ "معارف" (جس کے مدیر سید سلیمان ندوی مرحوم تھے) مذہبی دنیا میں بڑے بلند مقام کا حامل سمجھا جاتا ہے. اس کی ستمبر ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں تحریر تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم مولویوں، جن کا خطاب میر باقر داماد کی "الافق المبین" کے الفاظ میں "لم لا یکونیون" اور "لا نسلمیون" بھی ہے یعنی لم یکون کذا (ایسا کیوں نہیں ہو سکتا) اور لا نسلم (ہم یہ تسلیم نہیں کرتے) یہ دو حربے ہمارے ہاتھوں میں ایسے ہیں کہ جب تک جس مسئلہ کے متعلق جو جی میں آئے ہم کہتے چلے جا سکتے ہیں. خدا نہ کرے کہ ہم مدرسہ والوں

کے درمیان کسی بدقسمت آدمی کی کوئی بات جا پڑے۔ جنگلوں کے درخت اور گھاس، جن سے کاغذ تیار کئے جاتے ہیں، شاید کانپ اٹھتے ہوں۔ جب ان کو خبر ملتی ہو کہ مولویوں نے "آستینیں" لم لا یکون کذا" اور" لا نسلم" کہنے کے لئے چڑھائی ہیں۔ سمندر بھی تھرا اٹھیں کہ ان کا پانی بھی ہم مولویوں کے لم لا یکونیات اور لا نسلمیات کی سیاہی کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ (کذا)

یہ مسئلہ کہ مزارعت (یعنی زمینداری، خواہ بٹائی پر ہو یا نقدی پر)۔ ائمہ سلف میں کچھ لوگ اس معاملہ کے عدم جواز کے قائل تھے۔ یا مسلمانوں کی تاریخ و فلسفہ کی کتابوں میں علوم الدوائل کا جس حصہ میں ذکر کیا جاتا ہے اس میں "بوذاسف" کا لفظ عام طور پر جہاں کہیں استعمال ہوا ہے، مراد اس سے "گوتم بدھ" ہے۔ یہ تو خیر غیر معروف مسائل ہیں، نماز میں آمین زور سے کہنا بہتر ہے یا آہستہ۔ رفع الیدین، امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کا پڑھنا، روزمرہ کے اسلامی عبادات کے اجزاء ہیں۔ لیکن ان عام مسائل کے متعلق بھی جیسا کہ دنیا جانتی ہے لم لا یکون اور لا نسلم کے قصے آج تک ختم نہیں ہوئے ہیں، ہزارہا صفحات فریقین کی طرف سے لکھے جا چکے ہیں اور ہنوز روز اول ہے۔ (کذا)

ان حضرات کی یہی ذہنیت نہیں کہ یہ انفرادی طور پر سمجھتے ہیں کہ انہیں سمجھنے، سوچنے کی ضرورت نہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ :-

یہ طے شدہ بات ہے کہ تحقیق و تفتیش کا کام پہلی صدی، دوسری صدی اور تیسری صدی میں پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ اسی کا نام فقہ اسلامی ہے جو ائمہ ھدیٰ کی تحقیقات کا مجموعہ ہے ...... اگر تحقیقاتِ اسلامی سے ایسے مفہومات مراد ہوں جو مکمل اور تنقیح شدہ موجود ہیں تو موجودہ دور کی تحقیق اگر اس کے مطابق ہے تو بلا ضرورت ہے۔ اور اگر تحقیق اس کے خلاف ہے تو مردود ہے۔ اس پر امتِ محمدیہ کا اجماع ہے۔[1]

ان مختصر سی مثالوں سے آپ نے دیکھ لیا کہ "قالوا قلوبنا غلف" کس طرح ہمارے علماء کا مسلک بن

---

[1] جامعہ اشرفیہ (لاہور) کے مفتی جمیل احمد تھانوی کا فتویٰ جو ہفتہ وار ایشیا کی ۴/ اگست ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ (بحوالہ ماہنامہ طلوع اسلام۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء)

چکا ہے۔ ان کی یہی وہ ذہنیت ہے جس کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے اِن حضرات کے خلاف اس کثرت سے تنقید کی ہے کہ اُسے یکجا کیا جائے تو ایک صحیفہ مرتب ہو جائے۔ ان کی تنقید میں طنز و تشنیع کا نشتر بھی ہے اور سوز و گداز کا مرہم بھی۔ مثال کے طور پر دو چار قطعات پیشِ خدمت ہیں۔ وہ سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی زبان سے کہتے ہیں:۔

از شگرفی ہائے آں قرآں فروش ــــ دیدہ ام روح الامیں را در خروش

زاں سوئے گردوں دلش بیگانہ ــــ نزدِ اُو ام الکتاب افسانہ

اور اُس کے بعد ایک نالۂ زہرہ گداز کے ساتھ کہتے ہیں:۔

بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ ــــ آسمانش تیرہ از بے کوکبی

کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد ــــ ملت از قال و اقولش فرد فرد

اور مقطع کا بند یہ کہ:۔

مکتب و ملّا و اسرارِ کتاب ــــ کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب

دینِ کافر، فکر و تدبیرِ جہاد ــــ دینِ ملّا فی سبیل اللہ فساد

اور بالِ جبریل میں ساقی نامہ کے یہ اشعار ان پر مستزاد:۔

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب ــــ مگر لذتِ شوق سے بے نصیب

بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا ــــ لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا

تمدّن، تصوّف، شریعت کلام ــــ بتانِ عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی

یہ امت روایات میں کھو گئی

اس کے جواب میں ان میں سے ہر شخص یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے کہ یہ "علمائے سوء" کے متعلق ہے، ہمارے متعلق نہیں ــــ اور ان میں سے ہر فرقے کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے فرقے کے علماء، علمائے حق ہیں اور باقی فرقوں کے علماء، علمائے سوء۔ اور قرآن کا ارشاد یہ ہے کہ جب امت فرقوں میں بٹ جائے تو کُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ۔ (۳۰/۳۲) "ہر فرقہ یکساں طور پر فریبِ نفس میں مبتلا رہتا ہے"۔ ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ ان میں ایسے حضرات بھی ہیں جو طبعاً منکسر المزاج بھی ہیں اور وسیع القلب

بھی۔ لیکن یہ ان کی ذاتی خصوصیات ہیں۔ جو تعلیم ان لوگوں کو دی جاتی ہے اس کا نتیجہ وہی تنگ نظری اور تعصب رعونت اور نخوت ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

بات چلی تھی اس سے کہ بنی اسرائیل کے احبار و رہبان کی ذہنیت یہ ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں، قُلُوبُنَا غُلْفٌ۔ (۲/۸۸)۔ قرآن کہتا ہے کہ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ (۲/۸۸) "نہیں، یہ اُن کے کفر کی وجہ سے خدا کی لعنت ہے۔" اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اس ذہنیت کو کفر سے تعبیر کیا اور یہ بات بڑی واضح ہے۔ وہ کہتا ہے: اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ۔ فَوَيْلٌ

تنگ نظری کفر ہے

لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۳۹/۲۲)۔ "انسان کی ایک کیفیت تو یہ ہے کہ اس کا سینہ کھلا ہوا ہو، دل میں کشادہ ہو، نگاہ میں وسعت ہو، تلاشِ حقیقت کے لئے سر میں سودا اور دل میں تڑپ ہو، حصولِ علم کے لئے سرگرداں ہو۔ یہ ہیں وہ لوگ، جنہیں خدا کی طرف سے شمع ہدایت مل جاتی ہے۔ اس کے مقابل، وہ لوگ جن کے سینے میں دل نہیں، پتھر کا ٹکڑا ہو، وہ ساری عمر غلط راستوں پر چلتے رہتے ہیں۔" دوسری جگہ ہے: فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ۔ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ (۶/۱۲۶) "ہدایت وسعادت طلب کرنے والوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ قبولیتِ حق کے لئے ان کے سینوں میں کشاد پیدا ہوجاتی ہے۔ لیکن جن کے دلوں میں ایسی طلب نہ ہو، ان کا سینہ اس طرح بھنچا ہوا ہوتا ہے گویا وہ ضیق النفس (دمہ) کے مریض ہو۔ سینہ نہایت تنگ، ایسا تنگ کہ کھل کر سانس بھی نہ لے سکیں۔ ہموار زمین پر چل رہے ہوں تو یوں نظر آئے گو یا کسی پہاڑ پر چڑھ رہے ہیں۔ جن کی ذہنیت اس قسم کی ہو، انہیں ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی۔" اسی لئے قرآن نے اسے کفر سے تعبیر کیا ہے اور اس کا نتیجہ بتایا ہے لعنت۔

ہمارے ہاں تو لعنت کا لفظ گالی بن کر رہ گیا ہے لیکن عربی لغت اور قرآنِ کریم کے استعمال کی

لعنت کے معنی

رو سے یہ لفظ گالی نہیں۔ اس کے معنی ہوتے ہیں زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہو جانا، سعادات و برکات سے دور رہنا۔ مثلاً قوم عاد کی تباہی کے سلسلے میں کہا کہ انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ وَاُتْبِعُوْا

فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ (۱۱/۶۰) "اس دنیا میں بھی محرومیاں ان کے پیچھے لگی رہیں اور قیامت میں بھی ان کی یہی حالت ہوگی" اور اس کے بعد ہے اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ (۱۱/۶۰)۔ یہاں لفظ بُعد (دُوری) نے لعنت کے مفہوم کو واضح کر دیا۔ یہی الفاظ قوم فرعون کے ضمن میں بھی آئے ہیں۔ (۱۱/۹۹ ; ۲۸/۴۲)۔ اس مقام پر اتنی وضاحت کافی ہے۔ آگے چل کر جہاں جہاں یہ الفاظ (لعنت یا ملعون وغیرہ) آئیں گے، متعلقہ آیات خود ان کی وضاحت کرتی جائینگی۔

زیر نظر آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ یہ لوگ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ہمیں علم حاصل کرنے کی حاجت نہیں۔ ہمیں کسی کی بات تک سننے کی بھی ضرورت نہیں۔ ہمارا علم مکمل ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ ذہنیت کافرانہ ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان علم اور حقیقت کی برکات سے محروم رہ جاتا ہے فَقَلِیْلًا مَّا یُؤْمِنُوْنَ (۲/۸۸) "ان میں سے خال خال لوگ ایسے نکلیں گے جن میں حق و صداقت کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتے"۔

(۰)

جب ان کی ذہنیت یہ ہے تو پھر ان سے کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ قرآن کریم میں پیش کردہ صداقتوں پر غور و فکر کر کے انہیں قبول کریں۔ چنانچہ اگلی آیت میں ہے۔

۲/۸۹ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ؗ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ ۔

یہ لوگ اس کتاب کی صداقت سے انکار کر رہے ہیں اور سرکشی برت رہے ہیں جو ان کے انبیاء کی حقیقی تعلیم کی مخالفت نہیں کرتی بلکہ اس کی تائید کرتی ہے۔ اور اُن دعاوی کو سچ کر کے دکھانے والی ہے جو ان سے کئے گئے تھے۔ یہ ایک سچے نبی کی آمد کا انتظار کر رہے تھے اور خدا سے دعائیں مانگا کرتے تھے کہ وہ آئے تو یہ اپنے مخالفین پر غلبہ پا سکیں۔ یہ اُس تعلیم کی صداقت کو اچھی طرح پہچانتے ہیں جسے یہ رسولؐ لے کر آیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ اس سے سرکشی برت رہے ہیں اس سے نہ تو اس رسول کا کچھ بگڑے گا، نہ خدا کی کتاب کا کچھ نقصان ہوگا۔ ان کا اپنا ہی نقصان ہوگا کیونکہ یہ زندگی

کی اُن خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے محروم رہ جائیں گے جو اس کتاب کی اطاعت سے حاصل ہو سکتی ہیں۔

اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ قرآنِ کریم مصدق (یعنی سچ کرکے دکھانے والا) ہے اُن دعاوی کا جو ان کی کتابوں میں موجود ہیں۔ قرآنِ کریم کے مصدق ہونے کا مفہوم آیت (۲/۴۱) میں بیان کیا جا چکا ہے، اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہ جو کہا گیا ہے کہ یہ آنے والے کے انتظار میں تھے اور خدا سے دعائیں مانگا کرتے تھے کہ اسے جلدی بھیج تاکہ ہم اپنے مخالفین پر غلبہ حاصل کریں تو یہ نکتہ وضاحت طلب ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرات انبیاء کرام دنیا سے تشریف لے جاتے وقت اپنی امت سے کہہ جاتے تھے کہ اگر اس کتاب میں تحریف ہو گئی یا اس نظام میں بگاڑ پیدا ہو گیا تو پھر ایک اور نبی آئے گا جو تعلیم خداوندی کو انسانی آمیزشوں سے پاک اور صاف کر دیگا اور نظامِ خداوندی کی گاڑی

تورات میں آنے والے نبی کی پیش گوئی

کو پھر سے صحیح پٹڑی پر ڈال دے گا۔ قرآنِ کریم کے بعض مقامات سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ متعدد بار بتایا جا چکا ہے، انبیائے سابقہ کی طرف نازل شدہ کتابوں میں سے کوئی بھی اپنی اصلی اور غیر محرف شکل میں دنیا میں موجود نہیں۔ بائبل، زندہ مذہب کی کتاب ہے لیکن اسکی جو کیفیت ہے وہ اس کی اس تاریخ سے سامنے آ چکی ہے جسے گذشتہ اوراق میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اُس میں بھی بعض آثار ایسے پائے جاتے ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کے انبیاء ایک آنے والے کی بشارت دے کر جایا کرتے تھے۔ مثلاً عہد نامہ عتیق کی کتاب استثناء کے باب اٹھارہ آیت اٹھارہ میں ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ:-

> میں ان کے لئے، ان کے بھائیوں میں سے، تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈال دونگا۔ اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب اُن سے کہے گا اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو، جنہیں وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔

ان کی کتابوں کی اسی قسم کی بشارات تھیں جن کی رو سے یہودی ایک آنے والے نجات دہندہ کے

انجیل میں بھی

انتظار میں تھے (اور اب تک انتظار میں ہیں) انجیل میں اس آنے والے کی بشارت، اس سے بھی واضح تر الفاظ میں موجود ہے۔ چنانچہ یوحنا کی انجیل میں ہے کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام نے اپنے متبعین سے جو آخری باتیں کیں، ان میں یہ بھی کہا کہ :-

لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی کا روپ جو باپ کی طرف سے نکلتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا اور تم بھی گواہ ہو کیونکہ شروع سے میرے ساتھ ہو۔ (باب ۔ ۱۵ ۔ آیات ۔ ۲۷ ۔ ۲۶)

اس سے اگلے باب نمبر ۱۶ میں ہے کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام نے ان سے کہا۔

میں نے یہ باتیں تم سے کیں، تمہارا دل غم سے بھر گیا۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار (یا وکیل یا شفیع) تمہارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دونگا۔ اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔ گناہ کے بارے میں اس لئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے۔ راست بازی کے بارے میں اس لئے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھو گے۔ عدالت کے بارے میں اس لئے کہ دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا ہے۔ مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں، مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ، یعنی سچائی کا روپ آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا۔ لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا۔ اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ وہ میرا جلال ظاہر کر دے گا۔ (آیات ۱۴ - ۶)

آپ بائبل کے اسلوب بیان یا زبان کا خیال نہ کیجئے۔ اول تو نہ معلوم ان میں کتنی تحریف ہو چکی ہے، اور

حضورؐ کے متعلق پیش گوئی

دوسرے یہ کہ اصلی زبان ترجمہ در ترجمہ ہو کر یہ کتاب کچھ سے کچھ بن چکی ہے۔ دیکھئے صرف یہ کہ ان تحریف شدہ کتابوں میں بھی ایسے آثار ملتے ہیں جن میں ایک آنے والے کے متعلق بشارات موجود ہیں۔ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی طرف سے دی گئی بشارت کا ذکر تو خود قرآن کریم میں ان الفاظ میں موجود ہے کہ :-

وَ اِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۔ (۶۱/۶)

(حضرت) عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ میں تمہاری طرف خدا کا فرستادہ ہوں اور جو کچھ تمہارے پاس تورات (کتبِ سابقہ) میں آیا تھا اُسے سچ کر کے دکھانے کے لئے آیا ہوں اور میں تمہیں اللہ کے ایک رسول کی خوشخبری دیتا ہوں جو میرے بعد آئیگا۔ اس کا نام احمد ہوگا۔

لیکن اب جب وہ آنے والا ان کے پاس واضح دلائل کے ساتھ آگیا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کی وحی لے کر نہیں آیا، جو کچھ یہ پیش کر رہا ہے، اس کا خود تراشیدہ "کھلا ہوا جھوٹ ہے۔

ہم اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ انجیل میں اس آنیوالے کے متعلق کیا الفاظ استعمال ہوئے تھے اور قرآنی آیت میں حضورؐ کا اسم مبارک احمد کیوں آیا ہے۔ واضح رہے کہ حضورؐ اپنے دونوں اسمائے گرامی محمدؐ اور احمدؐ سے متعارف اور موصوف ہیں۔ یہاں ہم اتنا کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں کہ جس آنے والے کی بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی وہ زمانہ نزولِ قرآن میں آچکا تھا۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے کہا ہے۔ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ (۶۱/۶) "جب وہ آنیوالا آگیا تو یہ کہنے لگے کہ وہ جھوٹا ہے۔" قرآن کے الفاظ فَلَمَّا جَآءَهُمْ واضح طور پر بتلاتے ہیں کہ زمانۂ نزولِ قرآن میں، وہ آنے والا ان کی طرف آچکا تھا۔

ہر مذہب میں آنے والے کا عقیدہ

آنے والے کی یہ شہادات تو بائبل سے ملتی ہیں۔ ویسے تمام دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کے متبعین کے ہاں ایک آنیوالے کا عقیدہ موجود ہے۔ مثلاً ہندو کلنکی اوتار کے انتظار میں ہیں۔ بدھ مت کے پیرو متیا کے انتظار میں، جینی ایک تری تھنکر کے منتظر ہیں، مجوسی مِتھرا کے انتظار میں، جو ان کے عقیدے کی رو سے زندہ آسمان پر چلے گئے تھے اور وہ دوبارہ، اپنی اصلی صورت میں آئینگے اور یا اس کے مثل اور بروز کی شکل میں۔ یہودی اور عیسائی کس طرح ایک آنے والے مسیحا کی انتظار میں ہیں، اس کا ذکر ابھی ابھی کیا جا چکا ہے۔ اہلِ مذاہب کے ان عقاید سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کے انبیاءؑ نے ایک بعد میں آنے والے کی بشارت دی ہوگی۔ قرآن کریم کی رو سے یہ بعد میں آنے والا، حضور نبیؐ آخر الزماں

(فٹ نوٹ صفحہ آئندہ پر)

صلے اللہ علیہ وسلم کی شکل میں آگیا اور دنیا کو وہ کتاب خداوندی دے گیا جو خدا کی طرف سے آنیوالی آخری کتاب ہے۔ وہ غیر متبدل بھی ہے اور محفوظ بھی۔ اس سے آنے والوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اسی کو ختمِ نبوت کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حضورؐ کے بعد کوئی "مامور من اللہ" نہیں آئیگا۔ "مامور من اللہ" صرف حضرات انبیائے کرام ہوتے تھے اور جب انبیائے کرام کی آمد کا سلسلہ ختم ہو گیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مامورین من اللہ کی آمد کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ حضورؐ کے بعد "مامورین من اللہ" کی آمد کا عقیدہ، ختمِ نبوت کی مُہر کو توڑ دیتا ہے۔

وہ آنیوالا آچکا ہے

لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو دین کی اساسات ہی بدل جاتی ہیں۔ ختمِ نبوت، یعنی مامورین من اللہ کی آمد کے سلسلے کے ختم ہو جانے کا عقیدہ اسلام کی اصل و اساس ہے۔ اگر یہ عقیدہ نہ رہے تو قرآن کریم کے مکمل، غیر متبدل، محفوظ اور آخری کتاب ہونے کا عقیدہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اور جب قرآنِ کریم کے متعلق یہ عقیدہ ختم ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اسلام کی اساس ہی باقی نہیں رہتی لیکن جب اسلام، دین کی جگہ مذہب بن گیا تو دیگر اہلِ مذاہب کی طرح ہمارے ہاں بھی آنے والے کا عقیدہ رائج ہو گیا۔ بلکہ اس باب میں ہم، باقی اہل مذاہب سے بھی آگے نکل گئے۔ وہ تو ایک ہی آنے والے کے انتظار میں ہیں اور ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہم ہر صدی پر ایک مامور من اللہ (مجدد) کے آنے کا عقیدہ رکھتے ہیں اور قیامت کے قریب امام مہدی کی آمد اور حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے آسمان سے نازل ہونے کا عقیدہ بھی۔ اور اس کے باوجود ہم ختمِ نبوت پر بھی ایمان رکھنے کے مدعی ہیں اور قرآنِ کریم کے مکمل، غیر متبدل اور محفوظ کتاب ہونے کے عقیدے کے حامل بھی۔ مامورین من اللہ کی آمد کے عقیدہ کے ماننے والے کہہ دیتے ہیں کہ یہ حضرات کوئی نئی کتاب لے کر نہیں آئیں گے — یہ قرآن کریم کو سمجھانے کے لئے ہی آئینگے۔ آپ غور کیجئے کہ جس

لیکن ہم بھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں

لہ (فٹ نوٹ صفحہ گذشتہ) مختلف اہلِ مذاہب اپنے مذہب کے اولین راہنما کو مختلف القاب سے پکارتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں آیا ہے کہ خدا نے ہر قوم کی طرف انبیاء بھیجے۔ اس اعتبار سے یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ان مذاہب کے اولین راہنما انبیائے کرامؑ ہی تھے۔ یہ وجہ ہے کہ ہم نے ان کے لئے انبیاء کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ لوگ انہیں بانیٔ مذہب کہہ کر پکارتے تھے۔ لیکن انبیائے کرامؑ دین کے بانی نہیں ہوتے تھے وہ تو دینِ خداوندی کو انسانوں تک پہنچانے والے ہوتے تھے۔ باقی رہے "بانیانِ مذاہب" تو حضرات انبیائے کرامؑ مذہب لاتے ہی نہیں تھے۔ وہ دینِ خداوندی لاتے تھے۔ اسلئے انہیں بانیانِ مذاہب نہیں کہنا چاہیئے۔

کتاب کی کیفیت یہ ہو کہ اس کے سمجھنے کے لئے بھی کسی "آسمان سے آنے والے" کی ضرورت پڑے، اس کا یہ دعوٰے کہ وہ نہایت واضح اور مبین و منیر کتاب ہے، کیا معنے رکھے گا؟ آنے والے کے عقیدے کے متعلق میں نے اپنی کتاب "شاہکارِ رسالتؐ" اور اس کے بعد دوسری کتاب "ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت" میں بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ لیکن چلتے چلتے ایک منظر کا سامنے لانا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ مذاہبِ عالم میں سے ہر ایک کا عقیدہ یہ ہے کہ جس آنے والے کا انہیں انتظار ہے وہ قیامت کے قریب آئے گا اور جب تک وہ ان کے مذہب کو باقی مذاہب پر غالب نہیں کر دیگا، قیامت نہیں آئے گی۔ آپ ذرا سامنے لائیے اس منظر کو کہ ہندو دھرم، بدھ مت، جین مت، مجوسیت، یہودیت، عیسائیت اور (اجازت دیجئے کہ ان کے ساتھ خود ہم مسلمانوں کے عقیدے کی رو سے وہ بھی جن کے ہم منتظر ہیں) یہ سب قربِ قیامت کے وقت دنیا میں آجائیں، اور ان میں سے ہر ایک اپنے مذہب کو دوسرے مذاہب پر غالب کرنے کے جہاد میں مصروف ہو تو اس وقت اس کرۂ ارض کا نقشہ کیا ہوگا؟ یہاں تو قیامت سے پہلے ہی قیامت آجائے گی!

بہرحال، اللہ تعالیٰ نے تمام نوعِ انسان کے لئے اپنا آخری ضابطۂ دین نازل کر کے اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے کر آنیوالوں کے عقیدے کو ختم کر دیا۔ اسی لئے رسالتِ محمدیہ ابد درکنار ہے اور اس کے سحابِ کرم کا دامن قیامت تک تمام نوعِ انسان کو محیط۔ جی چاہتا ہے کہ میں اس مقام پر ان الفاظ کو مقطع کے طور پر درج کر دوں جن پر میں نے اپنی مایۂ ناز تصنیف ۔ معراجِ انسانیت ۔ کے باب بعنوان "صبحِ بہار" کو ختم کیا تھا۔ یعنی

> خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا، آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے نہ کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت رہی، نہ کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔
> اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ در پکار اٹھتا ہے کہ:-

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر   بحق دل بند و راہِ مصطفٰیؐ رو

(۰)

بہرحال، آیت (۲/۸۹) میں کہا گیا ہے کہ یہودیوں نے رسالتِ محمدیہ کے انکار سے اپنی باز آفرینی کے موقعہ کو ہاتھ سے کھو دیا اور یہ ان کی انتہائی حرماں نصیبی تھی اور بڑا ہی گھاٹے کا سودا، یعنی

۲/۹۰ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۚ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۔

انہوں نے دنیاوی مفاد کے چند دراہم کاسدہ کے عوض اپنی ذات کی متاعِ بے بہا کو فروخت کر دیا۔ یعنی انہوں نے خدا کی کتاب سے سرکشی برتی۔ اور اس سرکشی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یہ کتاب ـ (معاذ اللہ) ـ حق و صداقت پر مبنی نہیں۔ بالکل نہیں، انہوں نے غور و فکر کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ انہوں نے محض اِس ضد اور تعصب کی وجہ سے اس سے انکار کر دیا کہ نبوت بنی اسرائیل کے بجائے بنی اسماعیل کے گھرانے میں کیوں آ گئی۔ یعنی وہی قدیمی حسد اور تعصب جو انہیں بنی اسماعیل کے ساتھ تھا، ان کے قبولیتِ حق و صداقت کے راستے میں دیوار بن کر حائل ہو گیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ اپنے سابقہ جرائم کی وجہ سے جس عذاب میں مبتلا تھے، اس انکار و سرکشی سے اس میں اور اضافہ ہو گیا۔ ان خانماں خرابوں کو مدینہ اور اس کے مضافات میں سر چھپانے کے لئے ٹھکانہ میسر آ گیا تھا لیکن انہوں نے وہاں مسلمانوں کے خلاف ایسی سازشیں کیں کہ وہاں سے بھی انتہائی ذلت کی حالت میں نکلنا پڑا۔ قرآنِ کریم نے اِسے عَذَابٌ مُّهِيْنٌ کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی نہایت رسوا کن عذاب۔

—— (۰) ——

اسی تسلسل میں قرآنِ کریم نے کہا ہے:۔

۲/۹۱ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۚ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس ضابطۂ خداوندی کی صداقتوں پر ایمان لاؤ تو یہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ نہیں، ہم تو اسی پر ایمان رکھیں گے جو ہماری طرف نازل کیا گیا تھا۔ اور اِس کے سوا ہر بات

سے انکار کرینگے۔ حالانکہ جس کتاب کی طرف انہیں دعوت دی جارہی ہے وہ ان کی طرف نازل شدہ سچی تعلیم کے خلاف نہیں۔ بلکہ وہ ان دعاوی کو سچ کر دکھانے والی ہے جو خود ان کے ہاں موجود ہیں اور جن کے لئے یہ ایک آنے والے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان سے کہو کہ اگر تمہارا اعتراض یہی ہے کہ تم اس قرآن کو اس لئے نہیں مانتے کہ یہ ایک غیر اسرائیلی نبی کی طرف نازل ہوا ہے تو یہ بتاؤ اس سے پہلے جو اسرائیلی انبیاء کرام تمہاری طرف آتے تھے، تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے تھے؟ تم ان کی تحقیر و تذلیل میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔ تمہاری مخالفت اس حد تک بڑھ جاتی تھی کہ تم انہیں قتل بھی کر دیا کرتے تھے (۲/۶۱ ; ۲/۸۷)۔

قتلِ انبیاء کا جرم

لہٰذا، تمہارا یہ دعویٰ کہ تم اسرائیلی انبیاء پر ایمان لایا کرتے تھے خود تمہاری اپنی تاریخ کی رُو سے جھوٹا ثابت ہو رہا ہے۔ دور کیوں جایئے۔ حضرت عیسےٰ علیہ السلام تو بنی اسرائیل میں سے تھے۔ کیا تم اُنکے دعوائے نبوت پر ایمان لائے تھے؟ اُن پر ایمان لانا تو ایک طرف، تم تو بڑے فخر سے کہتے پھر رہے ہو کہ ہم نے انہیں صلیب پر لٹکا دیا۔ انہیں (معاذ اللہ) ایک لعنتی کی موت مار دیا!

(٥)

اور آگے بڑھو!

۲/۹۲ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ۔

حضرت موسےٰ علیہ السلام کو تم اپنے مذہب کا موسس اور اپنا مورثِ اعلیٰ مانتے ہو، سوچو کہ تم نے خود ان کے ساتھ کیا کیا۔ انہوں نے واضح تعلیم خداوندی پیش کی اور تم نے اس کا جواب اس طرح سے دیا کہ وہ تم سے چند دن کے لئے الگ ہوئے تو تم نے ایک بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔ یہ کچھ کم ظلم نہیں تھا، جو تم نے اُن کی زندگی میں، اُن کے ساتھ، اور خود اپنے ساتھ کیا۔

(٥)

اس سے اگلی آیت میں ہے:-

۲/۹۳ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاُشْرِبُوْا

فِی قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِکُفْرِهِمْ قُلْ بِئْسَمَا یَأْمُرُکُمْ بِهِ إِیمَانُکُمْ إِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِینَ۔

طور کے دامن میں تم سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ تم کتابِ خداوندی کو مضبوطی سے تھامے رکھو گے، اسکی تعلیم کو بگوشِ ہوش سنو گے اور پھر اس کی اطاعت کرو گے۔ تم نے اس کا اقرار کیا تھا کہ تم نے اسے اچھی طرح سن اور سمجھ لیا ہے۔ لیکن اس کے بعد تم نے کیا کیا؟ بجائے اس کے کہ تم اس کی اطاعت کرتے تم نے اعلانیہ اور کھلے بند دل اُس کی خلاف ورزی کی۔ یہ اس لئے کہ تم نے اِس کتاب کے الفاظ کو تو سنا، لیکن اُسے اپنے دل میں جگہ نہ دی کیونکہ تمہارے مَن میں چور تھا۔ تمہارے دل میں گوسالہ کی محبت اور عقیدت حلول کئے ہوئے تھی۔ اے رسولؐ! ان سے کہو کہ یہ ہے تمہارا سابقہ ریکارڈ اور یہ ہے تمہارے ایمان کی حقیقت۔ للہٰذا تمہارا یہ کہنا کہ ہم اس لئے قرآن پر ایمان نہیں لاتے کہ ہم پہلے ہی وحیٔ منزل من اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، جو ہماری طرف نازل ہوئی تھی، خود فریبی اور فریب دہی سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر تمہارا ایمان، تمہیں یہی کچھ سکھاتا اور اسی قسم کی منافقت کی زندگی بسر کرنے کا حکم دیتا ہے تو تُف ہے ایسے ایمان پر!

بنی اسرائیل سے متعلق بات کی تو وضاحت ہو گئی لیکن اس میں جو سبق ہمارے لئے پوشیدہ ہے وہ

قرآن کو سُننا اور عمل اُس کے خلاف کرنا

ہمیں دعوتِ غور و فکر دیتا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ دین کا عملی مفہوم ہے سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا۔ احکاماتِ خداوندی کو اچھی طرح سے سنو، سمجھو اور ان کے مطابق عمل کرو۔ یعنی ان کا سُننا اور سمجھنا اسلئے ضروری ہے کہ اس کے بعد ان پر عمل کیا جا سکے۔ لیکن اگر کیفیت یہ ہو کہ آپ احکامِ خداوندی کے الفاظ سنتے رہیں۔ اور اُس کے بعد عمل اُس کے خلاف کرتے رہیں تو اس کا جو نتیجہ ہو گا وہ ظاہر ہے۔ ذرا سوچئے کہ کیا ہماری یہی حالت نہیں ہو چکی! جس قدر ہم خدا کی کتاب کو پڑھتے یا سنتے ہیں، اس کی مثال دنیا میں کہیں اور نہیں ملے گی۔ اور اس کے بعد اپنی عملی زندگی میں، ہم جس طرح اس کے خلاف چلتے ہیں اس کی مثال بھی دنیا میں کہیں اور نہیں ملے گی۔ خدا نے کہا تھا کہ کہو سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا — ہم نے سنا اور ہم اس کے مطابق عمل کریں گے۔ ہم اس کے برعکس، زبانِ حال سے یہ کہتے ہیں کہ سَمِعْنَا وَ عَصَیْنَا (۲/۹۳) — ہم نے سنا، بہت اچھی طرح سے سنا۔ لیکن ہم عمل اس کے خلاف کریں گے۔ قرآنِ کریم کو روزانہ پڑھنے اور سننے کے علاوہ، ہم رمضان المبارک کے ایک مہینے میں جس التزام سے اسے سُنتے ہیں — اور پورے

مہینے بیں ہی نہیں اُس کے بعد ایک ایک رات میں جس طرح اُسے ختم کرتے ہیں (اِسے شبینہ کہا جاتا ہے)۔ یہ "سننے" کی انتہا ہے۔ ہمارے ہر اجتماع کا آغاز قرآنی آیات کے سننے سے ہوتا ہے۔ دور دور سے قاری آتے ہیں۔ اور قرآن سنانے کی محفلیں گرماتے ہیں۔ اب تو ان کی قرأتیں گراموفون کے ریکارڈز تک میں بھر دی جاتی ہیں۔ کہ جب جی چاہے قرآن کے الفاظ کو سُن لیا جائے۔ حریم کعبہ کے متعلق بڑے وجد آفریں انداز میں کہا جاتا ہے کہ وہاں سال بھر، دن اور رات کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جس میں قرآن مجید کے الفاظ فضا میں گونجتے سنائی نہ دیتے ہوں۔ یہ سب سَمِعۡنَا (سننے) کے مظاہر ہیں۔ لیکن اس کے بعد یہ سوچئے کہ کیا آج دنیا کا کوئی گوشہ بھی ایسا ہے جہاں سے اَطَعۡنَا (ہم اس کی اطاعت کرتے ہیں) کی آواز بلند ہوتی ہو؟ اسکے برعکس عَصَيۡنَا (ہم اس کے خلاف کرتے ہیں) کے مظاہر ہر مقام پر نظر آئینگے۔ میکانکی طور پر کتاب اللہ کے الفاظ کو پڑھتے اور سنتے رہنا، لیکن "گوسالوں" کی عقیدت کو دل کی گہرائیوں میں پیوست رکھنا، یہ ہے ہمارا مسلک اور مشرب۔

اس مسلک کو پختہ تر کرنے کے لئے اس قسم کے عقاید وضع کر لئے گئے کہ قرآن مجید کے ایک ایک حرف کے پڑھنے سے دس دس نیکیاں مل جاتی ہیں۔ مثلاً الٓـمّٓ کہنے سے تیس نیکیوں کا ثواب مل جاتا ہے۔ مذہب کی تمام تگ و تاز کا منتہیٰ نیکیاں کمانا ہوتا ہے۔ اگر نیکیاں اس قدر آسان طریق سے مل جائیں تو کچھ اور کرنے کی ضرورت کیا رہ جاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے "ناظرہ" قرآن شریف پڑھانے (اور پڑھنے) کے اہتمامات کئے جاتے ہیں۔ اسے خود پڑھا جاتا ہے اور اس طرح پڑھنے کا "ثواب" مُردوں کو بخشا جاتا ہے۔ اسے قریب المرگ مریض کو سنایا جاتا ہے کہ اس کی جان آسانی سے نکل جائے۔

یہ ہیں (سَمِعۡنَا) کی متعدد شکلوں کی چند ایک مثالیں جو امت میں صدیوں سے رائج چلی آرہی ہیں۔ اس (سَمِعۡنَا) کی جس پر عمل پیرا ہونے سے انقلاب عظیم برپا ہو جاتا!

اِس (اپنی) جگر خراش داستان کے بعد پھر بنی اسرائیل کی طرف آجاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم خدا کی چہیتی اولاد ہیں (۵/۱۸) اور جنت پر ہماری واحد اجارہ داری ہے (۲/۱۱۱) قرآن کریم نے ان سے کہا کہ:-

۲/۹۴ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔

تم اس دنیا میں انتہائی ذلّت و خواری کی زندگی بسر کر رہے ہو۔ خدا کی اس وسیع و عریض زمین پر تمہیں کہیں ٹھکانہ تک میسر نہیں آسکتا۔ ایں سو راندہ و آں سو درماندہ، مارے مارے پھر رہے ہو۔ اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ جنت تمہارا انتظار کر رہی ہے تو پھر تم سوچ کیا رہے ہو؟ موت کی تمنا کرو اور اپنی جان دیدو اور سیدھے اس جنت میں چلے جاؤ جس میں ہر قسم کا راحت و آسائش کا سامان موجود ہے۔ جس شخص (یا قوم) کو آنکھ بند کرتے ہی اس قسم کی زندگی میسر آسکتی ہو وہ اِس ذلت و خواری میں دن کیوں بسر کرے؟ موت کی تمنا تمہارے اس دعویٰ کی صداقت کی دلیل ہونی چاہیئے۔

لیکن قرآن کریم نے خود ہی کہدیا کہ:-

۲/۹۵ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ۔

یہ کبھی مرنے کی تمنا نہیں کریں گے۔ ان کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ جب کبھی جان دینے کا موقعہ آیا تو یہ وہاں سے نہایت بزدلی سے بھاگ اٹھے (۲/۲۴۳)۔ یہ اس لئے کہ ان کا یہ دعویٰ بھی محض دکھاوے کا ہے کہ جنت ان کا انتظار کر رہی ہے۔ یہ جس قسم کی معصیت اور بدعملی کی زندگی بسر کرتے ہیں اِس کا انہیں اچھی طرح احساس ہے اور اس وجہ سے یہ کبھی موت کی تمنا نہیں کرسکتے۔ یہ جانتے ہیں کہ خدا ہمارے ان جرائم سے اچھی طرح واقف ہے اس لئے ہمیں ان کی سزا مل کر رہے گی۔

موت محاسبۂ خویش کا ذریعہ ہے

موت، انسان کے لئے بہت بڑا محاسبۂ خویش (TEST) کا مقام ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے کہا ہے کہ: خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۶۷/۲)۔ "موت اور حیات کا تو سلسلہ ہی اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس (TEST) سے تم اپنا محاسبہ کرسکو کہ تمہاری ذات میں کس قدر استحکام پیدا ہو چکا ہے"۔ جس کی ذات میں استحکام

پیدا ہو چکا ہو وہ تو موت کو عروس کی طرح گلے لگا لیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ موت، میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی — یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

موت سے مرنا تو ایک طرف، یہ تو اس کے سامنے، ایک جہانِ تازہ کا دروازہ کھول دیتی ہے اور اس دروازے کے کھلنے سے آئندہ زندگی کے وہ حسین مناظر اس کے سامنے نمودار ہو جاتے ہیں جن کی طرف یہ لپک کر جاتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم — چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

مومن کی علامت یہ ہے کہ وہ موت کا نہایت خندہ پیشانی سے استقبال کرتا ہے۔ لہٰذا قرآن کہتا ہے کہ یہ یہودی جو اپنی کرتوتوں سے اچھی طرح واقف ہیں، بھلا موت کی تمنا کیا کریں گے؟

۲/۹۶ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۔ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۔ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۔ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۔ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۔

موت کی تمنا کرنا تو ایک طرف، یہ تو زندہ رہنے کے لئے مشرکین سے بھی زیادہ حریص نظر آئیں گے۔ لیکن ان سے پوچھو کہ کیا اس دنیا میں زیادہ عرصہ تک رہنے سے تم اپنے اعمال کی سزا سے بچ جاؤ گے؟ تم یہاں زیادہ سے زیادہ کتنے عرصہ تک زندہ رہ سکتے ہو؟ کہہ لیجئے، سو برس، ڈیڑھ سو برس۔ سو یا ڈیڑھ سو برس تو ایک طرف، تم اگر ہزار برس تک بھی اس دنیا میں رہو تو موت سے پھر بھی رستگاری نہیں ہو سکے گی۔ موت ایک دن آئے گی اور آ کر رہے گی۔ بارگاہِ خداوندی کے مفرور (اشتہاری) مجرم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ انہیں اس عدالت میں حاضر ہونا ہوگا۔ جہاں سے انہیں ان کے کئے کی سزا مل کر رہے گی۔ وہ اس سے چھوٹ نہیں سکتے۔ لہٰذا اس سزا سے بچنے کا طریقہ یہ نہیں کہ تم بھاگتے پھرو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کر لو۔

لیکن، جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، محض نسلی تعصب کی بنا پر اس رسولؐ کے خلاف، تمہارا جذبۂ بغض و حسد تمہیں اس طرف آنے نہیں دے گا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ تم یہاں بھی ذلت و خواری کی زندگی بسر کرو گے اور مرنے کے بعد بھی الم انگیز عذاب میں مبتلا ہو گے۔ تم کہتے یہ ہو کہ نبوت، بنی اسرائیل کے گھرانے میں ہی رہنی چاہیئے تھی یہ بنی اسمٰعیل کے گھرانے کی طرف کیوں آ گئی؟

۲/۹۷-۹۸ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۔ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ

وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ۔

جبریل نہ تو اپنی طرف سے وحی کو وضع کرتا ہے اور نہ ہی اُسے اس کا اختیار حاصل ہے (یا یوں کہیے کہ اسے اس کی کیا مجال ہے) کہ وہ خدا کی وحی جسے چاہے ۔دے آئے ۔ جبریل اور دیگر ملائکہ کا تو فریضہ زندگی یہ ہے کہ وہ احکام خداوندی کی تعمیل کرتے ہیں، اور پوری پوری وفاشعاری کے ساتھ تعمیل کرتے ہیں ۔ اس لئے تمہارا یہ کہنا کہ وحی تو درحقیقت بنی اسرائیل کے کسی فرد تک پہنچانی مقصود تھی لیکن جبریل نے اسے بنی اسمٰعیل کے ایک فرد کو دیدیا ۔ جبریل کے تم پہلے ہی دشمن چلے آ رہے تھے ۔ اب اس کے خلاف ایک اور جرم عائد کرنے کا نہیں موقعہ ہاتھ آ گیا ۔ لیکن تم نے کبھی سوچا بھی کہ تمہارے اس اعتراض کی نشتر کہاں تک پہنچتی ہے ، یہ تو خود خدا کے خلاف اعتراض ہے کہ اس نے اس قسم کے کارندے رکھ چھوڑے ہیں ؟ خدا کے خلاف اعتراض ، اور تمام نظامِ وحی پر اور ان وسائط (ملائکہ) پر، جو اس کے حکم سے تدبیرِ امور کرتے ہیں —— یعنی جبریلؑ میکائیل سمیت تمام ملائکہ پر اعتراض —— اس قسم کا اعتراض درحقیقت خدا اور اس کے نظام سے کھلا ہوا انکار ہے۔ سوچو ، کہ جو لوگ اس قسم کی روش اختیار کئے ہوئے ہوں ، انہیں خدا کی تائید و حمایت کیسے حاصل ہو سکتی ہے ؟

نزولِ وحی وحی کے متعلق اجمالی سی گفتگو ، مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں آیات (۲/۴ صفحہ ۲۳ ؛ ۱/۵ صفحہ ۴۲) میں کی جا چکی ہے ۔ تفصیلی گفتگو اپنے مقام پر آئے گی ۔ یہاں ہم اتنا دھرا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ :

(۱) خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل ہونے کو وحی کہا جاتا ہے ۔ اس قسم کا علم صرف انبیائے کرام کو ملتا تھا ۔ غیر از نبی کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم نہ مل سکتا تھا، نہ مل سکتا ہے ۔ قرآن کریم میں کشف اور الہام وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں ۔

(۲) جہاں تک وحی کے سرچشمہ کا تعلق ہے ، وہ تو فوق الفطرت (SUPRA-NATURAL) تھا لیکن جو کچھ وحی کی رو سے دیا جاتا تھا ، یعنی وحی کا متن (TEXT) ، وہ فوق العقل (SUPRA-RATIONAL) نہیں ہوتا تھا ، یعنی اُسے علم و بصیرت اور عقل و فکر کی رو سے سمجھا جا سکتا تھا ۔

(۳) خدا کی یہ وحی ، اپنی آخری شکل میں ، قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم نہیں مل سکتا ۔ اسی کو ختم نبوت کہتے ہیں ۔

نبی کو وحی کس طرح ملتی تھی ، اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے ۔ خدا نے صرف اتنا ہی بتایا ہے کہ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ (۲/۹۷) ۔ "اسے جبریل ، خدا کے حکم کے مطابق ، قلبِ نبویؐ پر نازل کرتا تھا" ۔ دوسری جگہ جبریل کو روح الامین کہکر پکارا گیا ہے ۔ جہاں کہا ہے کہ : وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ

الْمُنْذِرِيْنَ (۲۶/۱۹۲-۱۹۴)۔ "یہ قرآن خدائے رب العٰلمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ روح الامین نے اسے تیرے قلب پر نازل کیا ہے"۔ سورۃ النحل میں اسے روح القدس کہا گیا ہے (۱۶/۱۰۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں بھی اسے روح القدس ہی کہا گیا ہے (۲/۸۷ ؛ ۲/۲۵۳ ؛ ۵/۱۱۰) ـــــ روح کا مفہوم بھی اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا۔ قرآن کریم میں صرف ایک اور مقام پر جبریل کا لفظ آیا ہے۔ جہاں کہا گیا ہے کہ رسول کو، اللہ، جبریل، مؤمنین اور ملائکہ کی تائید اور حمایت حاصل ہے (۶۶/۴)۔ ملائکہ کے متعلق اسی جلد کے پہلے باب میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے نیز ان کی تسبیح و تقدیس کا مفہوم بھی سامنے آچکا ہے۔ اُسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ میکائیل کا لفظ صرف (۲/۹۸) میں آیا ہے۔ یہودی میکائیل کو اپنا دوست سمجھتے تھے اور جبریل کو دشمن۔

آیت (۲/۹۸) کے آخر میں کہا گیا ہے کہ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ (۲/۹۸) ـــــ عام ترجمہ اس کا یہی ہوگا کہ "خدا کفار کا دشمن ہے"۔ ـــــ لیکن دشمن کا لفظ جس مفہوم میں ہمارے ہاں استعمال ہوتا ہے اس کی رو سے خدا کو کسی کا "دشمن" کہنے سے اس کے متعلق بڑا غلط تصور ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ لفظ "عَدُوٌّ" (یا عداوت) کا مفہوم آیت (۲/۳۶) میں بیان ہوچکا ہے۔ اس کے بنیادی معنی، دو چیزوں میں بُعد یا مغایرت پیدا ہو جانے کے ہیں۔ جو شخص بھی قوانینِ خداوندی کو چھوڑ کر دوسرے قوانین کی اطاعت کرتا ہے، ظاہر ہے کہ وہ خدا سے ہٹ جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر،

خدا کے دشمن ہونے کا مفہوم

وہ زندگی کی ان سعادات و برکات سے محروم رہ جاتا ہے جو اُسے قوانینِ خداوندی سے حاصل ہونی تھیں۔ خدا کی عداوت سے یہی مفہوم ہے۔ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو مؤمنین کا ولی، اور مومنین کو خدا کا ولی کہہ کر پکارا ہے (۳/۶۸)۔ ولی، ولایت، اولیاء اللہ وغیرہ قرآنی اصطلاحات کا مفہوم۔ آگے چل کر اپنے مقام پر سامنے آئے گا۔ یہاں اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے جو تقویت حاصل ہوتی ہے اُسے اس قسم کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ "خدا مؤمنین کا ولی" ہے۔ ورنہ خدا کے لئے نہ عدوٌّ کا لفظ ہمارے عام مفہوم کی رو سے آیا ہے، نہ ولی (دوست) کا لفظ ہمارے مروجہ مفہوم کے مطابق۔

یہودیوں کے متعلق کہا یہ جارہا تھا کہ وہ اس وحیِ خداوندی کی مخالفت کرتے ہیں۔ جو رسول اللہ کی طرف بھیجی جارہی ہے۔ اس سے وہ کسی دوسرے کا نقصان نہیں کرتے، خود اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔ وہ اتباعِ وحی سے حاصل ہونے والی خوشگواریوں سے محروم رہ جائیں گے۔ اسی کو کہیں لعنت سے تعبیر کیا گیا ہے، کہیں عداوت سے۔

بات یوں شروع ہوئی تھی کہ یہودی جبریل کے اس لئے دشمن ہو گئے کہ اس نے اس وحی کو ایک غیر اسرائیلی تک کیوں پہنچا دیا۔ اس کے لئے کہا:-

۲/۹۹ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ۔ وَمَا یَکْفُرُ بِھَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ۔

"اے رسولؐ! ہم نے اس وحی کو بذاتِ خود تمہاری طرف نازل کیا ہے۔" یہاں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ وحی بھیجنے کا طریق کوئی بھی کیوں نہ اختیار کیا گیا ہو، وحی خدا کی طرف سے نازل ہوتی تھی۔ اس میں نہ تو اس قوت کا کوئی عمل دخل ہوتا تھا، جس کے ذریعے یہ وحی پہنچائی جاتی تھی، اور نہ ہی اس رسول کا کوئی دخل جس کی طرف یہ وحی بھیجی جاتی تھی۔ وحی خالص علمِ خداوندی کا نام ہے جو ان وسائط سے نوعِ انسان تک پہنچائی جاتی تھی —— خدا سے نبی کی طرف، بذریعہ روح الامین اور اس کے بعد اس نبی کے ذریعے دوسرے انسانوں تک۔ اس کے بعد کہا کہ اس سے انکار صرف فاسق کرتے ہیں۔ فاسق کا مفہوم، پہلی جلد میں، زیرِ آیت (۲/۲۶ صفحہ ۲۴۳ پر) بیان کیا جا چکا ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ وحی ایک قالب (PATTERN) عطا کرتی ہے جس کے اندر رہتے ہوئے انسانی ذات کی نشو و نما ہو سکتی ہے۔ اس قالب کے اطراف و جوانب کو حدود اللہ کہا جاتا ہے۔ جو لوگ ان حدود کی پابندی نہیں کرتے انہیں فاسقین کہکر پکارا جاتا ہے۔

فاسقین کا مفہوم

اگر ذرا بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو دین اور لادینی میں بنیادی فرق یہی ہے۔ دین، خدا کی طرف سے متعین کردہ حدود کے اندر زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔ نہ ان حدود میں تبدیلی کی جا سکتی ہے نہ ان سے تجاوز۔ جو شخص دین سے انکار کرتا ہے اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ کسی غیر متبدل پابندی کے تابع زندگی بسر نہیں کرنا چاہتا۔ وہ کھلی چھٹی چاہتا ہے کہ جس طرح اس کا جی چاہے کرے۔ مشہور روسی قلمکار، دوستووسکی (DOSTOEVESKY) نے اس حقیقت کو چار الفاظ میں محصور کر دیا ہے جب کہا کہ "تم خدا کا انکار کر دو تو ہر چیز جائز قرار پا جائے گی"۔ اسی کو اباحت یا فسق کہا جاتا ہے۔ سیکولرازم، کمیونزم، سوشلزم وغیرہ میں کشش و جاذبیت ہی یہ ہے کہ اس میں ہر غیر متبدل اخلاقی پابندیوں سے آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی کو فسق کہا جائے گا۔ قرآنِ کریم نے یہاں کہا ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے وحی سے انکار کے لئے جو وجوہات پیش کی جاتی ہیں وہ محض پردہ ساز ہوتا ہے۔ اس انکار کی علت العلل یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر قسم کی پابندی سے آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ اس وضاحت کی روشنی میں یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ قرآن نے جو کہا ہے کہ وحی کی صداقتوں سے صرف فاسقین انکار کرتے ہیں، تو یہ کتنی بڑی حقیقت کی پردہ کشائی ہے۔

ان پابندیوں سے آزاد رہنے کی ذہنیت کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اسے اگلی آیت میں ان الفاظ میں بیان کر دیا گیا کہ:۔

۱۰۰/۲ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُھُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔

"جب یہ کسی سے عہد و پیمان کرتے ہیں تو اگرچہ وہ عہد و پیمان پوری کی پوری قوم کی طرف سے ہوتا ہے لیکن انہی میں کا ایک گروہ اس معاہدہ کو توڑ دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ کسی مستقل قدر یا غیر متبدل اصول پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ مصلحت کوشی ان کا شیوہ اور مفاد پرستی ان کا شعار ہے، وہ خواہ کسی طریق سے حاصل ہو جائیں" قرآن کریم نے جو یہاں کہا ہے کہ معاہدہ تو پوری قوم کی طرف سے ہوتا ہے، لیکن ان میں سے کچھ لوگ اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو اس میں بھی میکاولی سیاست کے ایک اہم گوشے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آپ ابتدائی سطح پر محلّوں کی زندگی کو لیجئے۔ ان میں ایسے گھرانے بھی ہوتے ہیں جو ایک آدھ آدمی ایسا رکھ چھوڑتے ہیں جو دوسروں سے لڑائی جھگڑا کرتا رہے۔ جب اہل محلہ اس کی شکایت لے کر آتے ہیں تو نہایت معصومیت سے کہدیا جاتا ہے کہ بھائی کیا کریں! یہ لڑکا اس قسم کا نکل آیا ہے۔ یہ ہمارے قابو میں ہی نہیں۔ اسے ہم بھی برداشت کر رہے ہیں، تم بھی برداشت کرو۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ ایسا ہی سرکش ہے تو تم نے اسے... گھر میں رکھ کیوں چھوڑا ہے کہ اہل محلہ کے لئے فتنہ و فساد کا موجب بنتا رہے؟ اسے نکال باہر کرو۔ لیکن وہ کبھی ایسا نہیں کریں گے۔ گھرانوں اور خاندانوں سے آگے بڑھیے تو جماعتوں اور پارٹیوں میں بھی اس قسم کے لوگ رکھے جاتے ہیں جو دوسروں کے خار پہلو بنے رہتے ہیں جس سے معاشرے کا امن و چین تباہ ہو جاتا ہے۔ پارٹیوں سے آگے بڑھ کر قوموں کی طرف آئیے تو یہ روزمرّہ کا مشاہدہ ہے کہ ہمسایہ قوم کے ساتھ امن و سلامتی کا معاہدہ کر رکھا ہے لیکن آج سرحد کے اس حصے میں فساد مچا دیا جاتا ہے، کل اس حصے میں۔ پھر اس کے لئے تحقیقاتی کمیشن بٹھائے جاتے ہیں جس کا نتیجہ سوائے لیپا پوچی کے، کچھ نہیں نکلتا۔ ہمسایہ قوم سے امن کا معاہدہ اس لئے کیا تھا کہ انہیں امن اور چین کی زندگی نصیب ہو۔ لیکن عملاً ہوتا یہ ہے کہ معاہدہ برقرار رہتا ہے مگر امن و چین نصیب نہیں ہوتا۔ معاہدہ کے معنے اس امر کا اطمینان ہو جاتا ہے کہ فریقِ مخالف کی طرف سے اس کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ یہ فریقِ مقابل کی ذمہ داری ہے کہ ان کے کسی فرد یا گروہ کی طرف سے اس کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔ اگر وہ اس کا انتظام نہیں کرتے یا نہیں کر سکتے تو ایسے معاہدے کے معنے کچھ نہیں رہتے۔ قرآن کریم نے یہاں اسی حقیقت پر زور دیا ہے۔

معاہدہ کی پابندی

تمدنی زندگی سے آگے بڑھئے تو مذہب کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ یہ یہود جو اس طرح تمہاری مخالفت کر رہے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ان کا شروع سے وطیرہ ہی یہی رہا ہے۔ مثلاً ابھی کل کی بات ہے کہ:۔

۲/۱۰۱ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَآءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ۔

اِن کی طرف خدا کا ایک رسول آیا جو خود انہی میں سے (یعنی بنی اسرائیل میں سے) تھا۔۔۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ اس نے آ کر کہا کہ میں تمہارے سابقہ انبیاء کی تعلیم کی مخالفت کرنے کے لئے نہیں آیا بلکہ ان دعاوی کو سچ کر دکھانے کے لئے آیا ہوں جو تم سے کئے گئے تھے ان میں سے کچھ لوگوں نے تو اسے تسلیم کیا لیکن باقی قوم نے اس کی تعلیم کو یوں جنس کاسد کی طرح اُٹھا کر پھینک دیا جیسے یہ جانتے ہی نہیں تھے کہ ان سے کیا کہا گیا تھا اور یہ رسول کیا کرنے کے لئے آیا تھا۔

کتاب اللہ کی طرف دعوت دینے والوں کی مخالفت

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا طرزِ عمل یہودیوں ہی سے مخصوص نہیں۔ جب اور جہاں بھی دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو وہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جو شخص بھی انہیں کتاب اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے اس کی یوں مخالفت کی جاتی ہے جیسے یہ جانتے پہچانتے ہی نہیں کہ وہ کس کتاب کی طرف دعوت دیتا ہے؟ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی۔ یہود اور نصاریٰ، دونوں نے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی۔ اور جب حضورؐ کے بعد اسلام بھی دین کے بجائے مذہب بن گیا تو جس شخص نے بھی مسلمانوں کو قرآن کی طرف دعوت دی اس کی اسی طرح مخالفت ہوئی جس طرح ہر اہلِ مذہب، ہر منزّل من اللہ کتاب کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ آج بھی، قرآن کریم کی طرف دعوت دینے والوں کی، خود مسلمانوں کی طرف سے جس طرح مخالفت ہوتی ہے، وہ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے۔

یہ کچھ تو یہودیوں نے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا لیکن ان سے بھی پہلے انہوں نے اسی قسم کی سازش ایک اور رسول کے خلاف کی تھی، یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام کے خلاف۔ قرآن کریم نے اس پوری داستان

کو ایک ہی آیت میں سمٹا کر رکھ دیا ہے جو درج ذیل ہے :-

۲/۱۰۲ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۔ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ ۔ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا ۔ يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۔ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۔ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۔ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۔ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ ۔ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۔ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۔

یہ آیت، اُن آیات میں سے ہے جس کے مروجہ ترجمہ اور وضعی روایات پر مبنی تفاسیر نے، نہ صرف یہ کہ بہت سے الجھاؤ پیدا کر دیئے ہیں بلکہ بعض اہم حقائق کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس لئے اس کے متعلق ذرا تفصیل سے بات کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں شاہ عبدالقادر (مرحوم) کا اردو زبان میں سب سے پہلا ترجمہ ہے جسے بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ چونکہ مرورِ وقت سے اس زمانے کا اسلوب بیان کچھ ژولیدہ سا ہو گیا تھا۔ اس لئے شیخ الہند، مولانا محمود الحسن دیوبندی (مرحوم) نے اس اسلوب کو قدرے مروّجہ قالب میں ڈھالا اور وہ ترجمہ مولانا شبیر احمد عثمانی (مرحوم) کے حواشی کے ساتھ شائع ہوا۔ اس ترجمے کو خاصی شہرت حاصل ہے۔ اس لئے میں وہی ترجمہ پیش کئے دیتا ہوں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ان اہل کتاب نے، کتاب اللہ کو تو اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا اور :-

> پیچھے ہولئے اس علم کے جو پڑھتے تھے شیطان، سلیمان کی بادشاہت کے وقت۔ اور کفر نہیں کیا سلیمان نے لیکن شیطانوں نے کفر کیا کہ سکھلاتے تھے لوگوں کو جادو۔ اور اس علم کے پیچھے ہولئے جو اترا دو فرشتوں پر شہر بابل میں، جن کا نام ہاروت اور ماروت ہے۔ اور نہیں سکھاتے تھے وہ دونوں فرشتے کسی کو، جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو آزمائش کے لئے ہیں، سو تو کافر مت ہو۔ پھر ان سے سیکھتے وہ جادو، جس سے جدائی ڈالتے مرد میں اور اس کی عورت میں، اور وہ اس سے نقصان نہیں کر سکتے کسی کا بغیر حکم اللہ کے۔ اور سیکھتے ہیں وہ چیز، جو نقصان کرے ان کا اور فائدہ نہ کرے۔ اور وہ خوب جان

چکے ہیں کہ جس نے اختیار کیا جادو کو، نہیں اس کے لئے آخرت میں کچھ حصہ۔ اور بہت ہی بری چیز ہے جس کے بدلے بیچا انہوں نے اپنے آپ کو، اگر ان کو سمجھ ہوتی۔

اس پر حسبِ ذیل حاشیہ درج ہے:۔

خلاصہ یہ کہ یہود اپنے دین اور کتاب کا علم چھوڑ کر، علمِ سحر کے تابع ہو گئے۔ اور سحر لوگوں میں دو طرف سے پھیلا۔ ایک حضرت سلیمانؑ کے عہد میں، چونکہ جنات اور آدمی ملے جلے رہتے تھے تو آدمیوں نے شیطانوں سے سحر سیکھا اور نسبت کر دیا حضرت سلیمانؑ کی طرف کہ ہم کو انہی سے پہنچا ہے۔ اور ان کو حکم جن و انس پر اسی کے زور سے تھا...... دوسرے پھیلا ہاروت ماروت کی طرف سے۔ وہ دو فرشتے تھے شہر بابل میں۔ بصورتِ آدمی رہتے تھے۔ ان کو علمِ سحر معلوم تھا۔ جو کوئی طالب اس کا جاتا، اول اس کو روک دیتے کہ اس میں ایمان جاتا رہے گا اور اس پر بھی باز نہ آتا تو اس کو سکھا دیتے۔

اس سے دو تین وضاحت طلب سوال سامنے آتے ہیں:۔

(۱) یہودی کفر اور جادو کی نسبت، حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف کرتے تھے (قرآنِ کریم نے اس کی تردید کی ہے)۔

(۲) عام طور پر مشہور ہے کہ بابل میں، دو فرشتے آدمیوں کی شکل میں رہتے تھے، جادو ان کے ذریعے پھیلا —— اور

(۳) یہ سوال، کہ خود، جادو کیا ہے اور قرآنِ کریم کی رو سے اس کی حیثیت کیا؟

آپ نے دیکھا کہ یہ سوال کس قدر اہم ہیں اور اس قابل کہ ان کی پوری پوری وضاحت سامنے آ جاتے۔

سب سے پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام کے خلاف یہودیوں کی افترا پردازیاں دیکھئے۔ واضح رہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام بنی اسرائیل کے اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں —— ان کا صحیفہ —— غزل الغزلات —— بائبل میں موجود ہے۔ اس کے باوجود آپ دیکھئے کہ خود بائبل اور یہودیوں کے دیگر مقدس لٹریچر میں، حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق کیا کچھ ملتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ان کا بیٹا (رجعام) برسرِ اقتدار آیا لیکن یہ بڑا کمزور حکمران تھا۔ اس لئے اس کے زمانے میں بہت سے فتنوں نے سر اٹھایا۔ ان سرکشی اختیار کرنے والوں میں ایک شخص (یربعام) نامی تھا جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے شمالی حصہ مملکت کا گورنر مقرر کیا تھا لیکن اس نے بہت سے اور لوگوں کو ساتھ ملا کر سلطنت کے خلاف بغاوت شروع کر دی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے اس کی سرکوبی کرنا چاہی لیکن وہ بھاگ کر مصر چلا گیا۔ آپ کی وفات کے بعد واپس لوٹا اور دس اسباطِ بنی اسرائیل کو ساتھ ملا کر مملکت کے خلاف

جنگ کی اور اپنی حکومت قائم کر لی۔ نہ صرف حکومت، بلکہ بیت المقدس کے مقابلے میں بت خانے تعمیر کرائے جہاں اعلانیہ بت پرستی ہوتی تھی۔ بنی اسرائیل، یوں بار دگر، بت پرستی کی لعنت میں گرفتار ہو گئے۔ بت پرستی کے ساتھ، وہ سب اوہام و خرافات، جو مندروں میں عام تھے، یعنی جادوگری، کہانت، توہم پرستی، غرضیکہ کفر و شرک کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو اُن پر مسلط نہ ہو چکا ہو۔ چنانچہ خود بائبل میں اس کا ذکر موجود ہے۔ کتاب سلاطین نمبر ۱، باب (۱۲ــ ۱۱) میں ہے:۔

> حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے زمانے میں ایک شخص یربعام نامی نے حیا کاہن کے ساتھ مل کر آپ کی سلطنت کے خلاف سخت سازشیں کی تھیں۔ اس وقت تو وہ اپنی مساعی میں کامیاب نہ ہو سکا، لیکن رجعام کے عہد سے اس نے بڑی قوت حاصل کر لی اور بنی اسرائیل کے دس اسباط کو اپنے ساتھ ملا کر رجعام کو شکست دی۔ اس نے بیت المقدس کے ہیکل کے مقابلے میں دو بت خانے تعمیر کرائے، جہاں سونے چاندی کے بتوں کی پرستش ہوتی تھی۔

اس سے واضح ہے کہ بت پرستی وغیرہ پھیلائی تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے دشمنوں نے، لیکن خود بائبل کی اسی کتاب "سلاطین" میں اسے حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کی مملکت کے خلاف جو شورشیں اٹھیں ہوئی تھیں وہ آپ پر (معاذ اللہ) خدا کا عذاب تھا جو بت پرستی کے جرم کی پاداش میں نازل ہوا تھا۔ اس میں کہا گیا ہے:۔

حضرتِ سلیمانؑ اور تورات

> سو از بسکہ اس کا (حضرت سلیمانؑ کا) دل خداوند اسرائیل کے خدا سے، جو اسے دوبارہ دکھائی دیا، برگشتہ ہوا، اس لئے خداوند سلیمان پر غضبناک ہوا کہ اس نے اسے حکم کیا تھا کہ وہ اجنبی معبودوں کی پیروی نہ کرے، پر اس نے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا۔ اس سبب سے خداوند نے سلیمان کو کہا از بسکہ تجھ سے ایسا ایسا کچھ ہوا اور تو نے میرے عہد کو اور میری شریعتوں کو جو میں نے تجھے فرمائیں، حفظ نہ کیا، اس واسطے میں سلطنت کو تجھ سے پھاڑ لوں گا اور تیرے خادم کو دونگا، لیکن تیرے باپ داؤد کی خاطر سے میں تیرے جیتے جی ایسا نہ کروں گا، پر تیرے بیٹے کے ہاتھ سے پھاڑ لوں گا۔ مگر ساری سلطنت نہ پھاڑ لوں گا بلکہ اپنے بندے داؤد کی خاطر اور یروشلم کے لئے، جسے میں نے چن لیا ہے ایک فرقہ تیرے بیٹے کو دوں گا۔

(۱ سلاطین نمبر ۱ ۱۱ــ ۱۳/۹)

اس سے ذرا پہلے ہے:۔

پر سلیمان بادشاہ بہت سی اجنبی عورتوں کو فرعون کی بیٹی کے سوا چاہتا تھا۔ موآبی۔ اور عمونی اور ادومی اور صیدانی اور حتی عورتوں کو۔ ان قوموں کی جن کی بابت خداوند نے بنی اسرائیل کو حکم کیا کہ تم ان کے پاس اندر نہ جاؤ اور وہ تم پاس اندر نہ آئیں کہ وہ یقیناً تمہارے دلوں کو اپنے معبودوں کی طرف مائل کرائیں گی سو سلیمان انہیں سے عاشق ہو کے لپٹا۔ اس کی سات سو جورواں بیگمات تھیں اور تین سو حرمین۔ اور اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو پھیرا۔ کیونکہ ایسا ہوا کہ جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا اور اس کا دل اپنے خدا کی طرف مائل نہ تھا۔ جیسا کہ اس کے باپ داؤد کا دل تھا، سو سلیمان نے صدانیوں کی دیبی عناراث اور بنی عمون کے نفرتی ملکرم کی کی پیروی کی۔ اور سلیمان نے خداوند کی نظر میں بدی کی اور اس نے خداوند کی پوری پیروی اپنے باپ داود کی طرح نہ کی۔ (اسلاطین (۱) ۱۱: ۱-۶)

آپ دیکھئے کہ یہودیوں کی کتاب مقدس میں خود ان کے پیغمبروں کے متعلق کس قسم کے افسانے ملتے ہیں! اس مقام پر تو صرف حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر ہے۔ بائبل میں بہت سے دیگر اولوالعزم انبیائے کرام کے متعلق جس قسم کی خرافات ملتی ہیں، انہیں دیکھ کر حیا کی آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ بہر حال یہ تھی کفر کی وہ روش، جسے یہودیوں نے حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کر رکھا تھا۔ اب آئیے جادو کی طرف۔ تالمود میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق لکھا ہے کہ ان کے پاس

جادو اور حضرت سلیمان

ایک انگشتری تھی جس پر اسم اعظم[1] کندہ تھا۔ جس کی تاثیر سے انسان، حیوان، چرند، پرند، جنات، بھوت سب آپ کے مسخر تھے۔ جب آپ کی سلطنت مستحکم ہو گئی تو آپ کو اپنی قوت بڑا ناز ہو گیا۔ یہ بات خداوند یہوا کو ناگوار گذری، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیوؤں کا بادشاہ اسموڈیس چالاکی سے آپ کی انگشتری چرا کر لے گیا، اور آپ کا ہم شکل بن کر تخت پر بیٹھ گیا۔ حضرت سلیمانؑ کی قوت کا راز تو اسی انگشتری میں تھا، جب وہ چھن گئی تو سب کچھ گیا۔ چنانچہ آپ جان بچا کر بھاگے اور فقیروں کا بھیس بدل کر بھیک مانگنے لگے۔ آخر شاہ رسمون کے ملک میں پہنچ کر آپ نے شاہی باورچی خانے میں نوکری کر لی۔ قضا کار بادشاہ کی بیٹی آپ پر عاشق ہو گئی۔ جب بادشاہ کو اس کا علم ہوا تو اس نے ان دونوں کو جنگل میں نکال دیا۔ ایک دن ایک ماہی گیر مچھلی لے کر ادھر سے گزر رہا تھا۔ بھکارن شہزادی نے

---

[1] آپ نے غور فرمایا کہ مسلمانوں میں اسم اعظم کا تصور کہاں سے آیا؟

وہ مچھلی اس سے خرید لی، اور جس وقت اس کا پیٹ چاک کیا تو اس میں سے ایک انگوٹھی برآمد ہوئی (حضرت سلیمانؑ جنہوں نے اپنا نام قہلت رکھ چھوڑا تھا) فوراً پہچان لیا کہ یہ وہی انگوٹھی ہے، اُسے فوراً اٹھا لیا اور آنکھ جھپکنے کے عرصے میں یروشلم پہنچ کر اس غدار کو قتل کیا اور خود تختِ حکومت پر متمکن ہوگئے (یہودی تالمود)۔ یہ ہیں وہ خرافات جو یہودیوں کی مقدس ترین کتابوں میں خدا کے اس برگزیدہ رسول کی طرف منسوب ہیں۔

قرآنِ کریم عظیم کتاب ہے۔ اس کے دشمن (یہود و نصاریٰ وغیرہ) خود اپنے انبیاء اور بزرگوں کے متعلق اس قسم کے خرافاتی افسانے وضع کرتے ہیں اور قرآن اِن حضرات کی مدافعت کرتا ہے۔ مثلاً انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کل بارہ شاگرد تیار کر سکے تھے۔ ان میں سے ایک نے تو چند پیسوں کے عوض مخبری کر کے آپ کو پولیس کے حوالے کرا دیا اور جب آپ کے خلاف مقدمہ چلا تو باقی گیارہ کے گیارہ ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس کے برعکس قرآنِ کریم یہ کہتا ہے کہ جب حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام مخالفتوں کے ہجوم میں گھر گئے تو آپ نے اپنے رفقاء سے پوچھا مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ (۳/۵)۔ "تم میں سے کون محض خدا کی خاطر اس مصیبت کے وقت میرا ساتھ دے گا؟" تو ان سب نے بیک زبان پکار کر کہا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ (۳/۵)۔ "ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔ آپ دیکھ لیجئے گا کہ ہم کس طرح احکامِ خداوندی کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم کرتے ہیں"۔ اتنا ہی نہیں کہ قرآنِ کریم نے محض تاریخی حیثیت سے اس واقعہ کا ذکر کر دیا ہو۔ اس نے جماعتِ مومنین سے کہا ہے کہ تمہیں اپنی زندگی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی سی روش اختیار کرنی چاہیئے (۱۴/۶۱)۔

حضرت عیسیٰ کے حواری

ظاہر ہے کہ جب قرآنِ کریم سابقہ انبیائے کرام کے رفقاء اور متبعین کے متعلق اس انداز سے مدافعت پیش کرتا ہے تو وہ خود حضراتِ انبیائے کرام کا دامن اُن آلودگیوں سے کیوں نہ پاک اور صاف کرے گا جن سے خود ان کے نام لیواؤں نے انہیں ملوّث کر رکھا ہے۔ اس سلسلے میں قرآنِ کریم نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا دامن ان دونوں تہمتوں سے یہ کہکر پاک کر دیا کہ: وَمَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَلٰکِنَّ الشَّیٰطِیْنَ کَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (۲/۱۰۲)۔ یہ قطعاً غلط ہے کہ سلیمانؑ نے کفر کی روش اختیار کر لی تھی۔ اس نے قطعاً ایسا نہیں کیا تھا۔ یہ تو اس کے دشمن، شیاطین تھے جنہوں نے کفر کی روش بھی اختیار کی اور وہ لوگوں کو جادو بھی سکھاتے تھے"۔

قرآن کریم اور حضرت سلیمانؑ

قرآنِ کریم نے یہ کچھ آج سے چودہ سو سال پہلے کہا اور دیکھئے کہ اب خود اہلِ بائبل کی تحقیق نے انہیں کس نتیجے پر پہنچایا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا ببلیکا میں کہا گیا ہے کہ:۔

اتنا تو غالباً صحیح ہے کہ (حضرت) سلیمانؑ کی اسرائیلی اور غیر اسرائیلی، متعدد بیویاں تھیں، لیکن آپ نے ان سب کے لئے عبادت خانے نہیں بنوائے تھے، نہ ہی خدائے یہوہ کے ساتھ اپنی بیویوں کے دیوتاؤں کی پرستش شامل کی تھی۔ انہیں اس سرزمین میں، جو خداوند یہوہ کی وراثت تھی، خدائے واحد کے انکار کا خیال بھی نہیں آسکتا تھا۔ اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کہ وہ اپنی بصیرت کے مطابق خدائے یہوہ کا وفادار پرستار تھا۔

اور ڈکشنری آف بائبل میں اس کی تائید ان الفاظ میں آئی ہے:-

ایسا باور کرنا مشکل ہے کہ سلیمان بادشاہ، خدائے یہوہ سے مرتد ہو کر بت پرست ہو گیا تھا۔

یہ تو قرآن کریم نے کہا، لیکن اب یہ دیکھئے کہ ہمارے ہاں کی اسی قرآن کی تفاسیر میں اس سلسلے میں کیا کچھ ملتا ہے۔ ہماری کتبِ تفاسیر کے سلسلے میں اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ اگر یہ مفسرین اس قسم کی باتوں کو یہ کہہ کر پیش کرتے کہ یہ ان کے اپنے خیالات ہیں تو بعد میں آنے والے، ان سے اختلاف بھی کرسکتے تھے اور ان کی تردید بھی۔ لیکن ان تفسیروں کا معاملہ ہی الگ ہے۔ قرآن کریم کی سب سے پہلی مفصل اور مبسوط تفسیر، ابنِ جریر طبری نے (تیسری صدی ہجری میں) مرتب کی۔ اس میں آیات کی تفسیر میں کہا یہ گیا ہے کہ رسول اللہؐ نے ایسا فرمایا ہے۔ یا فلاں صحابیؓ سے یوں مروی ہے۔ یعنی اس تفسیر میں جو کچھ لکھا گیا اسے رسول اللہؐ

ہماری تفاسیر میں کیا کہا گیا ہے

یا صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کر دیا۔ اس کے بعد جتنی تفسیریں مرتب ہوئیں، وہ سب کم و بیش تفسیرِ طبری ہی کو بطور سند پیش کرتی ہیں۔ اب آپ غور کیجئے کہ اگر کسی آیت کے متعلق یہ کہا جائے کہ رسول اللہؐ نے اس کی تفسیر یوں بیان فرمائی ہے تو کون مسلمان ہے جو یہ کہنے کی جرأت کرسکے کہ مجھے اس سے اختلاف ہے؟ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ جو کچھ امام طبری نے لکھ دیا وہی کچھ آج تک آخری سند بن کر چلا آرہا ہے۔ اس سلسلہ میں غور طلب سوال یہ ہے کہ امام طبری نے جو کچھ کہا اس کا مدار روایات پر ہے۔ روایت کے معنی یہ ہیں کہ میں نے فلاں سے سنا، اس نے فلاں سے سنا، اس نے فلاں سے سنا۔ اب اگر اس طرح سے شنید کا سلسلہ دو، تین سو سال تک پیچھے لے جایا جائے تو اس کی سند کیا ہو سکتی ہے کہ جو کچھ آخری راوی نے بیان کیا وہ بالضرور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے۔ اس پرکھ کے لئے قابلِ اعتماد طریق یہ ہے کہ جس بات کو بھی رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا جائے اس کے متعلق یہ دیکھ لیا جائے کہ وہ قرآن کریم کے خلاف تو نہیں۔ اگر وہ قرآن کریم کے مطابق ہے تو ایسا باور کر لینے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ اسے حضور کا ارشادِ گرامی سمجھا جاسکتا ہے لیکن

اگر وہ قرآن کریم کے خلاف ہو تو ظاہر ہے کہ وہ حضورؐ کا قول نہیں ہو سکتا، لہٰذا اُسے مسترد کر دینا چاہیئے۔ یہ ہے وہ مسلک جو روایات، تاریخ اور تفاسیر کے سلسلے میں، میں نے اختیار کر رکھا ہے۔

اوپر بتایا گیا ہے کہ یہودیوں نے کفر اور سحر کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کیا۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں اس کی تردید کر دی۔ اس کے بعد آپ دیکھئے کہ ہماری کتب تفاسیر میں اس سلسلے میں کیا لکھا ملتا ہے۔ امام طبری کی تفسیر بڑی ضخیم تھی۔ امام ابن کثیر نے اسے نسبتاً مختصر شکل میں پیش کیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ تفسیر بڑی مقبول ہے۔ اس تفسیر میں (زیرِ نظر آیت کی تشریح کرتے ہوئے) کہا گیا ہے:۔

> حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ایک انگوٹھی تھی جب آپ پاخانے جاتے تو اپنی بیوی حضرت جادہ کو دے جاتے۔ جب حضرت سلیمانؑ کی آزمائش کا وقت آیا اس وقت ایک شیطان جن آپ کی صورت میں آپ کی بیوی صاحبہ کے پاس آیا اور انگوٹھی طلب کی، جو دیدی گئی۔ اُس نے پہن لی اور تخت سلیمانی پر بیٹھ گیا۔ تمام جنات وغیرہ حاضرِ خدمت ہوگئے۔ حکومت کرنے لگا۔ اِدھر جب حضرت سلیمانؑ واپس آئے اور انگوٹھی طلب کی تو جواب ملا تو جھوٹا ہے انگوٹھی تو حضرت سلیمانؑ لے گئے۔ آپ نے سمجھ لیا کہ یہ خدا کی طرف سے آزمائش ہے۔ ان دنوں میں شیاطین نے جادو کی اور نجوم کی اور کہانت کی اور شعر اشعار کی اور غیب کی جھوٹی سچی خبروں کی کتابیں لکھ لکھ کر حضرت سلیمانؑ کی کرسی تلے دفن کرنی شروع کر دیں۔ آپ کی آزمائش کا یہ زمانہ ختم ہوگیا۔ آپ پھر تخت و تاج کے مالک ہوئے۔ عمرِ طبعی کو پہنچ کر جب رحلت فرمائی تو شیاطین نے انسانوں سے کہنا شروع کیا کہ حضرت سلیمانؑ کا خزانہ اور وہ کتابیں جن کے ذریعہ سے وہ ہواؤں اور جنات پر حکمرانی کرتے تھے اور اُن کی کرسی تلے دفن ہیں۔ چونکہ جنات اُس کرسی کے پاس نہیں جا سکتے تھے اس لیے انسانوں نے اسے کھودا تو وہ کتابیں برآمد ہوئیں۔ بس اب ان کا چرچا ہوگیا اور ہر شخص کی زبان پر چڑھ گیا کہ حضرت سلیمانؑ کی حکومت کا رازیہی تھا بلکہ لوگ، حضرت سلیمانؑ کی نبوت سے انکاری ہوگئے اور آپ کو جادوگر کہنے لگے۔
>
> (تفسیر ابن کثیر۔ پارہ اول صفحہ ۱۲۵)

معالم التنزیل، ہمارے ہاں کی ایک اور اہم تفسیر ہے۔ اس میں مندرجہ بالا "افسانے" یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ:۔

> جب اس جن (یعنی جعلی سلیمان) کو حکومت کرتے کچھ عرصہ گذر گیا تو حضرت سلیمانؑ کے صحابی آصف نے آپ کی ازواجِ مطہرات سے پوچھا کہ باہر تو اس کا (یعنی جعلی سلیمان کا، جس کے متعلق انہیں علم نہ تھا کہ وہ جعلی ہے)

حال بہت بُرا ہے، تمہارے ساتھ اس کا برتاؤ کیسا ہے؟ اس کے جواب میں آپ کی ازواج نے کہا کہ یہاں اس کا حال بدتر ہے۔ یہ تو حیض کی حالت میں بھی اجتناب نہیں کرتا۔ اور غسلِ جنابت بھی نہیں کرتا۔ ان تفاسیر کے افسانوی اور اُن روایات، جن پر یہ تفاسیر مبنی ہیں، کے وضعی ہونے میں شبہ کیا رہ جاتا ہے؟

بابل اور سحر کاری

اب آئیے آیہ زیر نظر کے دوسرے گوشے، یعنی ہاروت و ماروت کی طرف۔ تاریخی انکشافات اس پر شاہد ہیں کہ زمانۂ قدیم میں بابل، سحر و کہانت اور شعبدہ گری و فسوں سازی کا گہوارہ تھا۔ چنانچہ راجزن اپنی مشہور کتاب — بابل اور اشوری مذہب — میں لکھتا ہے:-

اہلِ بابل و نینوا کے مذہب کا معتدبہ حصّہ جھاڑ پھونک کا مجموعہ بن کر رہ گیا تھا۔ (صفحہ ۱۴۵)

انسائیکلو پیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس کا مقالہ نگار بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ "اہلِ بابل کا مذہبی لٹریچر، سحر و کہانت سے بھرا پڑا تھا۔ جب کلدانیوں (اہلِ بابل) کی قومیت کا شیرازہ بکھرا تو وہ تمام دنیا میں پھیل گئے اور جہاں جہاں گئے انہوں نے شعبدہ بازی اور افسوں طرازی کی اس نظر فریب تعلیم کو عام کرنا شروع کر دیا" (دیکھئے RAGOZIN کی کتاب کالڈیا) یہودی شعبدہ بازی اور سحر و کہانت کے بہ دل شیدائی تھے۔ اہلِ بابل کے بکھرے ہوئے معلموں کا سب سے زیادہ اثر انہی توہم پرستوں پر ہوا۔ چنانچہ جیوش انسائیکلو پیڈیا اس پر شاہد ہے کہ یہودیوں میں اہلِ بابل ہر جگہ بہ نگاہِ تقدس دیکھے جانے لگے اور (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی رو سے) ان کی تعلیم یہودیوں کے ہاں عام ہو گئی۔ اس پر جیوش انسائیکلو پیڈیا (جلد ہشتم) کی حسب ذیل شہادت قابلِ غور ہے[1]

قدیم یہودیوں میں جادو کی تعلیم عام تھی۔ حتیٰ کہ صدرِ مجلس یا محکمۂ قضا کی رکنیت کے لئے جادو کا علم لاینفک شرط سمجھا جاتا تھا، خواہ یہ جادو کفار سے ہی کیوں نہ سیکھا جائے۔ ان کے بڑے بڑے علماء اسی علم کے ماہر تھے، اور قانون کی نگاہ میں اس کا اثر مسلم تھا۔ لوگ اہلِ علم کی باتوں کی پرواہ کرتے یا نہ کرتے، لیکن ساحرین کی عقیدت ان کے رگ و ریشے میں سما چکی تھی۔ اسی نے انہیں تباہ کر دیا۔

اس کے بعد آئیے اپنی کتبِ تفاسیر کی طرف۔ تفسیر ابن کثیر میں آیۂ زیرِ نظر (۲/۱۰۲) کی تفسیر میں لکھا ہے:-

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اتارا اور ان کی اولاد

---

[1] یہودی (بلکہ سامی اقوام) میں مروجہ جادو کی تفاصیل (G. CAMPBELL THOMPSON) کی کتاب (SEMITIC MAGIC ; ITS ORIGIN AND DEVELOPMENT) میں ملاحظہ کیجئے۔

ہاروت وماروت

پھیلی اور زمین میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہونے لگی تو فرشتوں نے کہا کہ دیکھو یہ کس قدر بدلوگ ہیں، کیسے نافرمان اور سرکش ہیں، ہم اگر ان کی جگہ ہوتے تو ہرگز ہرگز خدا کی نافرمانی نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اچھا تم اپنے میں سے دو فرشتوں کو پسند کرلو۔ میں ان میں انسانی خواہشات پیدا کرتا ہوں اور انہیں زمین پر بھیجتا ہوں، پھر دیکھتا ہوں کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ہاروت ماروت کو پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں انسانی طبیعت پیدا کی اور ان سے کہدیا کہ دیکھو بنی آدم کو تو میں نے نبیوں کی معرفت اپنے حکم احکام پہنچاتا ہوں لیکن تم سے بلاواسطہ خود کہہ رہا ہوں کہ میرے ساتھ کسی کو شریک کرنا، زنا کرنا، شراب نہ پینا۔ اب یہ دونوں زمین پر اترے اور زہرہ کو ان کی آزمائش کے لئے حسین و شکیل عورت کی صورت میں ان کے پاس بھیجا جسے دیکھ کر یہ مفتون ہو گئے اور اس سے زنا کرنا چاہا۔ اوس نے کہا اگر تم شرک کرو تو میں منظور کرتی ہوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ تو ہم سے نہ ہوسکے گا .... وہ چلی گئی۔ پھر آئی اور کہنے لگی اچھا اس بچے کو قتل کر ڈالو، تو مجھے تمہاری خواہش پوری کرنی منظور ہے۔ اونہوں نے اسے بھی نہ مانا۔ وہ پھر آئی اور کہا کہ اچھا یہ شراب پی لو۔ اونہوں نے اسے ہلکا گناہ سمجھ کر اسے منظور کرلیا۔ اب نشہ میں مست ہوکر زنا کاری بھی کی اور اوس بچے کو بھی قتل کر ڈالا۔ جب ہوش وحواس درست ہوئے تو اوس عورت نے کہا جن جن کاموں کا تم پہلے انکار کرتے تھے، سب تم نے کر ڈالے۔ یہ نادم ہوئے۔ انہیں اختیار دیا گیا کہ یا تو عذاب دنیا کو اختیار کرو یا عذاب اُخروی کو۔ اونہوں نے دنیا کے عذاب پسند کئے۔ (ابن کثیر پارہ اول۔ صفحہ ۱۲۲)

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں:-

صحابہ اور تابعین سے بھی اس قسم کی روائتیں بہت کچھ منقول ہیں۔ بعض میں ہے کہ زہرہ ایک عورت تھی اوس نے ان فرشتوں سے یہ شرط کی تھی کہ تم مجھے وہ دعا سکھا دو جسے پڑھ کر تم آسمان پر چڑھ جاتے ہو۔ اونہوں نے سکھا دی۔ یہ پڑھ کر چڑھ گئی اور وہاں تارے کی شکل میں بنا دی گئی۔ (ابن کثیر پارہ اول صفحہ ۱۲۴)

اس کے بعد ہے:-

ابن عباسؓ فرماتے ہیں یہ واقعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے کا ہے۔ یہاں بابل سے مراد بابل دنباوند ہے۔ اس عورت کا نام عربی میں زہرہ تھا اور نبطی زبان میں اس کا نام بیدخت تھا اور فارسی میں ناہید تھا۔ یہ عورت اپنے خاوند کے خلاف ایک مقدمہ لائی تھی۔ جب انہوں نے اوس سے برائی کا ارادہ کیا

تو اوس نے کہا پہلے مجھے میرے خاوند کے خلاف حکم دو تو مجھے منظور ہے۔ اونہوں نے ایسا ہی کیا پھر اوس نے کہا مجھے یہ بھی بتا دو کہ تم کیا پڑھ کر آسمان پر چڑھ جاتے ہو اور کیا پڑھ کر اترتے ہو؟ اونہوں نے یہ بھی بتا دیا۔ چنانچہ پڑھ کر آسمان پر چڑھ گئی لیکن اترنے کا وظیفہ بھول گئی اور وہیں ستارے کی صورت میں مسخ کر دی گئی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جب کبھی زہرہ ستارے کو دیکھتے تو لعنت بھیجا کرتے تھے۔ اب ان فرشتوں نے جب چڑھنا چاہا تو نہ چڑھ سکے سمجھ گئے کہ اب ہم ہلاک ہوئے۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ پہلے پہل چند دنوں تک تو یہ فرشتے ثابت قدم رہے۔ صبح سے شام تک عدل کے ساتھ حکم کرتے رہتے۔ شام کو آسمان پر چڑھ جاتے پھر زہرہ دیکھ کر اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکے۔ زہرہ ستارے کو ایک خوبصورت عورت کی شکل میں بھیجا گیا تھا۔　　(ابن کثیر۔ پارہ اول صفحہ ۱۲۸-۱۲۷)

اس قسم کی تفسیروں کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ متقدمین کی تفاسیر ہیں، جنہوں نے روایات کے بارے میں،

مودودی صاحب کی تفسیر

زیادہ چھان پھٹک سے کام نہیں لیا، لیکن اس زمانے میں، جو تفاسیر لکھی جا رہی ہیں ان میں اس قسم کا رطب و یابس شامل نہیں کیا جاتا۔ ہمارے ہاں (LATEST) تفسیر ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تفہیم القرآن ہے۔ آپ دیکھئے کہ اس بارے میں اس میں کیا لکھا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:-

اس آیت کی تاویل میں، مختلف اقوال ہیں، مگر جو کچھ میں نے سمجھا ہے، وہ یہ ہے کہ جس زمانے میں بنی اسرائیل کی پوری قوم بابل میں قیدی اور غلام بنی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو انسانی شکل میں ان کی آزمائش کے لئے بھیجا ہوگا، جس طرح قوم لوط کے پاس فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں گئے تھے[1]، اسی طرح ان اسرائیلیوں کے پاس وہ پیروں اور فقیروں کی شکل میں گئے ہوں گے۔ وہاں ایک طرف انہوں نے بازار ساحری میں اپنی دکان لگائی ہوگی اور دوسری طرف وہ اتمام حجت کے لئے ہر ایک کو خبردار بھی کر دیتے ہوں گے کہ دیکھو ہم تمہارے لئے آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں، تم اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔ مگر اس کے باوجود لوگ ان کے پیش کردہ عملیات اور نقوش اور تعویذات پر ٹوٹے پڑتے ہوں گے۔

فرشتوں کے انسانی شکل میں آکر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو۔ وہ سلطنتِ الٰہی کے کارپرداز ہیں۔ اپنے فرائضِ منصبی کے سلسلے میں جس وقت جو صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے اختیار کر سکتے ہیں۔ ہمیں کیا خبر کہ اس وقت بھی ہمارے گرد و پیش کتنے فرشتے انسانی شکل میں آکر کام

[1] قرآن کریم نے کہیں نہیں کہا کہ وہ فرشتے تھے۔

کر جاتے ہوں گے۔ رہا فرشتوں کا ایک ایسی چیز سکھانا جو بجائے خود بری تھی تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پولیس کے بے وردی سپاہی کسی رشوت خوار حاکم کو نشان زدہ سکے اور نوٹ لے جاکر رشوت کے طور پر دیتے ہیں تاکہ اُسے عین حالتِ ارتکابِ جرم میں پکڑیں اور اس کے لئے بے گناہی کے عذر کی گنجائش باقی نہ رہنے دیں۔

(تفہیم القرآن۔ جلد اول صفحہ ۹۸ طبع ۱۹۵۱ئ)

ہم اس تفسیر پر اپنی طرف سے کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔ اسے ہم قارئین کی بصیرت پر چھوڑتے ہیں۔ البتہ ایک نکتے کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ:-

فرشتوں کے انسانی شکل میں آکر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو

قرآنِ کریم میں حضور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی مختلف جنگوں میں ملائکہ کے نزول اور تائید کا ذکر آیا ہے۔ اور ہر مقام پر یہ کہا گیا ہے لَمْ تَرَوْهَا "تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے" (۹/۲۶؛ ۹/۴۰؛ ۳۳/۹)۔ یعنی قرآنِ کریم بالفاظِ صریح کہہ رہا ہے کہ فرشتے (اور تو اور، حضور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کبارؓ تک کو بھی) نظر نہیں آسکتے تھے۔ اور مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ فرشتوں کے انسانی شکل میں آکر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو۔ یعنی ان کے نزدیک ہاروت و ماروت دو فرشتے تھے جو انسانی شکل میں، بابل میں لوگوں کو، خلافِ حکمِ خداوندی، جادو کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اور اس کے لئے جو "مصلحتِ خداوندی" تھی اُسے آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔

یہ ہے نمونہ ان تفاسیر کا، جن کی رو سے قرآنِ کریم کو دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

قرآنِ کریم کی روشنی میں اس آیۂ جلیلہ کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ (۲/۱۰۲)۔ ان (یہودیوں) کی کیفیت یہ تھی کہ یہ خدا کی صحیح تعلیم کو چھوڑ کر ان افسانوں کے پیچھے لگے رہتے تھے جو ان کے سرغنوں نے مملکتِ سلیمانؑ کے خلاف تراش رکھے تھے۔ ان میں سے

آیت کا صحیح مفہوم

ایک افسانہ یہ تھا کہ سلیمانؑ جیسا پیغمبر سحر آفرینیوں اور شعبدہ بازیوں کو ماننے لگ گیا تھا۔ ایسا کرنا کفر ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کے رسول، کفر کا شیوہ اختیار نہیں کیا کرتے۔ اس لئے وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ (۲/۱۰۲)۔ سلیمانؑ کفر کا مرتکب نہیں ہوا تھا۔ ایسا کچھ اس کے مخالفین کیا کرتے تھے۔ جو لوگوں کو جادو

سکھایا کرتے تھے۔

(پھر قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ) یہ قصہ بھی، جو ان لوگوں میں مشہور ہے، صحیح نہیں کہ بابل میں کوئی دو فرشتے، ہاروتؔ ماروتؔ تھے اور ان کی طرف وحی کے ذریعے سحر نازل ہوتا تھا جسے وہ لوگوں کو سکھاتے تھے۔ اعتراض سے بچنے کے لئے یہ لوگ اس افسانہ میں اتنا اضافہ کر دیتے ہیں کہ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ (۲/۱۰۲)۔ "جب لوگ ان کے پاس جادو سیکھنے کے لئے آتے تو وہ ان سے کہتے کہ دیکھو! ہمارا وجود تو ایک فتنہ ہے۔ تم کیوں کفر کی روش اختیار کرتے ہو"؟ لیکن جب اس پر بھی لوگ باز نہ آتے تو وہ انہیں ایسے جادو ٹوٹکے سکھا دیتے جن کے ذریعے وہ میاں اور بیوی میں تفرقہ پیدا کر دیں۔ یہ بھی افسانہ ہی ہے۔ بابل میں نہ ایسے کوئی فرشتے تھے اور نہ ان کی طرف منجانب اللہ کچھ نازل ہوتا تھا۔ نہ وہ لوگوں کو اس قسم کی تنبیہ کرتے تھے۔ یہ سب ان لوگوں کی افسانہ تراشیاں ہیں۔ جہاں تک اس عقیدے کا تعلق ہے کہ جادو ٹوٹکے کسی کو نقصان پہنچا دیتے ہیں تو یہ عقیدہ بھی سرے سے غلط ہے۔ نفع و نقصان تو قوانین خداوندی کی رو ہی سے پہنچا کرتا ہے نہ کہ اس قسم کی توہم پرستیوں سے (فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۚ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۲/۱۰۲) ان کے مذہبی پیشوا، اس قسم کے افسانوں کے سہارے لوگوں کو جادو ٹوٹکے سکھاتے تھے۔ اسے انہوں نے اپنا ذریعہ معاش بنا رکھا تھا۔ یہ ایسے بیوقوف نہیں تھے کہ انہیں معلوم نہ ہو کہ جو شخص اپنا دین و ایمان بیچ کر کذب و فریب کی تجارت کرتا ہے، وہ یہاں تو چار پیسے کما لیتا ہے لیکن اخروی زندگی کی خوشگواریوں میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ (وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۲/۱۰۲) پس افسوس ہے ان کی اس خرید و فروخت پر۔ کیا ہی بُری متاع ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کی نجات بیچ ڈالی۔ کاش وہ جانتے کہ وہ خود اپنے ہاتھوں کس طرح اپنے آپ کو برباد کر رہے ہیں (وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۲/۱۰۲)

یہ ہے اس آیۂ جلیلہ کا صحیح مفہوم۔ اس میں حرفِ مَا نے سارا مفہوم واضح کر دیا ہے۔ اس کی رو سے قرآن یہ کہتا ہے کہ اس قسم کی کوئی بات سرے سے تھی ہی نہیں۔ یہ سب ان کا خود تراشیدہ افسانہ ہے۔ (حرفِ مَا اس سارے افسانے کی نفی کر رہا ہے)۔

اور اگلی آیت میں ہے کہ :-

۲/۱۰۳ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۚ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔

"اگر اس قسم کی روش اختیار کرنے کی بجائے، منزل من اللہ صداقتوں پر ایمان رکھتے اور اس قسم کی تباہ کن روش سے بچتے، تو انہیں خدا کے ہاں سے وہ کچھ ملتا، جو اس سے کہیں زیادہ گراں بہا ہوتا جو یہ ان فریب کاریوں سے کماتے ہیں۔ اے کاش! ایسی صاف اور سیدھی بات ان کی سمجھ میں آجاتی ——— بات تو صاف اور سیدھی ہے لیکن انسان کی مفاد پرستیاں اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہیں۔ یہی کچھ ان لوگوں کے ساتھ ہوا تھا۔"

جادو کی حقیقت

اس کے بعد آخری گوشہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ سحر (جادو) کی حقیقت کیا ہے اور قرآن مجید کا اس باب میں موقف کیا؟ اس جلد کے پہلے باب میں بتایا جاچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کارگہِ کائنات کو پیدا کیا تو اس کے ساتھ ہی وہ قوانین بھی نافذ کر دیئے جن کے مطابق اسے سرگرمِ عمل رہنا تھا۔ ان قوانین کی اصل و بنیاد، قانونِ علت و معلول (LAW OF CAUSE AND EFFECT) ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ یہاں جو واقعہ بھی ظہور میں آتا ہے اس کا ایک سبب ہوتا ہے یا یہ کہ ہر عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ ان قوانین کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت انسان کے اندر ودیعت کر کے رکھدی گئی ہے۔ یہ جس قدر ان قوانین کا علم حاصل کرتا جائے گا، ہر واقعہ کا سبب اس کی سمجھ میں آتا جائے گا۔ نوعِ انسان کی ابتدائی زندگی میں اس نے ہنوز یہ علم حاصل نہیں کیا تھا اس لئے اسے یہ معلوم نہیں ہوسکتا تھا، کہ واقعات کا ظہور کس طرح سے ہوتا ہے۔ وہ دیکھتا تھا کہ ایک اچھے بھلے آدمی کو بخار ہوگیا لیکن اسے یہ معلوم نہیں ہوسکتا تھا کہ بخار کیوں ہوا؟ اس کا سبب کیا ہے؟ اور جب اس کا سبب ہی اس کو سمجھ میں نہیں آسکتا تھا تو اسے یہ بھی کس طرح معلوم ہوسکتا تھا کہ اس کا ازالہ کس طرح کیا جائے؟ یہی کیفیت، نت نئے دن، خارجی کائنات میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات کی تھی۔ واقعات اس کے سامنے آتے تھے لیکن ان کے اسباب کا اسے کچھ علم نہیں ہوتا تھا۔ ان حالات میں وہ اس کے سوا اور کیا کرسکتا تھا کہ اپنے ذہن میں کچھ غیر مرئی قوتوں کا خیال پیدا کرے اور یہ سمجھ لے کہ ان واقعات کی خالق وہ قوتیں ہیں۔ انہیں آپ دیوی دیوتا کہہ لیجئے۔ سیلاب آتا تو اس کا یہ خیال اس سے کہتا کہ پانی کے دیوتا کو غصہ آگیا ہے جس کا نتیجہ یہ سیلاب ہے۔ ان میں سے کچھ زیرک لوگ اِن رسوم کو سر انجام دیتے تھے۔ ان رسومات کا نام پوجا پاٹ، پرستش یا (WORSHIP.) تھا۔ ماہرینِ علم الانسان

(ANTHROPOLOGISTS) اسے "عہدِ پرستش" یا (AGE OF WORSHIP) سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ لوگ ان رسومات کو ادا کرتے تھے لیکن ان کے اپنے ہاتھ میں اقتدار کوئی نہیں تھا۔ جب ان کا ذہن آگے بڑھا تو انہوں نے ایک ایسا عقیدہ وضع کیا جس کی رو سے یہ قوت اور اقتدار ان کے ہاتھ میں آ گئے۔ وہ عقیدہ یہ تھا (مثلاً) کسی شخص کو بخار آتا تو وہ کہتے کہ کسی دشمن نے کوئی ٹونا ٹوٹکا کیا ہے۔ ہم ایسا منتر جانتے ہیں جس سے اس شخص کا بخار بھی اتر جائے اور ٹونا کرنے والے کا بھی ستیاناس ہو جائے اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ کہتے کہ ہمارے پاس ایسا علم بھی ہے جس سے ہم دیوتاؤں کو بھی مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ ہماری مرضی کے تابع چلیں۔ اس عقیدہ کی رو سے یہ زیرک لوگ رفتہ رفتہ بہت سی غیر مرئی قوتوں کے مالک بن گئے۔ اس طرح مذہبی پیشوائیت یا (PRIEST-CRAFT) کا آغاز ہوا۔ ماہرین علم الانسان اس دور کو، "دورِ سحر" (AGE OF MAGIC) کہہ کر پکارتے ہیں۔

انسان کی طبیعت عجوبہ پسند واقع ہوئی ہے۔ جو واقعات التزاماً اور معمولاً اس کے سامنے آتے رہتے ہیں اس کا ذہن ان سے مانوس ہو جاتا ہے اس لئے ان میں نہ کچھ اجنبیت محسوس کرتا ہے نہ ہی وہ اس کے لئے وجہ حیرت بنتے ہیں۔ لیکن جن واقعات کے اسباب اس کی سمجھ میں نہیں آتے وہ اس کے لئے بڑے تحیر انگیز اور تعجب خیز قرار پاتے ہیں اور وہ (بچوں کی طرح) ان میں بڑی کشش اور جاذبیت، بلکہ لذت و انبساط محسوس کرتا ہے۔ تاریخ انسانی کے اولین اوراق میں انسان کی یہ عجوبہ پسندی ہر مقام پر ابھری ابھری نظر آتی ہے گو وہ دور تو بعد میں ختم ہو گیا لیکن انسانی عجوبہ پسندی کا جذبہ اس کے ساتھ ختم نہیں ہوا۔ علم انسانی کے آگے بڑھنے کے ساتھ اس میں کمی ضرور واقع ہو گئی لیکن یہ یکسر معدوم نہیں ہو سکا۔ اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ جادو یا (MAGIC) کا لفظ آج بھی بڑے بڑے دانشوروں تک کے لئے کشش اور لذت اندوزی کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔

یوں تو (MAGIC) کا لفظ اشارہ کناں ہے کہ اس کی ابتدا مجوس (MAGIS) کے ہاں سے ہوئی لیکن عصرِ حاضر کی تحقیق کا رخ اس طرف ہے کہ اسے سب سے پہلے ایک باضابطہ علم یا فن کی صورت قدیم مصری مذہب نے عطا کی۔ وہاں سے یہ یونان کی طرف گیا اور اس کے بعد بابل میں (جو بعد میں) اس کا مشہور مرکز قرار پا گیا۔ یونان میں اس کی نسبت ایک افسانوی نام (HERMES TRISMAGISTUS) کی طرف کی گئی ہے۔ جہاں سے اسے (HERIMETIC SCIENCE) کا نام ملا ہے۔ یہ فن مشرق کے ظلمت کدوں میں ابھی تک اسی قدیم نقاب میں لپٹا چلا آتا ہے۔ لیکن ممالک یورپ میں سحر و نیرنجات (OCCUL-TISM) نے ایک سائنس کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے اور اس کی سوسائٹیاں مختلف مقامات پر موجود ہیں۔

علم سحر کے معتقدین کا عقیدہ یہ ہے کہ ہمارے حواس کی دنیا سے ماوراء، ایک عالم مثال (ASTRAL WORLD) ہے جس میں تمام موجوداتِ عالم (افراد و حوادث) کے عکس موجود رہتے ہیں۔ وہاں ماضی، حال اور مستقبل کی کوئی تخصیص نہیں۔ ماضی اور حال کے افراد و حوادث کی طرح مستقبل کے افراد و حوادث بھی اپنی عکسی صورت میں اس عالم مثال میں موجود رہتے ہیں اور وہاں سے اس کائنات کی طرف بھیجے جاتے ہیں۔ عالم مثال اور ہمارے اس حواس کی دنیا میں باہمی تعلق ایک آفاقی عامل (UNIVERSAL AGENT) کے ذریعے قائم ہے۔ (اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے ہمارے کرۂ ارض کے گرد ریڈیائی لہریں موجزن ہیں اور وہ ہر کہربائی حرکت کو ایک ثانیہ میں ہر مقام پر پہنچا دیتی ہیں) یہی وہ عامل ہے جو ایک شخص کے خیالات کی دنیا کو دوسرے شخص کے "عالم تخیل" سے مربوط کئے ہوئے ہے خواہ ان میں کتنا ہی بُعدِ مکانی کیوں نہ ہو۔ اب صرف کرنا یہ ہوتا ہے کہ اس عامل کو اپنا ہمنوا بنا لیا جائے۔ جو ایسا کرے، ماضی، حال اور مستقبل کی تمام قوتیں اس کے اشاروں پر ناچیں گی۔ اور وہ باتیں ظہور میں آئیں گی جو کسی کی عقل و فکر میں نہ آسکیں۔ اسی کا نام سحر، افسوں، طلسم، نیرنجات ہے۔ اس عامل سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے انسان کو اپنی داخلی قوتوں کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنا ضروری ہے۔ اور یہ ان ریاضتوں اور مشقتوں سے ہوتا ہے جو اس "سائنس" میں قدیم سے چلی آتی ہیں۔ یہ ہیں مختصر بنیادیں جن پر اس فن کی ساری عمارت قائم ہے۔ عام طور پر سمجھا یہی جاتا ہے کہ اس فن سے مقصود فقط شعبدہ بازی ہے لیکن اس کے معتقدین کا عقیدہ یہ ہے کہ شعبدہ بازی تو فقط راستے کے مناظر ہیں۔ یہ دراصل ادراکِ حقیقت کا ذریعہ ہے کیونکہ ان کے نزدیک حقیقت، وہی عالم مثال ہے اور اس کا ادراک اسی طریق سے ہوسکتا ہے۔ اس لئے قدیم زمانہ میں فنِ سحر نے ایک مذہبی حیثیت اختیار کر رکھی تھی۔ اور اب بھی مشرق میں اسے عام طور پر یہی حیثیت حاصل ہے۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ اس فن کی تمام تر بنیاد اس پر ہے کہ انسان اپنی داخلی قوتوں کو اس قدر نظم و ضبط میں لے آئے کہ اس سے اس قسم کی خلافِ معمول (خارقِ عادات) باتیں ظہور میں آنے لگ جائیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ "داخلی قوتیں" کیا ہیں جنہیں ایک نقطہ پر مرکوز کرنا ان کا مطمعِ نگاہ ہوتا ہے۔

علمائے نفسیات (PCYCHOLOGISTS) کی تحقیق ہے کہ انسان کی قوتِ متخیلہ یا قوتِ ارادی (WILL POWER) کو مختلف طریقوں سے بڑھایا جاسکتا ہے۔ غالب قوتِ ارادی والا انسان، اپنے سے کمزور قوتِ ارادی والے انسان کو اپنی قوت سے متاثر کرسکتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے حواس اس کی مرضی کے تابع کام کرنے لگ جاتے ہیں۔ یعنی اس کی آنکھیں وہی کچھ دیکھتی ہیں جو یہ دکھانا چاہے۔ اس کے

کان وہی کچھ سنتے ہیں جو یہ سنانا چاہے وقس علیٰ ہذا۔ انسان کے حواس اس کے ذہن کے تابع ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب آپ کسی گہری فکر میں مستغرق ہوں تو آپ کے سامنے سے کوئی گزر جاتے، آپ کو خبر تک نہیں ہوتی حالانکہ آپ کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں۔ اس لئے قوتِ غالب والا انسان دراصل کمزور قوت والے انسان کی دماغی قوت کو مغلوب کر لیتا ہے اور اس طرح اس کے حواس خود بخود اس کی قوت کے تابع کام کرنے لگ جاتے ہیں۔ اب اگر یہ چاہے کہ ایک پتھر کا ٹکڑا اُسے سونا بن کر دکھائی دے تو وہ اسے سونا ہی دیکھے گا اور سونا ہی سمجھے گا۔ یا یہ کہ اس کا دماغ درد کا احساس نہ کرے تو وہ اس کا احساس چھوڑ دے گا، جیسے کلوروفارم کے اثر کے ماتحت دماغ سے قوتِ احساس معطل ہو جاتی ہے۔ یہ ہے وہ بنیاد، جس پر سحر و افسوں کی تمام محیر العقول اور نگاہ فریب عمارت استوار ہے (STEINER) اپنی کتاب (THE WAY OF INITIATION) میں لکھتا ہے:-

ہر انسان میں ایسی مخفی قوتیں موجود ہیں جن کی رو سے وہ عالمِ بالا کا علم حاصل کر سکتا ہے۔۔۔۔۔۔ جب سے نوعِ انسانی کی ابتداء ہوئی ہے ایسے اسکول موجود رہے ہیں جن میں وہ لوگ، جن کی یہ قوتیں بلند سطح پر موجود تھیں، ان لوگوں کو یہ کچھ سکھاتے تھے جو اس کی تلاش میں تھے۔

فنِ سحر کا بہت بڑا محقق (ELIPHAS LEVI) لکھتا ہے:-

جس طرح جسمانی ورزشوں کے ذریعہ سے انسان اپنی جسمانی قوتوں کو محیر العقول درجہ تک لے جا سکتا ہے اور قائم رکھ سکتا ہے اسی طرح "روحانی" قوتوں کا حال ہے کیا آپ اپنے آپ پر اور دوسروں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں؟ اگر کرنا چاہتے ہیں تو یہ سیکھئے کہ اپنی قوتِ ارادی کو کس طرح استعمال میں لایا جاتا ہے۔ فنِ سحر کا سب سے پہلا راز یہی ہے اور اس راز کی بنیادوں کو محکم بنانے کے لئے قدیم استادانِ فن نے یہ طریق اختیار کر رکھا تھا کہ اپنی خانقاہوں کے اردگرد ایسی ایسی نگاہ فریب اور بھیانک صورتیں پیدا کر چھوڑتے تھے کہ جو شخص اگر اس فن کے سیکھنے کے لئے اس حلقہ میں داخل ہونا چاہتا، اس کی قوتِ ارادی کا پہلے ہی امتحان ہو جاتا اور اس کے بعد اسے ایسی ایسی مشقت آمیز ریاضتوں سے گزارا جاتا جن سے اس کی قوتِ محکم سے محکم تر ہوتی جاتی۔

ان بیانات کے پیشِ نظر (EVELYN UNDERHILL) نے اپنی کتاب (MYSTICISM) میں لکھا ہے "فنِ سحر کے دورِ حاضرہ کے استادوں کے نظریہ کی رو سے یہ فن اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ قوتِ ارادی کو اس

کی عام حدود سے آگے بڑھا دیا جائے۔ لہٰذا سحر کاری یہی ہے کہ ذہن کو خاص نظم وضبط کے ماتحت لاکر قوتِ ارادی کو ایک نقطہ پر مرکوز کر دیا جائے۔" جب قوتِ ارادی میں اس قسم کا نظم وضبط پیدا کر دیا جائے تو یہ کیا کیا کرشمے دکھا سکتی ہے، اس کے متعلق (E. TOWENE) اپنی کتاب (JOY-PHILOSOPHY) میں لکھتا ہے :-

ذرا تصور میں لائیے کہ یہ تمام کائنات اور ستاروں کا ہجوم سب کے سب چشم براہ ہیں کہ آپ انہیں کیا حکم دیتے ہیں۔ پھر تصور میں لائیے کہ آپ کو فقط ایک بٹن دبانا ہے اور اس کے بعد جو کچھ آپ کہیں گے یہ کریں گے۔ جونہی آپ نے کہا کہ میں یہ کچھ کر سکتا ہوں اور میں یہ کر کے دکھاؤں گا" کائنات کی تمام قوتیں آپ کے اشارے پر ناچنے کے لئے تیار ہوں گی۔

قوتِ ارادی کو بیدار اور مستحکم کرنے کے لئے عجیب و غریب طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ سب سے بڑی چیز اسے ایک نقطہ پر مرکوز کرنا (CONCENTRATION) ہے۔ اس کے لئے مراقبے کرائے جاتے ہیں۔ مختلف الفاظ اور فقرات کو خاص طریقوں سے دہرایا جاتا ہے۔ بڑی بڑی مشقتیں اور ریاضتیں اٹھانی پڑتی ہیں (LEVI) لکھتا ہے :-

یہ تمام شکلیں اور ان کی مثل حرکات وسکنات۔ یہ تمام اعداد وشمار اور حروف والفاظ، مقدس فقرے، منتر، تعویذ سب قوتِ ارادی کی تربیت کے ذرائع ہیں جن سے یہ قوتیں ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہیں اور اس طرح متخیلہ کی تخلیقی قوتوں کو محکم بنا دیتی ہیں۔ ایک عمل، خواہ وہ کتنا ہی توہم انگیز اور جہالت آمیز کیوں نہ نظر آتا ہو، مؤثر ہو سکتا ہے کیونکہ اس سے قوتِ ارادی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

عملیات کے ذریعے مریضوں کا علاج کرنے کے متعلق یہی محقق لکھتا ہے :-

عامل کی تمام قوت کا راز یہی قوتِ ارادی ہے اور اس کا کمال فقط یہ ہے کہ وہ مریض کے دل میں اپنی عقیدت پیدا کر دے۔

یہ ہے فنِ سحر کی بنیاد۔ یعنی قوتِ ارادی اور متخیلہ کے کرشمے۔ جس شخص پر اس قوت کو اثر انداز کیا جاتا ہے وہ، وہی کچھ دیکھنے اور سمجھنے لگ جاتا ہے جو کچھ اسے دکھایا اور سمجھایا جائے۔ یعنی جو کچھ اسے دکھائی دیتا ہے وہ فی الواقعہ ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ محض فریبِ نگاہ ہوتا ہے۔

یہودی اور باطنیت

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں "سحرِ بابل" کے عنوان میں بتایا جا چکا ہے، ان توہم پرستیوں کا آغاز تو بابل اور اس کے گرد و پیش کی سرزمین سے ہوا لیکن یہودی

اس سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔ شروع شروع میں انہوں نے اسے اس کے اصلی نام — سحر — (جادو) ہی سے پکارا لیکن جب یہ نام بدنام ہوگیا اور یہ شعبدہ بازی سمجھا جانے لگا تو ان کے احبار و رہبان نے ضروری سمجھا کہ اسے کوئی مقدس لبادہ اوڑھا دیا جائے۔ انہوں نے اسے باطنیت کہکر پکارا۔ انگریزی زبان میں اسے ——— (MYSTICISM) کہا جاتا ہے اور ہمارے ہاں یہ "تصوّف"[1] کے نام سے مشہور ہے۔ آئندہ سطور میں، ہم باطنیت اور تصوّف کو مرادف معنوں میں استعمال کریں گے۔ اس وضاحت کے ساتھ آگے بڑھیے۔

یہودیت ظواہر پرستی کا مذہب ہے۔ اس لئے اس میں باطنیت کی گنجائش بہت مشکل تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی پہلی تباہی کے بعد بابل کی اسیری کے زمانے میں، جب یہ قوم اپنے ضعف و انحطاط کی انتہا تک پہنچ چکی تھی، ان میں بھی کچھ کچھ باطنیت کے آثار نمودار ہونا شروع ہوگئے۔ چنانچہ اس دور میں ان کے "نبیوں" (PROPHETS) کے احوال وظروف کچھ ایسے ہیں جیسے باطنی خلوت گاہوں میں ارباب تصوّف کے ہوتے ہیں۔ اسی قسم کا اسلوبِ زندگی، وہی اندازِ گفتگو۔ اسی طرح کے مکاشفات اور الہامات۔ اسی نوع کی پیش گوئیاں۔ لیکن حقیقی تصوف ان میں اس کے بعد جا کر آیا جب ان کے مذہبی پیشواؤں نے اسکندریہ میں یونانی فلسفہ کا مطالعہ کیا اور وہاں اس فلسفہ اور اپنے معتقدات کے امتزاج سے ایک نیا مذہب ایجاد کیا۔ فیلو (PHILO) اس مذہب کا امام ہے۔ تصوف کا ابوالاباء درحقیقت افلاطون (PLATO) کو سمجھنا چاہیئے۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ علم السحر کے معتقدین کا عقیدہ یہ ہے کہ ہمارے حواس کی دنیا سے ماوراء ایک عالمِ امثال ہے۔ یہ تصور درحقیقت سب سے پہلے افلاطون نے پیش کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس عالمِ محسوس کے اوپر ایک عالمِ امثال ہے۔ وہ عالم حقیقی وجود رکھتا ہے اور یہ عالم محض اس کا پرتو ہے۔ اس عالم میں جو کچھ ہے اور جو کچھ ہوتا ہے اس کی حقیقت سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس حقیقی عالم کے متعلق علم، حواس کے ذریعے حاصل نہیں ہوسکتا، باطنی طریق سے حاصل ہوسکتا ہے۔ افلاطون کے اس فلسفہ کی نشاۃِ ثانیہ، بعد کے فلاسفروں کی ایک جماعت کے ہاتھوں ہوئی جن کا امام فلوطینس (PLOTINUS) تھا۔ ان فلاسفرز میں ایک (APOLLONIOUS OF TYANA) نے ہندوستان کا سفر کیا اور وہاں کے برہمنوں سے ویدانت (ہندی تصوف) سیکھا۔ فلاطینس، رومی لشکر کے ساتھ ایران گیا، اور وہاں کے مغوں سے مجوسی تصوف کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ان فلاسفروں نے فلاطینوس کی زیر سرکردگی افلاطون کے فلسفہ قدیم

---

[1] تصوف کے متعلق، ضمناً، جلد اول (آیات ۱/۱۵ ص۲۵ ؛ ۲/۱۱-۱۲ ص۲۳۴ ؛ ۲/۲۸ ص۳۵۱) اور جلد دوم (آیات ۲/۴۴ ؛ ۲/۵۵) میں ذکر آچکا ہے۔ یہاں ایک اور زاویۂ نگاہ سے اس کی تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔

کو، ان ہندی اور ایرانی تصورات کے ساتھ ملا کر، ایک جدید قالب میں ڈھالا۔ اس کا نام نوفلاطونی فلسفہ .... (NEO-PLATONISM) ہے۔ اس فلسفہ کا مرکز اسکندریہ تھا اور یہیں اس سے فیلو کا یہودی تصوف متاثر ہوا۔ اس تصوف کا سب سے پہلا اثر یہ تھا کہ تورات کی شریعت، باطنیت میں بدل گئی۔ چنانچہ یہودی تصوف کی سب سے اہم کتاب زہار میں ہے کہ:-

> تورات کی روح درحقیقت اس کے باطنی معنوں میں پوشیدہ ہے۔ انسان ہر مقام پر خدا کا جلوہ دیکھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ تورات کے باطنی معانی کا راز پا جائے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے لگ جائے۔

تورات کی شریعت، ہر بنی اسرائیل کے لئے کھلی تھی لیکن تورات کے باطنی معانی صرف خواص تک محدود ہو کر رہ گئے چنانچہ مثنا (کتاب "حقیقت") میں لکھا ہے کہ:-

> کتابِ پیدائش کے باطنی معنی کی تعلیم ایک وقت میں ایک سے زیادہ آدمیوں کو نہیں دی جانی چاہیئے، اس کی سخت ممانعت ہے۔ اور کتاب حزقیل کے پہلے باب کی تعلیم تو ایک آدمی کو بھی نہیں دینی چاہیئے تاوقتیکہ اس نے مقامِ ولایت حاصل نہ کر لیا ہو۔

ان کا عقیدہ یہ تھا کہ تورات کے اصلی معانی اس کے الفاظ سے نہیں مل سکتے۔ ان کی گہرائیوں تک پہنچنے کا ایک اور طریقہ ہے جو عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ وہ کہتے تھے کہ عبرانی زبان کے حروفِ ابجد میں عجیب و غریب تاثیر ہے اور انہیں خاص طریقوں سے اکٹھا کرنے اور دہرانے سے تورات کے الفاظ کے باطنی معانی معلوم ہو جاتے ہیں۔ نیز ایک سے دس تک کے عدد بھی یہی خواص و تاثرات رکھتے ہیں۔ ان حروف اور اعداد کے متعلق کتاب زہار میں ہے کہ:-

> خدا نے ان کے نقوش تیار کئے۔ پھر ان کے سانچے بنائے۔ ان کا وزن کیا۔ ان میں ادل بدل کیا۔ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ ملایا اور ان کے پر اسرار مجموعوں سے کائنات کی ہر شئے کی روح پیدا کی۔ چنانچہ کائنات میں جو کچھ بھی موجود ہے وہ بھی انہی کی قوت کے سہارے قائم ہے اور جو کچھ پیدا ہو گا، وہ بھی انہی کے ذریعے پیدا ہو گا۔

ان حروف اور اعداد کا باطنی علم، علمِ حقیقی ہے اور اس سے انسان پر، اسرار و رموزِ کائنات اور تورات کے حقیقی مفہوم کی راہیں کھلتی ہیں۔ جس پر یہ راہیں کھلتی ہیں اس سے عجیب و غریب کرامات صادر ہونے لگ جاتی ہیں چنانچہ ان کے

"ربانی صوفیوں" (RABBANIC MYSTICS) کی شعبدہ بازیوں کے عجیب و غریب قصے مشہور رہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ سبت کی شام، رموز کائنات کے حل کرنے میں مصروف ہوتے۔ بھوک لگتی تو ایک تین سالہ بچھڑا نمودار ہو جاتا جسے وہ کھا جاتے۔ وقس علیٰ ہذا۔ ان کے یہ ارباب تصوف اپنے ہاں کی الہامی کتابوں کی تاویلات اپنے ذاتی مکاشفات سے کرتے اور خوابوں کی تعبیرات سے زندگی کے مسائل کا حل بتاتے اور آنے والے واقعات کی خبریں دیتے۔ آپ نے دیکھا کہ عہد قدیم کا وہی سحر، کس طرح نئے روپ میں نمودار ہو گیا۔

جب عیسائیت کا ظہور ہوا تو یہ تصوف یہودیوں میں عام تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم (خدا کے سچے نبی کی تعلیم کی طرح) ان خرافات کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہودی پیشوا ان کی جان تک کے دشمن ہو گئے۔ لیکن ان کی تشریف براری کے بعد خود عیسائیت بھی کچھ بن کر رہ گئی۔ ایک تو اس لئے کہ جو لوگ عیسائی ہوئے تھے وہ پہلے یہودی ہی تھے اور دوسرے اس لئے کہ عیسائیت اپنے ابتدائی دور ہی میں سخت نامساعد حالات کا شکار ہو گئی، اس لئے اسے بہت جلد، مجاہدانہ سعی و عمل کو چھوڑ کر، تصوف کی قرارگاہ میں پناہ لینی پڑی۔ بہرحال، اب ہم عیسائیت کی طرف آتے ہیں۔

عیسائیت اور تصوّف

عیسائیت میں پہنچ کر باطنیت نے ایک منظم مسلک (ORGANISED SYSTEM) کی شکل اختیار کر لی۔ اب باقاعدہ خانقاہیں قائم ہو گئیں۔ ان کے قواعد و ضوابط وضع ہوئے۔ ان میں داخلہ کی شرائط مقرر ہوئیں۔ ان کے اندر زندگی بسر کرنے کے طور و طریق متعین ہوئے جن پر نہایت سختی سے پابندی لازمی ٹھہرائی گئی۔ اس "روحانی ترقی" کے لئے مختلف قسم کی ریاضتوں اور مشقتوں کے زینے تجویز ہوئے۔ جگہ جگہ مختلف اولیاء (SAINTS) نے اپنے حلقے اور مراکز قائم کئے اور اس طرح پورا مذہب باطنیت کی آماجگاہ بن گیا۔ اب ہر مقام پر اس قسم کے الفاظ دہرائے جانے لگے کہ:۔

> اگر تم حواس کے دروازے بند کر کے دل کی آنکھیں کھولو۔ اگر تم جسمانی لذائذ سے منہ موڑ کر روحانی کیفیات کا پیچھا کرو تو تم خدا کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لوگے۔ جب آدم اور حوا کی جسمانی آنکھیں کھلی ہیں تو ان کی روحانی آنکھیں بند ہو گئی تھیں لیکن اس کے بعد یسوع مسیح آیا کہ جن کی آنکھیں بند ہیں وہ دیکھنے لگ جائیں اور جو دیکھ رہے ہیں ان کی آنکھیں بند ہو جائیں۔ بس یاد رکھو! حواس کی آنکھیں بند اور دل کی آنکھیں کھولنے سے خدا اور اس کا اکلوتا بیٹا بے نقاب ہو کر سامنے آسکے گا۔
>
> (ST. ORIGEN)

اِس مقصد کے لئے ترکِ دنیا، ترکِ علائق، ترکِ خیالات، ترکِ آرزو، غرضیکہ "روحانیت" کے علاوہ ہر شے کا ترک، ضروری قرار پا گیا اور حقیقی زندگی اِسے سمجھا گیا جس میں انسان ہر وقت ——— گوش بند و چشم بند و لب بہ بند ——— کی حالت میں مراقبہ میں بیٹھا رموز و اسرارِ کائنات کے جلوے دیکھتا رہے۔

وہ عالمِ غیب، وہ دنیائے نور، وہ بلند سے بلند تر مقام، جہاں سادہ، غیر متبدل اور مطلق حقیقتیں، باطنیت کی مضمر خاموشیوں کی نورانی قباؤں میں لپٹی ہوتی ہیں۔ ان کے جلوے، دیدۂ ظاہر بیں سے نہیں دیکھے جا سکتے۔ انہیں دیکھنا چاہتے ہو تو اپنے حواس کو بھی پیچھے چھوڑ دو اور عقل و خرد اور شعور و ادراک کو بھی۔ یعنی ہر اس چیز کو جو عقل و حواس کے ذریعے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ خواہ وہ موجود ہے یا غیر موجود۔ سب کو چھوڑو اور اپنے آپ کو اس میں جذب کرنے کی کوشش کرو جو ان تمام حدود و قیود سے ماوراء ہے۔ یاد رکھو! اگر تم میں ان نسبتوں میں سے کوئی نسبت بھی باقی رہی جن سے وہ ماوراء ہے تو تم اس تک نہیں پہنچ سکو گے۔ اس کے نور کی شعاع، کامل تاریکی میں نظر آیا کرتی ہے، کامل تاریکی میں۔ (DONYSIUS)

اس کے لئے ترکِ دنیا، مرشد کی اطاعت، خاموشی اور انکساری اولین شرائط ہیں۔ (ST. BEDICT)۔ ان طریقوں سے ایک تارک الدنیا زاہد کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ:-

اِسے ایک نور کی چادر اوڑھا دی جاتی ہے۔ اس کے دل سے روشنی کی کرن پھوٹتی ہے جو اور زیادہ گہری اور تیز روشنی کی طرف اس کی راہنمائی کرتی ہے تاآنکہ وہ دریائے نور میں غرق ہو جاتا ہے۔ اب اسے اپنے آپ پر بھی کوئی اختیار نہیں رہتا۔ وہ دنیا داروں کی نگاہوں میں پاگل اور وحشی سا نظر آنے لگتا ہے لیکن درحقیقت وہ تکمیلِ نفس کی منزلیں طے کر رہا ہوتا ہے۔ اور تمام اسرار و رموز کے پردے اس کی آنکھوں سے اُٹھتے جاتے ہیں اور آخر الامر وہ خود حقیقتِ مطلق میں جذب ہو جاتا ہے۔ (ST-MACARIUS)

خدا اور انسانی روح کے باہمی تعلق کو (ORIGEN) "عروسی تعلق" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور ان کے دوسرے ولی (SAINTS) بھی اسے "آسمانی دلہن" (HEAVENLY SPOUSE) کہہ کر پکارتے ہیں۔ چونکہ اس طرح زہد و انزوا کی زندگی بسر کرنے والے، لوگوں کی نگاہوں میں بے حد مقبول اور واجب التعظیم قرار پاتے تھے اس لئے رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ لوگ فوج در فوج اس مسلک کی طرف بڑھنے شروع ہو گئے۔ چنانچہ چوتھی صدی عیسوی میں حالت یہ ہو چکی تھی کہ بستیاں خالی ہو رہی تھیں اور خانقاہیں آباد۔ شام اور فلسطین کے علاقے خاص طور پر اس مشرب خانقاہیت کے مراکز تھے۔

ہم نے یہاں، ایران اور ہندوستان کی باطنیت کا ذکر قصداً نہیں کیا۔ اس لئے کہ ہم "تصوف کی تاریخ نہیں لکھ رہے ہم بتانا صرف یہ چاہتے ہیں کہ سحر (جادو) کی توہم پرستیوں نے پہلے یہود و نصاریٰ کو اور اس کے بعد مسلمانوں کو کس طرح متاثر کیا، اور کس طرح، یہ چیزیں مذہب کی روح (دین کا مغز) بن کر ان تمام اہلِ مذاہب کے اعصاب پر مسلط ہوگئیں۔

قرآن اور باطنیت

جیساکہ بتایا جاچکا ہے، قرآن آیا اور اس نے آکر دانشگاف الفاظ میں بتایا کہ کائنات میں کوئی سِرّ مستور نہیں، کوئی راز خفی نہیں، کوئی باطنی علم نہیں خالقِ کائنات کے مقرر کردہ قوانین ہیں جن کی رو سے ہر معلول (EFFECT) ظہور میں آتا ہے۔ ان قوانین کا علم حاصل کرنا انسان کا فریضہ ہے۔ وحیٔ خداوندی نے اس حقیقت کا چھٹی صدی عیسوی میں پہلی مرتبہ اعلان نہیں کیا۔ اس نے سلسلۂ رشد و ہدایت کی داستان کا آغاز جس نبی کے تذکرہ سے کیا ہے اس کے ضمن میں اس حقیقت کی بھی وضاحت کر دی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ ابتدائے انسانیت کا دور تھا۔ اُسے آپ دورِ پرستش میں شمار کر لیجئے۔ یا عہدِ سحر میں، بہرحال تھا وہ انسانی جہالت کا دور، جس میں وہ ہنوز قانون کے تصور سے نا آشنا تھا۔ وہاں سیلاب آیا تو حضرت نوح ؑ نے یہ نہیں کہا کہ کسی دیوی دیوتا کی کف دہانیاں ہیں۔ نہ ہی یہ کہا کہ میں اسے اپنی کسی مخفی قوت کے ذریعے روک دیتا ہوں۔ انہوں نے وحی کے زیرِ ہدایت کشتی بنائی۔ کشتی اس قانونِ خداوندی کی مظہر ہوتی ہے کہ مساوی الحجم پانی کے ہٹنے سے، پانی پر تیرتی رہتی ہے۔ لہٰذا انہوں نے اس قانونِ خداوندی کی رو سے سیلاب کی تباہیوں سے بچاؤ کی صورت اختیار کی۔ وحی کا یہ سلسلہ جاری رہا اور قرآن کریم میں آکر تکمیل کو پہنچا جہاں اس نے قدم قدم پر بتایا کہ یہاں خدا کے غیر متبدل قوانین کی کار فرمائی ہے۔ کارگاہِ کائنات میں اعجوبہ پسندی اور شعبدہ بازی کو کوئی دخل نہیں۔ جہاں تک، انسان کی اپنی زندگی کا تعلق ہے اس کے لئے بھی اس کتابِ عظیم میں، واضح الفاظ میں راہنمائی کے لئے اصول و قوانین عطا کر دیتے ہیں ان میں بھی کوئی سِرّ مستور نہیں - - - - - کوئی راز پسِ پردہ نہیں۔ قرآن کریم، عربی زبان کی ایک واضح کتاب ہے جس کا مفہوم علم و بصیرت اور فکر و تدبر کی رو سے سمجھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس کتابِ عظیم کی ماننے والی قوم میں باطنیت کا تصور تک بھی بار نہیں پا سکتا تھا لیکن، آپ ہی نہیں، دنیا اس حیرت انگیز "حادثہ" پر انگشت بدنداں ہے کہ یہ قوم بھی باطنیت کا شکار ہوئی اور دیگر اہل مذاہب سے بھی کہیں زیادہ شدت کے ساتھ شکار۔ ہمارے ہاں اس باطنیت کو تصوف کہکر پکارا گیا۔[1]

---

[1] میں نے جادو۔ باطنیت۔ تصوف کے موضوعات پر اپنی مختلف تصانیف میں لکھا ہے۔ اس باب میں ان کا ملخص ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے۔

مسلمان اور تصوف جہاں تک اس لفظِ تصوف کا تعلق ہے اور تو اور خود صوفیاء بھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ اس کے بنیادی معانی کیا ہیں اور صوفی کو صوفی کیوں کہتے ہیں۔ بعض اس لفظ کو اصحابِ صفّہ کے نام سے ماخوذ سمجھتے ہیں یعنی (روایات کے مطابق) وہ صحابہؓ جو مدنی زندگی کے ابتدائی ایام میں پناہ گزینوں کی طرح بے سروسامانی کی حالت میں، مسجد نبویؐ کے ایک چبوترے پر رہا کرتے تھے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ صفا سے مشتق ہے۔ بعض اسے یونانی لفظ صوفیا (SOPHIE) سے ماخوذ سمجھتے ہیں جس کے معنے عقل و دانش کے ہیں اور جو فلسفہ (PHILOSOPHY) کی ترکیب میں شامل ہے لیکن اکثر کا خیال ہے کہ یہ لفظ اُون کی نسبت سے وضع کیا گیا ہے کیونکہ یہ لوگ اُون کے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں میں پہلا شخص، جو صوفی کے لقب سے مشہور ہوا، ابو ہاشم عثمان بن شریک تھا اور صوفیوں کی پہلی خانقاہ ۱۴۰ھ میں رملہ کے قریب (جو فلسطین میں واقع ہے) قائم ہوئی۔ ابو ہاشم کوفہ کا رہنے والا تھا۔ وہ وہاں سے اُٹھ کر رملہ کی خانقاہ میں آگیا۔ یہاں ۱۶۰ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ اگرچہ صوفیوں کی پہلی خانقاہ فلسطین میں قائم ہوئی جو عیسائیوں کے مسلکِ خانقاہیت کا مرکز تھا۔ لیکن تصوف کے بنیادی تصور کو اسلام میں ایرانیوں نے داخل کیا۔ مسلمانوں نے ایرانیوں کو جتنی بڑی شکست دی تھی وہ اس کا بدلہ جنگ کے میدان میں تھیں لے سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے دوسرے میدان تجویز کئے۔ وہ مسلمان ہو کر اسلامی مملکت کے بڑے بڑے شہروں میں آگئے اور یہاں پہنچ کر اپنے آبائی معتقدات کو عام کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کی قوت کا راز قرآن کی تعلیم میں ہے اس لئے وہ جانتے تھے کہ جب تک مسلمان کو قرآن سے بیگانہ نہ بنایا جائے اس کی قوت میں ضعف نہیں آسکتا۔ وہ قرآن کے الفاظ کو چھیڑ نہیں سکتے تھے اس لئے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا تھا اور اس کا انتظام بڑا پختہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس کے الفاظ تو وہی رہیں لیکن ان الفاظ کا مفہوم بدل جائے[1] اس کے لئے ایک طریقہ تو یہ تھا جسے (مثلاً جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے) مفسر طبری نے اختیار کیا۔ یعنی ہر آیت کی تفسیر کے لئے کوئی نہ کوئی روایت وضع کر لی اور اس آیت کے معنی اس روایت کی رو سے یہ کہہ کر کر دیئے کہ یہ معنی خود رسول اللہؐ نے بیان فرمائے ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم کے الفاظ تو وہی رہے لیکن ان الفاظ کا مفہوم کچھ سے کچھ ہو گیا۔ یہی مفہوم ہے جو ہمارے ہاں اس وقت سے آج تک متوارث چلا آرہا ہے۔ دوسری طرف انہوں نے یہ خیال پھیلانا شروع کر دیا کہ قرآن کے اصلی معنی اس کے الفاظ سے متعین نہیں ہو سکتے۔ اس کے الفاظ کے نیچے ایک باطنی مفہوم ہے جو قرآن کا مغز اور اس کی روح ہے۔ وضعی روایات کی رو سے قرآن کی تفسیر کا سلسلہ آگے نہیں

---

[1] تفصیل اس اجمال کی میری کتاب ــــ شاہکارِ رسالتؐ ــــ میں ملے گی۔

چل سکتا تھا، کیونکہ روایات جس قدر بنانی ممکن تھیں، اس زمانہ میں بن گئیں لیکن اس باطنی طریق سے تفسیر کا طریق ہمیشہ کے لئے جاری رہ سکتا تھا۔ چنانچہ یہ سلسلہ جاری رہا اور آج تک جاری ہے [1]۔ اس طریق سے اسلام کو جو نقصان پہنچا اس کے متعلق علامہ اقبالؒ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت (SUBTLE) طریق تنسیخ کا ہے اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلانِ طبیعت موجود تھا۔ اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصے تک اس کا نشو و نما ہونے نہ دیا تاہم وقت پاکر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا۔ بالفاظِ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے۔ (اقبال نامہ جلد اوّل صفحہ ۴۵)

اس مقام پر شاید بعض حضرات کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ قرآن کریم جیسی واضح، بیّن کتاب منیر کی موجودگی میں مسلمانوں میں اس قسم کے عقائد راسخ کیسے ہو گئے۔ اس کے لئے ایک بڑا خوبصورت اور "مقدس" طریقہ اختیار کیا گیا۔ (جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے) یہ کہا گیا کہ رسول اللہؐ کو وحی کے علاوہ الہام بھی ہوتا تھا۔ اسے وحی خفی یا وحی غیر متلو کا نام دیا گیا (واضح رہے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں مسلمان، ان اصطلاحات سے آشنا تک نہ تھے) اس عقیدہ نے دو کام کئے۔ ایک طرف ان روایات کو وحی کا درجہ حاصل ہو گیا جو قرآن کی تفسیر یا "اسلام کی تکمیل" کے لئے وضع کی جارہی تھیں اور دوسری طرف قرآن کے باطنی مفہوم کے لئے سند ہاتھ آگئی۔ اس کے علاوہ انہیں اس سے ایک اور بڑا فائدہ ہو گیا۔ ان لوگوں کو خدشہ یہ تھا کہ اربابِ شریعت کی طرف سے باطنی مفہوم کی مخالفت ہو گی، لیکن جب اربابِ شریعت نے اس اصول کو مان لیا کہ رسول اللہؐ کو وحی کے علاوہ الہام بھی ہوتا تھا اور ختمِ نبوت کے معنی سلسلۂ وحی کا ختم ہو جانا ہے، نہ کہ سلسلۂ الہام کا۔ تو وہ اصولاً اہلِ باطن کی مخالفت کر ہی نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ اس قسم کی روایات خود ہماری کتبِ احادیث میں موجود ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ رسول اللہؐ نے مجھے دو برتن

---

[1] باطنی معانی کی رُو سے قرآنِ کریم کی متعدد تفاسیر لکھی گئیں۔ اس مسلک کے سرخیل "شیخ اکبر" محی الدین ابن عربی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے باطنی معانی پر مشتمل ساٹھ جلدوں میں تفسیر لکھی تھی۔

عطا فرمائے تھے۔ ایک کو تو میں نے کھول کر عام کر دیا ہے (یہ شریعت کا علم ہوا) لیکن اگر دوسرے کو کھول دیتا تو میری شاہ رگ کاٹ دی جاتی (یہ ہوا باطن کا علم جو سینہ بسینہ آگے چلتا ہے) باقی رہیں خانقاہوں کی ریاضتیں، سو ان کے لئے اس قسم کی وضعی روایات موجود ہیں کہ رسول اللہ نبوت سے پہلے، پانی اور ستو لیکر غار حرا میں تشریف لے جاتے تھے اور وہاں کئی کئی روز تک مصروف مراقبہ رہتے تھے۔ انہیں ریاضتوں کا نتیجہ خدا کی طرف سے وحی کا ملنا تھا۔ یہ تھے وہ حربے، جن سے، قرآن کے علی الرغم، باطنیت جیسا قرآن دشمن عقیدہ عام ہوتا چلا گیا۔

دوسری طرف یہودیت اور نصرانیت کے تصوف نے پہلے ہی سے فضا کو ان خیالات سے معمور کر رکھا تھا۔ جو یہودی یا نصرانی مسلمان ہوئے انہوں نے اس کو اپنے قدیمی رجحان کے عین مطابق پایا اس لئے انہوں نے اسے لپک کر گلے سے لگا لیا۔ نتیجہ یہ کہ تیسری ہجری میں خود مسلمانوں میں اسی زور شور سے خانقاہیں کھلنی شروع ہو گئیں جس طرح اس سے پہلے عیسائیوں کے ہاں ہوا تھا۔

اگر تصوف کے سلسلہ کی ابتدا ان لوگوں کے نام سے کی جاتی جنہوں نے فی الحقیقت اس کی ابتدا کی تھی تو ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ خیال گذرتا کہ یہ ان کی اپنی اختراع تھی۔ اس کیلئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ ان حضرات نے باطنی طور پر سلسلہ بسلسلہ رسول اللہ سے فیض حاصل کیا تھا اور چونکہ یہ تصور ایرانیوں کا پیدا کردہ تھا اس لئے اس میں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی نمایاں طور پر درمیان میں لایا گیا، اور انہیں "شاہ ولایت" کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔ اب صوفیوں کے مختلف "شجروں" کا منتہیٰ حضرت علیؓ ہی قرار پاتے ہیں۔ مثلاً حضرت جنیدؒ مرید تھے حضرت سری سقطیؒ کے۔ سری سقطیؒ مرید تھے خواجہ حسن بصریؒ کے اور خواجہ حسن بصریؒ مرید تھے حضرت علیؓ کے، جنہوں نے یہ باطنی علم رسول اللہ سے حاصل کیا تھا۔ حالانکہ تاریخ میں اتنی شہادت بھی نہیں ملتی جس سے یہ مترشح ہو کہ خواجہ حسن بصریؒ کی ملاقات کبھی حضرت علیؓ سے ہوئی تھی۔ لیکن یہ باتیں تو اہل ظواہر کی ہیں۔ صوفیاء کے نزدیک زمان و مکاں کا بعد کچھ حیثیت نہیں رکھتا اور سب کچھ بیٹھے بٹھلاتے، ایک لمحہ میں ہو جاتا ہے۔ مثلاً چوتھی صدی ہجری میں حضرت جنیدؒ کے ایک مرید نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ان کے پیر و مرشد کو خرقہ تصوف حضرت انس بن مالکؓ سے ملا تھا جو رسول اللہ کے صحابی تھے، حالانکہ حضرت جنیدؒ تیسری صدی کے ہیں۔ ان کی وفات (۲۹۸ھ) میں ہوئی تھی۔

آپ نے دیکھا کہ وہی عہد قدیم کا سحر (MAGIC)، مسلمانوں سمیت، تمام دنیا کے اہل مذاہب پر کس طرح اکاس بیل کی طرح مسلط ہو گیا، اور مسلط چلا آرہا ہے۔ اس کے صرف چوے بدلے گئے ہیں، حقیقت ہر مقام پر وہی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں ؛ اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

قرآن کریم کا نزول عربی زبان میں ہوا۔ یہ حقیقت بڑی حیرت انگیز ہے کہ اگرچہ دنیا کی دیگر توہم پرست قوموں کی طرح عربوں میں بھی سحر (جادو) کا عقیدہ عام تھا لیکن اس کے باوجود وہ اسے سمجھتے تھے جھوٹ اور فریب ہی۔ چنانچہ اربابِ لغت نے کہا ہے کہ اس مادہ (س ۔ ح ۔ ر) کے بنیادی معنے موڑنے توڑنے کے ہوتے ہیں اور اس سے مطلب ہوتا ہے باطل کو حق کی صورت میں پیش کرنا۔ دوسرے مقام پر ہے کہ اس کے اصلی معانی کسی چیز کو اصل حقیقت سے غیر حقیقت کی طرف پھیر دینے کے ہیں۔ صاحب تاج العروس نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایسا دھوکہ ہے جس میں پتہ نہ چلے کہ دھوکہ کس طرح دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد یہ لفظ عام دھوکے کے معانی میں بھی استعمال ہونے لگا۔[1] سَحَرَہٗ وَ سَحَّرَہٗ کے معنی ہیں اس کو دھوکہ دیدیا۔ قرآن کریم میں یہ لفظ انہیں معانی میں استعمال ہوا ہے، اور جادو کے معانی میں ان مقامات پر آیا ہے جہاں دوسروں نے اسے ان معانی میں استعمال کیا — داستانِ حضرت موسیٰ علیہ السلام میں یہ لفظ تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ اس مقام پر ہم بتائیں گے کہ وہاں نہ ساحرین کے معنے جادوگر کے ہیں اور نہ ہی وہ معرکہ جادو کی شعبدہ بازیاں دکھانے کا تھا۔ وہ دین حقہ اور باطل پر مبنی مذہب کے درمیان دلائل و براہین، پر مبنی ایک مناظرہ تھا۔ بہرحال اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

زیرِ نظر آیت (۲/۱۰۲) میں واضح الفاظ میں کہا گیا ہے: وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (۲/۱۰۲) "شیاطین لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے تھے اور یہ کفر تھا" لیکن ہمارے ہاں ایسی روایات وضع ہوئیں جن سے یہ ثابت کیا گیا کہ جادو ایک حقیقت ہے اور اپنا اثر رکھتا ہے اور اس کے لئے

رسول اللہ پر جادو

(یہ لکھتے ہوئے ہماری روح کانپتی ہے کہ) اس کا ہدف خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو بتایا گیا۔ ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن، کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ وہ اس میں قرآن کریم کی آخری دو آیات کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> صلح حدیبیہ کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو محرم ۷ھ میں خیبر سے یہودیوں کا ایک وفد مدینہ آیا اور ایک مشہور جادوگر سے ملا اور اس سے کہا کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ تمہیں معلوم ہے۔ ہم نے ان پر بہت جادو کرنے کی کوشش کی مگر کوئی کامیابی

---

[1] حوالوں کے لیے دیکھئے میری لغات القرآن مادہ (س-ح-ر)۔

نہیں ہوئی۔ اب ہم تمہارے پاس آئے ہیں کیونکہ تم ہم سے بڑے جادوگر ہو۔ لو یہ تین اشرفیاں حاضر ہیں انہیں قبول کرو اور محمدؐ پر ایک زور کا جادو کرو۔ اس زمانے میں حضور کے ہاں ایک یہودی لڑکا خدمت گذار تھا۔ اس سے ساز باز کر کے ان لوگوں نے حضورؐ کی کنگھی کا ایک ٹکڑا حاصل کر لیا جس میں آپ کے موئے مبارک تھے۔ انہی بالوں اور کنگھی کے دندانوں پر جادو کیا گیا۔ ۔ ۔ ۔ آپ پر اس جادو کا یہ اثر ہوا کہ آپؐ گھلتے چلے جا رہے تھے۔ کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کر لیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا تھا، اپنی ازواج کے متعلق خیال فرماتے کہ آپؐ ان کے پاس گئے ہیں، مگر آپ نہیں گئے ہوتے تھے اور بعض اوقات آپ کو اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھا ہے، مگر نہیں دیکھا ہوتا تھا۔

(تفہیم القرآن جلد ششم صفحہ ۵۵۴)

یہ افسانہ کھلے بندوں پکار رہا ہے کہ یہ یہودیوں کا وضع کردہ ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ قرآنِ کریم میں کہا گیا ہے کہ: اِذۡ یَقُوۡلُ الظّٰلِمُوۡنَ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسۡحُوۡرًا (۱۷/۴۷) "ان ظالموں کی طرف دیکھو کہ یہ جماعت مومنین سے کہتے ہیں کہ تم ایسے شخص کا اتباع کرتے ہو جس پر جادو کیا گیا ہے" اس کے بعد خدا کا ارشاد ہے: اُنۡظُرۡ کَیۡفَ ضَرَبُوۡا لَکَ الۡاَمۡثَالَ فَضَلُّوۡا فَلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ سَبِیۡلًا (۱۷/۴۸) "اے رسولؐ! دیکھو کہ یہ بدبخت تمہارے خلاف کس کس قسم کی بہتان تراشیاں کرتے ہیں۔ یہ ایسے گمراہ ہیں کہ صحیح راستے کی طرف آنے کی استعداد ہی کھو بیٹھے ہیں"۔ آپ دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ ان مخالفین کی بہتان تراشیاں تھیں جو کہتے تھے کہ حضورؐ پر جادو کیا گیا ہے اور ہماری تفاسیر یہ کہہ رہی ہیں کہ مخالفین کا الزام بالکل صحیح تھا۔ رسول اللہؐ پر واقعی (معاذ اللہ) جادو کیا گیا تھا اور اس کا اثر بھی آپ پر ہو گیا تھا۔ اثر بھی اس حد تک کہ آپ اندر ہی اندر گھلتے چلے جا رہے تھے اور حافظہ اس حد تک بگڑ چکا تھا کہ وہ خیال فرماتے کہ ایک کام کر دیا گیا حالانکہ وہ نہیں کیا ہوتا تھا (مثلاً) حضورؐ نے نماز نہیں پڑھی ہوتی تھی لیکن اپنے دل میں خیال کر لیتے تھے کہ میں نماز پڑھ چکا ہوں حتیٰ کہ آپ کو ایسی چیزیں نظر آنے لگ گئی تھیں جو فی الواقعہ موجود نہیں ہوتی تھیں۔ آپ سوچیے کہ یہ کتنی بڑی سازش تھی جو اس قسم کی روایات وضع کرنے کی شکل میں کی گئی۔ افسوس ان دشمنوں پر نہیں، ان کا تو زندگی کا مشن ہی یہ تھا، افسوس تو اس پر ہے کہ ہم روایات کو مقدس غلافوں میں لپیٹے، ہزار برس سے اپنے سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں اور آج بھی انہیں دنیا کے سامنے قرآنِ کریم کی تفسیر کی شکل میں پیش کرتے ہیں!

یہی نہیں کہ اس قسم کی وضعی روایات ہماری کتبِ احادیث و تفاسیر میں داخل ہو چکی ہیں۔ ہم جادو کو مانتے

ہیں اور اس پر عمل پیرا بھی ہوتے ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ ہم اسے جادو نہیں کہتے۔ ہم نے اس کے بڑے مقدس نام رکھ لئے ہیں۔ یہ درود و وظائف، یہ گنڈے تعویذ، یہ مراقبے اور ریاضتیں اسی حقیقت کے مظاہر نہیں تو اور کیا ہیں!

تعویذ اور وِرد وظیفے

اور پھر ان کی تقدیس، گوسالۂ سامری کی طرح اس طرح ہمارے دل کی گہرائیوں میں حلول کر چکی ہے کہ ہم اسے سننا تک بھی گوارا نہیں کرتے کہ انہیں سحر (جادو) کہدیا جائے۔ اگر ان سے کہا جائے کہ ایسا کچھ تو کفار اور مشرکین بھی کرتے رہتے ہیں، وہ بھی گنڈے تعویذ دیتے ہیں، دم کرتے ہیں، شعبدے دکھاتے ہیں، پھر ان میں اور ان میں فرق کیا ہے، تو اس کے جواب میں یہ کہکر اپنے آپ کو فریب دے لیا اور دوسروں کو فریب دے دیا جاتا ہے کہ وہ "کالا علم" ہے اور یہ "نوری علم"۔ حالانکہ اس میں کالے اور نوری کا سوال ہی نہیں۔ اس کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ الفاظ یا اعداد میں خاص قوت ہوتی ہے۔ انہیں خاص طریقے سے دہرایا یا لکھا جائے تو وہ اپنا اثر پیدا کر دیتے ہیں خواہ الفاظ کچھ بھی ہوں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ یہ ایک فن ہے جسے ہر انسان بلا لحاظ عقیدہ و مسلک حاصل کر سکتا ہے۔ مختلف اقوام میں اس کے حصول کے مختلف طریقے ہیں چونکہ جن لوگوں سے اس قسم کی محیرالعقول باتیں سرزد ہوتی تھیں انہیں بڑی بڑی فوق الفطرت قوتوں کا حامل سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے ان قوتوں کی تقدیس و عظمت دلوں میں گھر کر جاتی تھی۔ لہٰذا ازمنۂ قدیم سے اس قسم کی قوتیں اور مذہبی تقدیس لازم ملزوم چلی آتی ہیں۔ ہندوؤں کے جوگی، بدھوں کے لاما، یہود و نصاریٰ کے رہبان اور دوسرے مذاہب کے فقیر منش لوگ، جو ان قوتوں کو حاصل کرتے ہیں ہمیشہ مذہبی احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ ان باتوں کو مذہب کا انتہائی مقام قرار دیدیا گیا۔ اس لئے اس قسم کے لوگ انتہائی عزت و تکریم کے مستحق قرار پاگئے اور شرفِ انسانیت کے تمام شعبے اس سے ادنیٰ درجے پر رہ گئے۔ اسی وجہ سے یہ چیزیں زیادہ عام ہوگئیں اور عظمت و عقیدت کے حصول کا آسان ذریعہ قرار پا گئیں۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ ان تمام لوگوں نے اسے دیدہ دانستہ، دنیاوی مقاصد کے حصول کی خاطر، بطور مکر و فریب اختیار کیا تھا۔ ایسے لوگ بھی تھے جو اسے فی الواقعہ مذہب کا انتہائی مقام سمجھتے تھے اور یہی سمجھ کر انہوں نے اسے اختیار بھی کیا تھا۔ لیکن اس سے بھی اس کی حقیقت نہیں بدل سکتی۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے یہ ایک فن ہے اور ہر شخص بطور فن اس کی تحصیل کر سکتا ہے۔ اگر ایک مسلمان، تا بہ کمر پانی میں کھڑا ہو کر، سورۃ یٰس کی بعض آیات کا ورد کرکے کچھ خاص قسم کی قوت حاصل کر سکتا ہے تو ایک ہندو جوگی، اپنے طریق پر، وید کے کسی منتر سے ویسی ہی قوت حاصل کر سکتا ہے۔ آپ ان کا نام مختلف

رکھ لیجئے۔ اسے کالا علم اور اُسے نوری علم کہہ دیجئے لیکن جہاں تک اس فن کا تعلق ہے حقیقت دونوں کی ایک ہے۔ یہ سب قوتِ ارادی کی تنظیم و انضباط کے ذرائع ہیں۔ بقول (UNDERHILL) "اس باب میں ذرائع کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اصل چیز تو قوتِ ارادی کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنا ہے" (MYSTICISM P-158)۔[۱] وظیفہ، گنڈہ تعویذ یا قرآنی آیات کے عملیات کو دین سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ سب قوتِ ارادی کو مجتمع کرنے کے لئے مختلف ذرائع ہیں اور ان کے نتائج (مثلاً امراض کا علاج وغیرہ) اسی قوت کے کرشمے۔ مشرق میں یہ طریقے بڑے مخفی رکھے جاتے تھے (اور ابھی تک رکھے جاتے ہیں) لیکن مغرب نے اسے ایک سائنس کی حیثیت سے عام کر دیا ہے۔ امریکہ میں ——— (MENI—CULTURE ; NEW THOUGHT اور NEW CONSCIOUSNESS) کے سکول اور یورپ میں مختلف سوسائٹیاں اپنے اپنے طریقوں پر یہ سب کچھ سکھاتی پڑھاتی ہیں۔ لہٰذا اسے قرآنی آیات کے "عمل" سے حاصل کیجئے یا یوگ کے ذریعے۔ یورپ کی سوسائٹیوں سے سیکھئے یا امریکہ کی تنظیموں سے۔ نتیجہ ہر صورت میں وہی برآمد ہوگا۔ لیکن جب آپ اسے دین، اور دین کا بھی[۲] نچوڑ قرار دیں گے، اور وجہِ افضلیت خارق عادات باتیں تسلیم کریں گے۔ تو مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلم (مثلاً ہندوؤں کے جوگی، سنیاسی) ایسے ایسے محیر العقول شعبدے دکھائیں گے جن کا جواب نہیں بن پڑے گا۔ آئے دن آپ اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں کہ فلاں مقام پر فلاں جوگی نے اس قسم کی محیر العقول بات دکھائی اور فلاں مقام پر اس قسم کی۔ لہٰذا اگر کسی مذہب کی حقانیت کی دلیل اس کے پیروؤں کے خارق عادات شعبدے ہیں تو دنیا میں اسلام کی برتری کا ثبوت مشکل ہو جائے گا۔ باقی رہا یہ کہ آپ کے ہاں کے شعبدے کرامات ہیں اور دوسروں کے شعبدے محض سحر کاری کی "شیطنت"۔ تو یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ دوسرے لوگ یہی کچھ آپ کے متعلق کہہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم، اس اسلام کو، جس میں زندگی اور حرارت پائی جائے، صحیح اسلام قرار نہیں دیتے بلکہ صحیح اسلام اسے قرار دیتے ہیں جس میں اس قسم کی "روحانیت" کے کرشمے پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ غیر مسلموں کی طرف سے مسلمانوں کے پیروں اور فقیروں یعنی "روحانی

---

[۱] (WHITE) اپنی کتاب (THE OCCULT SCIENCE) میں تفصیل کے ساتھ لکھتا ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے مختلف ریاضتیں، مراقبے اور وظائف کس طرح ایک ہی قسم کے نفسیاتی اثرات پیدا کرتے ہیں۔

[۲] شریعت اور طریقت کی باہمی آویزش کے مباحث پر نگاہ ڈالئے، ہر مقام پر طریقت کا پلڑا جھکا ہوا دکھائی دے گا۔ اہلِ طریقت و معرفت کا بالعموم دعویٰ یہ ہے کہ شریعت محض ظاہری اعمال کا نام ہے "روحانیت" جو مذہب کی غایت ہے، انہی کے ہاں ہے اور اس کا ثبوت اسی قسم کی خارق عادات باتوں سے پیش کیا جاتا ہے۔ جنہیں کرامات کہکر پکارا جاتا ہے۔

بزرگوں" کی عام طور پر تعریفیں کی جاتی ہیں اور بہت سے غیر مسلم ان کے معتقدین کے حلقہ میں داخل ہو جاتے ہیں لیکن وہ مسلمانوں کے ان جلیل القدر مشاہیر کو کبھی بنظرِ استحسان نہیں دیکھیں گے جنہوں نے دین کو ایک عملی نظام کی حیثیت سے نافذ کیا تھا۔ اس لئے کہ "روحانی بزرگوں" کو اسلام کا سچا پیرو قرار دیکر وہ غیر اسلامی مذہب کو اسلام سے برتر نہیں تو کم از کم اس کے برابر ثابت کر سکتے ہیں اور اس طرح اس دعویٰ کا بلند آہنگی سے اعلان کر سکتے ہیں کہ "تمام مذاہب اپنی بنیادی صداقتوں کی رُو سے یکساں ہیں"۔ لیکن دین کو ایک نظامِ زندگی قرار دیکر ایسا دعوٰی اور اس کا ثبوت ممکن نہیں۔

لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس باب میں زیادہ طول طویل بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا قرآن کریم نے بھی اپنے متعلق یہ کہا ہے کہ میری فلاں آیت یا فلاں لفظ کو اتنی مرتبہ دہرا لینے سے فلاں نتیجہ برآمد ہو جائے گا؟ جب قرآنِ کریم نے اپنے متعلق یہ نہیں کہا تو قرآن کا یہ مصرف انسانی دماغ کے اختراع کے سوا اور کیا ہوگا؟ باقی رہا یہ کہ "صاحب! جب ایسا کرنے سے یہ نتائج ہمارے سامنے آجائیں تو قرآنی آیات و الفاظ میں ان قوتوں کی موجودگی کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو گی؟" لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ فرض کر لینا حقیقت سے چشم پوشی ہے کہ یہ نتائج محض قرآنی آیات و الفاظ کے اوراد و وظائف سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ تجربہ شاہد ہے کہ غیر قرآنی (اور بعض اوقات بالکل مہمل) الفاظ و کلمات سے، ایسے بلکہ اس سے بھی زیادہ محیر العقول نتائج مرتب ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اس قسم کے نتائج، خواہ قرآنی الفاظ سے مرتب ہوں یا غیر قرآنی سے۔ بہر حال قوتِ ارادی کی کرشمہ سازیوں کا ہی نتیجہ ہیں جو اکتسابی طور پر ہر شخص حاصل کر سکتا ہے۔ اور قرآن کریم سے اس کی کوئی سند نہیں مل سکتی۔

اس مقام پر ایک بڑی دلچسپ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے جس کا ذکر کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہمارے ہاں اہل سنت والجماعت کے تین فرقے مشہور ہیں۔ اہل حدیث، اور اس کے مقابلے میں اہل فقہ۔ پھر اہل فقہ دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں دیوبندی اور بریلوی۔ اہل حدیث، کہتے ہیں کہ وہ اس قسم کی توہم پرستیوں کو بدعت قرار دیتے ہیں اور سخت گمراہی۔ بریلوی حضرات (اہل حدیث کی رو سے) بدعتی کہلاتے ہیں کیونکہ وہ اس قسم کی توہم پرستیوں کو مانتے ہیں۔ دیوبندی حضرات کا دعوٰی ہے کہ وہ اس قسم کی توہم پرستیوں پر عقیدہ نہیں رکھتے۔ لیکن ورد و وظائف، گنڈے، تعویذ ان کے ہاں بھی عام ہیں۔ دیوبند سے شائع ہونے والے رسالہ "خالد" میں ان کے کسی بزرگ کی کتاب۔ عطاء المنان — کا ترجمہ

مسلسل شائع ہوا کرتا تھا جس میں بڑے بڑے جلیل القدر بزرگانِ دین کے "عملیات" درج تھے۔ مثلاً ایک عمل یہ تھا:-

"الٰہی بحرمۃ یملیخا۔ کملیخا۔ کشفوطا۔ کشا فطیونس۔ تبونس۔ اذر فطیزنی۔ یوانس بوش وکلبہم قطمیر وعلی اللہ قصد السبیل و منہا جائر ولو شاء لہدٰکم اجمعین۔ ایک تعویذ یہ تھا: ہٹی ہٹی ہٹی ہٹی ہٹی ہٹی ہٹی ہٹی (بچوں کے گلے میں ڈال دیا جائے) ایک اور عمل تھا: بسم اللہ علیقہ بلیقہ۔ ثلیقہ۔ تلیقہ۔ بحق لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ وعلی ولی اللہ (فائدہ) بغرضِ اجرائے حاضرات ایک چلتا ہوا عمل ہے۔

آپ غور فرمایئے کہ جب اس قسم کے مہمل الفاظ و کلمات سے بھی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں تو پھر کالے علم اور نوری علم میں فرق کیا ہے! جہاں تک "نوری علم" کا تعلق ہے، ان حضرات (دیوبندی) کے ہاں سے "عملیاتِ قرآنی" پر اکثر کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں جن میں یہ بتایا جاتا ہے کہ قرآن کریم کی فلاں آیت کا ورد کرنے سے یہ اثر ہوتا ہے اور فلاں تعویذ لکھنے سے یہ اثر۔

قرآنِ کریم نے عمل پر بڑا زور دیا ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ — عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی لیکن اب "عامل" سے مراد قرآن کریم کے مطابق اعمالِ صالحہ کرنے والا نہیں لیا جاتا۔ اس سے مطلب ہوتا ہے تعویذ، گنڈے، ورد وظیفے کرنے والا۔ "اعمال قرآنی" کے موضوع پر کتابوں میں قرآنی آیات کے وظیفے اور تعویذ لکھے ہوتے ہیں اور ان کتابوں کے مصنف بڑے بڑے عالم اور بزرگ ہوتے ہیں۔ چونکہ اس قسم کے "عمل"، بالعموم تکیوں، دائروں میں کئے جاتے ہیں جہاں "عالم لاہوت کی سیر کرنے کے لئے" نشے میں مدہوش ہوا جاتا ہے۔ اس لئے نشہ کے لئے بھی "عمل" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مثلاً جب، پوچھا جائے کہ وہ کونسا "عمل کرتا ہے" تو اس کے معنی ہوتے ہیں وہ کون کون سے نشہ کا عادی ہے۔ یہ وہ مقام، جہاں ہمیں "باطنیت" نے پہنچا دیا ہے۔ انہیں جہلاء کی باتیں کہہ کر مسترد کر دیا جائے گا۔ لیکن (جیسا کہ ہم نے ابھی کہا ہے) "اعمال قرآنی" پر مشتمل کتابیں تو بڑے بڑے جید علماء کی تصنیف کردہ ہیں اور تعویذ گنڈے ہمارے ہاں کے چوٹی کے عالموں کے ہاں سے ملتے ہیں۔ جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ قرآنی آیات پر مبنی ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب اقبالؒ نے کہا تھا کہ:-

مکتب و ملا و اسرارِ کتاب   کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب

تو اس سے انہوں نے اس بلند حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت اس کا احساس ہی نہیں کر سکتی کہ قرآن کا مقام کیا ہے۔

قرآن کی عظمت

جس شخص کے قلبِ سلیم کو اللہ تعالیٰ نے متاعِ ایمان سے بہرہ یاب اور اس کی نگاہوں کو نورِ بصیرت سے سرفراز فرمایا ہو، وہ جب خدائے حی و قیوم کی اس زندہ و پائندہ کتاب کی عظمتوں پر نگاہ ڈالتا ہے تو اس کے جبروت و جلال کے سامنے تھرتھرا اٹھتا ہے۔ اس عظیم المرتبت ضابطۂ خداوندی کی شوکت و سطوت کے پیشِ نظر اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ اس سراجِ منیر کی درخشندگی کو دیکھ کر اس کی نگاہوں میں خیرگی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جب تدبر و تفکر سے اس کی گہرائیوں میں اترتا ہے تو حقائق و معارف کی ایک نئی دنیا اس کے سامنے جلوہ بار ہوتی ہے۔ اگر کسی کتاب کی رفعتِ شان کا اندازہ اس کے "مصنف" سے لگایا جا سکتا ہے تو اس کتابِ حکیم کی بلندیٔ منزلت کا کیا پوچھنا جس کا "مصنف" خود خدائے علیم و بصیر ہو۔ اگر اس کی تقدیس کا جائزہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا محمل کون ہے تو اس کتابِ مقدس و مبارک کا کیا کہنا جس کا مہبط اس ذاتِ اقدس و اعظم کا قلبِ منور تھا جو معراجِ انسانیت کی مظہرِ اتم تھی۔ اگر اس کتاب کی عظمت کا اندازہ اس کے مشمولات سے کیا جا سکتا ہے تو اس زندہ و پائندہ کتاب کے علوِ مرتبت کا کیا ٹھکانہ جس کے اصولوں کے ماتحت نظامِ کائنات سرگرمِ عمل ہو اور جس کے قوانین، اقوام و مللِ عالم کی موت و حیات کے فیصلے کر رہے ہوں۔ اور پھر اگر اس نسخۂ تکوینِ حیات کی ارجمندی کی قدر و قیمت اس کی تعلیم کے نتائج سے پہچاننی ہو تو اس کے متعلق پوچھئے سرزمینِ عرب کے ان ذرات سے، جنہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کس طرح ایک، اونٹ چرانے والی بادیہ نشین قوم، دیکھتے ہی دیکھتے، قیصر و کسریٰ کی دولت و ثروت کی وارث بن گئی اور مکارمِ اخلاق کے اس بلند مقام پر فائز ہو گئی جو آج تک چشمِ عالم کو دیدۂ حیراں بنا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں بلکہ ایک برقِ خاطف تھی جو فاران کی بدلیوں سے چمکی اور ہر طاغوتی قوت کو خاکستر بنا گئی۔ ایک شمشیرِ برہنہ تھی جو فضائے عالم میں کوندی اور ہر اس زنجیر کو کاٹ کر الگ کر گئی جس نے انسانیت کو غیر خداوندی بندشوں میں جکڑ رکھا تھا۔ یہ تھی وہ کتابِ حکیم جو مسلمانوں کو اس لئے دی گئی تھی کہ وہ اسے قیامت تک کے لئے اپنا نصابِ زندگی بنائیں اور اس کے قوانین کے تابع چلیں۔ لیکن ذرا غور کیجئے کہ کوئی مریض کسی طبیب سے دردِ سر کا نسخہ لے تو اس کا فائدہ اسی صورت میں ہوگا کہ اس نسخہ کے مطابق دوائیاں خرید کر انہیں حسبِ ہدایت استعمال کرے۔ لیکن اگر وہ اس کاغذ کو جس پر وہ نسخہ لکھا ہے، سبز کپڑے میں، سی کر سر پر باندھ

لے تو اس کی اس حرکت پر عقل ہنسے گی اور علم روئے گا۔ پھر سوچئے کہ اگر کوئی شخص تعزیراتِ پاکستان کی اس دفعہ کے الفاظ کو جس میں (مثلاً) لکھا ہے کہ چوری کی سزا تین سال کی قید ہے، دس ہزار مرتبہ پڑھ کر پھونکے کہ اس سے چور کا سراغ مل جائے گا تو اس کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟ قرآن کریم قوموں کے امراضِ کہن کا نسخہ کیمیا ہے، ایک ضابطۂ قوانین ہے، جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان کو انفرادی اور اجتماعی شرف و مجد حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اس نسخۂ کیمیا کو کاغذ پر زعفران سے لکھ کر گھول گھول کر پیا جائے یا اس ضابطۂ قوانین کی مختلف دفعات کے چلّے کاٹے جائیں تو اس سے بڑھ کر اس کتاب حکیم کا غلط مصرف اور کیا ہو گا؟۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس قسم کی کرامات پسندی سے انسانی فضیلت کا معیار کس طرح بدل جاتا ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے انسان کی فضیلت کا سب سے بڑا معیار تقویٰ ہے یعنی یہ کہ اس کی زندگی کس قدر، قوانین خداوندی کے مطابق ہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ ایک شخص نہایت بلند سیرت و بلند کردار ہو، وہ گمنامی کی زندگی جیئے گا۔ کوئی اس کی طرف رجوع نہیں کرے گا۔ اس کے برعکس، ایک شخص کسی خانقاہ میں بیٹھا بھنگ کی لہروں اور چنڈو کی موجوں میں مستغرق ہو۔ لیکن اگر وہ سٹہ کا نمبر صحیح بتا دے تو جیتے جی مرجع انام رہے گا اور مرنے کے بعد اس کی قبر کی پرستش ہو گی۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ معیارِ فضیلت، سیرت و کردار کی بلندی نہیں بلکہ شعبدہ بازی قرار پا چکا ہے۔ اب اگر کسی ایسے شخص سے اس قسم کے شعبدات ظہور میں آتے ہیں جو بیباکانہ لغو زندگی بسر کر رہا ہے تو اس کی لغویت پر طرح طرح کے پردے ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ اس کی "بزرگی" کی شان میں فرق نہ آنے پائے۔ اس قسم کے لوگوں کی عقیدت و عظمت، کچھ اس طرح غیر شعوری طور پر قوم کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتی ہے کہ بڑے بڑے اربابِ علم و فضل، ان کی شان میں گستاخی کا کلمہ زبان پر لاتے خوف کھاتے ہیں۔ گویا ان لوگوں کو محکمہ قضا و قدر میں ایسا دخل حاصل ہے کہ نہ معلوم ان کی سوءِ ادبی سے کتنی بڑی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اس غلط معیارِ فضیلت سے قوانین الٰہیہ اور اقدارِ خداوندی کی جو قدر و قیمت دلوں میں رہ سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔

ایسے حضرات بھی ہیں جو اگرچہ شریعت کے پابند ہیں لیکن معیارِ فضیلت اسی قسم کی چیزوں کو قرار دیتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کی "پرستش" میں بھی کوئی کسر باقی نہیں رکھی جاتی۔ اگرچہ زبان سے سب یہی کہتے ہیں کہ ہم کبھی لوگوں کو اس قسم کی باتوں کی جرأت نہیں دلاتے لیکن وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے

ہیں کہ لوگ کس طرح انہیں اور ان کے بزرگوں کو قبلۂ حاجات و کعبۂ مقصود سمجھتے ہیں لیکن بایں ہمہ وہ ایک لفظ اس کے خلاف نہیں کہتے۔ اور اگر وہ بفرضِ محال، زبان سے اس کی مخالفت بھی کریں تو بھی اس کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے جب وہ اپنے عمل سے لوگوں کو خود انسان پرستی کی طرف دھکیل کر لاتے ہیں۔ ان کے ماننے والوں کے دلوں میں یقیناً خدا کی ایسی عظمت و عقیدت نہیں ہوتی جتنی خود ان حضرات کی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنی ہر مشکل میں انہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور گو کہتے یہی ہیں کہ ہم ان کے "واسطہ" سے اپنی درخواست خدا تک پہنچاتے ہیں (جو خود ایک غیر قرآنی عقیدہ ہے) لیکن فی الحقیقت اپنی مرادوں کا منبع انہیں کو سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کا خدا کے ساتھ وہ تعلق کبھی نہیں رہ سکتا جو قرآن کریم قائم کرنا چاہتا ہے۔ سنئے کہ اس باب میں غیر مسلموں کی شہادت کیا ہے۔

> اگر گہرائیوں میں اتر کر دیکھئے تو عملیات کا ہر طالب اس مقام کی طرف جد و جہد کرتا دکھائی دے گا جہاں وہ صرف بٹن دبا دے اور باقی سب کچھ آفاقی قوتیں خود بخود کر دیں۔ وہ جب بہ ہزار مشقت اس قسم کی قوت حاصل کر لیتا ہے جس سے وہ بہت سوں پر غالب آ جائے تو اس سے اُس "ایک" کو بھول جانے کی طرف میلان ہو ہی جاتا ہے (LEVI کے الفاظ میں فطرت کے امور کا بہت گہرا مطالعہ، اس قسم کے غیر محتاط متجسس کو خدا سے بیگانہ بنا دیتا ہے کیونکہ اس کی دماغی تکان اس کے ارتعاش قلب کو مفلوج کر دیتی ہے۔
>
> (MYSTICSM: BY UNDERHILL)

اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس خانقاہ نشینی کے طلسم نے جس طرح مسلمانوں جیسی یکسر برق تپاں قوم کو جمود و تعطل کے بیکار مجسمے بنا کر رکھ دیا ہے وہ کسی تشریح کے محتاج نہیں۔ عمل بالقرآن نے وہ قوم پیدا کی تھی جس کے ہاتھ میں اقوام عالم کی "تقدیریں" تھیں۔ جن کی نگاہوں سے موت کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ جن کی ہیبت سے مصائب و مشکلات کی پیشانی پر پسینہ آ جاتا تھا۔ وہ جس طرف باگیں اٹھاتے، فتح و ظفر ان کی رکاب تھامتی۔ وہ جدھر رخ کر لیتے، کامرانی و کامیابی ان کا بڑھ کر استقبال کرتی۔ وہ قوم جو "اپنے اور اپنے خدا کے درمیان کسی دوسری طاقت کو حائل نہ ہونے دیتی" وہ جو اپنے تمام عزائم و مراحل میں، اپنی قوتِ بازو اور قوانین خداوندی کی تائید کے سوا کسی اور چیز پر بھروسہ نہ کرتی۔ یہ تھی وہ قوم جسے قرآن کریم نے دنیا میں قوانینِ الہیہ کی تنفیذ و ترویج کے لئے پیدا کیا تھا۔ لیکن (UNDERHILL کے الفاظ میں) اس منزل کی تلاش نے "جہاں انہیں صرف

بٹن دبانا پڑے اور باقی سب کچھ غیر معلوم آفاقی قوتیں ان کے لئے خود بخود کر دیں"، اس قوم کو رفتہ رفتہ ایسی حالت میں پہنچا دیا کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی دوسروں کے آسرے ڈھونڈنے لگ گئی۔ اور قدم قدم پر اس طرح غیروں کی محتاج ہو گئی کہ ہر شخص انہیں ذلیل و خوار سمجھنے لگا۔ یہ سب اس لئے کہ وہ کشمکش حیات میں مردانہ وار حقائق کا سامنا کرنے کی بجائے، کامیابی و کامرانی کے لئے کشف و کرامات کے "سم سم" کے پیچھے پڑ گئے اور اس طرح وہ تمام زندہ کرامتیں جو خود ان کے دست و بازو سے ظہور میں آتی تھیں افسانے بن کر رہ گئیں۔ بقول علامہ اقبالؒ:

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا ؛ ہے بندۂ آزاد خود اِک زندہ کرامات (ضرب کلیم ص۲۲)

اس کا نتیجہ یہ کہ آج دنیا میں مسلمان سے زیادہ نکمی اور اپاہج قوم شاید ہی کوئی اور ہو۔ یہ ہے مآل اس "اعجوبہ پسندی" کا جسے ان کے فریبِ نگاہ نے بڑے بڑے مقدس غلافوں میں لپیٹ رکھا ہے۔ اسی غلط تصور کا نتیجہ ہے کہ اسلام جیسا زندہ اور زندگی بخش نظامِ حیات دھرم بن کر رہ گیا۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ وہ عظیم المرتبت مجاہدینِ اسلام، جن کے ایمان کی حرارت نے فضائے کائنات میں تموّج پیدا کر دیا مسلمانوں کے ذہن سے عام طور پر اتر چکے ہیں، لیکن وہ بزرگ جن کی طرف اس قسم کی حسی کرامات منسوب ہیں، ہر وقت ان کے قلب و نگاہ کے سامنے رہتے ہیں۔

یقین مانیئے! یہ سب کشمکشِ حیات میں اعترافِ شکست ہے، کشاکشِ زندگی سے سپر اندازی ہے، دنیائے عمل و حقیقت سے فرار کی راہ ہے۔ دنیا میں سب سے بڑی کرامت وہ ہے جو جماعتِ مومنین کی قوتِ بازو سے ظہور پذیر ہو اور جس کا عملی نتیجہ اس زمین پر آسمان کی بادشاہت کا قیام۔ اس کرامت سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی کرامت نہیں۔ وہ کرامت جس سے جہانِ انسانیت میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ جائے۔ اور اس طرح یہ زمین "اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"۔

بعض حضرات، حقائق سے آنکھیں چرانے کی خاطر، تصوّف کی دو قسمیں بیان کر دیتے ہیں۔ یعنی اسلامی تصوف اور غیر اسلامی (عجمی) تصوف۔ لیکن جب تصوف (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) اپنی اصل کے اعتبار سے "اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے" تو اسے اسلامی اور غیر اسلامی میں تقسیم کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ اسلام اسلام ہے اور بس! یہ ایک نظامِ مملکت ہے، نظامِ معاشرہ ہے، ضابطۂ زندگی ہے، جسے اس قسم کی باطنیت اور کشف و کرامات کی بھول بھلیوں سے کچھ واسطہ نہیں۔ قرآن کریم سے ان امور کی کوئی سند نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم۔ بلکہ احادیث تک میں بھی تصوف کا لفظ تک نہیں ملتا۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے تصوف کو، اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا کہکر پکارا ہے۔ مناسب

معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اس اجمال کی تفصیل بھی خود انہی کے الفاظ میں بیان کر دی جائے۔ انہوں نے لکھنؤ سے شائع ہونے والے اخبار "نیو ایرا" (NEW ERA) کی ۲۸ جولائی ۱۹۱۷ء کی اشاعت میں، تصوف کے موضوع پر ایک مقالہ لکھا تھا۔ اسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ اور تصوف

"آج کل کا مسلمان یونانی و ایرانی تصوف کی ان تاریک وادیوں میں بے مقصد و مدعا ٹامک ٹوئیے مارتے پھرنے کو ترجیح دیتا ہے جس کی تعلیم یہ ہے کہ گرد و پیش کے حقائق ثابتہ سے آنکھیں بند کر لی جائیں، اور توجہ اس نیلی، پیلی اور سرخ روشنی پر جما دی جائے، جسے "اشراق" کا نام دیدیا گیا ہے۔ یہ دراصل دماغ کے ان خانوں سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتی ہے جو ریاضت کی کثرت و تواتر کے باعث ماؤف ہو چکے ہیں۔ میرے نزدیک یہ خود ساختہ تصوف اور یہ "فنائیت" یعنی حقیقت کو ایسے مقام پر تلاش کرنا جہاں اس کا وجود نہ ہو، دراصل ایک بدیہی علامت ہے جس سے عالم اسلام کے روبہ انحطاط ہونے کا سراغ ملتا ہے۔

دنیائے قدیم کی تاریخ ذہنی کے مطالعے سے یہ نہایت اہم حقیقت آپ پر منکشف ہو جائے گی کہ زوال پذیر قوموں اور گروہوں نے ہر دور میں اس خود ساختہ تصوف اور فنائیت میں پناہ لی ہے۔ جب روح حیات فنا ہو جاتی ہے اور زمان و مکان کے مسائل سے دست و گریباں ہونے کی ہمت باقی نہیں رہتی تو داعیانِ انحطاط ایک مزعومہ ولایت و سرمدیت کی تلاش میں لگ جاتے ہیں۔ اس طرح اپنے معاشرے کی روحانی بے مائیگی اور جسمانی فرسودگی کو آخری مرحلے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ بظاہر ایک لبھا لینے والا نصب العین وضع کر لیتے ہیں، جس کے فریب میں مبتلا ہو کر صحتمند اور قوی افراد بھی رفتہ رفتہ موت کی آغوش میں پہنچ جاتے ہیں۔ اسلامی معاشرے کا نظام ایک خاص نوعیت کا ہے جسے اوہام و وساوس کے ان ماتوں نے شدید نقصان پہنچایا ہے۔ بحیثیت ایک معاشرہ کے ہماری تخلیق اس حقیقت پر مبنی ہے کہ اجتماعی ترتیب و تنظیم میں نسل و زبان کے امتیازات پر خطِ نسخ کھینچ دیا جائے۔ یہ مقصد اسی صورت میں پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس نظام شریعت کے تابع رکھیں جو اصلاً مبنی بر وحی ہے۔ لیکن قدیم صوفیاء کا عقیدہ یہ تھا کہ شریعت کی حیثیت تو محض ایک مظہر کی تھی۔ اور وہ خفیہ خفیہ اس کی تلقین کرتے رہے کہ یہ حقیقت کا ایک قشر اور ایک پردہ ہے اور حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ شریعت سے الگ ہے۔ اکثر حالتوں میں شریعت کی پابندی قائم رکھی گئی تھی کہ اجتماعی مخالفت سے بچے رہیں، اگرچہ اس کی حیثیت ایک پردے ہی کی رہی۔ اسلامی فکر و ادب کا مطالعہ کرنے والا کوئی فرد اس اعتراف میں متامل نہ ہوگا کہ شریعت سے اعراض کا رجحان اسی خود ساختہ تصوف کا براہِ راست

نتیجہ ہے جو عجمی دل و دماغ کی پیداوار ہے۔ حالانکہ شریعت ہی اسلامی معاشرے کو منظم و مرتبط رکھنے کا واحد ذریعہ ہے۔

یوں اسلامی جمہوریت رفتہ رفتہ اپنے اصل مقام سے ہٹتی گئی اور اُسے ایک نوع کی روحانی امرائیت کا غلام بنادیا گیا۔ یہ امرائیت ایسے علم و قوت کی مدعی تھی جس کے دروازے عام مسلمانوں پر بند تھے۔ مسلمانانِ اندلس ارسطاطالیسی روحیت سے آگاہی کے باعث مغربی اور وسطی ایشیا کے ضعف انگیز اثرات فکر کے دائرے سے باہر تھے۔ وہ ایشیا کی مسلم قوموں کے مقابلے میں روح اسلام سے قریب تر تھے۔ آخرالذکر قوموں نے عربی اسلام کو عجمی تخیلات میں ڈھلنے دیا یہاں تک کہ وہ اپنی حقیقی و اصلی حیثیت سے بالکل محروم ہوگیا۔ تسخیر ایران کا نتیجہ نہ نکلا کہ ایران اسلام کا حلقہ بگوش بن گیا، بلکہ یہ نکلا کہ اسلام، ایرانیت کے رنگ میں رنگا گیا۔

مغربی اور وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ دسویں صدی عیسوی کے بعد سے کیجیے۔ جو کچھ میں اوپر لکھ چکا ہوں اس کے ایک ایک حرف کی تصدیق و توثیق ملے گی۔ انحطاط کے سحر کی کیفیت یہی ہے کہ جن ہاتھوں سے ہم زہر کا پیالہ پیتے ہیں، انہی کو چومتے ہیں۔

واضح رہے کہ اسلام کا آفتاب تاریخ کے روزِ روشن میں افق پر جلوہ گر ہوا۔ ہمارے جمہوریت پرور پیغمبرِ اعظمؐ نے عاقل و دانش مند اصحابؓ میں زندگی بسر کی اور انہی میں کام کرتے رہے۔ ان اصحاب نے ایک ایک لفظ آنے والی نسلوں تک پہنچا دیا جو اِس پیغمبرِ اعظمؐ کی مقدس و بابرکت زبان پر جاری ہوا۔[1] حضور کی تعلیمات میں کوئی بھی چیز نہیں جسے مخفی کہا جا سکے۔ قرآن مجید کا ایک ایک لفظ زندگی کی مسرت اور روشنی سے لبریز ہے۔ یہ تاریک اور قنوطیت افزا تصوف کے لیے وجہِ جواز مہیا کرنے ہی سے پاک و مبرا نہیں بلکہ ان تمام مذہبی تعلیمات کے خلاف کھلا ہوا جارحانہ اقدام ہے۔ جنھوں نے صدیوں تک عالمِ انسانیت کو مبتلائے فریب رکھا۔

پھر آیئے! دنیا کے حقائق کو خوشی خوشی قبول کیجیے۔ خدا اور اس کے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے جلال و عظمت کی خاطر ان حقائق سے عہدہ برآ ہونے کی سعی و کوشش میں مصروف ہوجایئے۔ اس شخص کی بات پر کان نہ دھریئے جو کہتا ہے کہ اسلام میں کوئی مخفی اصول بھی ہے جسے ناشناساؤں پر منکشف نہیں کیا جا سکتا۔ اسی پر جھوٹے مدعیوں کے اقتدار اور آپ کی غلامی کا انحصار ہے۔

دیکھیے کس طرح رومی مسیحیت کی روح نے اپنے گرد و پیش مستحکم حصار تعمیر کر لیے تاکہ اس کی تاریک مملکتیں تاریخ نگاروں

---

[1] یعنی قرآنِ کریم جو تھا تو کلام خداوندی لیکن دنیا کو لسانِ نبوتؐ کی وساطت سے ملا تھا۔

کے ممکن حملوں سے محفوظ رہیں۔ ایسے ہی لوگوں نے تاریخ اسلام سے آپ کی ناواقفیت کی بنا پر فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کو غلام بنا رکھا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ تاریخ کی روشنی کبھی نہ کبھی اس کی تعلیمات کے دھندلکے کو آپ کی ذہنی فضا سے زائل کردے گی۔ لہٰذا وہ آپ کو سکھاتے ہیں کہ حسّی ادراک حجاب اکبر ہے (العلم حجاب الاکبر)۔ حسّی ادراک کے یہ دشمن آپ کے احساسِ حقائق کو کند کرتے ہیں اور علمِ تاریخ کی بنیاد کھوکھلی کر دیتے ہیں۔

نوجوان مسلمانو! اس شعبدہ بازی سے خبردار رہو۔ شعبدہ بازوں کی کمند بڑی مدت سے تمہاری گردنوں پر پڑی ہوتی ہے۔ دنیائے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا انحصار اس پر ہے کہ بڑی سختی سے اس توحید کو اپنا لیا جائے جو مصلحت کوشیوں اور مفاہمت اندوزیوں کو جانتی نہ تھی اور جس کی تعلیم تیرہ سو سال پیشتر عربوں کو دی گئی تھی۔ عجمیت کے دھندلکے سے باہر نکلو اور عرب کے درخشاں صحرا کی روشن فضا میں آجاؤ۔"

یہ ہے وہ سحر، جس سے یہ امت ہزار برس سے مسحور چلی آرہی ہے اور اس کا نتیجہ بھی بھگت رہی ہے۔ اس سلسلے میں انسب یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کی اس آیت کو پیش کردیں جس میں اس نے "سحرِ بابل" کی بھول بھلیوں میں گم ہو جانے والوں کے متعلق کہا تھا:۔

۲/۱۰۳ وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ خَيْرٌ ۖ لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۔

اگر یہ لوگ اس قسم کی روش اختیار کرنے کی بجائے منزل من اللہ صداقتوں پر ایمان رکھتے اور ایسے تباہ کن اسلوب سے بچتے تو انہیں خدا کے ہاں سے وہ کچھ ملتا جو اس سے کہیں زیادہ گراں بہا ہوتا۔ اے کاش! یہ اس حقیقت کو سمجھ لیتے۔"

۲/۱۰۴ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا ۗ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۔

بات چلی تھی یہودیوں کی ذہنیت سے۔ اور درمیان میں وہ اہم موضوع آگیا جسے آپ نے ابھی ابھی ختم کیا ہے اس کے بعد ہم اسی داستان کا سررشتہ پھر تھامتے ہیں۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ صدیوں کی محکومی، غلامی، خانماں خرابی

یہودیوں کی پست ذہنیت

کی وجہ سے یہ لوگ اس قدر دنی الطبع ہو چکے تھے کہ عام آدابِ معاشرت تک سے بھی عاری ہو گئے تھے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محفلوں

میں آکر بیٹھتے تو وہاں بھی اس دنائت کا مظاہرہ کئے بغیر نہ رہ سکتے۔ بات کرتے تو ذو معنی، اور پھر الفاظ ادا کرتے تو اس طرح زبان کو توڑ مروڑ کر، کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا۔ چنانچہ سورۃ النساء میں ہے: مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۔ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ ۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۔ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (۴/۴۶) "یہودیوں کی یہ حالت ہے کہ وحی کے الفاظ تک کو ان کے اصلی مقام سے ہٹا کر ان میں ردو بدل کر دیتے ہیں اور عام گفتگو میں بھی عجیب انداز سے ذو معنے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً بجائے اس کے کہ "سمعنا و اطعنا" کہیں (یعنی ہم نے آپ کی بات سن لی ہے اور ہم اس کی اطاعت کریں گے) یہ "سمعنا و عصینا" کہیں گے یعنی (ہم نے اسے سنا ہے اور ہم اس کی نافرمانی کریں گے۔" یا کہیں گے "اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ" (تو ہماری بات سن! اگرچہ تیری بات نہیں سنی جاتی گی یا طنزاً کہیں گے کہ تو بہرہ ہو جائے) غرضیکہ یہ عجیب انداز سے زبان کو توڑ مروڑ کر باتیں کریں گے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ دینِ خداوندی کو ہدفِ طعن و تشنیع بنا دیا جائے۔ اس کا مذاق اڑایا جائے۔ اگر ان کی نیت نیک ہوتی اور یہ سیدھی طرح کہتے کہ "سمعنا و اطعنا"، "ہم نے سنا اور ہم اس کی اطاعت کریں گے" یا "اسمع و انظرنا" ہماری بات سنیئے اور ہم پر نگہ التفات رکھیے تو ان کے لئے بہتر ہوتا اور بات صاف اور سیدھی ہو جاتی۔ لیکن انکار و سرکشی، اور حسد و تعصب کی بنا پر ان کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ یہ عام معاشرتی حسنِ آداب سے بھی محروم ہو چکے ہیں۔ تم دیکھو گے کہ ان میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جو ایمان لائیں گے — جن لوگوں کی ذہنیت اس حد تک پست ہو چکی ہو وہ ایسی بلند تعلیم کو کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں۔"

اس سے واضح ہے کہ یہودی، حضور کی مجلس میں آکر بیٹھتے تو یا تو ذو معنی الفاظ استعمال کرتے اور یا تلفظ ہی توڑ مروڑ کر ادا کرتے جس سے معنے کچھ کے کچھ ہو جاتے۔ اس کی مثال میں لفظ رَاعِنَا پیش کیا گیا ہے۔ یہ لفظ اگر مادہ (ر-ع-ن) سے ہو تو اس کے معنے حماقت اور رعونت کے ہوتے ہیں۔ اور اگر مادہ (ر-ع-ی) سے ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کی رعایت کرنا۔ ان معانی کی رو سے مطلب یہ ہوگا کہ وہ رسول اللہ سے کہتے کہ "تم ہماری رعایت کرو تو ہم تمہاری رعایت کریں گے۔ تم ہمارا خیال رکھو تو ہم تمہارا خیال رکھیں گے"۔ یعنی وہ سودے بازی کرنا چاہتے تھے اور قرآنِ کریم واضح طور پر بتا چکا ہے کہ ایک داعیٔ انقلاب (رسول) کسی سے سودے بازی نہیں کرتا۔ حق باطل کے ساتھ مفاہمت کر ہی نہیں سکتا۔ تفصیل اس اجمال کی، جلد اول میں، آیت (۲/۱۰۴)

کے تحت صفحہ ۱۷۸ پر گزر چکی ہے۔ اور اگر وہ اس لفظ کو ذرا زبان دبا کر بولتے تو حضورؐ کو (معاذ اللہ) احمق اور نحوست پرست قرار دیتے۔

قرآنِ کریم نے یہود کی اس قسم کی نازیبا حرکات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے، جماعتِ مومنین سے دو باتیں کہیں۔ پہلی تو یہ کہ قُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِيۡدًا (۳۳/۷۰) "ہمیشہ، بات واضح، صاف، دوٹوک اور نپی تلی کہو جس میں کوئی ابہام نہ ہو" (نیز ۴/۹)۔ خاص طور پر شہادت میں تاکیداً کہا کہ کبھی توڑ مروڑ کر کوئی لفظ نہ کہو (۴/۱۳۵)۔ اور دوسری بات یہ کہی کہ حضورؐ کو مخاطب کرتے وقت ایسا لفظ بھی استعمال نہ کرو جس کے معنے یہ ہو جائیں کہ آپ ہماری رعایت کیجئے تو ہم آپ کی رعایت کریں گے۔ مومنین کا یہ شعار نہیں ہوتا۔ وہ رسول کی زبانِ مبارک سے احکامِ خداوندی سنتے ہیں تو بے چون وچرا اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ اور جب رسول کسی اختلافی معاملے میں فیصلہ دیتا ہے تو فیصلے کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی کبیدگی یا گرانی پیدا نہیں ہوتی۔ وہ بطیبِ خاطر اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اسی بنا پر کہا کہ تم حضورؐ کو مخاطب کرو تو یوں کہو کہ اُنۡظُرۡنَا "آپ ہم پر نگاہِ التفات رکھئے۔ آپ ہماری طرف دیکھتے رہیے کہ ہمارا قدم جادۂ حق وصداقت سے ادھر ادھر نہ ہونے پائے۔ آپ ہماری نگرانی کیجئے"۔ اسی حقیقت کو ذرا آگے چل کر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ "ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی قوم بنایا ہے تاکہ تم نوعِ انسانی کے اعمال کی نگرانی کرو وَيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيۡدًا (۲/۱۴۳) "اور خدا کا رسولؐ تمہارے اعمال کی نگرانی کرے"۔ تم حضورؐ سے یوں خطاب کیا کرو اور اس کے بعد حضورؐ کے فرمان کو دل کے کانوں سے سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ ایسا نہ کرو گے تو تم کفر کی روش اختیار کر لو گے اور المناک عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

اس کے بعد کہا کہ یہ سب ان کی کٹ حجتیاں ہیں۔ یہ لوگ درحقیقت چاہتے ہی نہیں تھے کہ تمہیں نبوت ملتی، خدا کی کتاب تم پر نازل کی جاتی:۔

۲/۱۰۵ مَا يَوَدُّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ وَلَا الۡمُشۡرِكِيۡنَ اَنۡ يُّنَزَّلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ يَخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ ۔

اہلِ کتاب کیوں نہیں چاہتے تھے کہ حضورؐ کو نبوت ملے۔ اس کی وجوہات پہلے بیان کی جا چکی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ

یہ چاہتے ہی نہیں تھے کہ تمہیں نبوّت ملتی

چونکہ ہر مذہب کے پیرو اس فریبِ نفس میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ان کا مذہب سچا ہے اور تمام مذاہب سے ارفع و اعلیٰ۔ اس لئے وہ کسی دوسرے کی آواز تک سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ لہٰذا یہود و نصاریٰ پر تو یہ بات بھی گراں گزرتی تھی کہ حضورؐ انہیں دین کی دعوت کیوں دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ، عرب میں وہ لوگ بستے تھے جو کسی خاص مذہب کے پیرو نہ تھے (یعنی قریش اور دیگر عربی قبائل) قرآن کریم نے انہیں مشرکین کہہ کر پکارا ہے۔ یہ قرآن کی اصطلاح ہے اور اس میں جہاں بھی اس زمانے کے ان "مشرکین" کا ذکر آئے گا اس سے مراد یہی لوگ ہوں گے۔

قریش اس دعوت کی کیوں مخالفت کرتے تھے اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ قریش کی پوزیشن یہ تھی کہ وہ بڑی سرمایہ دار قوم تھی۔ اس کے تجارتی قافلے یمن سے شام تک رواں دواں رہتے تھے۔ مکہ، سارے عرب اور ارد گرد کے علاقوں کی مرکزی منڈی تھا جو ان کی تحویل میں تھا۔ بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ اس سارے علاقے کی تجارت کا مرکزی کنٹرول ان کے ہاتھ میں تھا۔

کعبہ اہلِ عرب کی مرکزی پرستش گاہ تھا اور قریش اس کے متولی یا مہاجن تھے۔ اس سے انہیں ایسا مقدس اور بلند مقام حاصل ہو گیا تھا کہ اس زمانے میں، جبکہ رہزنی اور قزاقی عام تھی، ان کے تجارتی قافلوں کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ (۱۰۶/۲-۱) علاوہ بریں، خود کعبہ کی آمدنی بھی کچھ کم نہ تھی۔ وہ تو ایک ریاست تھی۔

پھر، انہوں نے انسانوں کو اس طرح نسلی طبقات میں تقسیم کر رکھا تھا کہ کوئی ان پیدائشی حدود کو توڑ ہی نہیں سکتا تھا، ان طبقات میں قریش کو بلند ترین مقام حاصل تھا ـــــ جیسے ہندوؤں کے ہاں برہمنوں کو۔

غلامی ان کے معاشرے کا معمول تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے سارے کام کاج غلام کرتے تھے جن کی حالت مویشیوں سے بھی بدتر تھی۔ اور ان کے گھروں میں لونڈیاں تھیں جن کی عام خرید و فروخت ہوتی تھی۔

قریش کیوں مخالف تھے

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ، اگرچہ ان کی اپنی کوئی منظم حکومت نہیں تھی لیکن وہ کسی خارجی قانون اور ضابطہ کے بھی پابند نہیں تھے۔ وہ پنچایتی طور اپنے معاملات طے کرتے تھے۔ اس نظام میں سردارانِ قوم کو بہت بڑی سیادت اور قیادت حاصل تھی۔

یہ تھے وہ مفادات، جن کے حامل قریش تھے۔ جب مکہ میں قرآنی تعلیم عام ہوئی تو انہوں نے بھانپ لیا کہ اس کی رو سے ان سے وہ سب کچھ چھن جائے گا جس کے وہ اس طرح غاصب بنے بیٹھے تھے۔ اس سے ان کی نہ مذہبی سیادت باقی رہے گی، نہ اقتصادی قیادت نہ نسلی تفوق باقی رہے گا۔ نہ سیاسی امارت۔ جب تک یہ تعلیم نظری حیثیت لئے رہی تو اگرچہ وہ اس

تعلیم پر لبیک کہنے والوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتے رہے لیکن انہوں نے ان کے خلاف اجتماعی طور پر کوئی قدم نہ اٹھایا کیونکہ انہیں یقین نہیں تھا کہ یہ نظری تعلیم ان کے لئے سچ مچ کا خطرہ بن جائے گی۔ لیکن جب یہ تعلیم مدینہ میں ایک مملکت کی شکل اختیار کرنے لگی تو انہوں نے ان خطرات کو بے نقاب دیکھ لیا۔ انہیں صاف نظر آ گیا کہ اگر مسلمانوں کا معاشرہ قرآنی خطوط پہ متشکل ہو گیا تو اس کے انسانیت ساز، حیات بخش نتائج کو دیکھ کر ساری دنیا ان کی طرف کشاں کشاں چلی آئے گی اور اس سیلِ بے پناہ کے سامنے نہ قرلیش باقی رہیں گے نہ ان کے امتیازات و مفادات۔ یہ وجہ تھی کہ وہ اس کے خلاف تھے کہ اس قسم کا نظام قائم ہو جائے۔ وہ تو ایک طرف، قیصر و کسریٰ تک کی سلطنتیں بھی اس سے خائف تھیں۔ حضورؐ نے جب قیصر اور کسریٰ کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے تحریر فرمایا تھا کہ اگر تم نے اپنی موجودہ استبداد و استحصال کی روش نہ چھوڑی تو روما کے محنت کشوں اور ایران کے دہقانوں پر ہونے والے مظالم کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے گا تو انہوں نے بھی اس ابھرنے والی تحریک کے ہاتھوں اپنے مستقبل کا اندازہ لگا لیا تھا۔ لہٰذا اہلِ کتاب اور مشرکینِ عرب تو ایک طرف، دنیا کی کوئی قوت بھی یہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ نظام قائم ہو جائے۔

مندرجہ بالا آیت (۲/۱۰۵) میں قرآن کریم کو "خیر" کہکر پکارا گیا ہے۔ اور خیر کی وضاحت سورۃ النحل میں، ان الفاظ سے کی گئی ہے: وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا خَيْرًا لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ (۱۶/۳۰)" جماعت مومنین (متقیوں) سے پوچھا جا رہا ہے کہ جو کچھ تمہارے رب نے تمہاری طرف نازل کیا ہے وہ ہے کیا؟ تو اس کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ وہ خیر ہے

قرآن کریم خیر ہے

یعنی جو لوگ اس کے مطابق زندگی بسر کریں گے انہیں اس دنیا میں بھی ہر قسم کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں حاصل ہوں گی اور ان کی اُخروی زندگی بھی انہی حسنات کو لئے ہوئے ہو گی۔ متقیوں کے لئے یہ ٹھکانا کس قدر خوشگوار (پر نعائم) ہو گا!۔ اس کے بعد اگلی آیات میں ان نعماء کی تفصیل دی گئی ہے۔ یہ ہے اس "خیر" پر عمل کرنے کا نتیجہ، جو خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے ـــــ دنیا اور آخرت ـــــ دونوں کی خوشگواریوں اور سرفرازیوں کا ضامن۔"

اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ نبوت کسی کو کسب و ہنر سے نہیں مل سکتی۔ یہ خدا کی طرف سے وہبی طور ملتی ہے اور جس ہستی کو اس کے لئے منتخب کیا جاتا ہے اس کا فیصلہ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔

وحی کے متعلق ہم اس سے پہلے بڑی تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں (ملاحظہ فرمایئے آیات (۲/۴) جلد اول صفحہ ۲۲ نیز (۲/۵) جلد اول صفحہ ۴۲ ؛ (۲/۴۴) جلد اول صفحہ ۱۴۰ نیز (۲/۲۳) جلد اول صفحہ ۲۰۸ ؛ (۲/۹۷) جلد دوم سابقہ صفحات)۔ یہاں ہم اتنا کہکر

آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں کہ نبوت، خالصتاً وہبی (عطیہ خداوندی) ہوتی تھی اور چونکہ حضورؐ کے ساتھ سلسلۂ نبوت ختم ہو گیا اس لئے اب کسی کو نبوت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اہل کتاب کی طرف سے پہلا اعتراض تو یہ تھا کہ نبوت کے لئے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں منتخب کیا گیا اور دوسرا اعتراض یہ کہ اگر یہ وحی خدا کی طرف سے ہے تو ایسا کیوں ہے کہ اس کے بعض احکام ان احکامات سے مختلف ہیں جو ہماری شریعت میں موجود ہیں حالانکہ وہ بھی وحی پر مبنی ہے۔ اس کا جواب اگلی دو آیات میں دیا گیا، جہاں کہا کہ:-

۲/۱۰۶-۱۰۷ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۔ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۔

یہ آیات "ناسخ اور منسوخ" سے متعلق ہیں۔ اس اہم مسئلہ کے متعلق تفصیلی گفتگو، جلد اول میں، زیر آیت (۲/۳) صفحہ ۱۲۵ پر کی جا چکی ہے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کا تعلق قرآن مجید کی آیات سے نہیں، کتب سابقہ کے احکام سے ہے۔ قرآن کریم کا ایک لفظ بھی منسوخ نہیں۔ وہ سب کا سب مکمل اور غیر متبدل احکام و اقدار خداوندی کا مجموعہ ہے۔

اس کے بعد جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ تم اس بنیادی حقیقت کو بھی سمجھ لو کہ جس قدر احکام و قوانین کا دیا جانا

ناسخ و منسوخ

خدا کو مقصود ہے وہ سب از خود قرآن مجید میں دیدیئے جائیں گے اور جن امور کے متعلق کچھ نہیں کہا جائیگا ان کے متعلق سمجھ لینا چاہئے کہ ایسا دانستہ کیا گیا ہے۔ خدا سے بھول نہیں ہو گئی۔ لہٰذا ان امور کے متعلق تم اپنے رسول سے اس قسم کے سوالات نہ شروع کر دینا جس قسم کے سوالات اس سے پہلے بنی اسرائیل، اپنے رسول، موسیٰ علیہ السلام سے کیا کرتے تھے۔

چنانچہ اگلی آیت میں ہے کہ:-

۲/۱۰۸ اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۔ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۔

ہم اس موضوع کے متعلق جلد اول، آیت (۲/۳) صفحہ ۱۲۸۔ نیز زیر نظر جلد میں آیت (۲/۱) کے تحت (سابقہ صفحات میں) گفتگو کر چکے ہیں۔ اسے دیکھ لیجئے۔ اس مقام پر اتنا کہدینا کافی ہے کہ اس قسم کی روش اختیار کر لینے کو قرآن کریم نے "ایمان کو کفر سے تبدیل کر لینے" کے مرادف قرار دیا ہے۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے۔

دین کی جزئیات کا تعین

ہم اسے دہرا دیں کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے عہدِ ہمایوں میں اسلامی مملکت قائم ہو چکی تھی اسلئے قرآنی احکام و اقدار کی جو تفاصیل اور جزئیات قرآن کریم میں نہیں دی گئیں تھیں، انہیں یہ نظامِ مملکت باہمی مشاورت سے طے کرتا تھا۔ اس لئے یہ صورت ہی پیدا نہیں ہوتی تھی کہ امت رسول سے کہے کہ وہ ان جزئیات کو بھی بذریعہ وحی حاصل کرے۔ لیکن بعد میں، جب وہ اسلامی نظام باقی نہ رہا تو، ان جزئیات کو احادیث کی رو سے متعین کرنے کی کوشش کی گئی اور عقیدہ یہ وضع کیا گیا کہ یہ احادیث بھی وحی پر مبنی ہیں ——— وحی کا ایک حصہ (جسے وحی جلی کہا جاتا ہے) قرآن مجید کے اندر ہے اور اس کا دوسرا حصہ (جسے وحی خفی کہا جاتا ہے) احادیث میں ——— گویا اس طرح ہم نے اس سوال کو دہرا دیا کہ جو کچھ قرآن کریم میں نہیں آیا اُسے بھی خدا کو بذریعہ وحی دینا چاہئے تھا اور اس نے اسے وحی کی دوسری قسم کے ذریعے دیدیا۔ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں، وحی کی ان دو قسموں کا عقیدہ بھی غیر قرآنی ہے۔ وحی کی ایک ہی قسم ہے اور وہ سب کی سب قرآن مجید کے اندر محفوظ ہے، خارج از قرآن کہیں نہیں۔

آیت (۲/۱۰۵) میں کہا گیا ہے کہ اہلِ کتاب چاہتے ہی نہیں تھے کہ یہ وحی رسول اللہؐ کی طرف نازل ہوتی۔ لیکن جب یہ نازل ہو گئی اور لوگوں نے اسے قبول کرنا شروع دیا تو اس کے بعد ان کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ کسی طرح، ان لوگوں کو اس دین سے برگشتہ کر دیں، چنانچہ آگے ہے:-

۲/۱۰۹ وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔

آیت کے آخری حصے میں آسمانی انقلابی پروگرام کی ایک اہم کڑی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اس انقلاب کی بنیاد نفسیاتی تغیر پر ہے۔ اس کے لئے طریق کار یہ تھا کہ رسولؐ، وحی کی تعلیم کو عام کرتا جائے اور لوگوں کو اس پر غور و فکر کی دعوت دے۔ معترضین کے اعتراضات کا بہ دلائل و براہین جواب دے۔ ان کے شکوک و شبہات کو رفع کرے اور جو لوگ اس طرح، اس دعوت کو قبول کر لیں، انہیں اپنی جماعت میں شامل کرتا جائے۔ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا کافی حصہ اس تبلیغ و تنظیم میں گذرا۔ اس کے بعد جب ایسا مقام آ گیا جہاں دیکھا گیا کہ باقی لوگ اس دعوت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں اور محض ضد اور تعصب کی بناء پر اس کی مخالفت کئے جا رہے ہیں تو حضورؐ سے کہا گیا کہ اب تم اپنی ساری توجہ اس جماعت کی تعلیم و تربیت و تنظیم پر مرکوز کر دو اور ان مخالفین سے اعراض برتو۔ اس

مخالفین سے اعراض

کے بعد اگر انہوں نے اپنی مخالفت میں آخری فیصلہ چاہا تو وہ بھی قوانینِ خداوندی کے مطابق ہو جائے گا۔ لیکن ان لوگوں سے علیحدگی اختیار کرنے کے سلسلے

میں کہا کہ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا (۷۳/۱۰) یا فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ (۱۵/۸۵) ان سے الگ بھی ہو تو حسن کارانہ انداز سے۔ دنیا میں دوسروں سے تعلقات وابستہ کرنے کیلئے تو کہا جاتا ہے کہ ایسا حسن کارانہ انداز سے کرنا چاہیئے لیکن یہاں یہ تاکید ہو رہی ہے کہ مخالفین سے بھی اعراض برتنے کی نوبت آ جائے تو ان سے حسن کارانہ انداز سے علیحدگی اختیار کرو۔ ان سے درگذر کرو، اور اپنے پروگرام کی تکمیل کے لئے آگے قدم بڑھاتے جاؤ (۵/۱۳)۔

نبی کا قلب بھی بڑا ہی گداز اور پُرسوز ہوتا تھا۔ مخالفین اپنی دشمنی میں انتہا تک پہنچ جاتے تھے لیکن اُسے یہ غم کھائے جاتا تھا کہ یہ اس طرح تباہ ہو جائیں گے۔ اے کاش! یہ کسی طرح اس تباہی سے بچ جائیں۔ یہ احساسِ غم اتنی شدت اختیار کر جاتا تھا کہ خود خدا کو یہ کہنا پڑتا تھا کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (۲۶/۳) "ایسا نظر آتا ہے کہ تم تو اس غم میں، کہ یہ لوگ امن و سلامتی کا راستہ کیوں اختیار نہیں کرتے، اپنی جان گھُلا لو گے۔"

نبی کا قلبِ گداز

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ (۳۵/۸) "اے رسولؐ! تو ان کی غم خواری میں اس طرح اپنی جان نہ گھُلا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے"۔ لیکن اس چھوڑ دینے کے باوجود یہ تاکید بھی کر دی کہ وَذَكِّرْ بِهِ أَن تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ (۶/۷۰) "تو انہیں قرآن کے ذریعے نصیحت بہرحال کرتا رہ، تاکہ کوئی شخص، حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر تباہ نہ ہو جائے"۔ یعنی، پہلے، رسولؐ ان لوگوں کو بھی اپنی خاص توجہ کا مرکز قرار دیتا تھا۔ اب یہ کہا گیا کہ اس اختصاص سے تو قطع نظر کر لو لیکن اپنی عمومی دعوت جاری رکھو۔ یہ تھی فریضۂ تبلیغ کی اہمیت!

سابقہ آیت میں کہا یہ گیا کہ اب تم جماعتِ مومنین کی تربیت و تنظیم کے لئے اپنی کوششوں کو مرتکز کر دو۔ اس کے لئے پروگرام وہی دیا گیا جو دین کی اساس ہے۔ کہا یہ گیا کہ:-

۲/۱۱۰ وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَآتُوا الزَّكَوٰةَ ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ

یعنی "اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ" کا پروگرام۔ اقامتِ صلوٰۃ کے متعلق جلد اول میں آیت (۲/۳) کے تحت (صفحات ۷۰-۱۴۰) پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ اور زکوٰۃ کے متعلق آیت (۲/۴۳) کے تحت سابقہ صفحات میں ـــ اُسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں کہا یہ گیا کہ اپنی جماعت پر اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دو کہ اس انقلابی پروگرام کے ابتدائی دور میں تمہاری سعی و عمل کا محسوس نتیجہ جلدی سامنے نہیں آئے گا لیکن تم اس یقین پر استقامت سے آگے بڑھتے چلے جاؤ کہ تمہارا کوئی عمل ضائع نہیں ہو رہا۔ تم یوں سمجھو کہ تمہارے اعمال، وہ پیش رو کارندے ہیں جو کاروان کے منزل پر پہنچنے سے پہلے ان کے لئے سب انتظام کر رکھتے ہیں۔ یہی کچھ تمہارے اعمالِ حسنہ کریں گے۔ تم اس پروگرام

پر عمل کرتے جاؤ اس سے اس دنیا میں بھی جنتی معاشرہ قائم ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد اگلی دنیا میں بھی۔

یہ ان (اہل کتاب) کا زعم باطل اور فریب نفس ہے جو کہتے ہیں :-

۲/۱۱۱ وَقَالُوا لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۔

یعنی یہ کہ جنت، یہود و نصاریٰ کے لئے مخصوص ہو چکی ہے۔ اس آیت کا بنیادی تعلق، خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل سے ہے جس کی تشریح گذشتہ صفحات (بالخصوص زیرِ آیت ۲/۴۸ ، ۲/۹۴) پر کی جا چکی ہے۔

اہل کتاب کے اس زعمِ باطل کے بعد کہا کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ :-

۲/۱۱۲ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِندَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۔

جو بھی اپنے آپ کو خدا کے قوانین کے سامنے جھکا کر، حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرے گا اس کا اجر اُسے خدا کے ہاں سے ملے گا۔ اور اس اجر کو ان چار الفاظ میں دہرا دیا کہ ان پر نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔

قصۂ آدم کے آخر میں یہی کہا گیا تھا کہ جو لوگ ہمارے بتائے ہوئے راستہ پر چلیں گے ان پر کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا (۲/۳۸)، اسی کو یہاں دہرایا گیا ہے۔

بنی اسرائیل کی داستان تو آگے بھی چلتی ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ قارئین اس منزل پر تھوڑی دیر کے لئے سستا لیں اور داستان کے اگلے حصے کے لئے تیسری جلد کا انتظار فرمائیں۔

والسلام۔ وللہ الحمد۔

خلاصہ باب پنجم و ششم

(آیات ۵۵ یا ۱۱۲)

(۵۵)۔ ہم نے تمہیں ایک واضح ضابطۂ قانون دیا تھا جس کے نتائج نے نہیں، خود بخود بتا دینا تھا کہ وہ (واقعی) خدا کا قانون ہے، کسی انسان کا خود ساختہ نہیں۔ لیکن، بجائے اس کے کہ تم اس پر عمل پیرا ہو کر اس کے نتائج سے خدا کو

پہچانتے، تمہاری ذہنی سطح اسقدر پست، اور تم محسوسات کے اس درجہ خوگر ہو چکے تھے، کہ تم موسیٰ سے یہ کہنے لگے کہ ہم تیری کوئی بات ماننے کے لئے تیار نہیں جب تک ہم اس خدا کو (جس کی طرف سے، تم کہتے ہو کہ یہ قانون نازل ہوا ہے) خود اپنی آنکھوں سے بے نقاب نہ دیکھ لیں۔ (حالانکہ ظاہر ہے کہ خدا کوئی مادی پیکر نہیں جسے آنکھوں سے دیکھا جا سکے۔ اس کا تو، اس کی خدائی اور اس کے قوانین کے نتائج سے، بہ چشمِ بصیرت ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے)۔

تقاضا تمہارا خدا کو بے نقاب دیکھنے کا تھا، اور ہمت کا یہ عالم کہ زلزلہ کی گرج دار آواز، اور ارتعاش سے (۷/۱۵۵) تمہارے ہوش اُڑ گئے، حالانکہ تم دیکھ رہے تھے کہ وہ زلزلہ ہی ہے۔ (یہ اس لئے کہ تمہاری توہم پرستیوں نے، جن کی وجہ سے تم نے بچھڑے تک کو دیوتا بنا لیا تھا، اِن مظاہرِ فطرت کا خوف تمہارے دل میں پیدا کر رکھا تھا۔ شرک کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے)۔

(۵۶) ہم نے اس کے بعد بھی تمہیں اُٹھا کھڑا کیا اور اس کا موقعہ دیا کہ تمہاری صلاحیتوں کی پوری پوری نشو ونما ہو سکے تاکہ تم غلامی کے مرگ آفریں اثرات سے آزاد ہو کر انسانی سطح کی حیاتِ نو سے سرفراز ہو سکو، اور اس طرح تمہاری کوششیں ثمر بار ہو سکیں۔

(۵۷) اس کے لئے تمہیں بلا مزد و معاوضہ، سامانِ معیشت کی فراوانیاں عطا کی گئیں۔ اُس بیابان میں، پانی سے بھرے ہوئے بادل تمہارے سروں پر سایہ فگن تھے، اور کھانے کے لئے نہایت خوشگوار غذا —— پرندوں کا گوشت اور خود رُو نباتاتی شیرینی —— تمہارے لئے وجہ سکون و اطمینان بنتی تھی۔

لیکن تم اس پر بھی ہمارے قوانین کے اتباع پر قائم نہ رہے! اس سے ہمارا کچھ نقصان نہیں ہوا، تم نے اپنا ہی نقصان کیا، اور خود اپنے ہاتھوں سے ایسا کیا۔

(۵۸) ہماری تجویز یہ تھی کہ تم فلسطین کی سرزمین میں فاتحانہ حیثیت سے رہو (۵/۲۱) اور اس طرح، اپنے اختیار و ارادہ سے، جیسے اور جب جی چاہے، سامانِ رزق سے فائدہ اٹھاؤ، فقط اس ایک شرط کے ساتھ کہ تم ہمارے قوانین کے سامنے اپنا سر جھکائے رکھو۔ اِس طرح، تمہاری صحرا نوردی اور خانہ بدوشی کی زندگی بھی ختم ہو جاتی، اور تم سے جو غلطیاں سرزد ہو چکی تھیں ان کے مضر اثرات سے تمہیں سامانِ حفاظت بھی مل جاتا۔ اور اگر تم اس کے بعد بھی حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتے، تو ان فتوحات کا سلسلہ اور بھی آگے بڑھتا چلا جاتا۔

(۵۹) لیکن تم نے سپاہیانہ اور مجاہدانہ زندگی کے مقابلہ میں آرام طلبی اور تساہل انگیزی کی زندگی کو پسند کیا (۵/۲۴) اور اس طرح ہمارے تجویز کردہ راستے کو چھوڑ کر، ایک الگ راہ اختیار کرلی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کے سماوی قانونِ مکافات کے مطابق تم

میں کمزوری آتی چلی گئی اور تمہاری ٹانگیں بری طرح لڑکھڑانے لگ گئیں۔ تم میں جرأت و ہمت باقی نہ رہی (۵/۲۴-۲۲)۔
[اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہی سرزمین، جس کی ملکیت کا قبالہ تمہارے نام لکھا جا چکا تھا، (۳/۲۱)، چالیس سال تک تمہارے قبضہ میں نہ آسکی۔ (۵/۲۶)]۔

(۶۰) تم اپنی تاریخ کے اس واقعہ کو بھی یاد کرو جب تمہیں پانی کی دقت ہوتی۔ اور موسیٰؑ نے اس کے لئے ہم سے درخواست کی تو ہم نے ان کی راہنمائی اس مقام کی طرف کر دی جہاں پانی کے چشمے مستور تھے۔ وہ اپنی جماعت کو لے کر وہاں پہنچا۔ چٹان پر سے مٹی ہٹائی، تو اس میں سے، ایک دو نہیں اکٹھے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ اس نے ان چشموں کو نامزد کر دیا اور ہر قبیلہ کو بتا دیا کہ ان کا چشمہ کونسا ہے اس طرح ہم نے تمہیں سامانِ معیشت کی فکر سے نجات دلا دی۔ اور کہدیا کہ دیکھو! اب جب کہ تمہاری معاشی ضروریات پوری ہو رہی ہیں، تم۔۔۔ معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کر کے اس کا شیرازہ منتشر نہ کر دینا

(۶۱)۔ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ۲/۵۹) تم نے بیابانہ زندگی پر، شہری زندگی کو ترجیح دی۔ اس کے لئے موسیٰؑ سے کہا کہ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم (اس صحرائی زندگی میں) صبح و شام ایک ہی قسم کا کھانا کھاتے رہیں۔ اس لئے، تم اپنے نشوونما دینے والے سے ہمارے لئے زرعی پیداوار طلب کرو ــــــ سبزیاں ترکاریاں، ککڑیاں، لہسن (یا مختلف قسم کے اناج) مسور پیاز (وغیرہ) ــــــ حالانکہ صحرائی زندگی تمہاری عسکری تربیت گاہ تھی اور وہاں کی خوراک ایسی تھی جو تم میں زندگی کی حرارت پیدا کر دیتی۔

موسیٰؑ نے کہا کہ (کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ) تم اس بہترین زندگی کی بجائے۔ جو تمہارے لئے تجویز کی جا رہی تھی اس قسم کی ادنیٰ زندگی اختیار کرنا چاہتے ہو۔ اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو جاؤ شہر کی زندگی اختیار کر لو۔ وہاں تمہیں یہ سب کچھ مل جائے گا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں عسکریت اور کشور کشائی کی صلاحیتیں مفقود ہو گئیں اور محکومیت اور تساہل انگیزی کی خصلتیں پیدا ہو گئیں۔ اور اس طرح، ان پر ذلت و خواری کا عذاب خداوندی مستولی ہو گیا۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ انہوں نے قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے انبیاء کی عزت و توقیر کے بجائے، انہیں ناحق ذلیل کرنے کی تدبیریں کرنے لگے۔ نیز بعض کی جان تک کے لاگو ہو گئے (۲/۸۷؛ ۳/۱۸۲)۔ یہ سب کچھ ان کی سرکشی اور حدود فراموشی کا نتیجہ تھا۔

(۶۲)۔ یہ تو تمہاری روش رہی ہے، اور اس کے باوجود تمہارا عقیدہ یہ ہے کہ تم خدا کی چہیتی اولاد ہو (۵/۱۸) اور جنت تمہاری

نسل کے لئے مخصوص ہے (۲/۱۱۱) ـــ یہ تمہاری خام خیالی ہے ـــ جنت کسی نسل کے لئے مخصوص نہیں. ہمارا قانون یہ ہے کہ یہودی ہوں یا نصرانی. صابی ہوں یا وہ لوگ جو کسی مذہب میں رسمی طور پر داخل ہوئے بغیر ویسے ہی خدا کو مانتے ہیں ـــ یا خود مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے والے ـــ غرضیکہ کوئی بھی ہو، جو بھی خدا کے اقتدارِ اعلیٰ، زندگی کے تسلسل، اور اس کے قانونِ مکافات پر اس طرح ایمان رکھے جس طرح اس قرآن میں بتایا گیا ہے (۲/۱۳۷)، اور اس کے دیتے ہوئے پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کرے، تو ان کے نشوونما دینے والے کے قانونِ مکافات کے مطابق، ان کا اجر ملے گا، (جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ) نہ کسی قسم کا خوف ان کے دامن گیر ہوگا، نہ حزن، وجۂ افسردگی بنے گا.
(۴/۱۳۶ ; ۵۷/۲۸ ، ۶۱/۱۰-۱۱ ; ۹/۲۹ ; ۴۷/۲).

(٦٣)۔ (اس ضمنی گوشہ کے بعد تم پھر اپنی تاریخ کی طرف پلٹو) اور اس حقیقت کو سامنے لاؤ کہ تمہاری طبیعی حفاظت کا سامان اس طرح کر دیا گیا تھا کہ تمہاری پشت پر پہاڑ کھڑا تھا اور تم اس کے دامن میں تھے ـــ اور تمہاری انسانیت کی حفاظت کے لئے تمہیں ضابطۂ قوانین دیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہم نے تم سے کہا تھا کہ تم اس ضابطۂ ہدایت کو نہایت مضبوطی سے تھامے رکھنا۔ یعنی جو کچھ اس میں کہا گیا ہے اسے ہر وقت اپنے پیشِ نظر رکھنا، تاکہ تم زندگی کے ہر خطرے سے محفوظ رہ سکو. تم نے اس کا محکم عہد کیا تھا۔

(٦٤)۔ لیکن، اس محکم عہد و پیمان کے بعد، تم اس سے پھر گئے. یہ تو ہمارا قانونِ مہلت تھا جس کی وجہ سے تم پر فوراً گرفت نہ کی گئی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تم سے زندگی کی خوشگواریاں اور سامانِ نشوونما کی فراوانیاں، جو تمہیں حاصل تھیں، فوراً چھن جاتیں اور تم بالکل تباہ و برباد ہو جاتے ۔

(٦٥)۔ ضابطۂ خداوندی کو مضبوطی سے تھامنا تو بہت بڑی چیز تھی، تمہاری ناپختگیٔ سیرت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ تم سے کہا گیا کہ ہفتے میں ایک دن اپنا کاروبار بند رکھو، اور مچھلیاں نہ پکڑو (۷/۱۶۳)۔ لیکن تمہاری حرص و ہوس اتنی سی پابندی کی بھی متحمل نہ ہو سکی (۴/۱۵۴ ; ۱۶/۱۲۴)۔ اور تم نے اس نظم و ضبط کو توڑ ڈالا۔ (اس سے ہمارا تو کچھ نہ بگڑا) تم خود ہی ذِلت و مسکنت کے چلتے پھرتے پیکر بن گئے. سرکش قوتوں کی محکومی کے شکنجے میں جکڑے گئے (۵/۶۰ ; ۷/۱۶۷)۔ اور زندگی کی شادابیوں سے محروم رہ گئے (۴/۴۷)

(٦٦)۔ تمہاری یہ ذلت و خواری، ہر اس قوم کے لئے جو تباہیوں سے بچنا چاہے، عبرت و موعظت کا سامان اپنے اندر رکھتی ہے۔ ان کیلئے بھی جو اس وقت تمہارے ہم عصر تھے، اور ان کے لئے بھی جو ان کے بعد آئے، اور انہوں نے تاریخی نوشتوں سے تمہارے حالات کو پڑھا۔

(۶۷)۔ پھر تمہاری خوئے بہانہ سازی کا یہ عالم ہو چکا تھا، کہ جب تمہیں خدا نے حکم دیا کہ ایک سانڈ ذبح کر ڈالو تاکہ تمہارے دل سے گوسالہ پرستی کا وہ جذبۂ عقیدت نکل جائے جو تم نے قبطیوں کی دیکھا دیکھی اپنے اندر پیدا کر لیا تھا (۲/۹۳ نیز ۲/۱۵۲)۔ تو پہلے تو تم نے اس حکم ہی کا مذاق اڑانا شروع کر دیا، حالانکہ تمہیں معلوم تھا کہ تمہیں وہ حکمِ خداوندی؛ ایک پیغمبر کی وساطت سے ملا ہے، اور یہ بات ایک پیغمبر کے شایانِ شان نہیں ہوتی کہ وہ جہالت آمیز باتیں کرے۔

(۶۸)۔ جب تمہیں بتایا گیا کہ یہ خدا کا حکم ہے اور اس کی تعمیل ضروری، تو تم نے خواہ مخواہ موشگافیاں شروع کر دیں، اور کہنے لگے کہ خدا سے کہو کہ وہ ذرا واضح طور پر بتائے کہ وہ سانڈ کس قسم کا ہونا چاہئے۔

جب تم نے خود ان جزئیات کا تعین چاہا تو تم سے کہا گیا کہ وہ سانڈ نہ بوڑھا ہونا چاہیئے نہ بچہ، بلکہ اس کے بین بین ادھیڑ عمر کا ہونا چاہیئے۔ لہٰذا اب تم اس حکم کی تکمیل میں لیت و لعل مت کرو۔

(۶۹)۔ تم نے کہا کہ نہیں، بات اب بھی واضح نہیں ہوئی۔ اپنے رب سے پوچھ کر یہ بتاؤ کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ کہا گیا کہ گہرے زرد رنگ کا سانڈ، جو دیکھنے والوں کی نگاہوں میں اچھا جچے۔

(۷۰)۔ اس پر بھی تم آمادۂ عمل نہ ہوئے، اور مزید حجت بازی کے لئے کہا کہ بات اب بھی کچھ مشتبہ سی رہی۔ ذرا اور وضاحت سے بیان کیجئے تاکہ ہم صحیح بات تک پہنچ جائیں اور جو کچھ خدا کا منشاء ہے ٹھیک اسی کے مطابق کریں۔

(۷۱)۔ کہا گیا کہ ایسا سانڈ جسے نہ ہل میں جوتا گیا ہو اور نہ کنوئیں پر چلایا گیا۔ ہر طرح سے صحیح و سالم اور بے داغ ——— کہا کہ ہاں! اب تم نے ٹھیک ٹھیک پتہ بتایا۔

سو تم نے ایک معمولی سی بات میں بھی اس قدر موشگافیاں شروع کر دیں۔ یہ کچھ تم نے اس لئے نہیں کیا تھا کہ پہلے بات واضح نہ تھی۔ تمہیں شروع ہی سے معلوم تھا کہ ہم تمہارے ہاتھوں سے سانڈ (دیوتا) اس لئے ذبح کرانا چاہتے تھے کہ تم نے اسے معبود بنا رکھا تھا، اور ہم چاہتے تھے کہ تمہارے دل سے یہ جذبۂ عقیدت نکل جائے۔ لیکن تمہارا جی نہیں چاہتا تھا کہ تم اُسے ذبح کرو۔ اس کی محبت تمہارے دل کی گہرائیوں تک اُتر چکی تھی (۲/۹۳)۔ لیکن تم اس کا اقرار بھی نہیں کرنا چاہتے تھے، اسلئے تم نے حیلہ سازیاں کرنی شروع کر دیں، اور اس قدر لمبی چوڑی باتوں کے بعد اس حکم کی تعمیل کی۔

یاد رکھو! تعمیلِ احکام میں وہ باتیں کرید کرید کر نہیں پوچھنی چاہئیں جو خدا نے خود نہ کہی ہوں (۵/۱۰۱)۔

(۷۲)۔ ایک طرف تو تمہاری یہ حالت کہ ایک جانور کے ذبح کرنے میں اس قدر حیل و حجت، اور دوسری طرف یہ عالم کہ ایک انسانی جان ناحق لے لی۔ اُسے (خفیہ طور پر) مار دیا، اور جب تفتیش شروع ہوئی تو لگے ایک دوسرے کے سر الزام دھرنے۔ یعنی تم میں اتنی اخلاقی جرأت بھی نہ تھی کہ جرم ہو گیا ہے تو کھلے بندوں اس کا اقرار کر لو۔ لیکن جس بات

کو تم چھپانا چاہتے تھے خدا اسے ظاہر کر دینا چاہتا تھا، تاکہ جرم بلا قصاص نہ رہ جائے۔

(۷۳)۔ مشرکانہ توہم پرستیوں سے، جن میں تم مبتلا ہو چکے تھے، انسان کی نفسیاتی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ اسے کسی ذرا سی خلاف معمول بات کا سامنا کرنا پڑے تو اس پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے (۲۲/۳)۔ چونکہ خدا تمہاری اس نفسیاتی کیفیت سے واقف تھا، اس لئے اس نے قاتل کا سراغ نکالنے کے لئے ایک نفسیاتی ترکیب بتائی (جو انسان کی اس زمانے کی ذہنی سطح کے اعتبار سے، بڑی خلاف معمول تھی) اس نے کہا کہ تمہیں جن لوگوں پر شبہ ہے انہیں ایک ایک کر کے بلاؤ اور ان سے کہو کہ وہ لاش کے کسی حصے کو چھوئیں۔ (چنانچہ جو مجرم تھا جب وہ لاش کے قریب پہنچا تو خوف کی وجہ سے اس سے ایسے آثار نمایاں ہو گئے جو اس کے جرم کی غمازی کرنے کے لئے کافی تھے)۔ اس طرح اللہ نے اس قتل کے راز کو بے نقاب کر دیا اور، مجرم سے قصاص لے کر ان مرگ آفریں تاثرات کو جو قوم پر چھا رہے تھے، مبدل بہ حیات کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ قصاص میں قوم کی حیات کا راز پوشیدہ ہوتا ہے (۲/۱۷۹)۔

اللہ اس طرح تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا رہتا ہے تاکہ تم، عقل و شعور سے کام لے کر، ایسے معاملات کو سلجھا لیا کرو، اور اس حقیقت کو سمجھ لو کہ نفسیاتی تغیر سے (افراد سے آگے بڑھ کر) کس طرح خود قوموں کی حالت بدل جاتی ہے (۱۳/۱۱)۔

(۷۴)۔ غرضیکہ، تمہارے ساتھ یہ کچھ ہوتا رہا۔ تم بگڑتے اور بنتے رہے۔ آخر الامر تم نے ضابطۂ خداوندی سے یکسر منہ موڑ لیا۔ اس سے تمہارے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے، بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ اس لئے کہ، بعض پتھر بھی ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے ندیاں پھوٹ نکلتی ہیں، اور بعض ایسے کہ وہ پھٹ جاتے ہیں تو ان کے اندر سے (ندیاں نہ سہی) پانی کے چشمے ضرور بہ نکلتے ہیں۔ اور ایسے پتھر بھی ہوتے کہ وہ قانونِ خداوندی کے سامنے، سختی کو چھوڑ کر، اپنے مقام سے نیچے اتر آتے ہیں یعنی نرم پڑ جاتے ہیں — ایسے نرم کہ انہیں آسانی سے پیسا جا سکتا ہے اور بعض کو پگھلا یا بھی۔ لیکن تمہارے دل ہیں کہ نہ وہ انسانیت کی غمخواری میں نرم ہوتے اور نہ قانونِ خداوندی کے سامنے جھکتے ہیں، اور نہ آنسو بن کر تمہاری آنکھ سے ٹپکتے ہیں۔

لیکن اس سے خود تمہارا اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔ تمہاری کوئی حرکت ہمارے قانونِ مکافات کی نگاہوں سے اوجھل نہیں۔ ان میں سے ایک ایک کا نتیجہ مرتب ہو کر رہے گا۔

(اے جماعتِ مؤمنین، دیکھنا! تم بھی کہیں ان جیسا نہ ہو جانا۔ (۵۷/۱۶)۔

(۷۵)۔ اے قرآنی انقلاب کی طرف دعوت دینے والی جماعت! ہم جانتے ہیں کہ تم دل سے چاہتے ہو کہ یہود بھی اس انقلاب

میں تمہارا ساتھ دیں، اور اس طرح، وہ خود بھی اس ذلت و خواری کی زندگی سے نجات حاصل کرلیں اور انسانیت بھی ان کی دسیسہ کاریوں سے مخلصی پائے۔ لیکن کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اس قسم کی قوم، جس کی قلبی کیفیت وہ ہو چکی ہو جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، کبھی تمہارا ساتھ دے سکتی ہے؟ بالخصوص، جب ان کی حالت یہ ہے کہ وہ یہ کچھ لاعلمی سے نہیں کرتے۔ ان میں (مذہبی پیشواؤں کا) گروہ موجود ہے جو قوانینِ خداوندی کو سنتے ہیں، سمجھتے ہیں، اور پھر جان بوجھ کر اس میں تغیر و تبدل کر دیتے ہیں، اور اس کی ایسی ایسی تاویلیں کرتے ہیں جن سے بات کچھ سے کچھ بن جاتی ہے ــــ باقی لوگ انہی کا اتباع کرتے رہتے ہیں۔

جو لوگ دیدہ دانستہ یہ کچھ کریں، ان سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ حق کو قبول کرلیں گے؟

(۷۶)۔ تم انہیں ایماندار سمجھتے ہو، حالانکہ ان کی حالت یہ ہے کہ جب تمہارے پاس آتے ہیں تو اپنے آپ کو ایماندار ظاہر کرتے ہیں اور جب آپس میں، ایک دوسرے سے تنہائی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اس جماعت سے خلا ملا رکھنا تو اچھا ہے، لیکن ہمیں اس کی احتیاط برتنی چاہیئے کہ ان سے اپنی کتابوں کی وہ باتیں نہ کہہ دی جائیں جنہیں یہ ہمارے خلاف بطور دلیلِ خداوندی لاکر، ہمارا منہ بند کر دیں۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔

(۷۷)۔ لیکن یہ اتنا نہیں سوچتے کہ جس خدا کی طرف سے انہیں وہ باتیں ملی تھیں، یہ، اُسی خدا سے ان باتوں کو چھپانا چاہتے ہیں! ان سے پوچھیئے کہ کیا خدا سے یہ باتیں چھپی رہ سکتی ہیں؟ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ لوگ ظاہر کیا کرتے ہیں اور چھپا کر کیا رکھتے ہیں۔

(۷۸)۔ یہ لوگ دوسروں کے ساتھ ہی اس قسم کی فریب کاری نہیں کرتے، خود اپنوں کے ساتھ بھی یہی کچھ کرتے رہتے ہیں (مثلاً) ان میں بعض لوگ ایسے ہیں جو پڑھے لکھے نہیں۔ وہ خوش عقیدگی کی پیدا کردہ جھوٹی آرزوؤں کو پلّے باندھے رکھتے ہیں۔ اور توہم پرستیوں اور قیاس آرائیوں میں مست رہتے ہیں۔ اور شریعت کے متعلق جو کچھ انہوں نے پوچھنا ہو، اس کے لئے اپنے احبار و رہبان (علماء مشائخ) کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

(۷۹)۔ ان کے علماء کرتے یہ ہیں کہ شریعت کے احکام خود اپنے ذہن سے، اپنی مرضی کے مطابق، وضع کر لیتے ہیں، اور ان اَن پڑھ لوگوں سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ سب ارشاداتِ خداوندی ہیں۔ اور اس طرح ان سے ناجائز فائدہ حاصل کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ ان کی یہ خود ساختہ شریعت، اور اس کے ذریعے کمائی ہوئی دولت، سراسر تباہی اور بربادی کا موجب ہے۔ ($\frac{۵۶}{۸۲}$)

(۸۰)۔ ان کی یہ خوئے فریب دہی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ، اور تو اور، یہ خود اپنے آپ کو بھی دھوکا دینے سے

نہیں چوکتے۔ چنانچہ، یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم جو جی میں آئے کریں، ہم سے کوئی مواخذہ نہیں ہو گا۔ ہم، زیادہ سے زیادہ، چند دنوں تک جہنم میں رہیں گے (یعنی صرف اُتنے وقت کے لئے جب تک ہمارے شفاعت کرنیوالے ہمیں خدا سے بخشوا نہیں لیں گے)۔ ان سے پوچھو کہ کیا تم نے اس کے متعلق خدا سے کوئی عہد لے رکھا ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس لئے کہ خدا اپنے عہد سے پھرا نہیں کرتا۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں۔ تم خدا کے متعلق اس قسم کی باتیں کرتے ہو جن کے لئے تمہارے پاس کوئی علم و دلیل نہیں۔

(۸۱)۔ تم سے کس نے کہہ دیا کہ خدا کے ہاں سفارشیں چلتی ہیں؟ وہاں کسی کی سفارش نہیں چل سکتی، نہ ہی اس کی کوئی چہیتی قوم ہے)۔ اس کا غیر متبدل قانون یہ ہے کہ جس قوم نے بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کی، اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سارا معاشرہ خطا کاریوں سے بھر گیا اور ہر سمت فساد ہی فساد رونما ہو گیا، تو یہ وہ لوگ ہیں جن کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں گی، اور وہ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

(۸۲)۔ ان کے برعکس، جو قوم خدا کے قانون پر یقین رکھتے ہوئے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو گی، تو ان لوگوں کو جنتی زندگی نصیب ہو گی۔ اور ان کی کھیتیاں ہمیشہ لہلہاتی رہیں گی۔ ($\frac{۲}{۱۱۲}$)۔

(۸۳)۔ تمہارا خدا سے یہ عہد نہیں تھا کہ تم جو کچھ بھی کرتے رہو گے، تم سے اس کی باز پرس نہیں ہو گی)۔ تمہارا عہد یہ تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی اور کے قوانین و احکام کی اطاعت نہیں کرو گے۔ (ضعیف) ماں باپ سے حسنِ سلوک سے پیش آؤ گے۔ نیز اپنے رشتہ داروں سے، اور ان لوگوں سے جن کا چلتا ہوا کاروبار رُک جائے اور ان کی زندگی کی گاڑی کھڑی ہو جائے۔ ان سب سے ایسا برتاؤ کرو گے کہ ان کی کمیاں پوری ہو جائیں اور اس طرح معاشرہ کا توازن بگڑنے نہ پائے۔

تم نے یہ عہد بھی کیا تھا کہ تم لوگوں سے ہمیشہ خوش معاملگی سے پیش آؤ گے، اور انہیں اچھی باتوں کی تلقین کرو گے۔ نیز یہ کہ تم ایسا نظام قائم کرو گے جس میں تمام افراد، قوانینِ خداوندی کا پورا پورا اتباع کریں۔ اور ان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچتا رہے —— لیکن تم نے، اس عہد کے بعد، گریز کی راہیں نکالنی شروع کر دیں اور معدودے چند کے سوا، سب کے سب، سیدھا راستہ چھوڑ کر دوسری طرف چل نکلے —— یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی۔ تمہاری نفسیاتی کیفیت ہی ایسی ہو چکی تھی کہ تم قانونِ خداوندی کو چھوڑ کر دوسری راہوں پر چل نکلتے!

(۸۴)۔ تم نے یہ عہد بھی کیا تھا کہ تم باہمی خونریزی نہیں کرو گے، اور اپنے میں سے کمزوروں اور غریبوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر نہیں کرو گے۔ تم نے اس کا اقرار کیا تھا۔ اور سب کچھ دیکھتے بھالتے، سوچتے سمجھتے اقرار کیا تھا —— تم اب بھی اسے تسلیم کرتے ہو۔

(۸۵)۔لیکن تم ہو کہ ایسے محکم قول و اقرار کے بعد، باہمی خونریزیاں کرتے ہو اور، اپنے غریب بھائیوں کو اُن کے گھروں سے نکال باہر کرتے ہو۔ اور بجائے اس کے کہ تمہاری سوسائٹی، ان مجرمین کے خلاف، کوئی کارروائی کرے، تم اُلٹے ان غریبوں کے خلاف ظلم و استبداد میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو ——— کہیں کمزور کو کمزور تر بنانے سے اور کہیں ان سرکشوں کی حوصلہ افزائی کرنے سے ——— اور ستم ظریفی یہ کہ جب، ان گھروں سے نکالے ہوئے غریبوں کو دوسرے لوگ پکڑ کرلے جاتے ہیں تو تم بڑے خدا ترس بنتے ہو، اور ان کا زرِ فدیہ ادا کرکے انہیں چھڑا لیتے ہو، اور اس سے سمجھتے یہ ہو کہ تم نے بڑا نیکی کا کام کیا! حالانکہ خود ان لوگوں کو ان کے گھروں سے نکالنا وہ سنگین جرم تھا جس سے تمہیں منع کیا گیا تھا۔ سو تمہاری حالت یہ ہے کہ تم ضابطۂ خداوندی کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو۔ (حالانکہ جس طرح انسانی زندگی کے حصے بخرے نہیں کئے جا سکتے اسی طرح اس ضابطۂ خداوندی کے بھی ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا جا سکتا۔ اسے مانا جائے گا تو سب کا سب مانا جائے گا۔ اور انکار کیا جائے گا تو پورے کے پورے سے انکار کیا جائے گا۔ جس طرح جسم کے دو ٹکڑے کر دینے سے کوئی ٹکڑا بھی زندہ نہیں رہ سکتا اسی طرح جو قوم ضابطۂ خداوندی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیتی ہے، اور جو حصہ مفید مطلب ہو اس پر عمل کرتی ہے اور دوسرے کو چھوڑ دیتی ہے، تو) اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا کہ ایسی قوم کے حال کی زندگی بھی ذلت اور رسوائی کی زندگی ہو، اور مستقبل کی زندگی بھی اندوہناک تباہیوں سے لبریز۔ دنیا میں بھی ذلت اور آخرت میں بھی رسوائی۔

ضابطۂ خداوندی سے اس قسم کا برتاؤ کرنے کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ یاد رکھو! خدا کے قانونِ مکافات کی نگاہوں سے تمہارا کوئی عمل پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔

(۸۶)۔یہ لوگ محض، ذاتی مفاد کی خاطر، ضابطۂ خداوندی کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرتے ہیں، اور طبیعی زندگی کی آسائشوں کے لئے مستقبل کی سرفرازیوں کو بیچ ڈالتے ہیں (لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، ان کی یہ زندگی بھی تباہ ہو جاتی ہے، اور آخرت کی زندگی بھی خراب) اور یہ تباہی بڑھتی چلی جاتی ہے، اور کوئی ایسا نہیں ہوتا جو اس حال سے نکلنے میں ان کی مدد کر سکے۔ یہ درحقیقت نتیجہ ہوتا ہے اس غلط نظام کا جس میں صاحبِ اقتدار اور سرمایہ دار طبقہ کو کھلی چھٹی ہوتی ہے کہ وہ غریبوں اور محنت کشوں کا استحصال کرکے انہیں مفلس سے مفلس تر بناتے جائیں اور پھر صدقہ و خیرات سے ان کی جھولی میں بھیک کے چند ٹکڑے ڈال کر اپنے آپ کو فریب دے لیں کہ ہم بڑا ثواب کا کام کر رہے ہیں۔ یاد رکھو! غلط نظام سے پیدا ہونے والی تباہیاں اس قسم کے فریب نفس سے رک نہیں سکتیں وہ آ کر رہتی ہیں۔

(۸۷)۔تمہاری طرف قوانینِ خداوندی بھیجنے کا سلسلہ موسیٰ تک ہی نہیں رہا، بلکہ، اس کے بعد بھی۔ تمہارے پاس، مختلف رسول، یکے بعد دیگرے آتے رہے۔ آخر میں عیسیٰؑ ابن مریم آیا۔ اسے بھی ہم نے واضح دلائل و براہین دیئے تھے۔ یعنی ہم نے اُسے اس وحی کی رُو سے تائید و تقویت عطا کی تھی جو ہماری طرف سے بلا آمیزش اس تک پہنچی تھی۔ اور تمہارے پاس انبیائے سابقہ کی جو وحی رہ گئی تھی اس میں تم نے اپنی طرف سے ہزار ملاوٹیں کر رکھی تھیں۔

لیکن تمہاری روش ہمیشہ یہ رہی کہ جب کبھی کسی رسول نے ایسی بات کہی جو تمہارے مفاد و رجحان کے خلاف جاتی تھی اور اس لئے تمہارا دل اُسے پسند نہیں کرتا تھا، تو تم وہیں اکڑ گئے۔ پھر ان رسولوں میں سے بعض کی تم نے تکذیب کی اور بعض کے قتل کے درپے ہوگئے۔

یہی کچھ اب تم اس کتاب کے متعلق کر رہے ہو، تاکہ اس میں تمہاری منشاء کے مطابق تبدیلی کر دی جائے۔
(۱۰/۱۵ ؛ ۱۱/۱۱۳ ؛ ۱۷/۷۴ ؛ ۶۸/۹ ؛ ۳۹/۴۵)۔

(۸۸)۔قرآنی تعلیم سے ان کی بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ اس پر غور کرنا تو ایک طرف۔ یہ اسے سننا تک بھی نہیں چاہتے۔ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر اس کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ (ان سے کہو کہ یہ کوئی خوبی اور فخر کی بات نہیں کہ تمہارے دل اس کا اثر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ دل کا فریضہ تو ہر بات پر غور و فکر کر کے سچی بات کو قبول کرنا ہے۔ جو دل ایسا نہیں کرتے، سمجھ لو کہ) وہ اپنی اس استعداد اور صلاحیت سے محروم ہو چکے ہیں ایسے لوگوں کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ جو بات بھی ان کے سامنے پیش کی جائے اس پر غور و فکر کرنے کے بجائے پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ ہم نے اسے ماننا ہی نہیں (۲/۶)۔

اس قسم کی ذہنیت والوں میں سے بہت کم لوگ ایسے ہیں کہ صحیح بات کو سمجھ سوچ کر اسے تسلیم کر لیں۔

(۸۹)۔ان کی یہ حالت اس وقت ہو رہی ہے جب انکے پاس اللہ کی طرف سے وہ ضابطۂ قوانین آچکا ہے جو ان اخلاقی اقدار اور دعاوی کو سچ کر دکھانے والا ہے جو تعلیم خداوندی میں سے ان کے ہاں موجود ہیں، اور جس کے لئے یہ خدا سے دعائیں مانگا کرتے تھے کہ وہ آئے تو یہ کفار پر غلبہ پا سکیں۔ یہ خوب پہچانتے ہیں کہ یہ ضابطۂ قوانین خدا ہی کی طرف سے نازل ہوا ہے، لیکن اس کے باوجود، یہ اس سے انکار کر رہے ہیں۔ لیکن اس انکار سے انہوں نے اس ضابطۂ خداوندی کا کیا بگاڑا؟ اس سے ہوا یہ کہ یہ خود اس کی برکات سے محروم رہ گئے۔

(۹۰)۔تمہیں معلوم ہے کہ ان کے انکار کی اصلی وجہ کیا ہے؟ صرف یہ حسد کہ یہ رسول غیر اسرائیلی کیوں ہے! (انہوں نے از خود یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ دنیا بھر کی برکات و سعادات بنی اسرائیل کے لئے مخصوص ہو چکی ہیں، حتیٰ کہ نبوت بھی انہی کی قومیت کے دائرے میں محدود ہے) حالانکہ نبوت ایک ایسی موہبت ہے جو خدا کے قانونِ مشیت

کے مطابق اسے دی جاتی ہے جسے اس کا اہل سمجھا جائے۔ (اس میں، قوم اور وطن اور زبان اور رنگ کی کوئی خصوصیت نہیں)۔

بہر حال، ان کی اس ضد سے اس کے سوا اور کیا ہوا کہ یہ زندگی کی تمام خوشگواریوں سے محروم رہ گئے۔ ان کی امیدوں کی کھیتی جل کر راکھ ہوگئی اور ان کا انکار اور سرکشی ان کے لئے ایسی ذلت آمیز تباہی کا موجب بن گئی جس نے ان کی ساری اجتماعی قوت کو توڑ کر رکھ دیا۔ کتنا بُرا ہے یہ سودا جو انہوں نے اپنی زندگی کے عوض کیا ہے!!

اور یہ انجام ہر اس قوم کا ہوتا ہے جو قوانین خداوندی سے سرکشی اختیار کرے۔

(۹۱)۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ! اس ضابطۂ خداوندی کی صداقتوں پر ایمان لاؤ، تو اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو صرف اسی پر ایمان رکھتے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوا تھا۔ اس کے سوا ہم کسی اور تعلیم پر ایمان لانے کے لئے تیار نہیں۔ حالانکہ یہ قرآن (ان کی طرف بھیجی ہوئی سچی تعلیم کے خلاف نہیں بلکہ) ان اقدار اور دعاوی کو سچ کر دکھانے والا ہے جو تعلیم خداوندی میں سے ان کے پاس موجود ہیں۔

ان سے کہو کہ (اگر تمہارا اعتراض یہی ہے کہ ہم اس قرآن کو اس لئے نہیں مانتے کہ یہ ایک غیر اسرائیلی کی طرف نازل ہوا ہے تو) بتاؤ کہ، اس سے قبل، جو اسرائیلی انبیاء تمہاری طرف آتے رہے تھے، تم ان کی تذلیل و تحقیر پر کیوں اُتر آیا کرتے تھے۔ ان کی تعلیم کو غیر مؤثر کیوں بنا دیا کرتے تھے۔ اور ان کی جان تک کے دشمن کیوں بن جایا کرتے تھے؟ تمہارا یہ دعویٰ کہ تم اسرائیلی انبیاء پر ایمان لایا کرتے تھے، خود تمہاری اپنی تاریخ کی رُو سے جھوٹا ثابت ہو رہا ہے۔

(۹۲)۔ دیگر انبیاء بنی اسرائیل کو تو چھوڑو، تم نے خود موسیٰؑ کے ساتھ کیا کیا؟ وہ تمہارے پاس ایک واضح ضابطۂ قوانین لایا تھا (جس کی بنیادی تعلیم توحید تھی)، لیکن تم نے اُسے چھوڑ کر، گوسالہ پرستی شروع کر دی۔ کہو! یہ ایمان تھا یا کفر؟ یہ اطاعت تھی یا سرکشی؟۔

(۹۳)۔ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے (۲/۶۳) جب ہم نے تم سے، دامن کوہ میں، اس بات کا پختہ عہد لیا تھا کہ تم اس ضابطۂ خداوندی کو پوری قوت سے تھامے رہو گے، تو تم سے کہہ دیا گیا تھا کہ تم اس بات کو دل کے کانوں سے سن لو! اور اچھی طرح سمجھ لو۔ تم نے جواب دیا تھا کہ ہم نے اسے اچھی طرح سن اور سمجھ لیا ہے۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟ ہوا یہ کہ تم نے ان قوانین کی اطاعت کے بجائے ان سے سرکشی اختیار کر لی۔ یہ اسلئے کہ گوسالہ کی عقیدت تمہارے دل کی گہرائیوں میں اتر چکی تھی۔ تمہارے خون میں حلول کر چکی تھی۔

ان سے کہو کہ یہ ہے تمہارا سابقہ ریکارڈ! لہٰذا، تمہارا یہ کہنا کہ ہم اس لئے قرآن پر ایمان نہیں لاتے کہ ہم اس ضابطۂ خداوندی پر ایمان رکھتے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوا تھا، خود فریبی اور فریب دہی سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر تمہارا ایمان تمہیں یہی کچھ سکھاتا ہے، اور اس قسم کی زندگی بسر کرنے کا حکم دیتا ہے تو ہزار افسوس ہے ایسے ایمان پر۔

(۹۴)-ان سے کہو کہ تمہارا یہ بھی دعویٰ ہے کہ تم خدا کی چہیتی اولاد ہو (۵/۱۸)-اور آخرت کا گھر، یعنی جنت، تمہارے لئے مخصوص ہے (۲/۸۰)، اور غیر اسرائیلیوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں (۲/۱۱۱)۔ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو تمہیں موت سے کبھی نہیں ڈرنا چاہیئے، بلکہ اس کی تمنا کرنی چاہیئے (تمہیں نکھر کر میدانِ جنگ میں سامنے آنا چاہیئے۔ چھپ چھپ کر سازشیں نہیں کرنی چاہئیں۔ موت تو حسنِ عمل کا پہلا امتحان ہے، (۶۷/۲ ز ۶۲/۶)۔

(۹۵)-لیکن تم دیکھو گے کہ یہ لوگ مرنے کیلئے کبھی تیار نہیں ہوں گے، اس لئے کہ انہیں معلوم ہے کہ انہوں نے اپنی مستقبل کی زندگی کیلئے کیا کمائی کر کے آگے بھیجی ہوئی ہے۔ اللہ، اس قسم کے فریب کار سرکشوں کی ابلہ فریبیوں سے خوب واقف ہے۔

(۹۶)-مرنے کی تمنا تو ایک طرف! تم دیکھو گے کہ یہ لوگ، زندہ رہنے کے لئے، مشرکین عرب سے بھی زیادہ حریص ہیں۔ ان میں سے ایک ایک کی تمنا یہ ہے کہ اُسے ہزار سال کی عمر مل جائے۔ لیکن، یہ نادان اتنا نہیں سمجھتے کہ اس درازیِ عمر سے کیا ہو گا؟ کیا اس سے یہ اپنے غلط اعمال کے تباہ کن نتائج سے بچ جائیں گے؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ خدا کا قانونِ مکافات ان کے ایک ایک کام پر نگاہ رکھتا ہے۔ اسلئے ان کے ہر عمل کا نتیجہ ان کے سامنے آکر رہے گا۔

(۹۷)-یہ لوگ جبریل سے ناراض ہو رہے ہیں کہ اس نے ایک غیر اسرائیلی کو وحی کیوں دیدی (۲/۹۰)۔ ان سے کہو کہ اس میں جبریل سے ناراض ہونے کی کونسی بات ہے؟ وہ از خود تو کسی کی طرف وحی نہیں لے جاتا۔ اس نے اس قرآن کو قلبِ محمدی پر خدا کے حکم کے مطابق نازل کیا ہے اور جو کچھ نازل کیا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ان دعاوی کو سچ کر دکھانے والا ہے جو خود تمہارے ہاں موجود ہیں۔ اور تیسرے یہ کہ، یہ وحی، ہدایت وسعادت کو بنی اسمٰعیل میں محدود نہیں کرتی (کہ تمہیں شکایت ہو کہ تم اس سے محروم کر دیئے گئے ہو) یہ تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلی ہے، اور ان لوگوں کی جو اس کی صداقتوں پر ایمان لائیں، زندگی کی صحیح منزل کی طرف راہ نمائی کرتی ہے اور حال و مستقبل کی خوشگواریوں کی خوشخبری دیتی ہے (خواہ وہ کسی نسل سے کیوں نہ ہوں)۔

(۹۷)-(ان سے کہو کہ) تمہارے اس اعتراض کی نشتر، صرف جبریل تک ہی نہیں پہنچتی۔ یہ تو خود خدا پر اعتراض ہے اور اس کے تمام نظامِ وحی پر، اور ان وسائط پر جو اس کے حکم سے تدبیرِ امور کرتے ہیں ــــ یعنی جبریل و میکائیل سمیت تمام ملائکہ پر اعتراض ــــ اس قسم کا اعتراض، درحقیقت، خدا اور اس کے نظام سے کھلا ہوا انکار ہے۔ سوچو، کہ جو لوگ اس قسم کی روش اختیار کئے ہوں، خدا ان کا دوست کیسے ہو سکتا ہے!

(۹۸)-(ان سے کہدو کہ تمہاری تمام مخالفت، اور حسد وعناد کے علی الرغم) خدا نے یہ واضح تعلیم تیری طرف نازل کی ہے۔ اس سے وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو زندگی کے صحیح راستے کو چھوڑ کر غلط راہوں پر چل نکلے ہوں۔

(۱۰۰)۔ (یہ تو ہے ان کی اعتقادی زندگی کا عالم۔ باقی رہی ان کی عملی زندگی، سو اس کی کیفیت یہ ہے کہ) جب یہ کسی سے عہد و پیمان کرتے ہیں تو (اگرچہ وہ عہد و پیمان پوری کی پوری قوم کی طرف سے ہوتا ہے لیکن) ان میں سے ایک جماعت اس معاہدہ کو، ردی کاغذ کا ٹکڑا سمجھ کر پھینک دیتی ہے اور اس کا کوئی احترام نہیں کرتی ـــــ یہ اس لئے کہ یہ لوگ کسی مستقل قدر اور غیر متبدل اصول پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ (مصلحت کوشی ان کا شیوہ اور مفاد پرستی اس کا شعار رہے۔ وہ کسی طریق سے بھی حاصل ہو!)۔

(۱۰۱)۔ (اے رسول! یہ جو اس طرح تمہاری مخالفت کر رہے ہیں۔ تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ ہمیشہ یہی کچھ کرتے رہے ہیں۔ مثلاً تم سے پہلے) جب ان کی طرف ایک رسول (عیسےٰؑ) آیا ـــ وہ رسول جو (تمہاری طرح) ان اقدار و دعاوی کو سچ کر دکھانے والا تھا جو تعلیم خداوندی میں سے ان کے پاس موجود تھے۔ (اور وہ بنی اسرائیل میں سے تھا، اور ان کی کتابوں میں اس کا صریح ذکر بھی موجود تھا) لیکن اس کے باوجود، ان لوگوں کے ایک گروہ نے، جو کتابِ الٰہی اپنے پاس رکھتے تھے، اس کتاب کو یوں پسِ پشت ڈال دیا، گویا وہ اُسے جانتے تک نہ تھے (اور اس رسول کے قتل تک کے درپے ہوگئے)۔

(۱۰۲)۔ (ان لوگوں کا شیوہ ہی یہ رہا ہے کہ یہ خدا کی سچی تعلیم کو ٹھکراتے رہے) اور اپنے خود ساختہ افسانوں کے پیچھے لگے رہے۔ اُن افسانوں میں ایک یہ بھی تھا کہ (انہوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ خدا کا برگزیدہ پیغمبر) سلیمانؑ حقائقِ خداوندی کو چھوڑ کر، سحر آفرینیوں اور شعبدہ بازیوں کو ماننے لگ گیا تھا۔

سلیمانؑ خدا کا پیامبر، اور اس قسم کی کافرانہ روش کا حامل! یہ یکسر افترا پردازی تھی، جو اس کی نبوت کے خلاف ان شیاطین نے تراش رکھی تھی۔ اس باطل روش کا اتباع سلیمانؑ نے نہیں کیا تھا، خود ان کے فتنہ پرداز سرغنوں نے کیا تھا۔ وہ لوگوں کو جادو، ٹونے سکھاتے تھے (اور اسے منسوب کرتے تھے سلیمانؑ کی طرف)۔

پھر ایک افسانہ یہ بھی تھا (جو انہوں نے مشہور کر رکھا تھا) کہ بابل میں دو فرشتے تھے ـــ ہاروت و ماروت ـــ ان پر خدا نے اس علم (جادو) کو نازل کیا تھا۔ لوگ ان کے پاس جا کر اس قسم کے تعویذ گنڈے سیکھتے جن سے میاں بیوی میں افتراق پیدا ہو جاتے۔ لیکن وہ (فرشتے) یہ کچھ سکھانے سے پہلے لوگوں سے کہہ دیتے کہ بھائی! ہم تو ایک فتنہ ہیں۔ تم یہ کچھ سیکھ کر کیوں کافر بنتے ہو۔ (لیکن اس کے باوجود، لوگ ان سے یہ باتیں سیکھتے ـــ ان باتوں میں لذت ہی ایسی ہوتی ہے)۔

لیکن یہ سب افسانہ ہی افسانہ ہے۔ نہ بابل میں اس قسم کے کوئی فرشتے تھے۔ اور نہ ہی خدا نے انہیں کوئی باطنی علم سکھایا تھا۔ یہ سب ان لوگوں کی خود ساختہ کہانیاں ہیں۔

باقی رہے گنڈے، تعویذ۔ سو یہ، ان کے ذریعے کسی کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ نفع و نقصان، سب قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ تعویذ گنڈے سیکھنے (اور کرنے) والوں کو اس سے کچھ دنیاوی مفاد ضرور حاصل ہو جاتے ہیں، لیکن (ذرا بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو یہ حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے کہ) اس میں ان کا نقصان ہی ہے، نفع نہیں۔ اس لئے کہ اس سے انہیں دنیاوی مفاد حاصل ہو جاتے ہیں، لیکن مستقبل کی خوشگواریوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ (اور یہ حقیقت ہے کہ مستقبل کی خوشگواریوں کے مقابلہ میں، عاجلہ مفاد کچھ وزن نہیں رکھتے) — جو شخص جان دے کر، جسم کی لذتیں خریدتا ہے، اس کی تجارت نفع کا سودا کس طرح قرار پا سکتی ہے؟ اے کاش! یہ اس قدر کھلی ہوئی بات کو سمجھ سکتے۔

(۱۰۳)۔ اگر یہ لوگ ان افسانوں کے پیچھے لگنے کے بجائے، قرآنی حقائق پر ایمان لے آتے، اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے تو خدا کے ہاں سے انہیں اس کا بہت اچھا بدلہ (نتیجہ) ملتا — کاش، یہ عقل و فکر سے کام لیتے!

(۱۰۴)۔ اے جماعتِ مومنین! اس مقام پر ایک اہم حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ تم نے دیکھا ہے کہ یہودیوں کی ذہنیت یہ تھی کہ وہ موسیٰؑ سے بار بار اس قسم کے مطالبے کرتے تھے کہ ہمارے لئے یہ مہیا کر دو تو ہم تمہاری بات مانیں گے۔ یہ روش زندگی غلط ہے تم یہ نہ کرنا کہ اپنے نظام سے اس قسم کی سودے بازی شروع کر دو۔ اور اس سے کہہ دو کہ اگر تم ہماری رعایت کرو گے تو ہم تمہاری رعایت کریں گے...... تمہارا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیئے کہ تم اپنے رسول (نظامِ خداوندی کے مرکز) سے یہ کہو کہ آپ ہم پر نگاہ رکھیں کہ ہم بے راہ نہ ہونے پائیں، اور ہم آپ کی اطاعت کرتے جائیں گے۔

نیز باہمی گفتگو میں، ذو معنی الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔ نہ ہی بات توڑ مروڑ کر کرنا چاہیئے یہودیوں کی یہ بھی عادت ہے (۴۶)۔ یاد رکھو! یہ باتیں یوں تو بڑی عام سی دکھائی دیتی ہیں، لیکن ان کے اثرات بڑے دور رس ہوتے ہیں۔ جو لوگ ان حقیقتوں سے انکار کرتے ہیں وہ الم انگیز عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

(۱۰۵)۔ ان اہلِ کتاب، اور مشرکینِ عرب میں سے جو لوگ قرآن پر ایمان نہیں لاتے، وہ اسے دیکھ ہی نہیں سکتے کہ تمہاری طرف خدا کی وحی آئے (۳/۱ ؛ ۱۲/۳۰) اور اس کی بناء پر تمہیں زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہوں۔ لیکن اس میں ان کے چاہنے یا نہ چاہنے کا کیا سوال ہے؟ یہ سب کچھ خدا کے قانون کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ جس فرد کو چاہتا ہے وحی کے لئے چن لیتا ہے، اور پھر جو چاہے اس وحی کی خیر و برکت سے مستفید ہو سکتا ہے۔ اس کی نعمتوں کا دسترخوان ہر شخص کیلئے کھلا ہے۔ جو ہاتھ بڑھا کر کچھ لینا چاہے لے لے۔

(۱۰۶)۔ ان (اہلِ کتاب) کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ جب خدا کی کتابیں پہلے سے موجود تھیں، تو پھر ایک نئی کتاب (قرآن) کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔ نیز یہ بھی کہ اگر یہ کتاب خدا کی طرف سے ہے تو اس میں ایسے احکام کیوں ہیں جو خدا کی پہلی وحی (تورات) کے خلاف ہیں

ان سے کہدو کہ ہماری طرف سے وحی کا انداز یہ ہے کہ کسی سابقہ رسول کی وحی کے ایسے احکام، جو وقتی طور پر نافذ العمل رہنے کے لئے دیئے گئے تھے، انہیں، بعد میں آنے والے رسول کی وحی کے احکام سے بدل دیا جاتا ہے، اور یہ نئے احکام پہلے احکام سے بہتر ہوتے ہیں۔ جن سابقہ احکام کے متعلق اس کا فیصلہ ہوتا ہے کہ انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا جائے، یا جنہیں سابقہ رسولوں کی قومیں ترک یا فراموش کر دیتی ہیں، یا ان میں اپنی طرف سے آمیزش کر دیتی ہیں (۲۲/۵۲)۔ ان کی جگہ، انہی جیسے احکام، جدید وحی میں دیدیئے جاتے ہیں (۱۶/۱۰۱)۔ اور یہ سب کچھ ہمارے مقرر کردہ اندازوں کے مطابق ہوتا ہے جن پر ہمارا پورا پورا کنٹرول ہے۔

انہی اندازوں کے مطابق اب یہ آخری ضابطۂ حیات دیا گیا ہے، جس میں تمام سابقہ سچائیاں آگئی ہیں (۵/۴۸)۔ جو ہر طرح مکمل ہے (۶/۱۱۶)، اور جو ہمیشہ محفوظ رہے گا (۱۵/۹)۔ اس لئے یہ ضابطہ، اب تمام سابقہ ضوابط کی جگہ لے گا، اور ہمیشہ نافذ العمل رہے گا۔

(۱۰۷)۔ ان سے کہو کہ اس بارے میں کوئی شخص خدا پر اعتراض نہیں کر سکتا کہ اس نے وحی کا انتظام ایسا کیوں رکھا ہے؟ کیا انہیں اس کا علم نہیں کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں سب اقتدار اسی کا ہے۔ اس لئے وہی جانتا ہے کہ کونسا قانون کب نافذ کرنا چاہیئے۔ (ان سے کہہ دو کہ)، اس کے باوجود، اگر تم اس ضابطۂ قوانین کی اطاعت سے انکار کرتے رہو گے تو تم خود دیکھ لوگے کہ کوئی دوسرا ضابطہ، زندگی کی مشکلات دور کرنے میں تمہارا کارساز اور مددگار نہیں ہو سکے گا۔

(۱۰۸)۔ اس سلسلہ میں (اے جماعتِ مومنین!) تم بھی ایک بنیادی حقیقت کو سمجھ لو۔ اور وہ یہ کہ جس قدر احکام و قوانین کا دیا جانا خدا کو مقصود ہے، وہ سب، از خود، قرآن میں دیدیئے جائیں گے، اور جن امور کے متعلق کچھ نہیں کہا جائے گا، ان کے متعلق سمجھ لینا چاہیئے کہ ایسا دانستہ کیا گیا ہے، خدا سے بھول نہیں ہو گئی۔ لہٰذا ان امور کے متعلق تم اپنے رسول سے اس قسم کے سوالات نہ شروع کر دینا جس قسم کے سوالات، اس سے پہلے، بنی اسرائیل اپنے رسول، موسیٰؑ، سے کیا کرتے تھے۔ (اس کرید کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ایسی باتوں کو اپنے لئے غیر متبدل شریعت بنا لیا جن کا ہمیشہ کے لئے نباہنا مشکل تھا۔ آخر الامر انہیں ان سے انکار کرنا پڑا۔ سو تم بھی ایسا نہ کرنا (۵/۱۰۱)۔ جو قوم بھی ایمان سے بہرہ یاب ہو کر پھر کفر کی روش اختیار کرے، فلاح و بہبود کی راہ اس سے گم ہو جاتی ہے۔

(۱۰۹)۔ ان اہلِ کتاب میں سے اکثر چاہتے ہی یہ ہیں کہ تمہارے اس ایمان کے بعد، تمہیں پھر کفر کی طرف لوٹا دیں۔ یہ اس لئے نہیں کہ حقیقت ان پر واضح نہیں ہوئی۔ حقیقت تو ان کے سامنے نکھر کر آ چکی ہے، لیکن یہ اپنے قومی تعصب کی بنا پر اس دین کو اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں، اور نہ ہی یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اس نظامِ زندگی کی برکات سے تم فیض یاب ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ اس کا علاج کیا ہے؟ تم ابھی اپنے نظام کے ابتدائی دور سے گذر رہے ہو۔ اس لئے ان سے الجھ کر اپنا وقت اور توانائی ضائع مت کرو۔ اس وقت تک کہ فیصلہ کن انقلاب کا مرحلہ سامنے نہ آجائے، تم ان سے اعراض برتو، اور ان کا خیال کئے بغیر اپنے پروگرام کی تکمیل میں آگے بڑھتے جاؤ، اور جو کچھ یہ کہتے ہیں اس سے درگزر کرو (۱۵/۵ ؛ ۱۴/۱۵ ؛ ۴۲/۳۳ ؛ ۱۰/۱۱)۔ خدا ہر بات کے اندازے سے واقف ہے اور حالات پر پورا پورا کنٹرول رکھتا ہے۔ اس لئے وہ جانتا ہے کہ کس موقعہ پر کونسی روش اختیار کرنی چاہیئے۔

(۱۱۰)۔ اس پروگرام کی تکمیل، اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ سے ہوگی۔ یعنی ایسا معاشرہ قائم کرنے سے جس میں ہر فرد قوانینِ خداوندی کے پیچھے چلتے ہوئے، ان کی رو سے عائد شدہ فرائض کو ادا کرتا جائے، اور نوع انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتا رہے (۲/۳)۔ اس ابتدائی مرحلہ میں ایسا محسوس ہوگا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو، اس کا کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہو رہا۔ لیکن، یقین رکھو کہ تمہاری محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔ تم اپنی محنتوں کا نتیجہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق، وقتِ مقررہ پر، اپنے سامنے دیکھ لوگے (۲/۳)۔ کسی کا کوئی عمل، اس کے قانونِ مکافات کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتا۔

(۱۱۱)۔ ان (اہلِ کتاب) کا دعوٰے ہے کہ جنت بس انہی (یہود و نصاریٰ) کے لئے مخصوص ہو چکی ہے، ان کے علاوہ اس میں کسی اور کا داخلہ نہیں ہو سکتا۔ (۲/۱۳۵)۔ یہ ان کی خوش فہمی ہے جو ان کے فریبِ نفس اور جہالت نے پیدا کر رکھی ہے۔ ان سے کہو کہ، ذرا جذبات سے الگ ہٹ کر، علم و بصیرت کی رو سے بات کریں، اور اگر یہ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں، تو اس کی تائید میں دلائل و براہین پیش کریں — حقائق کے فیصلے خوش آیند جذبات کی رو سے نہیں ہوا کرتے، علم و براہان سے ہوتے ہیں۔

(۱۱۲)۔ اور علم و برہان کا فیصلہ یہ ہے کہ زندگی کی خوشگواریاں اور کامرانیاں، قومی گروہ بندیوں اور دل خوش کن آرزوؤں سے وابستہ نہیں۔ ان کے لئے ایک ابدی اور غیر متبدل قانون ہے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ جس کسی نے بھی اپنے آپ کو قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکا دیا۔ جس نے اپنا رخ اس منزل کی طرف کر لیا جو اللہ نے انسانوں کے لئے مقرر کی ہے — اور اس کے بعد (افراط و تفریط کو چھوڑ کر ۲/۱۸۰ ؛ ۴۰/۲۱)، حسن کارانہ انداز سے (قرآن کے مطابق) زندگی بسر کی، تو اس کے اس ایمان و عمل کا نتیجہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق، اسے مل جائے گا۔ ایسے لوگوں کی نشانی یہ ہوگی کہ نہ ان کے لئے کسی قسم کا خوف و خطر ہوگا، اور نہ ہی افسردگی اور غمگینی۔